خواتین ڈائجسٹ

جون 2012

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملیے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

جون 2012
جلد 40 شمارہ 2
قیمت 50 روپے

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

پکوان

نفسیات

بیوٹی بکس

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ---- 800 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کہی ان کہی

خواتین ڈائجسٹ کا جون کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انسانی تہذیب و تمدن نے ترقی کی تو گھر اور خاندان تشکیل پائے۔ اچھے خاندان سے اچھے معاشرے اور اچھے معاشروں سے بہترین قومیں بنتی ہیں۔ عورت کو گھر اور خاندان میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ وہ معاشرے ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے جہاں عورت کا حق تسلیم کیا گیا اور اسے احترام کا درجہ دیا گیا۔ ہمارے ہاں بہت سے معاملات میں تبدیلی آئی ہے۔ سوچ بدلی ہے۔ خواتین جو پہلے گھروں تک محدود تھیں، اب مختلف میدانوں میں سرگرم عمل ہیں۔ اپنی صلاحیتیں منوا رہی ہیں لیکن یہ تبدیلی صرف بڑے شہروں تک ہی محدود ہے۔ خواتین کی اکثریت آج بھی اپنے جائز حق سے محروم ظلم اور جبر کا شکار ہے۔ حقوق خواتین کا چرچا تو بہت کیا جاتا ہے۔ ان کی حمایت میں جلسے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ اسمبلی میں قرار دادیں پیش کی گئیں، بل منظور کیے گئے لیکن آج تک کسی ایک پر بھی صحیح معنوں میں عمل درآمد نہیں ہوا۔ خواتین کو جو حقوق، جو رتبہ اور جو احترام ہمارے مذہب میں دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کسی قرار داد یا مطالبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ صرف ان احکامات اور اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے جو مذہب نے متعین کیے ہیں۔

لیکن شاید اصل مسئلہ یہ بے عملی ہی ہے جس میں گزرتے وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اس شمارے میں،

- آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ آخری کوشش،
- فرحت اشتیاق کا مکمل ناول۔ جھکے ہیں سنگ سمیٹ لو،
- سمیرا حمید کا مکمل ناول۔ لگی تھی جو جیت،
- راحت جبیں اور شہزادی عباس غلجی کے ناولٹ،
- راشدہ رفعت، قرۃ العین حنا، تمینہ عظمت علی اور سعدیہ رئیس کے افسانے،
- عنیزہ سید اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- پی ایچ ڈی ماہر قانون رعنا خان ایڈووکیٹ سے ملاقات،
- ٹی وی فنکار عدیل حسین سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے،
- میری خامشی کو بیاں ملے۔ قارئین سے سروے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ ترتیب دیتے ہوئے ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کی خوشگوار تحریریں آپ کو موسم کی شدتوں سے بے نیاز کر دیں۔ ہم اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ٹھہرے۔ یہ آپ ہی بتا سکتی ہیں۔ خط ضرور لکھیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

مسلمان کو تکلیف

حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مسلمان کو جو بھی تکان یا بیماری، فکر، غم اور تکلیف پہنچتی ہے، حتیٰ کہ کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ مومن کے ساتھ اللہ کے فضل و کرم کا جو خاص معاملہ ہے، اس میں اس کا بیان ہے کہ دنیا میں پہنچنے والے آلام و مصائب کو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہے جب مومن صبر کرے۔ اگر وہ صبر کے بجائے جزع فزع اور تقدیر الٰہی کا شکوہ کرے گا تو اس دنیوی تکلیف کے ساتھ دوسری مصیبت اس کے لیے یہ ہو گی کہ وہ اجر سے محروم رہے گا، بلکہ مزید گناہوں کا بوجھ بھی اسے اٹھانا پڑے گا۔

2۔ بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندۂ مومن کو کسی بلند مرتبے تک پہنچانا چاہتا ہے لیکن اس کے اعمال اس کا ساتھ نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ آلام و مصائب کے ذریعے سے اس کے درجات بلند فرما دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ انہیں اپنی تقدیر الٰہی سمجھ کر صبر کرے۔

دوگنا اجر

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہا بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ آپؐ کو بخار تھا۔ میں نے کہا "اے اللہ کے رسول! بلاشبہ آپؐ کو شدید بخار ہوتا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں، مجھے اتنا بخار ہوتا ہے جتنا تمہارے دو آدمیوں کو۔"

میں نے کہا۔ "آپ کے لیے اجر بھی دوگنا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں، یہ ایسا ہی ہے۔ جو بھی مسلمان، اسے کوئی تکلیف پہنچے، کانٹا لگے

یا اس سے بڑی تکلیف آئے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کی برائیاں دور فرمادیتا ہے اور اس کے گناہ اس سے اس طرح گرتے ہیں جیسے (پت جھڑ کے موسم میں) درخت سے اس کے پتے گرتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ انبیاء علیہ السلام کو زیادہ تکلیفیں آتی ہیں' پھران کی بعد جو شخص زیادہ متقی اور پرہیز گار ہو' اسی قدر زیادہ آزمائشوں سے گزرے گا' جن سے ان کے اجر و ثواب میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ گویا آلام و مصائب کی زیادتی کمال ایمان کی علامت ہے' نہ کہ اللہ کی ناراضی کی دلیل۔

2۔ بخار مومن کے لیے رحمت ہے اور اللہ کے پسندیدہ بندوں کو آتا ہے۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن ازہر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "مومن بندے کی مثال' جب اسے بخار آتا ہے' ایسے ہے جیسے لوہے کو آگ میں ڈالا جائے تو ردی ختم ہو جاتا ہے اور عمدہ رہ جاتا ہے۔" یعنی اس کے گناہ ختم ہو جاتے ہیں اور وہ پاک صاف ہو جاتا ہے۔

مصیبت میں بہتری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے' اس کو مصیبت سے دوچار کردیتا ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ دنیا کی تکلیفیں' مصائب و آلام' بیماری' غربت' جان و مال کا نقصان وغیرہ' ان میں مومن کے لیے بھلائی کا پہلو اس طرح ہے کہ دنیا میں وہ ان کی وجہ سے اللہ کی طرف رجوع کرتا اور اس سے دعا و التجا کرتا ہے' اور ان کی وجہ سے اس کے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں' اس لیے آخرت کے نقطۂ نظر سے بھی اس میں ایک مومن کے لیے خیر ہے۔

2۔ دنیاوی آزمائشوں یا بیماری میں مبتلا ہونا بندۂ مومن کے لیے خیر اور بھلائی ہے' تاہم اس کا سوال نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے تدارک کی کوشش کرنی چاہیے۔

موت مانگنا

حضرت انس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے کوئی شخص کسی تکلیف کی وجہ سے جو اسے پہنچی ہو' موت کی آرزو نہ کرے اور اگر (اس کے بغیر) چارہ نہ ہو تو اس طرح دعا کرے۔ الھم احینی خیر" الہی۔ اے اللہ! تو مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہو اور اس وقت مجھے فوت کر دے' جب وفات میرے لیے بہتر ہو۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ انسان کو چونکہ مستقبل کا علم نہیں کہ آئندہ زندگی اس کے حق میں بہتر ہے یا نہیں' اس لیے مطلقاً" کسی تکلیف اور مصیبت سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنا ایک تو بے صبری ہے' دوسرے اندھیرے میں تیر چلانا ہے کیونکہ ممکن ہے زندگی کا باقی ماندہ حصہ اس کے دین و دنیا کے لیے بہتر ہو' اس لیے موت کی آرزو کرنا منع ہے۔

2۔ شہادت کی یا کسی مقدس جگہ میں مرنے کی آرزو کرنا جائز ہے کیونکہ یہ مسئلہ زیر بحث سے مختلف چیز ہے۔ اگر ویسے ہی موت کی آرزو کرنی ہو تو حدیث میں مذکورہ الفاظ کے ساتھ دعا کی جائے۔

حضرت ابو عبداللہ خباب بن ارت رضی اللہ عنہا بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی جب کہ آپ خانہ کعبہ کے سائے میں ایک چادر کا تکیہ بنائے استراحت فرما تھے۔ ہم نے کہا۔ "آپ ہمارے لیے اللہ سے مدد طلب کیوں نہیں

فرماتے؟ ہمارے لیے دعا کیوں نہیں کرتے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"(تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ) تم سے پہلے لوگوں کا (یہ حال ہوتا تھا کہ) آدمی پکڑ کر لایا جاتا' اس کے لیے زمین میں گڑھا کھود کر اسے اس میں کھڑا کردیا جاتا' پھر اس کے سر پر آرا چلا کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے جاتے اور لوہے کی کنگھیاں اس کے جسم پر پھیری جاتیں' جس سے اس کا گوشت اور ہڈیاں تک متاثر ہوتیں۔ لیکن یہ آزمائشیں اسے اس کے دین سے نہ پھیرتیں۔ (اس لیے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے) اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ اس معاملے کو ضرور مکمل فرمائے گا (دین اسلام کو غالب کرے گا) یہاں تک کہ ایک سوار (مسافر) صنعاء سے حضر موت تک (اکیلا) سفر کرے گا لیکن اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر اور اسی طرح اسے اپنی بکریوں پر' بھیڑیے کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا۔ لیکن تم جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ دین کی راہ میں تکلیفوں کا آنا' کسی ایک دور کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہر جگہ اور ہر دور میں اہل دین آزمائش کی بھٹیوں سے گزرے اور کندن بن کر نکلے۔ اس لیے آزمائشوں سے گھبرانا کسی مومن کا شیوہ نہیں۔

2۔ دین اسلام کے غلبے کی نوید اور امن و سلامتی کی خوش خبری' دور خیر القرون میں یہ پیش گوئیاں ظہور پذیر ہوئیں جس کا لوگوں نے مشاہدہ کیا اور اب بھی جہاں اسلام کا نفاذ ہے' امن و سلامتی اس معاشرے کا امتیاز ہے۔

3۔ اہل ایمان کے صبر و استقلال کے واقعات بیان کرنا پسندیدہ امر ہے۔ اس سے ایمان کو بالیدگی ملتی ہے اور اپنی کم مائیگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

4۔ اللہ کی زمین میں حدود اللہ کا قیام امن و سلامتی کی ضمانت ہے اور اس سے خیر و برکت کا نزول ہوتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "زمین میں ایک (مجرم کو) حد لگانا زمین والوں کے لیے چالیس دن بارش برسنے سے بہتر ہے۔"

راوی حدیث حضرت ابو عبداللہ خباب بن ارت رضی اللہ عنہ مکہ میں اظہار اسلام کرنے والوں میں سے پہل کرنے والے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مشرکین مکہ نے انہیں کمزور سمجھتے ہوئے ہر طرح کی اذیتوں اور تکلیفوں سے دوچار کیا تاکہ کسی نہ کسی طرح ان کو دین محمدؐ سے منحرف کر سکیں۔ لیکن اللہ کے اس شیر کے پایۂ ثبات میں بالکل لغزش نہ آئی۔ انہوں نے اسلام کی خاطر ہر طرح کی تکالیف کو خندہ پیشانی سے قبول کیا حتیٰ کہ ہجرت کا حکم آپہنچا' چنانچہ انہوں نے ہجرت کی۔ تمام غزوات میں شریک رہے۔ بدری صحابی ہیں۔ آخر میں کوفہ رہائش پذیر ہوئے اور وہاں ہی جان آفریں کے سپرد کی۔ 37 ہجری میں وفات پائی۔ 32 فرامین محمدیہ کو روایت کرنے کا شرف حاصل کیا۔ رضی اللہ عنہا۔

شرک

حضرت صہیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم سے پہلے لوگوں میں ایک بادشاہ تھا اور اس کا (مشیر) ایک جادوگر تھا۔ جب جادوگر بوڑھا ہو گیا تو اس نے بادشاہ سے کہا۔

"بے شک میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ایک لڑکا میرے سپرد کر تاکہ میں اسے یہ جادو کا علم سکھادوں۔"

چنانچہ بادشاہ نے ایک لڑکا اس کی طرف بھیجنا شروع کر دیا' جس کو وہ جادو سکھاتا۔ (لڑکا جس راستے سے آتا) اس کے راستے میں راہب (پادری) کا بھی ٹھکانا تھا۔ وہ لڑکا جب بھی جادوگر کے پاس گیا تو گزرتے ہوئے راہب (پادری) کے پاس بھی تھوڑی دیر کے لیے بیٹھا۔ اس لڑکے نے اس کی باتیں سنیں تو اسے اچھی لگیں۔ چنانچہ وہ جب بھی جادوگر کے پاس جاتا تو گزرتے ہوئے راہب (پادری) کے پاس بھی بیٹھ جاتا۔ جب وہ جادوگر کے پاس آتا تو (دیر سے آنے کی

وجہ سے) جادوگر اسے مارتا۔ اس نے راہب کو بتلایا۔ راہب نے اس سے کہا۔

"جب تمہیں جادوگر سے (مار کا) ڈر ہو تو یہ کہہ دیا کرو کہ مجھے میرے گھر والوں نے روک لیا تھا اور جب گھر والوں سے ڈر ہو تو کہہ دیا کرو کہ جادوگر نے مجھے روک لیا تھا۔"

چنانچہ اسی طرح دن گزرتے رہے کہ ایک دن لڑکے نے اپنے راستے میں ایک بہت بڑا جانور دیکھا جس نے لوگوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ لڑکے نے (دل میں) کہا۔ "آج پتا چل جائے گا کہ جادوگر افضل ہے یا راہب۔" اس نے ایک پتھر پکڑ کر کہا۔

"اے اللہ! اگر راہب کا معاملہ تیرے نزدیک جادوگر کے معاملے سے زیادہ پسندیدہ ہے تو اس جانور کو (اس پتھر کے ذریعے سے) مار دے تاکہ (راستہ کھل جائے اور) لوگ گزر جائیں۔"

چنانچہ (یہ دعا کر کے) اس نے پتھر اس جانور کو مارا، جس سے وہ ہلاک ہو گیا اور لوگ گزر گئے۔ وہ لڑکا راہب کے پاس آیا اور اسے یہ واقعہ بتلایا۔ راہب نے اس سے کہا۔

"بیٹے! آج تم مجھ سے افضل ہو۔ تمہارا معاملہ جہاں تک پہنچ گیا ہے، میں وہ دیکھ رہا ہوں اور عنقریب تم آزمائش میں ڈالے جاؤ گے۔ لہٰذا جب آزمائش کا یہ مرحلہ آئے تو تم میرے بارے میں لوگوں کو مت بتلانا۔"

اور یہ لڑکا مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو (اللہ کے حکم سے) درست کر دیتا تھا اور دیگر تمام بیماریوں کا علاج کرتا۔ بادشاہ کا ایک درباری (ہم نشیں) اندھا ہو گیا۔ اس نے جب سنا تو وہ بہت سے ہدیے لے کر لڑکے کے پاس آیا اور اس سے کہا۔

"اگر تم مجھے ٹھیک کر دو تو یہ سارے ہدیے جو یہاں میں ساتھ لایا ہوں، تمہارے ہیں۔"

لڑکے نے کہا۔ "میں کسی کو شفا نہیں دیتا، شفا صرف اللہ دیتا ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لے آؤ تو میں اللہ سے دعا کروں گا تو وہ تمہیں شفا عطا فرما دے گا۔"

چنانچہ وہ اللہ پر ایمان لے آیا اور اللہ نے اسے شفا عطا فرما دی۔

وہ (ٹھیک ہونے کے بعد) بادشاہ کے پاس آیا اور اس کے پاس اس طرح بیٹھ گیا، جیسے وہ بیٹھا کرتا تھا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا۔

"تیری بینائی کس نے بحال کر دی؟"

اس نے کہا۔ "میرے رب نے۔"

بادشاہ نے کہا "کیا میرے علاوہ تیرا کوئی اور رب ہے؟"

اس نے کہا۔ "میرا اور تیرا رب (صرف ایک) اللہ ہے۔"

بادشاہ نے اسے گرفتار کر لیا اور اس کو سزا دیتا رہا۔ حتیٰ کہ اس نے لڑکے کا پتا بتلا دیا، چنانچہ لڑکے کو (بادشاہ کی خدمت میں) لایا گیا۔ بادشاہ نے اس سے کہا۔

"بیٹا! تیرے جادو کا کمال اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ تو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو درست کر دیتا ہے اور بھی فلاں فلاں کام کر لیتا ہے۔"

لڑکے نے کہا "میں کسی کو شفا نہیں دیتا، شفا دینے والا صرف اللہ ہے۔"

بادشاہ نے اسے بھی گرفتار کر لیا اور اسے سزا دیتا رہا۔ حتیٰ کہ اس نے راہب کا پتا بتا دیا۔ چنانچہ راہب کو پیش کیا گیا۔

راہب سے کہا گیا "کہ تم اپنے دین سے پھر جاؤ۔"

اس نے انکار کر دیا تو بادشاہ نے آرا منگوایا اور اس آرے کو اس کے سر کے عین درمیان (مانگ والے مقام پر) رکھ دیا گیا اور اس کے سر کو چیر دیا، یہاں تک کہ اس کے سر کے دو حصے ہو گئے۔ پھر بادشاہ کے ہم نشیں (درباری) کو لایا گیا اور اس سے کہا گیا کہ "اپنے دین سے پھر جا۔" اس نے بھی انکار کر دیا۔ چنانچہ آرا اس کے سر کے مانگ والے مقام پر رکھ دیا گیا اور اس کے سر کو چیر دیا، جس سے اس کے سر کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔ پھر لڑکے کو لایا گیا۔ اس سے کہا گیا۔

"کہ اپنے دین سے پھر جا۔"

اس نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے اسے اپنے چند خاص آدمیوں کے سپرد کیا اور کہا کہ۔

"اسے فلاں فلاں پہاڑ پر لے جاؤ، اس (پہاڑ) پر اسے چڑھاؤ، جب تم اس کی چوٹی پر پہنچ جاؤ تو (اس سے اس کے دین کے متعلق پوچھو) اگر یہ اپنے دین سے پھر جائے تو ٹھیک، ورنہ اسے وہاں سے نیچے پھینک دو۔"

چنانچہ وہ اسے لے گئے اور اسے پہاڑ پر لے کر چڑھے تو لڑکے نے دعا کی۔

"اے اللہ! تو ان کے مقابلے میں، جیسے تو چاہے، مجھے کافی ہو جا۔"

چنانچہ پہاڑ لرزا۔ جس سے سب نیچے گر گئے۔ لڑکا بادشاہ کے پاس آ گیا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا۔

"تیرے ساتھیوں نے کیا کیا؟" (یعنی کیا انہوں نے تجھے پہاڑ کی چوٹی سے نہیں گرایا) لڑکے نے کہا۔

"ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہو گیا۔"

بادشاہ نے اسے پھر اپنے چند خاص آدمیوں کے سپرد کیا اور ان سے کہا۔

"اسے لے جاؤ اور کشتی میں سوار کرو اور سمندر کے درمیان لے جا کر (اس سے پوچھو) اگر یہ اپنے دین سے پھر جائے تو ٹھیک، ورنہ اسے سمندر میں پھینک دو۔"

چنانچہ وہ اسے لے گئے۔ اس نے کشتی میں بیٹھ کر دعا کی۔

"اے اللہ! ان کے مقابلے میں، جیسے تو چاہے، مجھے کافی ہو جا۔"

چنانچہ کشتی الٹ گئی اور وہ سب پانی میں ڈوب گئے۔ یہ لڑکا پھر بادشاہ کے پاس آ گیا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا۔

"تیرے ساتھیوں نے کیا کیا؟" (یعنی کیا انہوں نے تجھے سمندر میں نہیں پھینکا؟)

لڑکے نے کہا "اللہ تعالیٰ ان کے مقابلے میں مجھے کافی ہو گیا۔"

پھر لڑکے نے بادشاہ سے کہا تو مجھے اس وقت تک قتل نہیں کر سکتا جب تک تو وہ طریقہ اختیار نہ کرے جو میں تجھے بتلاؤں۔

بادشاہ نے کہا۔ "وہ کیا ہے؟"

اس نے کہا۔ "تو ایک کھلے میدان میں لوگوں کو جمع کر اور مجھے سولی دینے کے لیے ایک تنے پر چڑھا، پھر میرے ترکش سے ایک تیر لے کر اسے کمان کے چلے پر رکھ، پھر یہ الفاظ (بسم اللہ رب الغلام) اللہ کے نام سے جو اس لڑکے کا رب ہے۔ پڑھ کر مجھے تیر مار۔ جب تو ایسا کرے گا تو مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

چنانچہ بادشاہ نے لوگوں کو ایک میدان میں جمع کیا۔ اسے سولی دینے کے لیے لکڑی کے ایک تنے پر چڑھا دیا، پھر اس کے ترکش سے ایک تیر لے کر اسے کمان کے چلے پر رکھا اور کہا۔

"(بسم اللہ رب الغلام) اللہ کے نام سے جو اس لڑکے کا رب ہے۔" اور تیر پھینکا۔ تیر اس کی کنپٹی پر لگا۔ لڑکے نے اپنا ہاتھ اپنی کنپٹی پر رکھا اور مر گیا۔

لوگ یہ ماجرا دیکھ کر رب کائنات کی حقیقت اور اللہ واحد کی توحید سمجھ گئے اور بے اختیار پکار اٹھے۔

"ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لائے۔"

لوگوں نے بادشاہ سے کہا۔ "آپ جس چیز سے ڈرتے تھے، اللہ کی قسم وہی ہوا

چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ سڑکوں کے ناکوں پر خندقیں کھودی جائیں تو وہ کھودی گئیں اور ان میں آگ بھڑکا دی گئی۔ بادشاہ نے حکم دیا۔

"جو اپنے دین سے نہ پھرے، اسے اس آگ میں جھونک دو" یا اس سے کہا جائے، "آگ میں داخل ہو جا۔" انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حتیٰ کہ ایک عورت آئی، جس کے ساتھ بچہ تھا۔ وہ آگ میں گرنے سے جھجکی تو اس کو بچے نے کہا۔

"اماں! صبر کر، یقیناً تو حق پر ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

1- اس حدیث میں سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ دین کی راہ میں جو بھی مشکلات آئیں، انہیں صبر و عزیمت سے برداشت کیا جائے اور دین کی مصلحت کا تقاضا ہو تو جان تک قربان کر دی جائے۔

2- اولیاء اللہ کی کرامات برحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مشیت کے تحت انہیں اپنے بندوں کے ہاتھوں سے ظاہر کرواتا ہے۔

3- داعیانِ حق کے لیے اس قسم کے واقعات استقامت کا باعث ہیں۔

ذکر کاہلی کا

انشاجی

ہمارا اشماران لوگوں میں ہے جن کا ذکر پطرس نے اپنے مضمون "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" میں کیا ہے۔ اگر یہ مضمون ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے کا نہ ہوتا، اگر پطرس مرحوم کے نیاز بھی حاصل رہے ہوتے تو ہم یہی سمجھتے کہ انھوں نے یہ ہمارے بارے میں لکھا ہے۔ اٹھنا نمبر ایک اور اٹھنا نمبر دو ہمیشہ سے ہماری زندگی کا معمول رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم نے پطرس کے ہیرو کی طرح سورج کو کبھی طلوع ہوتے دیکھا ہی نہیں۔ کئی بار دیکھا ہے۔ فلموں میں بڑا اچھا لگتا ہے۔

جوش اور جگر دونوں بڑے شاعر ہیں لیکن ہمارا ذاتی رجحان ہمیشہ جگر کی طرف رہا ہے۔ شاعری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ ہماری ہی طرح کے تھے۔ جرند پرند اور جوش ملیح آبادی کی طرح علی الصباح نہیں اٹھ بیٹھتے تھے۔ ارے بھئی وہی تو وقت چڑیوں کے چہچہانے کا ہوتا ہے۔ جو لوگ نور کے تڑکے چھڑی لیے باغ میں جا پہنچتے ہیں۔ وہ ان بے زبانوں کے معمولات میں مخل ہوتے ہیں۔ جگر صاحب سے بھی ہم کبھی نہیں ملے، لیکن ایک بار ان کے قلم سے یا کسی اور کے قلم سے ہم نے پڑھا ہے کہ بھوپال میں ان لوگوں نے یعنی جگر صاحب اور ان کے دوستوں نے ایک انجمن الکھلا قائم کی تھی۔ کھلا، کاہل کی جمع ہے۔ جو جتنا بڑا احدی اور خدائی خوار ہوتا تھا۔ اتنا ہی اس انجمن میں یا کلب میں ذی مرتبت سمجھا جاتا تھا کہ انجمن کے دفتر میں ایک قالین بچھا تھا۔ یہ لوگ وہاں پہنچ کر کھڑے کھڑے گر پڑتے تھے کیونکہ کھڑے سے بیٹھنا اور بیٹھنے کے بعد لیٹنا ایک محنت طلب امر ہے۔ ناحق کا تکلف ہے اور آداب کاہلی کے خلاف ہے۔ دن بھر یہ لوگ وہاں اپنی کاہلی کے نشے میں غین پڑے رہتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی شخص آکر ان کے منہ میں پانی ڈال جاتا تھا۔

سچ یہ ہے کہ کاہلی میں جو مزا ہے' وہ کاہل ہی جانتے ہیں۔ بھاگ دوڑ کرنے والے اور صبح صبح اٹھنے والے اور ورزش پسند اس مزے کو کیا جانیں۔

"ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔" دیکھیے! ہمارے قبیلے میں کیسا کیسا آدمی ہوا ہے۔ غالب بھی "بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے" کے قائل تھے۔ میر صاحب یعنی میر تقی میر بھی اپنے حجرے میں قطب بنے بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی اپنے حجرے کی کھڑکی بھی نہ کھولی کیونکہ کھولنا بھی ایک طرح کا کام ہے' بلکہ یہاں تک سنا ہے ادھر کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ ایک صاحب نے کہا۔

"میر صاحب! یہ کھڑکی کھول لیا کیجیے' باہر کی ہوا آیا کرے گی اور اس طرف باغ بھی ہے۔" حیران ہو کر بولے۔

"اچھا میرے کمرے میں کوئی کھڑکی بھی ہے۔"

میر اور غالب تو خیر پرانے زمانے کے آدمی تھے۔ ہمارے حکیم الامت' شاعر مشرق علامہ اقبال کے متعلق بھی ہم نے کبھی نہیں پڑھا کہ چاق و چوبند آدمی تھے۔ یہی معلوم ہوا کہ تہہ بند باندھے چارپائی پر لیٹے رازی کے نکتہ ہائے دقیق پر غور کرتے رہتے تھے اور حقہ پیتے رہتے تھے۔

اس صبح خیز طبقے نے کوئی اتنا بڑا شاعر پیدا کیا ہو تو ہمیں اس کا نام بتائیے' تعارف کرائیے' ہمیں یاد پڑتا ہے' مرزا محمد رفیع سودا نے جو دلی کے چوروں پر مثنوی لکھی ہے۔ اس میں صبح اٹھنے والوں کو کچھ اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا۔ ملا مسجد کا صبح خیزیا ہے۔ ایسا ہی کوئی مصرعہ ارشاد کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی ان کا یعنی ایسی مثنوی کے ممدوحوں کا ساتھی ہے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اہل مغرب میں سارے لوگ موجد اور سائنس داں ہی نہیں ہیں' بلکہ بہت سے ہمارے قبیلے کے ہیں۔ بلکہ ایسے کہ ہمارے قبیلے کے لیے باعث نازش۔ ایک اخبار میں پڑھا کہ وہاں کاہلوں کے باقاعدہ کلب ہیں' جن میں کاہل لوگ بوجہ کاہلی کبھی نہیں جاتے۔ جو شخص چلا جائے اسے مستعد جان کر اس کا نام کاٹ دیا جاتا ہے۔ ہم نے جوش ملیح آبادی صاحب کا وہ نظام اوقات پڑھا کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک یہ باغ میں ملے گا اور فلاں وقت اسے میخانے میں تلاش کیجیے اور فلاں وقت نہ جانے کہاں اس کلب والوں نے جن کا نام "بورن ٹائرڈ ایسوسی ایشن" یعنی پیدائشی تھکے ماندوں کی انجمن ہے۔ مثالی زندگی کا نظام اوقات یہ مقرر کیا ہے کہ چوبیں میں سے دس گھنٹے تو سونا ہی چاہیے۔ باقی رہے چودہ گھنٹے... ان میں آٹھ گھنٹے آرام کے لیے وقف ہونے چاہئیں۔ یعنی آدمی لیٹا اکڑتا رہے' کچھ کام نہ کرے۔ باقی رہے چھ گھنٹے... اس میں سے چار گھنٹے کھانے کے لیے وقف رہنے چاہئیں۔ کھانا اور جگالی کرنا بھی تو ایک زندگی کی عشرتوں میں سے ہے۔ نوالے زہر مار کرنا تو کھانے کی تعریف میں نہیں آتا۔ باقی رہے دو گھنٹے... یہ انجمن تو ان میں بھی کسی قسم کے کام کاٹنا پسند نہیں کرتی' لیکن خیر کوئی ان میں کام کرنا چاہے تو اعتراض بھی نہیں کرتی۔ ہمارے خیال میں تو اس میں سے بھی کچھ وقت نہانے' شیو کرنے اور حاجات ضروریہ اور غیر ضروریہ کی مد میں نکل جاتا ہے۔ بشرطیکہ یہ مغرب کے کاہل لوگ ان تکلفات کو ضروری سمجھیں۔ یاد رہے کہ اس کلب کے پینتیس ہزار ممبر ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں تو انجمن سازی بھی تکلف اور کاہلی کے اصولوں کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ فارم بھرنا' فیس دینا' دستخط کرنا وغیرہ۔ ایک بار تین کاہلوں میں مقابلہ ہوا تھا کہ ہر شخص اپنی اپنی کاہلی کا کوئی قصہ سنائے' جو سب سے زیادہ کاہل ہو' وہ انعام پائے۔ ایک نے اپنا قصہ بیان کیا کہ بیر کو اٹھا کر منہ میں ڈالنے کے لیے بھی کسی راہ گیر کی خدمات حاصل کیں۔ دوسرے نے اس سے زیادہ دوں کی لی۔ تیسرے کے سامنے شمع پہنچی تو بولا۔ "یارو! قصے تو کئی ایک ہیں' لیکن کون سنائے؟" پس انعام کا حق دار یہی تیسرا ٹھہرا۔

✲ ✲ ✲

ہمارے ہاں کلب کا مطلب صرف نائٹ کلب سمجھا جاتا ہے یا شراب نوشی اور رقص و تفریح کا اڈہ۔ یہ بات نہیں' مغرب کے ملکوں میں شام کو گھر میں گھسے بیٹھے رہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ایران اور ترکی تک میں لوگ شام اترتے ہی میرو تفریح کے لیے نکل

پڑتے ہیں اور شام کا چوگا بھی باہر ہی کھاتے ہیں۔ جو کلبوں کے ممبر ہیں' وہ وہاں جاکر کچھ کھیلتے ہیں' کچھ پڑھتے ہیں' کچھ گپ کرتے ہیں۔ مغرب میں پینا پلانا بھی آداب زندگی میں داخل ہے۔ لہٰذا پی بھی لیتے ہیں اور کبھی کبھی زیادہ بھی پی لیتے ہیں۔ بعض تو اپنے پاؤں چل کر گھر پہنچ جاتے ہیں۔ بعض کو ڈنڈا ڈولی کرکے لانا پڑتا ہے۔ پابہ دست دگرے دست بدست دگرے۔

☼ ☼ ☼

آپ میں سے بہت سوں نے رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی کہانی "خود کشی کا کلب" پڑھی ہوگی۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اسی نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کلب کے ممبر بننے والے اپنی جان سے بے زار بے شک ہوتے تھے' لیکن اپنی جان آپ لیتے ڈرتے تھے۔

خود کشی کے لیے ہمت چاہیے۔ اس کلب کا کام ان کی بے ضرر موت کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ اخبار میں آتا تھا کہ فلاں شخص کار کے نیچے آیا اور مر گیا۔ فلاں دریا میں ڈوبا پایا گیا۔ شاید مخموری میں پل پر سے گزر رہا تھا پاؤں رپٹ گیا۔ کسی کے ساتھ کوئی اور حادثہ گزرا۔ لیکن اصل میں یہ سارے اس کلب کے کارنامے ہوتے تھے۔ خیر وہ تو ایک قصہ تھا۔ ہمیں معلوم نہیں خود کشی کے کلب سچ مچ ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے' لیکن اسی طرح ایک کہانی سر آرتھر کانن ڈائل کی بھی ہے' جس میں شرلاک ہومز صاحب اپنا کارنامہ دکھاتے ہیں۔ اس کا نام ہے "لال سر والوں کی انجمن" صرف سرخ بالوں والے اس کی خدمات سے مجتمع ہوسکتے تھے۔ شرلاک ہومز کے تفتیش کرنے پر یہ سارا کارخانہ فراڈ ثابت ہوا لیکن..... گنجوں کے کلب واقعی ہیں۔

جو آیا اس گھرانے میں لے آیا سر پہ گنج
قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا؟

ترکی میں ایک کلب خاوندوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بھی ہے اور ایک کلب سان فرانسسکو میں ہے جس کا نام ہے "برُے باورچیوں سے شوہروں کے بچاؤ کی انجمن" برُے باورچیوں سے بھی مطلب بیویاں ہی سمجھئے' کیونکہ ولایت میں لوگوں کے گھروں میں باورچی اور خانساماں نہیں ہوتے۔ عورتوں کے بہت سے کلب لاغری کو فروغ دینے کے ہیں کیونکہ چھریرا یا دبلا ہونا عورتوں کی قوم میں اچھا سمجھا جاتا ہے لیکن یہیں ایسے کلب بھی ہیں' جو موٹاپے کو زحمت نہیں بلکہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موٹے لوگ خوش اخلاق ہوتے ہیں جبکہ دبلی عورتیں چڑچڑے مزاج کی ہوتی ہیں۔

پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔

☼ ☼ ☼

آپ نے سینما میں اکثر دیکھا ہوگا کہ فلم چل رہی ہے۔ کوئی مونگ پھلی کھا رہا ہے اور کوئی دال سیو چاب رہا ہے۔ اس سے دوسرے فلم بینوں کے انہماک میں فرق آتا ہے لیکن ہمارے ہاں کسی کو خیال نہ آیا ہوگا کہ اس کے انسداد کے لیے اجتماعی کارروائی کرے' کلب وغیرہ بنائے۔

امریکہ میں ایک کلب ہے جس کا نام ہے۔ "سینما میں بے آواز کھانے والوں کی انجمن" یا "انجمن برائے انسداد کڑکڑ" لیکن ہم نے گفتگو کاہلی سے شروع کی تھی اور ایک اور کلب کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جس کا نام "انجمن فروغ سست الوجودی" ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ (جانے ہمارا یہ قول امریکہ کیسے پہنچ گیا) "جو کام کل کیا جاسکتا ہے' اسے آج ہرگز نہ کیا جائے۔"

یہ لوگ کرسمس بھی تاریخ کے نو ماہ بعد مناتے ہیں اور نمائشوں میں ایسے وقت جاتے ہیں' جب وہ ختم ہوگئی ہوں۔ خیر! ہم بھی سینما میں اپنی مرغوب فلم دیکھنے اس روز جاتے ہیں۔ جب اسے بند ہوئے کم از کم دو دن ہوگئے ہوں۔

کلب تو اور بھی طرح طرح کے ہیں' جن کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے' لیکن ہماری کاہلی ہمیں طویل بیان کی اجازت نہیں دیتی۔ بس خدا حافظ۔

پی ایچ ڈی ماہرِ قانون

رعنا خان ایڈووکیٹ سے ملاقات

شاہین رشید

کسی شاعر نے کہا تھا کہ

اے علم! تو نے ہی کیا ہے ملکوں کو نہال
تو گیا جہاں سے واں آیا زوال

یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر کی ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا راز "علم" ہی میں پوشیدہ ہے۔ جو ممالک اس راز کو پاگئے' انہوں نے اپنے شجر ترقی کو علم کے دریا سے سیراب کیا اور تاریخ میں سرخرو ٹھہرے مگر بدقسمتی سے ہمارے ملک میں تعلیم کی کوئی قدرو منزلت نہیں ہے۔ ہمارے پاس عیش و آسائش کے لیے تو بہت پیسہ ہے' مگر ہم تعلیم کے لیے اپنے ملکی بجٹ کا سب سے کم حصہ ہی مختص کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ذرائع ابلاغ کا کردار بھی نہایت قابل گرفت ہے کہ انہوں نے بھی لوگوں میں حصول علم کا شوق اجاگر کرنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے۔ میڈیا پر فلمی ستاروں کو اہمیت دی جاتی ہے یا کھلاڑیوں کو تاہم ہماری خوش قسمتی ہے کہ انفرادی سطح پر کچھ افراد ایسے بھی ہیں کہ جو شمع علم کے گرد پروانہ وار جھومتے ہیں۔

ایڈووکیٹ رعنا خان کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ رعنا خان نے قانون کے شعبے میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ یہ اس شعبے میں پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی اور سب سے کم عمر خاتون ہیں۔ آیئے! ان سے آپ کی ملاقات کراتے ہیں۔

"رعنا خان کچھ اپنے بارے میں بتایئے۔"

"ہم لوگ اردو اسپیکنگ ہیں۔ میری والدہ کا تعلق "دہلی" سے تھا اور میرے والد کا بھی' میرے شوہر یوسف زئی پٹھان ہیں۔ میرے تین بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ میں گھر میں بڑی ہوں۔ میں کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہمارا پورا گھرانہ لاء سے ہی وابستہ ہے۔ میرے والد محمد عبدالعلی ظفر گورنمنٹ آف سندھ کے ایڈوائزر ہیں۔ میری بہن سرکاری وکیل ہیں۔ ان کا نام ریحانہ خان ہے۔ میرے میاں ناصر رضوان خان بھی لائر ہیں۔"

"چونکہ سارا خاندان وکالت سے وابستہ ہے' اس لیے آپ نے بھی وکیل بننا پسند کیا؟"

"میں بالکل بھی لائر بننا نہیں چاہ رہی تھی۔ میں نے تو کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا تھا۔ جب ایم ایس سی سے فارغ ہوئی تو اس ڈیپارٹمنٹ میں مجھے لیکچرر شپ کی آفر ہوئی تو والد نے کہا کہ مجھے لاء میں کوئی بندہ چاہیے تو میں والد کے ساتھ آگئی اور میں نے ایل ایل ایم کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران میں نے ایم اے "ماس کمیونیکیشن" بھی کیا اور 2004ء میں پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کرایا اور تقریباً" سات سال لگے مجھے پی ایچ ڈی کرنے میں۔"

"اتنا ٹائم کیوں لگا؟"

"چار سے پانچ سال تو لگتے ہی ہیں اور دو سال مزید اس لیے لگ گئے کہ انکوائریز وغیرہ ہوتی تھیں۔ میری ساری رپورٹس اور ریسرچ باہر گئی تھیں۔ جبکہ پاکستان میں کبھی بھی لاء کی ریسرچ رپورٹس باہر نہیں جاتیں۔ میرے تھیسس کا ٹاپک تھا۔

Importance of fornsic investigation murder trail caused by gun shot wonds.

پڑتے ہیں اور شام کا چوگا بھی باہر ہی کھاتے ہیں۔ جو کلبوں کے ممبر ہیں، وہ وہاں جا کر کچھ کھیلتے ہیں، کچھ پڑھتے ہیں، کچھ گپ کرتے ہیں۔ مغرب میں پینا پلانا بھی آداب زندگی میں داخل ہے۔ لہٰذا پی بھی لیتے ہیں اور کبھی کبھی زیادہ بھی پی لیتے ہیں۔ بعض تو اپنے پاؤں چل کر گھر پہنچ جاتے ہیں۔ بعض کو ڈنڈا ڈولی کر کے لانا پڑتا ہے۔ پابہ دست دگرے دست بدست دگرے۔

☼ ☼ ☼

آپ میں سے بہت سوں نے رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی کہانی "خود کشی کا کلب" پڑھی ہوگی۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اسی نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کلب کے ممبر بننے والے اپنی جان سے بے زار بے شک ہوتے تھے، لیکن اپنی جان آپ لیتے ڈرتے تھے۔

خود کشی کے لیے ہمّت چاہیے۔ اس کلب کا کام ان کی بے ضرر موت کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ اخبار میں آتا تھا کہ فلاں شخص کار کے نیچے آیا اور مر گیا۔ فلاں دریا میں ڈوبا پایا گیا۔ شاید مخموری میں پل پر سے گزر رہا تھا پاؤں رپٹ گیا۔ کسی کے ساتھ کوئی اور حادثہ گزرا۔ لیکن اصل میں یہ سارے اس کلب کے کارنامے ہوتے تھے۔ خیر وہ تو ایک قصہ تھا۔ ہمیں معلوم نہیں خود کشی کے کلب سچ مچ ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے، لیکن اسی طرح ایک کہانی سر آرتھر کانن ڈائل کی بھی ہے، جس میں شرلاک ہومز صاحب اپنا کارنامہ دکھاتے ہیں۔ اس کا نام ہے "لال سر والوں کی انجمن" صرف سرخ بالوں والے اس کی خدمات سے مجتمع ہو سکتے تھے۔ شرلاک ہومز کے تفتیش کرنے پر یہ سارا کارخانہ فراڈ ثابت ہوا لیکن..... گنجوں کے کلب واقعی ہیں۔

جو آیا اس گھرانے میں لے آیا سر پہ گنج
قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا؟

ترکی میں ایک کلب خاوندوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بھی ہے اور ایک کلب سان فرانسسکو میں ہے جس کا نام ہے "بُرے باورچیوں سے شوہروں کے بچاؤ کی انجمن" بُرے باورچیوں سے بھی مطلب بیویاں ہی سمجھئے، کیونکہ ولایت میں لوگوں کے گھروں میں باورچی اور خانساماں نہیں ہوتے۔ عورتوں کے بہت سے کلب لاغری کو فروغ دینے کے ہیں کیونکہ چھریرا یا دبلا ہونا عورتوں کی قوم میں اچھا سمجھا جاتا ہے لیکن یہیں ایسے کلب بھی ہیں، جو موٹاپے کو زحمت نہیں بلکہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موٹے لوگ خوش اخلاق ہوتے ہیں جبکہ دبلی عورتیں چڑچڑے مزاج کی ہوتی ہیں۔

پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔

☼ ☼ ☼

آپ نے سینما میں اکثر دیکھا ہوگا کہ فلم چل رہی ہے۔ کوئی مونگ پھلی کھا رہا ہے اور کوئی دال سیو چاب رہا ہے۔ اس سے دوسرے فلم بینوں کے انہماک میں فرق آتا ہے لیکن ہمارے ہاں کسی کو خیال نہ آیا ہوگا کہ اس کے انسداد کے لیے اجتماعی کارروائی کرے، کلب وغیرہ بنائے۔

امریکہ میں ایک کلب ہے جس کا نام ہے۔ "سینما میں بے آواز کھانے والوں کی انجمن" یا "انجمن برائے انسداد کڑکڑ" لیکن ہم نے گفتگو کاہلی سے شروع کی تھی اور ایک اور کلب کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جس کا نام "انجمن فروغ سست الوجودی" ہے ان کا کہنا ہے کہ (جانے ہمارا یہ قول امریکہ کیسے پہنچ گیا) "جو کام کل کیا جا سکتا ہے، اسے آج ہرگز نہ کیا جائے۔"

یہ لوگ کرسمس بھی تاریخ کے نو ماہ بعد مناتے ہیں اور نمائشوں میں ایسے وقت جاتے ہیں، جب وہ ختم ہو گئی ہوں۔ خیر! ہم بھی سینما میں اپنی مرغوب فلم دیکھنے اس روز جاتے ہیں۔ جب اسے بند ہوئے کم از کم دو دن ہو گئے ہوں۔

کلب تو اور بھی طرح طرح کے ہیں، جن کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے، لیکن ہماری کاہلی ہمیں طویل بیان کی اجازت نہیں دیتی۔ بس خدا حافظ۔

پی ایچ ڈی ماہرِ قانون

رعنا خان ایڈووکیٹ سے ملاقات

شاہین رشید

کسی شاعر نے کہا تھا کہ

اے علم! تو نے ہی کیا ہے ملکوں کو نہال
تو گیا جہاں سے واں آیا زوال

یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر کی ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا راز "علم" ہی میں پوشیدہ ہے۔ جو ممالک اس راز کو پا گئے، انہوں نے اپنے شجر ترقی کو علم کے دریا سے سیراب کیا اور تاریخ میں سرخرو ٹھہرے مگر بدقسمتی سے ہمارے ملک میں تعلیم کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔ ہمارے پاس عیش و آسائش کے لیے تو بہت پیسہ ہے، مگر ہم تعلیم کے لیے اپنے ملکی بجٹ کا سب سے کم حصہ ہی مختص کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ذرائع ابلاغ کا کردار بھی نہایت قابل گرفت ہے کہ انہوں نے بھی لوگوں میں حصول علم کا شوق اجاگر کرنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے۔ میڈیا پر فلمی ستاروں کو اہمیت دی جاتی ہے یا کھلاڑیوں کو تاہم ہماری خوش قسمتی ہے کہ انفرادی سطح پر کچھ افراد ایسے بھی ہیں کہ جو شمع علم کے گرد پروانہ وار جھومتے ہیں۔

ایڈووکیٹ رعنا خان کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ رعنا خان نے قانون کے شعبے میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ یہ اس شعبے میں پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی اور سب سے کم عمر خاتون ہیں۔ آئیے! ان سے آپ کی ملاقات کراتے ہیں۔

"رعنا خان کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔"

"ہم لوگ اردو اسپیکنگ ہیں۔ میری والدہ کا تعلق "دہلی" سے تھا اور میرے والد کا بھی میرے شوہر یوسف زئی پٹھان ہیں۔ میرے تین بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ میں گھر میں بڑی ہوں۔ میں کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہمارا پورا گھرانہ لاء سے ہی وابستہ ہے۔ میرے والد محمد عبدالعلی ظفر گورنمنٹ آف سندھ کے ایڈوائزر ہیں۔ میری بہن سرکاری وکیل ہیں۔ ان کا نام ریحانہ خان ہے۔ میرے میاں ناصر رضوان خان بھی لائر ہیں۔"

"چونکہ سارا خاندان وکالت سے وابستہ ہے، اس لیے آپ نے بھی وکیل بننا پسند کیا؟"

"میں بالکل بھی لائر بننا نہیں چاہ رہی تھی۔ میں نے تو کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا تھا۔ جب ایم ایس سی سے فارغ ہوئی تو اس ڈیپارٹمنٹ میں مجھے لیکچرر شپ کی آفر ہوئی تو والد نے کہا کہ مجھے لاء میں کوئی بندہ چاہیے تو میں والد کے ساتھ آ گئی اور میں نے ایل ایل ایم کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران میں نے ایم اے "ماس کمیونیکیشن" بھی کیا اور 2004ء میں پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کرایا اور تقریباً سات سال لگے مجھے پی ایچ ڈی کرنے میں۔"

"اتنا ٹائم کیوں لگا؟"

"چار سے پانچ سال تو لگتے ہی ہیں اور دو سال مزید اس لیے لگ گئے کہ انکوائریز وغیرہ ہوتی تھیں۔ میری ساری رپورٹس اور ریسرچ باہر گئی تھیں۔ جبکہ پاکستان میں کبھی بھی لاء کی ریسرچ رپورٹس باہر نہیں جاتیں۔ میرے تھیسس کا ٹاپک تھا۔

Importance of fornsic investigation murder trail caused by gun shot wonds.

یہ ایسا ٹاپک تھا کہ یہاں پاکستان میں اس کا کوئی ایکسپرٹ نہیں ہے تو جب امریکا اور ترکی سے منظور ہوا' تب مجھے ڈگری ملی۔"

"اتنا زیادہ پڑھنے کا خیال کیسے آیا جبکہ شادی کے بعد تو لڑکیاں بچوں اور ہانڈی چولہے کو ترجیح دیتی ہیں؟"

"طبیعت میں ہمیشہ کچھ کر دکھانے کا شوق تھا اور ابھی بھی بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ خاص طور پر جوڈیشری میں (Judiciary)۔ میں آپ کو بتاؤں کہ میں لاء میں سرکیولم (curriculum) ایکسپرٹ ہوں اور میں سرکیولم ڈیزائن کرتی ہوں۔ جوڈیشری اکیڈمی کے لیے۔ ججز کی ٹریننگ کے لیے' پروسیکیوٹر کے لیے' سرکاری وکیلوں کی ٹریننگ کے لیے اور پولیس آفیسرز کے لیے کچھ ٹریننگ ڈیزائن کی ہیں' میری خواہش ہے کہ ہماری جوڈیشری اپنے معاملات کو ڈیل کرنے کے لیے باقاعدہ تربیت یافتہ ہو۔ ان کو ہر بات کا پتا ہو کہ وہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنا معاملہ کس طرح ڈیل کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے پوری ریسرچ کی۔ ریسرچ کا مقصد ہی میرا یہ ہے کہ جو ہمارے پروسیکیوٹر' ججز اور انویسٹی گیشن آفیسرز ہیں' ان کو بہت سی بنیادی باتوں کا علم نہیں ہوتا تو جب تمام باتیں ان کو پتا ہوں گی تو وہ کیس کو ٹھیک طرح سے ڈیل کر سکیں گے۔ میں دس سال سرکاری وکیل رہی ہوں ڈسٹرکٹ کورٹ میں اور ہائی کورٹ میں۔ میں نے دیکھا کہ اکثر شک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے غلط لوگوں کے حق میں فیصلہ ہو جاتا ہے..... پراپر انویسٹی گیشن نہیں ہوتی تھی تو جج کہتا تھا کہ شک پیدا کر دیا گیا۔ اس لیے فیصلہ دینا ہی پڑا۔ جبکہ ماں' ایک بہن' ایک بھائی یا بیٹا کہہ رہا ہے کہ میرے باپ کا قاتل یہی ہے' میرے بھائی کا قاتل یہی ہے یا میری بہن کا قاتل یہی ہے۔ لیکن پراپر تفتیش نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کرنا پڑتا ہے اور یہ کسی کے لیے بھی بہت تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ یہ بہت ناانصافی ہے' سو ان چیزوں کو کنٹرول کرنے کے لیے میں نے ساری ریسرچ کی ہے۔"

"تو اپنی اس ریسرچ کو پھیلانے کے لیے آپ کی کیا پلاننگ ہے؟"

"پلاننگ تو بہت زیادہ ہے۔ میری خواہش ہے اور میری کوشش ہے کہ میری ریسرچ کو پورے پاکستان میں جتنی بھی جوڈیشری اکیڈمیز ہیں۔ وہاں اسے باقاعدہ مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے اور باقاعدہ آگہی دی جائے۔ تاکہ سب کو انصاف مل سکے۔ چاہے وہ وکٹم کے ساتھ ہو یا Accure کے ساتھ ہو۔"

"اتنے اہم ٹاپک پر آپ نے پی ایچ ڈی کیا ہے اور پاکستان کی سب سے کم عمر خاتون بھی ہیں آپ..... تو حکومتی سطح پہ کوئی پذیرائی حاصل ہوئی؟ کوئی ایوارڈ وغیرہ ملا؟"

(ہنستے ہوئے)۔ "حکومتی سطح پہ کچھ نہیں ہوا اور حکومت کے حالات تو آپ کے علم میں ہیں ہی کہ انہیں تو اپنی حکومت بچانے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے قومی سطح کے لیول کی جو باتیں ہیں۔ وہ ان کے یہاں ڈسکس نہیں ہو رہی اور نہ ہی ہوتی ہیں..... تو ایوارڈ تو بہت دور کی بات ہے۔ حکومت کے علم میں ہی یہ بات آجائے تو بہت بڑی بات ہے۔"

"اور نہ ہی میڈیا نے کچھ کیا ہوگا۔ کیونکہ میڈیا بھی ایسی خبریں دیتا ہے جس سے اس کی ریٹنگ بڑھے۔ لیکن آپ اپنی ریسرچ کو پھیلانے کے لیے کس حد تک جدوجہد کریں گی؟"

"میری کوشش ہے کہ میں چیف جسٹس افتخار چوہدری صاحب سے ملوں۔ ان سے ملاقات میں' میں اپنی ریسرچ کے بارے میں بتاؤں گی اور یہ بھی بتاؤں گی کہ اس ریسرچ کے لیے میں نے اتنے سال لگائے ہیں اور اتنی محنت کی ہے اور یہ کہ میں اس سبجیکٹ میں پہلی پی ایچ ڈی خاتون ہوں۔ میں ان سے درخواست کروں گی کہ آپ اسے جوڈیشل اکیڈمیز کے اندر متعارف کرائیں اور پراپر طریقے سے ٹریننگ دلوائیں تو بہت سارے مسائل جو پیدا ہوئے ہیں' وہ نہیں ہوں گے اور لوگوں کو زیادہ بہتر طریقے سے انصاف مل جائے

گا۔ دیکھتے ہیں کہ میری درخواست کو وہ کس طرح سنتے ہیں۔"

"اور آپ کی بات کو کتنی اہمیت دیتے ہیں اور کتنا ٹائم دیتے ہیں؟"

"وہ بہت اچھے انسان ہیں' ضرور میری بات سنیں گے' مگر مسئلہ صرف ان کے پاس پہنچنا ہے۔ اگر پہنچ گئی تو پھر کچھ نہ کچھ بات بن ہی جائے گی۔"

"آپ وکیلوں کے لیے ایک شعر بہت مشہور ہے کہ.....

"پیدا ہوئے وکیل تو شیطان نے کہا
لو! آج میں بھی صاحب اولاد ہو گیا۔"

تو یہ آپ وکیلوں پر منحصر ہوتا ہے کہ جس کو ہرا دیں' جس کو جیتا دیں۔"

"میں شعر کے جواب میں یہ کہوں گی کہ.....

"پیدا ہوا وکیل تو مظلوم نے کہا
لو! آج میں بھی صاحب آواز ہو گیا۔"

"مگر ایسا کہاں ہوتا ہے۔ آج کل ایک ڈراما دکھایا جا رہا ہے۔ "کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" اس میں صاحب حیثیت شخص کس طرح وکیلوں کو خرید لیتا ہے اور وکیل مظلوموں سے بھی پیسے وصول کر لیتا ہے۔ تو ایسا ہوتا ہے؟"

"اس کے لیے تو میں یہی کہوں گی کہ "کالی بھیڑیں" تو ہر فیلڈ میں موجود ہیں۔ لیکن یہ وکالت اور جج کے شعبے ڈائریکٹ اللہ سے تعلق کے شعبے ہوتے ہیں۔ لوگوں کے مسائل سنتے ہی آپ اللہ تعالیٰ کے اسسٹنٹ ہو جاتے ہیں۔ خلیفہ ہو جاتے ہیں۔ آپ جج یا وکیل بنیں اور اگر اپنی ڈیوٹی کا احساس ہو جائے تو یہ شعبہ اتنا مقدس ہو جائے کہ لوگ اس کے بغیر چلیں ہی نہیں۔"

"ایسا ہوتا نہیں ہے۔ مقدموں کو اتنا لمبا کھینچا جاتا ہے کہ بے چارا بندہ عدالتوں کے چکر لگا لگا کر ہی تھک جاتا ہے۔"

"اب ایسا نہیں ہوتا۔ اب جوڈیشل پالیسی آئی ہے۔ اس کے تحت جو مقدمے بہت زیادہ لمبے کھینچتے ہیں یا جن کو بلاوجہ طویل کر دیا گیا ہے تو اب انہیں ایک مدت دے دی جاتی ہے کہ اس پیریڈ میں اسے مکمل کر لیں۔ ورنہ پھر پوچھ گچھ ہوتی ہے اور باقاعدہ چیف جسٹس کو رپورٹ ہوتی ہے' اب ایسا نہیں ہے کہ واہی تباہی مچی ہوتی ہے کہ جس کا جو دل چاہا کر لیا..... اب ایسا نہیں ہے' اب ایسا سوچنا بھی غلط ہے۔"

"آپ کہہ رہی ہیں کہ یہ پروفیشن اللہ کے بہت قریب ہے اور سب کو انصاف دینا چاہیے' مگر عموماً" انصاف ملتا نہیں ہے۔"

"یہ وہ شعبہ ہے جس میں آپ کا پنڈورا بکس اللہ کے پاس کھلتا ہے۔ جس طرح کمپیوٹر میں چھوٹا سا خانہ ہوتا ہے "ان بکس" کا تو وہ ان بکس اللہ کی طرف کھلتا ہے اور یہ میں تو سمجھتی ہی ہوں' بلکہ سب سمجھتے ہیں اور ہمارے پاس وکیلوں کے لیے باقاعدہ اقدار و ضوابط ہیں اور سب کو ان ہی کے تحت کام کرنا پڑتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر ان اقدار اور اخلاقیات کو اپلائی کون کرتا ہے؟"

"ارے! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ سب کے لیے یہ بات نہیں کر سکتیں اور میرے بہت سارے وکیل بھائی ایسے ہیں جن کے لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ میرے بتانے سے بھی زیادہ اچھے ہیں اور ان کی بہت اچھی ریپوٹیشن ہے۔ وہ اپنی ٹیبل پہ وہ فائل نہیں رکھتے جو کیس نہیں بنتا..... اور وہ صاف گوئی سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ کیس بنانے کے بجائے وہ کیس بنائیں' جو واقعی کیس ہے۔ آج میں آپ کے ڈائجسٹ کے حوالے سے یہ بات ضرور کہنا چاہوں گی اور پلیز! آپ یہ ضرور لکھیے گا کہ وکالت کا شعبہ ہو یا کوئی بھی شعبہ ہو انسان کو ایک بات کا اعتقاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسمت میں جتنی روزی لکھی ہے' وہ اس تک ضرور پہنچتی ہے۔ یہ انسان کے اپنے بس کی بات ہے کہ وہ اس روزی کو غلط طریقے سے کمائے یا صحیح طریقے سے کمائے۔ یہ انسان کے مینٹل

اپروچ کی بات ہے کہ وہ اسے غلط لیول پر لے جائے یا صحیح یہ اللہ نے جتنا لکھا ہے وہ اسے ملنا ضرور ہے۔"

"مگر لوگ کہاں سمجھتے ہیں۔ بس پیسہ آنا چاہیے' خواہ کہیں سے بھی آئے۔"

"آپ یقین کریں کہ جو بات میں آپ سے کہہ رہی ہوں' وہ میں نے اپنی پریکٹیکل لائف میں آزمائی ہے۔ بعض اوقات غلط کیس کے معاملے میں مجھے پیسوں کی آفر ہوئی اور میں نے جب صاف طور پر کہہ دیا کہ آئی ایم سوری! میں یہ کام نہیں کر سکتی تو آپ یقین کریں کہ دس منٹ بعد ہی اتنے ہی لیول کا صحیح والا کیس آگیا' تو میرا تو اللہ پر اندھا اعتقاد و اعتماد ہے کہ آپ اللہ کے قریب رہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے مسائل خود حل کرتا ہے۔"

"ایک خاتون وکیل ہونے کی وجہ سے خواتین کے مقدمات لڑتے وقت کیا مشکلات پیش آتی ہیں آپ کو؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ کوئی مشکلات پیش نہیں آتیں۔ آدمی کے مسئلے ہوں یا خاتون کے۔ مسائل تو مسائل ہی ہوتے ہیں۔ بحیثیت ایک ایڈوکیٹ کے میں اسے ڈیل کرتی ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کامیابی ہی ملتی ہے۔"

"اب تک کتنے کیس لڑ چکی ہو اور کتنے میں کامیابی ملی ہے؟"

"میں سو سے زیادہ کیسز لڑ چکی ہوں اور زیادہ تر میں مجھے کامیابی ہی حاصل ہوئی ہے ــــ کیس کے لیے اپنا وکالت نامہ فائل کرنے سے پہلے کیس کا اچھی طرح مطالعہ کر لیتی ہوں کہ یہ کیس چلنے کے قابل ہے یا نہیں اور اس میں مدعی کو کتنا ریلیف ملے گا۔ جب آپ کسی کیس کو کسی جج کے پاس لے کر جاتے ہیں تو آپ اپنا آپ بتا دیتے ہیں کہ آپ خود کیا ہیں۔ آپ جب صحیح کیس لے کر نہیں جاتے تو وہ آپ کو دو نمبر کا وکیل ہی سمجھے گا کہ اس کے پاس تو ایسے ہی کیس آتے ہیں' پھر آپ کی کوئی عزت نہیں ہوتی' جو اچھے وکیل ہوتے ہیں' وہ بہت سوچ سمجھ کر کیس لیتے ہیں۔ وہ کوئی اوٹنگے بوٹنگے قسم کے کیس نہیں لیتے۔"

"ہمارے ملک میں غربت بہت ہے اور افتاد بھی غریبوں پہ ہی آتی ہے تو جب غریب لوگ اپنا مقدمہ آپ کے پاس لے کر آتے ہیں تو آپ ان سے کتنا تعاون کرتی ہیں؟"

"آپ یقین کریں کہ میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ میں ان کے ساتھ تعاون کروں اور بعض اوقات تو میں ان سے فیس بھی نہیں لیتی۔ اکثر اوقات تو ایسے کیس آتے ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ کیس کی فیس دینا تو دور کی بات' ہمارے پاس تو روٹی کھانے کے لیے بھی پیسہ نہیں ہے تو اگر ان کے کیس میں جان ہوتی ہے تو میں بغیر فیس کے ان کا مقدمہ لڑتی ہوں۔"

"ایک کیس میں کتنا ٹائم لگتا ہے... اور آپ بتا رہی تھیں کہ آپ کو ترکی جانا ہے' کیوں؟"

"یہ تو کیس کی نوعیت پہ ہوتا ہے۔ کچھ جلدی ہو جاتے ہیں' کچھ میں ٹائم لگ جاتا ہے... اور مجھے ترکی ایک پیپر پڑھنے کے لیے جانا ہے۔ مجھے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہے اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں نے چار' پانچ سریکولم لکھے ہیں۔ تین' چار کتابیں لکھ رہی ہوں۔ مختلف ممالک میں پیپرز پڑھنے جاتی رہتی ہوں۔ گزشتہ دنوں انڈیا گئی تھی۔ ہمیں باقاعدہ بلایا جاتا ہے پیپر پڑھنے کے لیے۔"

"مالی طور پر یہ شعبہ مستحکم ہے؟"

"بنیادی طور پر یہ پیشہ خدمت کا پیشہ ہے۔ پہلے انسان سوشل ورکر ہوتا ہے' پھر وکیل بنتا ہے۔ جو سوشل ورکر رہتا ہے' وہ لوگوں کی تکلیف کو سمجھتا ہے۔ چونکہ آج کل وکیل کا دال پانی اسی پہ ہے تو اچھا بھی ہے اور نہیں بھی۔ ان کے لیے بہت اچھا ہے جو ہائی لیول کے وکیل ہیں۔ یہ شعبہ بہت زیادہ پوزیٹو بھی نہیں ہے اور بہت زیادہ اسٹرونگ بھی نہیں ہے۔

یہ شعبہ کم لوگوں کو اپنے اندر سمیٹتا ہے۔ اس لیے کہ اس شعبے میں انتہائی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ آئے اور چل پڑے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ نے ایم بی بی ایس کیا اور آپ ڈاکٹر بن گئے اور کلینک کھول لیا۔ اس میں بے انتہا پڑھنا پڑتا ہے۔ بہت مشکل سے لوگ اسے سہ پاتے ہیں۔"

"اپنے تعلیمی مدارج کے بارے میں بتائیں... پھر کچھ نجی سوال ہوں گے۔"

"میٹرک' انٹر کے بعد میں نے اسلامیہ سائنس کالج سے بی ایس سی کیا۔ ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کراچی یونیورسٹی سے کیا۔"

"شادی کب ہوئی اور بچے...؟ گھر کو مینیج کر لیتی ہیں؟"

"میری شادی 1997ء میں ہوئی۔ میرے ماشاء اللہ چار بچے ہیں۔ گھر کو بھی مینیج کر لیتی ہوں اور گھر والے کو بھی ہم دونوں ہی سپریم کورٹ کے لائر ہیں۔"

"تو جب گھر میں آپ دونوں کا جھگڑا ہوتا ہے تو پھر انصاف کیسے ہوتا ہوگا؟ دونوں وکیل ہیں' دونوں ہی بحث کرتے ہوں گے۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں جھگڑا کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ بغیر جھگڑے کے زندگی کیسے گزر رہی ہے۔ میں اپنی لائف میں بہت خوش ہوں... بچے میرے ماشاء اللہ سب پڑھ رہے ہیں۔ میری بڑی بیٹی عائشہ نویں جماعت کی طالبہ ہے۔ اس کے بعد فاطمہ آٹھویں کلاس میں' جویریہ ساتویں کلاس میں اور حسان چوتھی جماعت کا طالب علم ہے۔ ماشاء اللہ سب بہت قابل ہیں اور جوان کا دل چاہے گا' اپنے لیے پروفیشن کا انتخاب کریں گے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے رعنا خان سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: Info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

ام صغریٰ...... کراچی

آپ سے رشتہ کب جڑا' یہ ماضی کا ایک قصہ بن چکا ہے۔ اور اب خواتین ڈائجسٹ کے بغیر کوئی مہینہ نہیں گزرتا۔ ہمارے خاندان میں دور دور تک کوئی بھی ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق نہیں رکھتا۔ غالباً" یہ دو ہزار سات یا دو ہزار چھ کی بات ہے (یادداشت خاصی کمزور ہے ہماری) جب اپنی چھوٹی مامی جان کے ہاتھوں میں ہم نے خواتین ڈائجسٹ کی جھلک پائی۔ اس کی نہایت ہی شرافت کے پردے میں لپٹی ہوئی تحریروں نے ہمیں بہت متاثر کیا اور اب ہم اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہماری پسندیدہ اور دل سے قریب جو مصنفین ہمیں نظر آتی ہیں ان میں نمرہ احمد' بشریٰ سعید' فرحت اشتیاق' راحت جبیں' اور کنیز نبوی ہیں۔ خاص طور پر کنیز نبوی کے بارے میں کہوں گی کہ وہ جس طرح سندھ کو اپنی تحریروں میں دکھاتی ہیں' اس سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ مجھے تو پتا ہی نہ تھا کہ ہمارا سندھ اتنا خوب صورت ہے۔ ویسے تو امی ابو کا تعلق پنجاب سے ہی ہے لیکن وہ کیا کہتے ہیں ناکہ جہاں رزق لکھا ہوتا ہے انسان بھی وہیں پہنچ جاتا ہے تو ہمارے نانا لوگ وہاں سے ہجرت کر کے بہت عرصے پہلے سندھ آ گئے تھے۔ اب ہمارے تین عدد ماموؤں نے گاؤں کی حویلی کو رونق بخشی ہوئی ہے۔ اللہ ان کو زندگی دے اور ان کے اندر زیادہ سے زیادہ سلوک رکھے جو تینوں ایک ساتھ رہتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب بچپن میں ماں جانی کے ساتھ عید پر یا گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم گاؤں ماموں لوگوں کے ہاں جاتے تھے تو کس طرح پورا گاؤں اُمڈا چلا آتا تھا۔ سڑک پر پیدل چلنا مجھے بہت پسند تھا۔ کبھی کبھار چھوٹے ماموں بیل گاڑی لے آتے تھے تو اور مزا آجاتا تھا۔ کبھی کی ہے آپ نے بیل گاڑی کی سواری؟ موقع ملا تو کھوئیے گا مت کیوں کہ بیل گاڑی گاؤں کے کچے راستوں سے دھول مٹی اڑاتی ہوئی چلتی ہے ناں تو مٹی کی خوشبو آپ کو مدہوش کر دیتی ہے۔ ہرے بھرے کھیت' آموں کے اور کیلوں کے باغ آپ کی آنکھوں کو عجیب سی تراوٹ بخشتے ہیں۔ جوں ہی حویلی کے سامنے ہم پہنچتے تو چھوٹے بچوں سے لے کر خواتین اور جوان لڑکوں کا ایک جم غفیر نظر آتا۔ اور وہ سب ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ ماموں لوگوں کے ہاں آم بہت مشہور ہیں۔ جب بھی حویلی گرمیوں میں جاؤ تو خوب آم کھانے کو ملتے ہیں۔

لوگ بہت محبت اور خوشی سے اپنے باغوں سے آموں کی پیٹیاں مفت میں دے جاتے تھے۔ یہاں لنگڑا آم بہت مشہور ہے۔ لنگڑا اسے اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی نیچے سے دم نہیں ہوتی یہ بالکل گول اور موٹی شکل کا آم ہوتا ہے اور ہرا رہتا ہے۔ یہ آم کھانے میں بہت لذیذ ہوتا ہے۔ اب تو ہمارے گاؤں میں ایک سرکاری اسکول بھی بن گیا ہے بہت اچھا بڑا سارا اسکول ہے جو پانچ جماعتوں تک ہے اور سب بچوں کو پڑھانے کے لیے صرف ایک ماسٹر صاحب جو کبھی آئے اور کبھی نہ آئے (افسوس ہے بھئی) اب تو ماموں لوگوں نے حکومت سے سفارش اور خط لکھ لکھ کر آخر کار گاؤں کی کچی سڑک کو بھی پکا کروا لیا ہے۔ جب بھی گاؤں جاتی ہوں تو میری چھوٹی مامی میرا بہت بے صبری سے انتظار کرتی ہیں۔ پوچھیں کیوں؟ جی ہاں انہیں خواتین اور شعاع کا انتظار ہوتا ہے کہ کب میں پہنچوں اور کب وہ پڑھیں کیونکہ وہاں کوئی ان کو لا کر دینے والا جو نہیں۔

بات کافی لمبی ہو گئی میری اب آتے ہیں اس دفعہ کے خواتین کی طرف۔ بلاشبہ تمام تحاریر اچھی تھیں۔ فرحت صاحبہ کی تحریر کے بارے میں کیا کہوں کہ بلاشبہ بہت اچھی تحریر ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ام مریم اتنی جھوٹی اور اتنی بہروپیا کیوں ہے اور وہ ام کلثوم سے جھوٹ بول کر شاید اس سے ہمدردی سمیٹ رہی ہے۔ (اف کیسی چالاک نکلی سیم) اور آخر میں راحت جبیں واہ کیا بات ہے کہانی بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔

ج : ام صغریٰ آپ کے بچپن کی یادیں اور گاؤں کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ سندھ ہی نہیں پورا ملک بہت خوب صورت ہے اور اس کے لوگ بھی بہت محبت کرنے والے ہیں۔ سندھ دھرتی صوفیاء کا مسکن رہی ہے جن کا مسلک محبت تھا۔ اسی لیے یہاں کے لوگوں میں اتنی نرمی اور مٹھاس ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے ملک کو سلامت رکھے اور جو لوگ اس کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں انہیں اور ان کی نسلوں کو نیست و نابود کر دے۔ آمین

نبیلہ خان مون...... عبدالحکیم

طویل عرصے سے خواتین ڈائجسٹ کے خاموش قاری ہیں۔ بس! اب ضبط جواب دے گیا۔

اردو شاعری پڑھ کر دماغ تر و تازہ' آپ کا باورچی خانہ پڑھ کر' بلکہ الٹی سیدھی کوکنگ کر کے "دل دماغ فریش" آخر کام تو آگے کوکنگ نے ہی آنا ہے نا (بقول امی)! آپی خواتین ڈائجسٹ کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ یہ تمام سلسلے ایسے ہیں جیسے 'چاند کی چاندنی' بارش کی چھن چھن پتوں کی سرسراہٹ اور آپی جی جیسے جیسے...... زرداری انکل کی بے ہوش کرنے والی مسکراہٹ! ہاہاہا...... اللہ تعالیٰ خواتین ڈائجسٹ کو دن دگنی ترقی دے (آمین)

ج : پیاری نبیلہ! زرداری صاحب کی مسکراہٹ بے ہوش کرنے والی ہوتی تو پھر بھی کچھ توقع تھی کہ کبھی نہ کبھی ہوش آجائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کے لیے جان لیوا کا لفظ زیادہ مناسب ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ لیکن یہ کیا؟ صرف سلسلے ہی اچھے لگتے ہیں۔ باقی کسی تحریر کے بارے میں نہیں لکھا آپ نے۔

اقراء نوید...... اوکاڑہ

خواتین ڈائجسٹ نو تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے بات کروں گی ٹائٹل کی تو مجھے تو ہر ماہ ہی ٹائٹل اچھا لگتا ہے سو اب بھی لگا۔

سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھا۔ اس سلسلہ سے ہمارے دل ایمان کی حرارت سے منور ہو جاتے ہیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر سے نوازے (آمین) سلسلے وار ناول میں سب سے پہلے بات کروں گی عنیزہ سید صاحبہ کا "کوہ گراں تھے ہم" اس ناول کی پہلی قسط نے ہی ہمیں اپنے حصار میں لے لیا تھا' اس ماہ بھی قسط شاندار تھی۔

اس کے بعد نگہت عبداللہ صاحبہ کا "میرے خواب لوٹا دو" پڑھا۔ یہ ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ رمشا خالد کا مکمل ناول "اسی راستے پر" نمبر ون تھا ہلکا پھلکا ناول میرے تو دل کے تار چھو گیا صباحت یاسمین نے بھی اچھا لکھا۔

ناولٹ میں راحت جبیں کی تو تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ ویل ڈن راحت ہاں البتہ اس مرتبہ نزہت شبانہ حیدر مجھے کچھ خاص متاثر نہ کر سکیں (انتہائی معذرت کے ساتھ) کہانی کچھ واضح نہیں ہو سکی۔

افسانوں میں نمبر ون پہ عائشہ فیاض کا "ساس جیسی" تھا۔ عائشہ جی میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ فارحہ ارشد کا سرخ گلاب بھی گلاب کی پنکھڑی جیسا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ "میری بیاض" آپ کا باورچی خانہ" سب کچھ بہترین تھا۔

ایک اور بات مجھے سب سے اچھا سلسلہ نفسیاتی اور ازدواجی الجھنیں لگتا ہے۔

عدنان بھائی اتنے اچھے انداز میں ہم سب کی رہنمائی کرتے ہیں کہ پڑھ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے ہیں۔

ج : خواتین کی محفل میں خوش آمدید خواتین آپ کا پرچا ہے آپ ہر ماہ شرکت کریں۔ ہمیں خوشی ہو گی۔ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

مدیحہ نورین...... برنالی

فرحت اشتیاق جی کیا بات ہے کیا خوب لکھتی ہیں۔ اللہ تعالٰی ہمارے پیارے خواتین ڈائجسٹ کو بہت زیادہ ترقی سے نوازے۔ اگر اجازت ہو تو تین اقساط پر مبنی ناول بھیج سکتی ہوں اور پلیز یہ بھی بتایئے گا کہ تحریر بھی خط و کتابت کے پتے پہ ہی ارسال کرنا ہوتی ہے۔

ج : پیاری مدیحہ! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید۔ اس سے پیشتر آپ کے خطوط شامل نہ ہو سکے اس کے لیے معذرت آپ نے جو لکھا ہے بھجوادیں۔ شائع ہو گا یا نہیں' یہ پڑھ کر ہی بتا سکتے ہیں۔ بھجوانے کا پتا وہی ہے جو خط و کتابت کا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار کراچی۔

حمیرا اچکزئی...... ڈی آئی خان

خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ میرا رشتہ سترہ سال پر محیط ہے۔ میری ازدواجی زندگی کو سنوارنے اور گزارنے میں خواتین ڈائجسٹ نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ اس ماہ کا ٹائٹل بس سو سو تھا۔ بیک گراؤنڈ اور ماڈل کچھ خاص متاثر نہیں کر سکی۔

سب سے پہلے فرحت اشتیاق کا ناول جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے ویل ڈن فرحت جی۔ صباحت یاسمین کا مکمل ناول مزاحف بھی بہت اچھی تحریر تھی۔ آپی ڈرامہ ایکٹر عائشہ خان کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج : حمیرا! رفاقت کے اتنے طویل عرصہ میں آپ نے ہمیں ایک بار بھی خط نہیں لکھا کہ ہم آپ کی رائے سے آگاہ ہو سکتے۔ خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ آپ کا مسلسل ساتھ آپ کی پسندیدگی کی علامت ہے لیکن خط لکھتیں تو ہم آپ کی رائے سے زیادہ اچھی طرح آگاہ ہو سکتے تھے۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

صدف نازش...... معظم آباد

اپنی اکیس سالہ زندگی میں پہلی بار کسی رسالے کو خط لکھ رہی ہوں۔ مئی کا شمارہ پڑھا اور جس تحریر نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ ہے رمشا خالد خان کا ناول "اسی راستے پر" اس لیے کہ انسان جب دعا مانگے تو اسے یقین ہونا چاہیے کہ اللہ سے جو مانگا ہے اگر اچھا ہے تو ضرور ملے گا اگر اس کے حق میں بہتر نہیں تو کم از کم صبر ضرور ملے گا۔ باقی سب تحریریں بھی بہت اچھی تھیں۔ باجی صدف انور نے جس ناول کے متعلق پوچھا ہے اس کا نام "روشن چراغ رکھنا" ہے جو نگہت سیما نے لکھا تھا اور اکتوبر 2001ء میں شائع ہوا۔ جس میں ہیرو کا نام "روشن" اور ہیروئن کا نام "مشعال" تھا۔

ج : پیاری صدف خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی نگہت سیما کی گیارہ سال پرانی تحریر آپ کو یاد ہے۔ یہ مان کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی ہے۔ بلاشبہ ہماری قارئین خواتین ڈائجسٹ سے مثالی وابستگی رکھتی ہیں۔ خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شازیہ رشید...... گاؤں ٹانڈہ گجرات

میری شعاع اور خواتین سے دوستی تب سے ہے جب میں میٹرک میں تھی۔ میں ایم اے (اردو ادب) کی سال اول کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ بچپن سے مجھے ادب سے لگاؤ ہے خواتین اور شعاع سے کافی حد تک میرے اس شوق کی تسکین ہوئی ہے۔ یہ سردیوں کی لمبی راتوں اور گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں مخلص دوست کی طرح میرے ساتھ رہتے ہیں۔

میں دل سے قدر دان ہوں ان رائٹرز کی جو اپنی خوب صورت کاوشوں سے اس کو سجاتی ہیں۔ جو ہمارے لیے اتنی محنت اور دل جمعی سے لکھتی ہیں رسالے کی ہر کہانی سبق آموز ہوتی ہے۔ اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر کامیابی کی منازل طے کرنے والے یہ بے مثال رسالے ہیں۔

ج : پیاری شازیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند ہے' یہ جان کر خوشی ہوئی لیکن خط کچھ نامکمل سا لگا۔ خواتین کی تحریروں کے بارے میں کچھ لکھتیں تو ہمیں زیادہ اچھا لگتا۔

سلمٰی قادر...... کوئٹہ کینٹ

اس ماہ کا ٹائٹل زبردست تھا کرن کرن روشنی سے فیض یاب ہونے کے بعد عنیزہ سید کا سلسلے وار ناول اچھا جا رہا ہے نگہت عبداللہ کا بھی بہترین جا رہا ہے میرا بیسٹ ناول

فرحت اشتیاق کا "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" ہے اس کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ راحت جبیں کا "ساری بھول ہماری تھی" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ افسانوں میں عائشہ فیاض کا "ساس جیسی" ٹاپ پر تھا۔ پلیز عائشہ فیاض سے کوئی ناول لکھوائیں۔ آپی ایک فرمائش ہے احسن خان کا فیملی سمیت انٹرویو کریں۔ باقی عدنان بھائی بہت اچھے مشورے دیتے ہیں جو سیدھے دل پہ لگتے ہیں۔ آپی میں 9th کلاس میں پڑھتی ہوں، مجھے خواتین اور شعاع پڑھنے کا بہت شوق ہے مگر امی اکثر ڈانٹتی رہتی ہیں حالانکہ میں پڑھائی میں بہت اچھی ہوں، باقی سلسلے بھی اچھے ہیں۔

ج : پیاری سلمٰی! کافی عرصہ بعد آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ اپنی امی کو خواتین ڈائجسٹ پڑھنے کو دیں پھر وہ آپ کو نہیں ڈانٹیں گی۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

وثیقہ زمیرہ اور کلثوم آصفہ...... 440 فیض پور

ٹائٹل گرل بہت اچھی لگ رہی تھی، سب سے پہلے فرحت اشتیاق کا ناول جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو پڑھا۔ ناول بہت بہت اچھا جا رہا ہے ہمیں اس میں لیزا اور سکندر کا کردار بہت زیادہ پسند ہے اور میرے خواب لوٹا دو میں اجلال کا کردار اور دردِ دل میں علیزہ اور منصور حسین، آپ سے ایک فرمائش ہے جیا علی کا انٹرویو شامل کریں اور فائزہ افتخار سے بھی کہیں، وہ بھی اب واپس آجائیں۔ ان کا انٹرویو بھی شامل کریں۔

ج : وثیقہ اور کلثوم! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ فائزہ افتخار کا ناولٹ جون کے شعاع میں شامل ہے۔ آپ کی دیگر فرمائشیں نوٹ کرلی گئی ہیں۔ ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کرلیں۔

عائشہ ندیم شیخ...... پیر محل

پچھلے دنوں میری اماں جان کو فالج کا اٹیک ہوا تو اک احساس اس قدر حاوی ہوا کہ یہ چھتنار سایہ دار درخت کی صورت محبوب ہستی کس قدر ہمیں زمانے کی سرد و گرم سے بچائے ہوئے ہے خدانخواستہ...... !اللہ کے فضل و کرم سے اب اچھی ہیں۔

یقین مانیے کہ پچھلے کئی ماہ کے تبصرے لکھے پڑے ہیں مگر ہمت نہ ہو سکی۔ اپریل اور مئی کے ٹائٹل بہت خوب لگے۔ معصوم دل ربا جیسے الفاظ یاد آئے۔

تحریم زبیری کچھ خاص پسند نہیں۔ (معذرت) اس لیے اپنی توجہ "خط آپ کے" کی طرف مبذول کی۔ مجھے یہ سلسلہ بہت اچھا لگتا ہے۔ فیض کی شاعری اور پھر ناولز کے ٹائٹلز (ماشاءاللہ خوب!) "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ سید کا تھیم ہمیشہ — انٹیلکچوئیل ٹچ لیے ہوتا ہے بہت اچھا لگا۔ "چراغ آخر شب" کے بعد کسی ایسے ہی ماضی کے دریچوں سے جھانکتی خوشبو دار کار تھی۔ سو عنیزہ شکریہ! "عائشہ فیاض" کا ساس جیسی اچھا لگا رمشا خالد خان کا اسی راستے پر گرمیوں کے حوالے سے موزوں تھا۔ ہلکی پھلکی تحریریں اس پر شور ندی جیسی زندگی کو آسانی فراہم کرتی ہیں۔ راحت جبیں کی عریشہ بھی زرد موسم کی ایمن کی طرح سبق سیکھے بغیر لگتا ہے باز نہیں آئے گی۔ راحت جی ہمیں زرد موسم سیریل کی شکل میں ذرا نہیں بھایا؛ معذرت!) فرحت اشتیاق نے کمال کر دیا۔ پھر لیزا اور سکندر بہت خوب! سکندر جب لیزا کے سامنے رویا، مجھے لگا وہ ادھر ہی تو ہے۔ رو رہا ہے۔ میں کئی دن اپ سیٹ رہی۔ فرحت جی آپ سے بھی شکایت ہے "متاع جاں" کا کیا کر دیا ہے؟

صباحت یاسمین کا مزاحف کچھ خاص متاثر نہ کر سکا۔ البتہ ہم نزہت شبانہ حیدر کے متاثرین میں سے ہیں۔ ایک سی جیسا کریکٹر ہے تو سہی ادھر بھی اردگرد۔ پڑھ کر اچھا لگا، عبیر کا کردار بھی جانا پہچانا لگا۔ صد شکر نزہت آپ نے عبیر کو لاحاصل کی مسافت طے کرنے سے بچالیا۔ ورنہ آپ اکثر المیہ اینڈ کرتی ہیں۔ بہت اچھا تھا "خواب گر" نگہت عبداللہ کا میرے خواب لوٹا دو بھی اپنے راستے پر رواں دواں پھول کلیاں اور سرد و گرم بکھیر رہا ہے۔ اریبہ اور سارا دونوں ہمیں اچھی لگتی ہیں۔ بہت لمبا تبصرہ ہوگیا۔ نہیں؟ آنکھ اور منظر بھی اچھا لگا۔ اپا ڈی جے کو سیلا (یونہی ہے نام میرا خیال ہے) ایف ایم 103 کی پریزنٹر پلیز ان کا انٹرویو مع تصویر شائع کر دیجیے اس کے علاوہ ہمارے ایف ایم 95 آپ کی آواز ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ڈی جے مانی اور جان وکٹر John Victor کو بھی شاہین رشید کو نوٹ کروا دیجیے۔ اپیا میں ناول کب بھیجوں؟

ج : پیاری عائشہ! ناول بھجوانے کے لیے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر لکھ لیا ہے کہ فوراً" بھجوا دیں تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فرمائشیں شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

صبیحہ ناز...... لاہور

اس ماہ چار عدد مرد حضرات کی شاعری آپ نے نظمیں اور غزلیں کے سلسلے میں شامل کی ہیں۔ آپ نے میری پنجابی غزل شامل نہیں کی نہ سہی، میں نے رخصتی کے عنوان سے ایک منظوم پیغام بھیجا وہ شامل نہیں ہوا۔ چلو جی آپ کے معیار پر پورا نہ اترا ہوگا مگر بہت اچھی اچھی شاعرہ بہنیں ہیں ان کا کلام تو شامل ہو سکتا ہے نا۔

ج : پیاری صبیحہ! خواتین ڈائجسٹ تو پورا ہی بہنوں کی تخلیقات کے لیے ہے اگر دو صفحات پر مرد حضرات کو جگہ دے دی جائے تو کیا حرج ہے؟ "رخصتی" کے بارے میں آپ کا اندازہ درست ہے۔

سونیا غوری...... ہارون آباد

اتنی گرمی، بجلی غائب، پانی غائب، مگر ہم مطمئن ہیں خواتین ڈائجسٹ کی وجہ سے۔ ایک اچھی تفریح ہے۔ ملکوں ملکوں کی سیر ہو جاتی ہے جیسا کہ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو۔ اس کہانی نے شروع سے ہی ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میرے بھائی اس ناول کو شوق سے پڑھتے ہیں فرحت سسپنس اور منظر نگاری کمال کی کرتی ہیں جیسے بندہ خود اس جگہ پہ ہے۔ ڈائجسٹ کے انتظار میں بھائی کی حالت قیس کی طرح ہو جاتی ہے ایک درخواست ہے کہ بہت رلا دیا سکندر کو اب اور نہیں۔ پچھلی بار ہم مضبوط رہے تھے اس دفعہ ہم رو پڑیں گے۔ ابھی سیم فنی سے ایک ملاقات اور باقی ہے۔ راحت جبیں کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑتے ہیں۔ اس کی آخری قسط پہ تبصرہ کریں گے۔ ایک بات، ابرار کا دل مت دکھائیے گا۔ عریشہ کا تو دکھا ہی دیا ہے۔ ثوبان "من و سلویٰ" کا کردار لگ رہا ہے۔ ایسے مرد اگر یہ کہانیاں پڑھ لیں تو اپنا انجام بھی دیکھ لیں۔ عنیزہ سید "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" اس ناول کے سحر میں ہم ماہ نور کی طرح ڈوب چکے ہیں۔ جلتی بلتی دوپہر میں "مزاحف" ٹھاہ کر کے دل کو لگا۔ رمشا خالد اسی راستے پہ ملیں اور خوش کر گئیں۔ نگہت عبداللہ میرے خواب لوٹا دو۔ کہانی کا نام ہی اداس کر دیتا ہے۔ کوئی جادو کی چھڑی گھما کر برستی بارش میں آپ نے سارا کو اریبہ اور اریبہ کو سارا میں تبدیل کر دیا۔ اریبہ کی تبدیلی اچھی لگ رہی ہے۔ سارا کا انداز ہضم نہیں ہو رہا۔ پلیز سارا اور سمیر کے ساتھ پرامت کیجیے گا۔ پہلی قسط میں رازی کے ساتھ جو ہمدردی تھی، وہ اب نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کیوں۔ نزہت شبانہ حیدر کا ہیرو اپنے بھائی جیسا لگا۔ بھائی نے مجھے اداس دیکھ کر ڈھیر ساری کتابیں لا کر دی ہیں۔ سرفہرست شعاع خواتین کرن باقاعدگی سے لا کر دیتے ہیں۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔

ج : سونیا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کے بھائی خواتین، شعاع اور کرن باقاعدگی سے لا کر دیتے ہیں اور ان کے باقاعدہ قاری بھی ہیں۔ ہماری جانب سے ان کا شکریہ ادا کر دیجیے گا۔

ناہید قاضی...... رسال پور کینٹ

نگہت عبداللہ میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کا موجودہ ناول "میرے خواب مجھے لوٹا دو" اول قسط سے بہت اچھا جا رہا ہے۔ سرورق پر ماڈل اور لباس اچھا لگا۔ اس کے بعد کرن کرن روشنی پڑھا۔ بہت سی معلومات مل جاتی ہیں۔ راحت جبیں نے جب بھی قلم اٹھایا۔ معاشرے کے تمام کردار سامنے لائیں۔ اس کے بعد عنیزہ سید کا ناول پڑھا۔ شدت سے انتظار تھا اور اب تیسری قسط کا۔ فرحت اشتیاق کا ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" قسط بہت ہی دلچسپ تھی۔ واہ فرحت جی! اب کہانی کھل گئی ہے کہ اصل مجرم کون ہے۔ حالانکہ ہمیں پہلے ہی سکندر شہریار پر ترس آ رہا تھا۔ خواتین ڈائجسٹ کے ہر ناول اور ناولٹ سے کوئی نہ کوئی سبق ضرور حاصل ہوتا ہے۔ جو لڑکیاں لکھتی ہیں کہ ہم گھر والوں سے چوری چھپے پڑھتے ہیں تو ان کے گھر کے بڑے اس کی افادیت سے بے خبر ہیں۔ پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔

ج : پیاری ناہید! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

آمنہ فیصل...... مسلم ٹاؤن، لاہور

15 سال پہلے جب میں 8th کلاس کی طالبہ تھی، خواتین پڑھنا شروع کیا اور آج جب میں دو بچوں کی ماں ہوں۔ پہلے پہل مجھے خواتین کا اس طرح خطوط لکھنا بہت ہی عجیب لگتا تھا کہ اس دور میں کس کے پاس اتنا فالتو وقت ہے جب کہ دنیا اتنی تیز ہو چکی ہے لیکن وقت نے یہ ثابت

کر دیا کہ اگر دلی لگاؤ حد سے بڑھ جائے تو اظہار بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ ایک بے قراری سی سارے وجود میں طاری رہتی ہے۔

گرمی کی شدت میں ہلکے رنگوں کے پس منظر کے ساتھ ہم رنگ کپڑے زیب تن کیے خوب صورت ماڈل فرحت کا باعث بنی۔ جیسے کہ خوب صورت پیکنگ میں خوب صورت تحفہ۔ نصیحت جتنی کم ہو اتنی ہی پر اثر لگتی ہے۔ جیسے اس ماہ کے افسانے عائشہ فیاض' فارحہ ارشد' سعدیہ غزل اور امتل عزیز سب مصنفین نے افسانوں کو افسانوں کی طرز پر ہی لکھا جس میں سسپنس کے ساتھ ساتھ نصیحت کا پہلو بھی نظر آیا۔

فرحت اشتیاق اپنے مخصوص رومانٹک اور مسحور کن انداز میں کہانی کو نہایت پر اثر انداز میں بڑھا رہی ہیں۔

نگہت عبداللہ کا بہت عام فہم اور سادہ سا انداز جو نہ تو بہت زیادہ پرکشش ہے اور نہ ہی نظر انداز کیے جانے کے قابل۔ عنیزہ سید نے اگر پانچ سال کے ارادے سے ناول لکھنے کا آغاز کیا ہے تو ابھی بہت وقت پڑا ہے تبصرہ کرنے کے لیے بہرحال دوسری قسط پہلی کی نسبت زیادہ اچھی لگی۔

مزاحف کا آغاز تو عام سا تھا اور اختتام اپنے نام کی طرح مختلف۔ علی عباس جیسے نازک جذبات رکھنے والے کبھی بھی اس سنگدل معاشرے کا حصہ نہیں بن سکتے۔ اس کے علاوہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم' انٹرویوز اور دیگر سلسلے بھی بے شک اپنی مثال آپ تھے۔

ج : آئمہ! موتیوں جیسی خوب صورت سی تحریر میں لکھا آپ کا خط بہت اچھا لگا۔ بلاشبہ جذبات کا اظہار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً" محبت کا اظہار نہ صرف خوشی دیتا ہے بلکہ اس سے محبتوں میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ماریہ ـــــ لاہور

مجھے ایک ناولٹ لینا ہے جس کا نام شاید "تاروں سے سجا آنگن" تھا آپی یہ بہت پہلے 5'6 قسطوں میں چھپ چکا ہے مجھے اس کا طریقہ بتائیں۔ اس کے کرداروں کے نام' تبریز فارینہ اور بلال تھے۔

ج : ماریہ! آپ نے تو ہماری یادداشت کا امتحان لے لیا۔ اس نام کا ناولٹ شائع ضرور ہوا ہے لیکن کس کا تھا اور کب شائع ہوا تھا' یہ یاد نہیں ہے شاید قارئین میں سے کسی کو یاد ہو تو بتا دیں۔ کتابی شکل میں دستیاب نہیں ہے۔

صائمہ گل ـــــ مردان

میرے میاں میرے اور شعاع و خواتین کے درمیان ظالم سماج تھے مگر جب 2005ء میں شعاع میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد (مرحوم) کا انٹرویو سنایا تب سے اب تک ہم دونوں بلاناغہ شعاع اور خواتین پڑھتے ہیں۔

سب سے پہلے بات کروں گی "جو بچے ہیں" کی۔ خوب صورت منظر نگاری اور کردار نگاری میں اپنی مثال آپ یہ تحریر ہمارے ذہنوں پر برسوں حاوی رہے گی۔

"کوہ گراں تھے" اگرچہ دوسری قسط تھی مگر پلاٹ مضبوط اور سعد کا کردار جان دار ہے۔ کیپ اٹ اپ عنیزہ جی۔

راحت جی وہی معصوم لوگوں کے چہروں' باتوں اور لہجوں میں محبت ڈھونڈنے والی ہیروئن۔ تائی حمیداں کو تو مریم خوب مزہ چکھانے والی ہے۔ ایسی دوغلی اور حاسد عورت کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

باقی سارا پرچہ بہترین تھا۔

آخر میں بتاتی چلوں کہ یہ خط میں نے پانچ دنوں میں مکمل کیا ہے۔ ارے حیران نہ ہوں' جب تین بچوں کی ماں ہو اور رہتی بھی جوائنٹ فیملی میں ہو تو ایسا تو ہوتا ہی ہے۔

ج : پیاری صائمہ! آپ نے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھا بہت شکریہ۔ آپ کے میاں صاحب بھی خواتین ڈائجسٹ کے دل دادہ ہیں جان کر خوشی ہوئی۔

19 جون کو آپ کی سالگرہ ہے۔ مبارک باد اور دعائیں۔

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں ''شہناز'' نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔ سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

تیسری قسط

آپا رابعہ نے آلو منگوانے کے لیے گلی میں جھانک کر کسی بچے کو تلاش کرنا چاہا، گلی سنسان پڑی تھی۔ انہیں سخت مایوسی ہوئی۔

"مجال ہے، جو مدرسے کے کسی بچے کو پانچ، دس منٹ کے لیے گھر بھجوا کر پوچھ ہی لیا کریں کہ کوئی چیز تو نہیں منگوانی۔" وہ دل ہی دل میں مولوی سراج سرفراز کو کوستی ہوئی ڈیوڑھی میں آکر کھڑی ہوگئیں۔ دھوپ ڈھل رہی تھی اور صحن میں گڑے مٹی کے چولہے پر چھاؤں آرہی تھی۔

"جو پاتھیوں (اپلوں) کے لیے کہا تو بولے "کسی کا احسان نہیں لیتا۔" بالن (آگ جلانے کا سامان) اکٹھا لے نہیں سکتے' اللہ جانے! ان کی تنخواہ اور نذر نیازیں کہاں جاتی ہیں، مجھے تو ساری عمر پتا نہیں چلا۔"

وہ خود کلامی میں مشغول تھیں، جب دروازے کی کنڈی کھڑکی۔ انہوں نے سر پر اچھی طرح چادر اوڑھ کر دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔

"امرود گھلے نیں چوہدری صیب نے۔ نالے گندلاں دا ساگ وی ایہہ تازہ تازہ" (امرود بھیجے ہیں چوہدری صاحب نے، ساتھ میں سرسوں کا ساگ بھی ہے تازہ تازہ) دروازے پر آئے کھاری نے دانت نکوستے ہوئے انہیں بتایا۔

"لا مجھے دے یہ چیزیں اور بھاگ کر مجھے آلو لا کر دے۔" آپا رابعہ نے جلدی سے تھیلا کھاری کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"میں تو ٹرک کے ساتھ شہر چلا تھا، چوہدری صاحب نے مجھے کھڑا نہیں ہونے دیا، بولے کھاری بیٹا دوڑ کے جاؤ مولوی صاحب کے گھر سوغاتیں پہنچا کر آؤ۔" کھاری نے ان سے پیسے پکڑتے پکڑتے بھی دل میں جمع کی ہوئی باتیں گوش گزار کردیں۔

"بھاگ کے جا اللہ دتا دکان بند کر کے مسجد چلا جاتا ہے۔" آپا رابعہ نے کھاری کو دوڑا دیا اور خود ڈیوڑھی میں رک کر ہی اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگیں۔ دو، تین منٹ کے اندر ہی کھاری آلو کا تھیلا پکڑے واپس آگیا۔ تھیلے اور پیسوں کا حساب دینے کے بعد کھاری واپس جاتے جاتے مڑا۔

"اج بھین جی (ویسے بہن جی) (آپا رابعہ جگت بہن جی تھیں بہت کم لوگ انہیں آپا رابعہ کہہ کر بلاتے تھے) ایہہ جیہڑے شاپر ہوتے ہیں نا' ایہہ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔"

"چل چل' بڑا آیا افلاطون۔" آپا رابعہ نے مذاق سے کہا "تجھے کس نے بتایا؟"

"مینوں عقلاں والیاں ساریاں گلاں شہر والی بی بی نور نے سکھائی ہیں۔"

"اک تو تیری یہ شہر والی بی بی اللہ جانے' کیا شے تھی۔" آپا رابعہ نے چڑ کر کہا۔

"او، بڑی عقلاں والی بی بی اے۔" کھاری نے سامنے دیکھتے ہوئے عجیب جذب کے عالم میں جواب دیا۔

"نہ پر کس طرح؟" آپا رابعہ نے تھوڑی پر انگلی رکھ کر سوالیہ انداز میں سرہلاتے ہوئے پوچھا۔

"بھین جی! کبھی ہم نے' آپ نے سوچا کہ یہ بندر کا تماشا کس طرح ہوتا ہے؟ کبھی ہمیں خیال آیا کہ یہ جو جوگی لوگ میلوں میں گاتے پھرتے ہیں' ان سے پوچھیں کہ بھئی! آپ کی آواز میں اتنا اثر کیسے آیا؟" کھاری' آپا رابعہ سے سوال کررہا تھا۔ آپا رابعہ کھاری کی سنجیدگی پر حیرت زدہ تھیں۔

"تمہاری بی بی نے یہ کس سے پوچھا کھاری!" انہوں نے سوال کیا۔

"ہے سی اک جوگی' سائیں تھا شاید۔" کھاری نے بے نیازی سے کہا۔

"سائیں نے کوئی جواب دیا؟" آپا رابعہ کو خوامخواہ اس بات میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

"ہو!" کھاری نے مفکرانہ انداز میں سرہلایا۔ "سائیں ہوری آکھن لگے عشق صدقاں سوز پیدا ہوگیا۔"

(سائیں جی کہنے لگے عشق کی وجہ سے سوز پیدا ہوگیا)

"اوہو بھین جی ایہہ کیا کیا آپ نے شہر والا ٹرک نہ نکل گیا ہو، آپ مولوی صاحب کے لیے کھانا بنائیں، میں چلا۔" کھاری بگٹٹ بھاگا۔

آپا رابعہ کچھ دیر ڈیوڑھی میں کھڑی کھاری کی باتوں پر غور کرتی رہیں اور پھر آہستہ قدموں سے چلتی صحن میں آگئیں، دھوپ مکمل طور پر ڈھل چکی تھی، فضا میں آہستہ آہستہ خنکی بڑھ رہی تھی، شام کے سائے لمبے ہورہے تھے۔ انہوں نے صحن میں بچھی چارپائی پر بکھری کتابوں پر نظر ڈالی، طبیعات، کیمیا، حیاتیات......

"آپا رابعہ کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ آپا رابعہ اور مولوی سراج سرفراز اس بات پر نازاں تھے کہ ان کی بیٹی میٹرک سائنس کے مضامین کے ساتھ کرنے جارہی تھی۔ گورنمنٹ اسکولوں میں پڑھنے والی اکثر بچیاں سائنس پڑھنے سے بھاگتی تھیں۔

سعدیہ کلثوم کا سائنس پڑھنا آپا اور مولوی صاحب کے طغرے میں لگا پہلا پر تھا جو ان کی اولاد نے ان کی نذر کیا تھا۔ آپا رابعہ نے سعدیہ کی کتابیں سمیٹ کر چارپائی اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑی کی۔ کتابیں رکھنے کے لیے جب وہ کمرے میں آئیں سعدیہ کلثوم کمبل اوڑھے میٹھی نیند سو رہی تھی۔

"بے فکری کے زمانے کی نیند بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔" آپا رابعہ نے مٹی کے چولہے میں ادھ گیلی لکڑیاں اور اپلے سلگاتے ہوئے سوچا۔ پھونکنی سے پھونکیں مارتے ہوئے جو پانی ان کی آنکھوں میں اترا تھا' وہ دھوئیں کے باعث تھا یا کسی سوچ کی وجہ سے..... وہ خود بھی قیاس نہ کرسکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو' کیسی ہو؟" نادیہ نے بہت دنوں بعد اسے آن لائن دیکھا تھا' اس کا دل ایک دم خوش ہوگیا۔

"ارے واہ' یہ تم ہو!" نادیہ کی انگلیاں کی بورڈ پر متحرک ہوئیں۔ "مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"تمہاری ہمیشہ سے یہ ہی عادت رہی ہے' تمہیں نظر کے سامنے موجود چیزوں پر بھی یقین نہیں آتا۔" نادیہ کے سامنے اسکرین پر الفاظ ابھرے۔

"کوئی بے یقینی سی بے یقینی ہے۔" نادیہ نے لکھا۔ "اور سناؤ ہینڈسم! کیسے ہو؟"

"میں تو بڑا بیوٹی فل ہوں۔" اس نے وہ جملہ لکھا' جو ہمیشہ حال پوچھنے پر اس کی طرف سے سننے کو ملتا تھا۔

"اب تک تو تمہیں کسی بیوٹی کانٹیسٹ میں شرکت کرلینی چاہیے تھی۔" نادیہ نے لکھا۔

"اوہو نہیں نا..... میں اپنی بیوٹی کی تشہیر کا قائل نہیں۔" جواب آیا۔ "تم بتاؤ کیسی ہو ایلس! اور کیسا ہے تمہارا ونڈرلینڈ؟"

"ارے تمہیں پتا نہیں چلا؟ میں تو کب کی ونڈرلینڈ سے نکالی جاچکی ہوں۔" نادیہ نے کہا۔ "میرے پاس تو اب صرف ایک لیڈی برڈ اور ایک بھنگے کے ٹوٹے ہوئے پر باقی رہ گئے ہیں۔"

"تم غلط کہہ رہی ہو۔" جواب آیا۔ "انسان کبھی بھی اپنے ونڈرلینڈ سے باہر نہیں نکل پاتا۔ یہ ہی تو اس کی اکلوتی عیاشی رہ جاتی ہے۔ تم کسی وقت غور کرنا' تمہارا ونڈرلینڈ بھی تمہارے اردگرد ہی موجود ہوگا۔"

"اچھا نا۔ یہ بتاؤ' کیسے ہو اور آج کل کیا ہورہا ہے۔" نادیہ نے بات بدلی۔

"آج کل والد محترم کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش ہورہی ہے۔ چکی پیس رہا ہوں' مشق ستم کے نتیجے میں۔"

"اُفوہ! تم کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے۔" نادیہ نے جملے کے آخر میں غصے والی شکل بنائی۔

"یار! میرا خیال تھا تم بین السطور پڑھنے کی ماہر ہو' میری بات سمجھ جاؤ گی۔ غصہ کیوں ہوتی ہو۔ بات یہ ہے کہ میں آج کل رائل البرٹ ہال میں پیانو بجا کر دکھانے کی مشق کر رہا ہوں۔" جواب کے آخر میں شرارت بھری شکل بنی ہوئی تھی۔

"جاؤ' میں تم سے نہیں بولتی۔" نادیہ بالکل ناراض ہو گئی۔

"ارے نہیں نہیں' ناراض مت ہو میری گڑیا!" پیار بھرا جواب آیا۔ "ڈیڈی کے کام سے پشاور آیا ہوں۔ ایک ہمارے مہربان ہیں مسٹر البرٹ جان' وہ آج کل مجھے سبق پڑھا رہے ہیں کہ ملک کا کون سا بارڈر کون سی برآمد اور کیسی درآمد کے لیے موزوں ہے۔ میں سبق پڑھ کر کئی بار سنا بھی چکا مگر چھٹی نہیں مل رہی جیسا کہ روایت ہے۔"

"ہاہا' اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔" نادیہ کو شرافت کی سکھائی یہ بات یاد آ گئی۔ "ویسے تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم ڈیڈی کے اشاروں پر چلو' کیوں کہ تم اس لحاظ سے خوش قسمت ہو کہ اپنی اولاد میں سے صرف تم ہی کو انہوں نے اپنے دست شفقت کا مستحق جانا۔"

"ہاں بھئی' یہ تو ہے۔" "فوراً" ہی اعتراف سامنے آیا۔

"اچھا اب تم بتاؤ' کیسی ہو؟" اس کے بعد ایک سوال سامنے آیا۔

"میں ٹھیک ہوں' زندگی ویسی ہی ہے جیسی میں نے تمہیں پچھلی میل میں بتائی تھی۔ مجھے سردی سے وحشت ہوتی تھی۔ اللہ نے مجھے برف پوش علاقوں میں رکھا ہمیشہ۔ یہاں بھی آج کل برف کے نظارے کرتی زندگی گزار رہی ہوں۔ یوتھ ہاسٹل کی زندگی بہت اکتا دینے والی ہے۔ میں انتظار کر رہی ہوں کب میرے کورسز مکمل ہوں اور کب میں اپنی اگلی منزل کی طرف سفر اختیار کروں۔"

"اگلی منزل کیا ہے تمہاری؟" سوال سامنے آیا۔

"تمہارا وہ گھر' جس میں' میں تمہاری بیوی کی نند بن کر خوب حکم چلا سکوں۔ اس کی جان آفت میں لے آؤں جس کے نتیجے میں وہ آئے دن ناراض ہو کر بچوں سمیت میکے چلی جایا کرے۔" نادیہ نے جواب کے اختتام میں قہقہے لگاتا چہرہ بنایا۔

"فکر نہ کرو' میں ایسی لڑکی سے شادی کروں گا جو بچے لے کر نہیں' چھوڑ کر جایا کرے گی پھوپھی جان!" اس جواب کے آخر میں شرارت بھرا چہرہ منہ چڑا رہا تھا۔

"ایسی صورت میں بچے تم سنبھالو گے ابا جان!" نادیہ نے بھی چڑانے کی کوشش کی مگر اس کی اس بات کا جواب نہیں آیا۔ وہ آف لائن ہو چکا تھا۔ نادیہ کچھ دیر اس گفتگو سے محظوظ ہوتی یونہی بیٹھی سامنے رکھی اسکرین کو گھورتی رہی اور پھر اٹھ کر اپنے لیے کافی بنانے چل دی۔

اس روز وہ دن کے اختتام تک ایک عجیب سی خوشی کے احساس میں سرشار رہی تھی۔

✿ ✿ ✿

"کسی کو فنکاری اور فنکار کا اصل روپ دیکھنا ہے تو پردے کے پیچھے جھانکے۔ پردے پر تو سب تصنع ہے۔ پردے کے پیچھے ہانپتے ہوئے' اکتائے ہوئے چہروں پر پسینے کے قطرے سجائے اپنی باری کے منتظر فنکار ادھر ادھر بیٹھے' کہیں لیٹے ہوئے' کبھی پردے کے جوڑ سے آنکھیں ٹکائے نظر آئیں گے' پھر پتا چلے گا کہ اصل چہرہ کیا ہوتا ہے۔"

وہ سامنے دیوار پر لگے کلاک کی سیکنڈ والی سوئی کے ساتھ ساتھ آنکھیں گھما رہی تھی اور آوازیں بازگشت کی

صورت اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

"رسی پر چلنے کا کرتب' چھ انچی بار پر پاؤں کی انگلیوں کے بل کھڑے ہونا اور گھوم کر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے واپس اسی پوزیشن میں پنجوں کے بل بار پر آ کر ٹک جانا... تماشائی مبہوت ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں فنکار کی جنبش کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی ہیں۔ ان کا اوپر کا سانس اوپر' نیچے کا نیچے رہ جاتا ہے... دم بخود اور جب تماشا ختم ہوتا ہے تو وہ خوشی کے عالم میں تالیاں پیٹتے ہیں' سیٹیاں بجاتے ہیں' نعرے لگاتے ہیں۔ کبھی کسی تماشائی نے اس فنکار کے دل پر گزرنے والی کیفیت کو سوچا ہے' جو تماشا دکھانے کے بعد ابھی ابھی رنگ سے باہر نکلا ہے۔ ایک جنبش غلط' انگلی کا فرق' آنکھ کا ذرا سا چوک جانا' ذہن کا لمحہ بھر کو بھٹک جانا... اسے کیسے حادثے سے دوچار کرا سکتا ہے' وہ تماشا نہیں دکھاتا' موت کے منہ میں خود کو ڈال دیتا ہے' کبھی کسی نے اس بات پر غور کیا؟"

گھڑی کی سوئی تین منٹ اور آگے کھسک گئی۔

"تماشائیوں کے لیے فنکار ربر کا گڈا ہے' جس کو چابی دے دو تو وہ ایک میکنزم کے تحت وہ سب کرتا ہے' جو ان کو چند لمحوں کی تفریح مہیا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرے' تیسرے' پھر چھٹے اور پھر دسویں تماشے میں وہی فنکار نئی موت کے منہ میں خود کو ڈالنے کے لیے پردے کے آگے ظاہر اور غائب ہوتا رہتا ہے اور اس کے دماغ میں جو کیڑا چھپ کر بیٹھا ہوتا ہے' وہ ایک ہی نعرہ لگاتا اسے ہلا شیری دیتا ہے اور بار بار رنگ میں داخل کرواتا ہے۔

Earn some more money to night

"آج کی رات پہلے سے کچھ زیادہ پیسے کما لو۔"

یہ نعرہ فنکار میں ہر بار موت سے بچ آنے کے بعد نئی روح پھونکتا ہے اور وہ خم ٹھونک کر دوبارہ ایک نئے روپ میں رنگ میں داخل ہو جاتا ہے۔ کبھی تاروں پر چلتا ہے' کبھی شیروں اور کتوں کے ساتھ نت نئے تماشے کرتا ہے۔ کبھی ہاتھیوں پر سوار ہو کر ہواؤں میں اچھلتا ہے' کبھی کیلوں اور سوئیوں کے بستر پر لیٹتا ہے اور کبھی صندوق یا الماری میں بند ہوتا ہے... یہی فنکار منہ سے آگ کے گولے نکالنے کا کرتب بھی کرتا ہے اور موت کے کنویں میں گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں بھی چلاتا ہے۔"

Just to earn some more money

کلاک کی سوئیاں پانچ منٹ اور آگے کھسکیں اور گھنٹہ مکمل ہونے پر سیدھی ٹک گئی' کلاک کے اوپری حصے میں بنے ریک کا دروازہ کھلا اور نیلے رنگ کا پرندہ پھدک کر باہر نکلا' وہ لفظوں میں اعلان کر رہا تھا وقت کیا ہوا ہے۔

"وقت!" سارہ خان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "جو کبھی تو گزرنے میں ہی میں نہیں آتا اور کبھی یوں گزرتا ہے کہ پتا تک نہیں چلتا... اور اس کے گزر جانے کے بعد انسان اس کے چھوڑے ہوئے خس و خاشاک چنتا رہ جاتا ہے۔"

نیلا پرندہ اپنا فرض پورا کر کے واپس اپنے ڈبے میں بند ہو چکا تھا۔ گھڑی کی سیکنڈز والی سوئی اپنی دھن میں ہلکی سی ٹک ٹک کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ گھڑی کی یہ سوئی ان تھک چلتی تھی۔ اور کمرے میں اپنی صوت کی صورت زندگی کی ایک علامت تھی۔

"تم بہت عجیب ہو۔" اس آخری سوچ پر سارہ کو سعد کی کہی بات یاد آ گئی۔ "کیوں یوں بے بسی سے بڑی سوچوں میں گم رہتی ہو یا کمرے کے کونے کھدروں میں موجود چیزوں کے تجزیے کرتی رہتی ہو۔ تمہارے پاس ٹی وی ہے' آئی پوڈ ہے' کمپیوٹر ہے' وائی فائی ڈیوائس موجود ہے' کیوں تم ان میں مصروف نہیں ہو جاتیں۔ ان چیزوں کے ذریعے تم دنیائیں دریافت کر سکتی ہو' چیزوں کی کھوج لگا سکتی ہو۔ سارہ خان! دنیا بہت دلچسپ ہے۔ کیوں وقت ضائع

کررہی ہو کیوں زندگی کی ناقدری کررہی ہو۔"

سارہ نے ایک بار پھر بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے کی بائیں دیوار میں جڑی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے اور وہ بیڈ پر لیٹے لیٹے اس کھڑکی کے پار نظر آنے والے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں کو ہی دیکھ پاتی تھی۔ سارہ نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ بیڈ پر بچھی چادر کو اپنی گرفت میں جکڑ رہے ہیں۔ چادر کے بارڈرز اکٹھے ہو کر دائیں بائیں ہاتھوں کی گرفت میں آگئے تھے' اسی گرفت کو سہارا بنا کر اس نے اٹھنے کے لیے زور لگایا۔

دو بار ناکام رہنے کے بعد وہ خود کو اٹھا کر بٹھانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا' اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی بلند پہاڑ کی چوٹی سر کرلی ہو۔ بیڈ سے تین انچ کے فاصلے پر کرسی رکھی تھی۔ اس نے جسم پر پڑی چادر سمیت اپنی ٹانگیں بیڈ سے بائیں طرف لٹکانے کی کوشش کی۔ بیڈ پر بچھی چادر اس کوشش میں اس کے جسم کے نیچے اکٹھی ہوگئی تھی۔ جس وقت وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئی' کلاک کی سوئیوں نے اگلا نصف گھنٹہ بھی مکمل کرلیا تھا۔ نیلا پرندہ پھدک کر باہر آیا اور وقت کا اعلان کرنے لگا۔

سارہ نے سر اٹھا کر نیلے پرندے کو دیکھا اور بے اختیار مسکرا دی۔ وہ کچھ حاصل کرلینے کی مسرت کے عالم میں تھی۔ اگلے نصف گھنٹے کے اندر وہ کرسی کھینچ کر اپنے قریب کرلینے اور اس پر بیٹھ جانے کی منزل پا چکی تھی۔ سارہ کو محسوس ہوا' اس بار نیلا پرندہ خود بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"مبارک ہو' وقت کے ساتھ ساتھ تم بھی آگے بڑھ رہی ہو۔" سارہ نے محسوس کیا۔ اس کے اندر کہیں سے جوش اٹھ رہا ہو۔

اسے اپنا چہرہ بھی تمتماتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا' اسے لگا اس کے چہرے پر نمی تھی۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا اور زور لگا کر کرسی کو آگے گھسیٹا' اس کے کمزور جسم میں اتنا زور لگانے کی ہمت نہیں تھی' اس کے منہ سے بے اختیار سیمی آنٹی کے لیے مدد کی پکار نکلنے ہی والی تھی مگر اس نے اس پکار کو کنٹرول کرتے ہوئے اپنے گلے میں ہی دبا دیا۔

وہ ایک بلکہ ایک سے زیادہ دفعہ کوشش کرنا چاہتی تھی۔ اگلی بار جب نیلا پرندہ گھنٹے کا اعلان کرنے باہر نکلا۔ سارہ خان نے اپنی کوشش میں ناکامی کا اعتراف کرتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ نیلا پرندہ شاید اس اعتراف پر دکھی ہوگیا۔ سارہ کو لگا جیسے وہ سر جھکا کر مایوس انداز میں واپس اپنے ڈبے میں بند ہوگیا تھا۔ اس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا' اس کی نظر میز پر رکھے سیل فون پر پڑی' جسے استعمال کرنے کی ضرورت اسے شاذ ہی پڑتی تھی۔ سیل فون پر نظر پڑتے ہی نجانے کیوں اور کیسے اس کے کانوں میں کئی بار سنی ہوئی آواز میں ابھرتے الفاظ گونجنے لگے۔

if you ever find yourself stuck in the middle of the sea.....

سارہ نے موسیقی کی لہروں پر ابھرتے ان الفاظ کو محسوس کیا اور پھر اس کے دل نے گنا... ایک' دو' تین' تین بار گھنٹی بجنے کے بعد دوسری طرف سے اس کی پکار وصول کرلی گئی۔

"سنو! تم جہاں بھی ہو فوراً" چلے آؤ' میں چاہتی ہوں تم دیکھو' میں اس وقت کہاں موجود ہوں اور میرا دل کہاں پہنچنا چاہتا ہے۔"

سارہ کے کانوں نے خود اس کے اپنے منہ سے نکلنے والے لفظوں کو سنا اور اپنی حس سماعت پر یقیناً" حیران ہوئے جبکہ اس کا دل گنتی گن رہا تھا' ایک' دو' تین... اس کے دل کو پتا تھا کہ اس سے آگے کے ہندسے گننے کی اسے ضرورت نہیں پڑے گی۔

☼ ☼ ☼

"وہ جو تم نے تین چار پینٹنگز بنا رکھی ہیں' چار کول میں' ان کو کسی نمائش میں کیوں نہیں رکھتیں۔"

شاہ بانو نے اسے اس روز یاد دلایا تھا' جب وہ اس خیال سے جھوم رہی تھی کہ وہ سید پور گاؤں کے لوگ میلے میں شرکت کرنے جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں شاہ بانو کا دیا کارڈ تھا' جس پر نقرئی حروف میں میلے کا پروگرام درج تھا۔

"ارے یار!" ماہ نور نے ایسے سر جھٹکا جیسے شاہ بانو نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہو۔

"کیوں بھئی۔ کیا ہوا؟" شاہ بانو نے حیران ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"میں کون سی کوئی جانی پہچانی مصورہ ہوں۔" ماہ نور نے بے چارگی کا مظاہرہ کیا۔ "تین چار پینٹنگز کی سولو ایگزیبشن ہو نہیں سکتی اور گروپ ایگزیبشن میں ایک گمنام مصورہ کی کاوشیں کون رکھے گا؟"

"یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں۔ عبید بھائی نومیڈ آرٹ گیلری کی سید پور برانچ میں بھی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ وہ بتا رہے تھے کہ سید پور میلے کے دنوں میں نو آموز مصوروں کی پینٹنگز کی نمائش بھی کی جائے گی' اس طرح کے گروپ ایونٹ میں عبید بھائی تمہیں اسپانسر کر سکتے ہیں۔"

ماہ نور نے بے یقینی سے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ شاہ بانو نے سر ہلا کر اسے اپنی بات کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

"مگر وہ تو یونہی سی ہیں۔ ایک آدھے چہرے کی لڑکی' ایک درخت کے تنے پر شاخوں کے بجائے انسانی چہرہ' ایک sillhoule (روشنی کے عکس میں ہاتھوں سے بنائی شبیہہ) اور ایک بند دروازہ۔۔۔ ان پینٹنگز میں کچھ بھی تو خاص بات نہیں ہے۔ تمہارے عبید بھائی انہیں دیکھ کر کبھی اسپانسر نہیں کریں گے۔" ماہ نور نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں کریں گے؟" شاہ بانو نے سوال کیا۔ "بھئی ایسی نمائشوں کا تو مقصد ہی نئے ٹیلنٹ کو سامنے لانا ہے۔"

ماہ نور خاموش رہی۔

"بس طے ہو گیا۔" شاہ بانو نے جیسے فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ساتھ تمہاری پینٹنگز بھی اسلام آباد جائیں گی۔"

ماہ نور کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا' لیکن اس نے خوشی کا یہ درجہ شاہ بانو پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور بے نیازی سے ہاتھ میں پکڑا کارڈ پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ اس کی عمر ایسی تھی کہ اسے کارڈ پر لفظوں کے بجائے اپنا مستقبل نظر آنے لگا تھا۔ وہ خود کو مستقبل کی ایک نامور مصورہ کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

خدیجہ نے چیزوں سے لدی ٹرالی آگے کھسکائی اور کاؤنٹر پر بل بنوانے لگیں۔ سلور گرے بالوں کا جوڑا باندھے' سادے شلوار سوٹ پر پرنٹڈ دوپٹا اوڑھے' پاؤں میں اعلا برانڈ کی چپل پہنے اپنی سرخ و سفید رنگت کے ساتھ وہ اپنی عمر کے مطابق انتہائی گریس فل خاتون نظر آ رہی تھیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھے اس بڑے اسٹور کے وردی پوش لڑکے نے کمپیوٹرائزڈ بل ان کے ہاتھ میں تھمایا۔ خدیجہ نے گلے میں پڑی سنہری زنجیر کے ساتھ لٹکتا سنہری فریم کا نازک سا چشمہ آنکھوں سے لگایا اور بل کی تفصیلات پڑھنے لگیں۔ بل کے مندرجات پڑھتے ہوئے وہ کئی چیزوں کی قیمتوں پر اٹکیں اور کاؤنٹر والے لڑکے سے تصدیق کی کہ واقعی اس چیز کی قیمت وہی تھی' جو بل پر لکھی تھی۔

"میم! یہ انسانی کام ہے ہی نہیں' مشین سے نکلا ہوا بل ہے۔ غلطی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔" لڑکے نے انتہائی مؤدب انداز میں پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"اسی طرح کی لش پش کے ذریعے ہی تو تم لوگ ہمارے منہ بند کر دیتے ہو۔" خدیجہ نے ہنس کر کہا۔ "ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ہر چیز کی قیمت پر بحث ہوتی تھی اور کچھ پیسے تو ہر صورت کم کرا ہی لیے جاتے تھے' اب تم لوگ قیمتوں کے اسٹیکرز اس لیے چیزوں پر چپکا دیتے ہو کہ کوئی بولے نہ بات کرے۔"

"ارے نہیں نہیں میم!" لڑکے نے فوراً "ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

"یہ اسٹیکرز اس لیے لگائے جاتے ہیں کہ ایک ہی چیز کے مختلف برانڈز کی قیمتیں چیک کرنے کے بعد کسٹمر اپنی رینج کے حساب سے چیز خرید سکے۔"

"واہ کیا منطق ڈھونڈی ہے۔" خدیجہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرے جیسے کسٹمرز جو ہمیشہ سے ایک ہی کمپنی کی چیز خریدنے کے عادی ہوں' ان کے تو کسی کام کی نہیں یہ کسٹمر ہیلپ۔"

"اوہو میم! اب تو برانڈ رینج اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ کسٹمر کو چوز (انتخاب) کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔" لڑکے نے مسکرا کر کہا۔

"ارے چھوڑو میاں! برانڈز وغیرہ کو۔ ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں' عمروں سے برتی چیزوں کے معیاری ہونے کا بھروسا کیے ہوئے۔" خدیجہ نے کاؤنٹر پر رکھے شاپرز اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ ہمیشہ بات ایسے کرتی ہیں جیسے سدا کی گھریلو عورت ہوں۔ جسے مرچ مسالے سے آگے کچھ پتا نہ ہو۔ میم! آپ شہر کے اتنے بڑے اور اتنے پرانے کالج کے ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کی ہیڈ تھیں جب آپ نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لی۔" اسٹور کا مالک جو خدیجہ کی لین کا پرانا رہائشی تھا' نجانے کب سے خدیجہ اور کاؤنٹر پر بیٹھے لڑکے کی نوک جھونک سن رہا تھا' آگے بڑھ کر اس گفتگو میں کود پڑا۔

خدیجہ قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ "عورت کچھ بھی بن جائے شہاب صاحب! مرچ مسالے سے اسے سدا ہی پیار رہتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" شہاب صاحب نے سر ہلا کر کہا۔ "ہم نے ایسی خواتین بھی دیکھی ہیں جو خاصی مردانہ زندگی گزارتی ہیں۔ نسائی سوچ سے جن کا دور دور تک بھی واسطہ نظر نہیں آتا۔"

"وہ نجانے کون ہوں گی۔" خدیجہ شاپر اٹھائے بیرونی دروازے کی طرف چل دیں۔

"ہم تو ایسے نہ ہو سکے عمر بھر۔" اسٹور سے باہر نکل کر انہوں نے سامان پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں رکھا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

"گاڑیوں کا تو مانو دریا چل رہا ہے سڑکوں پر رنگ برنگ۔" سروس روڈ سے مین لین میں گاڑی موڑتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں۔ یہ شہر کی ایک معروف' بڑی اور مصروف شاہراہ تھی' جس کے دونوں جانب اونچی اونچی عمارتیں ایستادہ تھیں۔ ان عمارتوں کی پیشانیوں پر خوشنما بورڈز ٹنگے تھے۔ جدید شاپنگ مالز' فارمیسیز' بک اسٹورز' آرٹ گیلریز' شو اسٹورز' ڈرگ ہاؤسز' کافی شاپس' کیفے' ریسٹورنٹس۔۔۔ ان کے راستے میں ہر طرح کی عمارتیں تھیں۔ سڑک پر ٹریفک انتہائی منظم طریقے سے رواں دواں تھا۔

دو رویہ کشادہ سڑک کے درمیان پھولوں کے تختے تاحد نظر اپنی خوشنما بہار دکھلا رہے تھے۔ فٹ پاتھ اور سروس روڈز پر اکثر پیدل چلنے والے ادھر ادھر دھیان کیے بغیر تیزی سے چل رہے تھے۔ ہر ایک جیسے جلدی میں تھا۔ ان میں زیادہ تعداد طالب علموں کی تھی۔ خدیجہ یہ منظر دیکھ کر مسکرا دیں۔

"اسی سڑک کے مختلف سالوں میں کتنے مختلف منظر دیکھ رکھے ہیں ان آنکھوں نے۔ بچپن سے لے کر اب تک کتنے دور گزرے' کیسے حالات بدلے' کتنے منظر بدلے' کتنے لوگ زندگی میں آئے اور چلے گئے۔۔۔ نہیں بدلی تو

یہ سڑک نہیں بدلی' اسی طرح سکون سے اپنا سینہ کشادہ کیے کب سے لیٹی ہے۔ فرق آیا تو صرف اتنا کہ پہلے اس کو مال روڈ کہا جاتا تھا' اب کچھ لوگ اسے شاہراہ قائداعظم بھی کہہ لیتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

ابراہیم کے لیے کبھی بھی سعد کے مزاج کو سمجھنا آسان کام ثابت نہیں ہوا تھا۔ سعد اس کا ملے گروپ کلاس سے لے کر ایم بی اے تک کا کلاس فیلو رہا تھا۔ وہ بچپن سے ہم پیالہ وہم نوالہ قسم کے دوست تھے مگر اس پورے عرصے میں بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی کے باوجود ابراہیم کے ساتھ کتنی بار ایسا ہوا کہ سعد کے منٹوں میں بدلتے مزاج نے اسے چونکا دیا۔

ایسا بھی کئی بار ہوا کہ سعد کے بدلتے مزاج کی وجہ سے ابراہیم بدمزا ہو گیا مگر اس کے دل میں سعد کے لیے اتنا پیار اور اس کے ساتھ تعلق کی انتہا کا احساس اتنا زیادہ تھا کہ وہ سعد کو کبھی یہ احساس نہ دلا سکا تھا کہ کبھی کبھار وہ اس کے رویے کی وجہ سے خفگی بھی محسوس کرتا تھا اور ایسا ہی ان دنوں بھی ہو رہا تھا' جب سعد اسے اپنے ساتھ ایسی جگہوں پر لے جاتا تھا' جہاں جا کر ابراہیم کا دل متلانے لگتا تھا اور دماغ بھنا تا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تم کس چیز کی تلاش میں ہو۔" ایک روز ابراہیم نے یہ سوال سعد سے کر ہی دیا تھا۔

جواب میں سعد نے اپنی مخصوص مسکراہٹ پھینک کر شاید اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں! آج تمہیں بتانا ہی ہوگا۔" ابراہیم نے ضدی انداز میں کہا۔

"کیوں تمہاری روح اتنی بے قرار ہے کہ کسی طرح قرار ہی نہیں پاتی۔"

یہ الفاظ ابراہیم نے بے دھیانی میں کہے تھے مگر کرسی پر جھولتا سعد ایک دم چونک کر سیدھا ہو گیا تھا۔

"تم سے کس نے کہا میری روح بے قرار ہے؟" سعد نے اس سے سوال کیا تھا۔

"کہنا کس نے ہے۔" ابراہیم نے جمائی روکتے ہوئے کہا۔ "جو تم کرتے پھرتے ہو' اس کا میرے علاوہ کوئی عینی گواہ ہے ہی نہیں' اس لیے مجھے خود سے یہ خیال آیا ہے۔"

"یہ بتاؤ۔" سعد نے ابراہیم کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے' میں جنونی ہوں؟"

"خیر! ایسی بات تو میرے ذہن میں کبھی نہیں آئی تمہارے لیے۔" ابراہیم کو دوپہر کے کھانے کے بعد نیند سی آنے لگی تھی۔

"پھر تم نے یہ بات کیوں کی؟" سعد کے سوالات شروع ہو گئے تھے اور ابراہیم جانتا تھا کہ جب تک وہ اس کے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہیں دے گا' وہ اس کی جان نہیں چھوڑے گا۔

"یار! بات یہ ہے۔" ابراہیم نے ذہن پر چھاتی نیند کو جھٹک کر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہارے ذہن میں مذہب کے بارے میں سوال کلبلاتے ہیں تو کسی اسکالر کے پاس جاؤ' کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے تو کسی سائیکاٹرسٹ سے مشورہ کرو۔۔۔ کوئی فزیکل بیماری ہے تو ڈاکٹرز بہت۔۔۔ تم کن چکروں میں پڑے ہو یار! جوگی' سادھو' درویش' پیر اور ان کے مرید۔۔۔ یہ تمہارے مسئلوں کا' تمہارے سوالوں کا کیا جواب دیں گے۔ کوئی تمہاری پشت پر ہاتھ پھیر کر "سب اچھا ہوگا" کی نوید دیتا ہے' کوئی چٹکی بھر نمک چٹا دیتا ہے' جاؤ بچہ! راستی ملے گی' کوئی ہینڈ پمپ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کو چلا کر جتنا پانی پی سکتے ہو پی لو' روح سکون پا جائے گی۔۔۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں تم

یوں خوار کیوں ہو رہے ہو۔۔۔ اسی سے میں نے اندازہ لگایا کہ تم اندر سے بے قرار ہو۔"

"اوہ!" سعد نے سر جھٹک کر جھکایا اور پھر سر اٹھا کر ابراہیم کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" ابراہیم نے سوال کیا۔

"یار! تو میرا اتنا بڑا رازدان ہے اور مجھے اتنا جانتا ہے کہ شاید ہی میری کوئی بات تجھ سے چھپی رہ گئی ہو تو میں پریشان ہو گیا تھا کہ تو کہہ رہا ہے تو یقیناً" میرے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔"

"تو کیا تیرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے؟" ابراہیم نے ہونقوں کی طرح سوال کیا۔

"میرا یہ مسئلہ کیا کم ہے کہ تو میرا اتنا جگری دوست ہے' مجھے تجھ سے زیادہ کوئی جانتا نہیں' پھر بھی میرے بارے میں اتنے غلط اندازے لگاتا ہے۔ میرے ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں۔ ابراہیم کھابے کھانے والے پہلوانوں کی اولاد ہے' اسی لیے اس کے دماغ پر بھی کھابوں کی چربی چڑھ چکی ہے۔" سعد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"بکواس نہ کر۔" ابراہیم نے برا مناتے ہوئے کہا۔ "وہ تو مجھے جم کھولنے کی وجہ سے کہتے ہیں ایسا۔"

"میرے پاس تیرے لیے بڑے انقلابی آئیڈیاز ہیں۔" سعد نے اس کا بگڑا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر کہا۔

"کیا آئیڈیاز ہیں؟" ابراہیم بھی پچھلی بات بھلا کر متوجہ ہوا۔

"تو ایسا کر' ایک ماڈرن اکھاڑہ بنا۔ ایک ایسا ایریا' جس میں دیسی کشتیوں کو ایک نئے رنگ سے پروموٹ کیا جائے' پہلوانوں کی نیلامی ہو' جو سب سے اچھے پہلوان پر زیادہ بولی لگائے' وہی اس پہلوان کو اپنا کہنے کا حق دار ہو' پھر اس ایونٹ کی اتنی تشہیر کی جائے کہ بڑے بڑے ملینیئرز کی آدھی سے زیادہ بلیک منی اس میں انوالو ہو جائے۔۔۔ پہلوانوں کے وہ جو ہوتے ہیں' کیا کہتے ہیں ان کو۔۔۔" سعد نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"ہاں جانگیے' بلکہ کچھے' وہ بڑے ڈیزائنرز سے ڈیزائن کروائے جائیں اور جو پہلوان جس اسٹیک ہولڈر کا پٹھا ہو اسی کا پسندیدہ کچھا پہنے۔۔۔ کیسا!" سعد نے پرجوش انداز میں ابراہیم کی طرف دیکھا۔ ابراہیم مبہوت بیٹھا اس کی بات اتنی توجہ سے سن رہا تھا کہ شاید اس ساری تفصیلات کو اپنی آنکھوں کے سامنے حقیقت کا منظر بنتے فلم کی طرح چلتا دیکھ رہا تھا۔

"ہوں!" ابراہیم نے چونک کر سعد کی طرف دیکھا۔ "جانے دے یار!" وہ جیسے ہوش میں آ کر اس آئیڈیا کو ناممکن قرار دیتے ہوئے صوفے پر دراز ہو گیا۔ "تو جو مرضی کرے' رہے گا بزنس مین کی اولاد۔ ہر جگہ' ہر کام میں' ہر آئیڈیا میں پیسہ انوالو کرنے والا بزنس مین۔۔۔ دو جمع دو چار بتانے والا۔۔۔ بار ٹر سسٹم شروع کرنے والوں کا سپوت۔"

"اچھا!" سعد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی کو ضرور بتانا یہ بات۔۔۔ یار! کبھی کبھار تو ان کا دل مجھ سے راضی ہونا چاہیے۔"

"تو اس معاملے میں ان کی کاپی ہے پہلے ہی۔" ابراہیم نے نیند سے بند ہوتی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "لائیک فادر لائیک سن۔"

سعد کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اس کے سیل فون پر میسج کی ٹون بج اٹھی۔ ابراہیم نے ایک بار پھر موندی آنکھیں کھولیں اور اسے لگا کہ سعد آنے والا پیغام پڑھ کر بہت خوش اور پرجوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے سیل فون جیب میں ڈالتے ہوئے اٹھ کر ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"اچھا جگر! تو سو' تجھے مرغ کڑاہیوں کا خمار چڑھا ہوا ہے' میں چلتا ہوں۔"

"کدھر؟" ابراہیم نے نیند سے بوجھل آواز میں پوچھا۔

"ادھر ہی کہیں۔" سعد ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

ابراہیم واپس نیند میں جانے لگا اور آنکھوں کے ساتھ ساتھ بند ہوتے دماغ کو ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے کے لیے کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ سعد اس کے پوچھے سوال کا جواب نہ دینے کے لیے بات کو کتنی خوبصورتی سے گھما پھرا کر بدل گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ابراہیم کو اپنی حماقت پر غصہ آیا۔ دوسرے لمحے گہری نیند اس پر مکمل غلبہ پا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

دروازہ کھلنے پر سارہ نے پہلے کلاک کی طرف دیکھا' وقت چالیس منٹ آگے کھسک چکا تھا' پھر اس نے ڈبڈبائی نظروں سے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ سعد دروازے کے ساتھ لگا اپنے سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔

''میں خود... میں نے خود۔'' سارہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا چاہا۔ اس کی آواز گلے میں ہی گھٹ رہی تھی۔

سعد سہلاتے ہوئے اس کے قریب آیا۔ ''میں نے اِدھر...'' سارہ نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ اِدھر سے اُدھر...'' پھر اس نے کرسی کے بازو پر ہاتھ رکھا... ''میں خود اپنے آپ کو یہاں لائی۔''

اس نے فاتحانہ نظروں سے سعد کی طرف دیکھا' اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''اور میں اُدھر جانا چاہتی تھی مگر نہیں...'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

''اس سے آگے جانے کے لیے تم نے مجھے پکار لیا۔'' سعد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اور تمہاری پکار پر میں یوں چلا آیا۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اور کرسی کی پشت تھام لی۔ ''کہو تو کرسی سمیت اٹھا کر تمہیں کھڑکی کے قریب بٹھا دوں یا کرسی کو آگے دھکیلوں؟''

''بس ذرا سا زور لگانا پڑے گا۔'' سارہ نے اپنا بھیگا چہرہ اٹھا کر سعد کو دیکھا اور مسکرا دی۔

''کرسی کے بازو مضبوطی سے تھام لو۔'' سعد نے کرسی کی پشت پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اسے آگے دھکیلا اور یونہی نرمی سے کرسی دھکیلتا کھڑکی کے پاس لے آیا۔ کھڑکی کے پار برف پوش پہاڑ تھے جن پر سہ پہر کی ہلکی دھوپ پڑ رہی تھی۔ چناروں کے اونچے اونچے درخت تھے۔ نیچے جھانکنے پر سارہ کو سڑک نظر آئی' جس پر گاڑیاں اور لوگ رواں دواں تھے۔ آسمان سے پڑتی ہلکی پھوار سے سڑک بھیگ رہی تھی۔ لوگ چھتریاں بلند کیے سڑک کے اطراف بنی دکانوں میں گھستے نکلتے نظر آرہے تھے۔ چند ان ہی دکانوں کے چھجوں تلے کھڑے بارش رکنے کے منتظر نظر آتے تھے۔

''یہ سمجھو لوگ نہیں... زندگی رواں دواں ہے۔'' سعد نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ ''زندگی... جو جب تک ہے' رکتی نہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''میں اُدھر سے اِدھر آنے کے لیے سیمی آنٹی سے بھی کہہ سکتی تھی۔'' سارہ نے سر اٹھا کر کہا۔ ''لیکن میں چاہتی تھی کہ میری اس کوشش کو سب سے پہلے صرف تم دیکھو۔'' اس کے لہجے میں بچوں کی سی خوشی تھی۔

''آئی ایم آنرڈ۔'' سعد نے اپنی شرٹ کے کالر کھڑے کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''کیا خیال ہے اس کوشش کو دیکھتے ہوئے ایک عدد وہیل چیئر نہ لے آئیں؟'' اس شام رخصت ہوتے ہوئے سعد نے اچانک سارہ سے پوچھا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

''چلو' تم نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔'' سعد نے فوراً ''یہ تجویز خود ہی مسترد کر دی۔

''ایسی چیزوں کو دیکھ کر معذوری کا خیال بڑھنے لگتا ہے۔'' سارہ نے نیچی آواز میں کہا۔

''اوکے۔'' سعد نے شانے اچکائے اور جانے کے لیے دروازہ کھولا۔

''آئی ایم سوری سعد!'' سارہ نے پیچھے سے کہا۔

''نیور مائنڈ۔'' وہ ادھ کھلے دروازے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا کر بولا۔ ''اللہ حافظ!''

سارہ نے اس کے پیچھے بند ہوتے دروازے کو دیکھا اور پھر اپنے آپ پر نظر ڈالی۔

سعد کے اصرار پر سیمی آنٹی نے اس کے کپڑے بدلوائے تھے اور بال برش کر کے سمیٹے تھے۔ اس کے بیڈ پر نئی چادر بچھی تھی اور سرہانوں کے غلاف بھی نئے تھے۔ اس نے بہت دنوں بعد سکون سے تکیے پر سر رکھا تھا۔ اس رات اسے لگا' زندگی بانہیں کھولے اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ زندگی مسکرا بھی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''ع کو حلق سے نکالو یار محمد! یہ اردو کا عین نہیں عربی کا عین ہے۔''

مولوی سراج سرفراز نے زور زور سے ہل ہل کر قرآن پاک کا سبق یاد کرتے بچوں میں سے ایک کو چھڑی کی نوک چبھو کر ٹوکتے ہوئے کہا' تب ہی ان کی نظر کمرے میں لگی دیوار گیر گھڑی پر پڑی' بچوں کا پڑھنے کا وقت ختم ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اس روز مولوی صاحب کو اپنا جسم گرم اور دکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے موٹی چادر اپنے ارد گرد لپیٹی اور ہاتھوں کو سردی کی شدت سے بچانے کے لیے ہاتھ بھی چادر کے اندر کر لیے۔

صبح فجر کی اذان دینے سے پہلے جب وہ مسجد میں آکر صحن میں لگی ٹونٹیوں میں سے ایک کو کھول کر برف جیسے ٹھنڈے پانی کی دھار کے نیچے وضو کر رہے تھے تو بری طرح کپکپا رہے تھے۔ پانی جیسے ان کے ہاتھوں' پاؤں اور چہرے کو کاٹ رہا تھا' مگر وہ دل ہی دل میں خود سے گفتگو کر کے اپنا ایمان مضبوط کر رہے تھے۔

''مومن کا ایمان سردی' گرمی کی فکر میں نہیں پڑتا' نہ اسے دھوپ کی تپش کا احساس ہوتا ہے' نہ کہرے کی سردی کا۔ وہ اپنا عمل اپنے اللہ کی قربت اور ایمان پر استقامت کے لیے جاری رکھتا ہے۔ کیا ہم ان زمانوں کی آزمائشوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جب اہل ایمان کو ننگے پنڈے تپتی ریت پر لٹا کر ان کے اوپر پتھر رکھ دیے جاتے تھے؟ جب ان کو مختصر جگہ پر محصور کر کے پتے کھا کر گزارہ کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا' وہ اہل ایمان... جو اللہ کی راہ میں اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایما پر اپنے گھربار چھوڑ کر انجانے علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے... ان سے ہم خاک پاؤں کا کیا مقابلہ...؟''

مولوی سراج سرفراز ٹھٹھرتے ہوئے وضو کرتے جا رہے تھے اور اپنے ایمان پر استقامت کی خاطر دل میں سوچتے جا رہے تھے۔ اذان دینے تک کوئی شخص بھی مسجد میں نہیں پہنچا تھا۔

''الصلوٰۃ خیر من النوم'' (نماز نیند سے بہتر ہے)

مولوی صاحب نے دو مرتبہ دہرایا' مگر نیند کے ماتوں کو ان کے یہ الفاظ مدہوشی کی نیند سے نہ جگا سکے۔ اذان سے فارغ ہو کر مولوی صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ صفیں خالی تھیں اور ٹونٹیوں سے پانی گرنے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔

''استغفراللہ' استغفراللہ'' مولوی صاحب دل ہی دل میں ورد کرتے صفوں کی طرف چلے۔ اپنے پیچھے خالی صفوں کی امامت کرنے کی نیت سے وہ اپنی جگہ پر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے اکا دکا لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے مولوی صاحب نے نیت کی دعا پڑھنے کے بعد اپنے ہاتھ کانوں تک بلند کیے۔

''اللہ اکبر۔'' اپنے پیچھے انہیں چند آوازیں تقلید کرتی سنائی دیں۔ پھر مولوی صاحب پوری یکسوئی سے نماز میں مصروف ہو گئے۔ فرض ادا کرنے کے بعد انہوں نے دائیں بائیں سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ دعا کے

بعد وہ اپنے عقب میں بیٹھے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آپ حضرات ذرا جلدی آنے کی کوشش کیا کریں۔ نماز میں تاخیر بھی عمل کی سپیدی پر دھبہ ڈال دیتی ہے۔" مولوی صاحب نے اپنی خضاب لگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ان کے دو' چار مقتدیوں میں سے ہر ایک کے پاس اس تاخیر کی اپنی اپنی وجوہات تھیں۔ مولوی صاحب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے' وجوہات سنتے ہوں ہوں کرتے جواب دے رہے تھے اور ان کا جسم کپکپا رہا تھا۔

نمازیوں کے رخصت ہونے کے بعد مختصر سوئیٹر پہنے۔ گرم چادریں اوڑھے' ٹھٹھرتے کانپتے بچے اور بچیاں ناظرہ قرآن کا درس لینے آنا شروع ہوئے۔ بچوں کو سبق دیتے ہوئے مولوی صاحب کا جسم گرم ہونے لگا اور انہیں لگا' جسم بری طرح ٹوٹ رہا ہو۔ بچوں کے رخصت ہونے تک مولوی صاحب کے بخار کا گراف خاصا اونچا ہو چکا تھا۔ وہ خود کو بمشکل اٹھا کر کھانستے ہوئے اپنے گھر کی طرف چلے۔ جہاں ان کی اہلیہ جگت بھین جی رابعہ کلثوم' ان کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

"آج تو بخار نے پوری طرح لیا۔" گھر پہنچ کر ڈیوڑھی میں بندھی بکریوں کو چارا کھلاتی رابعہ کلثوم سے انہوں نے کہا اور بدقت چلتے کمرے تک پہنچے۔ جہاں ان کا بستر اور گرم رضائی ان کی منتظر تھی۔

رابعہ کلثوم' ان کے پیچھے ہی گئیں۔ انہوں نے فکرمندی سے مولوی صاحب کے ماتھے پر ہاتھ رکھا' جو بری طرح تپ رہا تھا۔

"اتنے دنوں سے کہہ رہی تھی' ڈاکٹر صاحب کو جا کر دکھائیں اور ڈاکٹری دوائیں کھائیں۔ آپ حکیم جی کے پیچھے لگے معجون اور جوشاندے کی پڑیوں پر گزارا کرنے پر بضد تھے۔ اب جو بخار لمبا ہو گیا تو نہ جانے کتنے دن ٹھپ رہے گا کاروبار زندگی!" رابعہ کلثوم ناراض لہجے میں بولیں۔

"مجھے جوشاندے کا پیالہ دے دو گرم گرم اور سعالین کی دو نکیاں بھی۔" مولوی صاحب نے رضائی اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔ آپ کی ضد نہیں جائے گی۔" رابعہ کلثوم بڑبڑاتے ہوئے صحن میں نکل گئیں۔ "مگر لکڑیوں کی آگ جلا کر جوشاندے کی دیگچی اس پر رکھتے ہوئے رابعہ کلثوم سوچ رہی تھیں۔" مولوی صاحب بھی کیا کریں۔ ڈاکٹری علاج کے لیے اتنے پیسے چاہئیں۔ حکیم صاحب دس' بیس روپوں میں دو دن کی دوا دے دیتے ہیں ہوالشافی کہہ کر۔ ہاتھ سے منہ تک نوالہ لے کر جانے کی مشکل میں گرفتار بندہ حکیم صاحب کو ترجیح نہ دے تو کیا کرے۔"

جوشاندے میں ابال آنے پر رابعہ کلثوم نے چولہے سے لکڑی کھینچ دی اور پیالے میں جوشاندہ چھاننے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"پڑھائی اور پڑھائی سے متعلقہ ریسرچ اپنی جگہ مگر مجھے یوں شہر شہر' گاؤں گاؤں ریسرچ کے نام پر تمہارا خوار ہونا بالکل بھی پسند نہیں ہے۔"

فائزہ نے معمول سے سخت لہجے میں ماہ نور سے کہا' جو اسلام آباد جانے کے لیے اتنی پرجوش نظر آ رہی تھی کہ ممی کی متوقع نہ کو ہاں میں بدلوا کر اٹھنے کا تہیہ کر کے ان کے پاس آئی تھی۔

"ممی! پروگریس کرنے کے چانسز تو ایسے ہی بڑھتے ہیں۔" ماہ نور نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو جن لوگوں کے پاس یوں لور لور پھرنے کا وقت نہیں ہوتا' وہ پروگریس نہیں کرتے کیا؟" فائزہ نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرا کام ہی ایسا ہے۔" ماہ نور نے ایک اور وجہ گھڑی۔ "ذاتی مشاہدہ اس کی بنیادی شرط ہے۔"

"تمہارے پاس انٹرنیٹ کے ذریعے ہر چیز تک رسائی کی سہولت موجود ہے۔" فائزہ نے اس کی دلیل رد کردی۔

"ممی! انٹرنیٹ' چیزوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان کی ہسٹری بتا دیتا ہے۔ ان پر ہوتی ریسرچ دکھا دیتا ہے۔ مگر انٹر نیٹ ان کو لائیو نہیں دکھاتا۔ ہمیں کسی جگہ کے متعلق سیکھنے کے لیے وہاں موجود ہونا چاہیے۔" ماہ نور ہار نہ ماننے کی قسم کھا کر آئی تھی۔

"اور سب سے بڑی بات!" ماہ نور نے فوراً" ہی ایک اور مضبوط وجہ گھڑی۔ وہاں جانے سے میری چار گمنام چارکول پینٹنگز کو تشہیر ملنے والی ہے۔ ممی ایکسپوزر ہوگا تو کام آگے بڑھے گا نا۔ اس سے زیادہ سنہری موقع مجھے کب مل سکتا ہے؟"

"ہاں یہ پوائنٹ تو ہے۔" بابا جو کب سے بظاہر نیوز ویک کے مطالعہ میں مشغول نظر آرہے تھے' نے اس گفتگو میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"جو ہنر اور قابلیت اس کے پاس ہے اس کو منوانے' اس پر کام کرنے کے مواقع حاصل کرنے اور خود کو سامنے لانے کے لیے اسے اِدھر اُدھر نکلنا تو پڑے گا ہی۔"

"تو اور کیا؟" ماہ نور نے زور و شور سے سر ہلاتے ہوئے بابا کی بات کی تائید کی۔

"آپ کو پتا بھی ہے کہ صابرہ بھابھی اس کی گاؤں کی مصروفیت کے بارے میں کیا بتا رہی تھیں؟" فائزہ نے خفگی سے کہا۔

"ارے اس بات کو تو میں نے بہت انجوائے کیا تھا۔" بابا ہنسے۔ "میں جب چھوٹا تھا مجھے بھی میلے ٹھیلے' تماشوں والے' چمٹا بجا کر گانے سنانے والے بڑے پسند تھے۔ میں ابا جی سے پیسے لیتا تھا۔ تختی یا کسی کتاب کے لیے اور اماں سے بہانہ بنا کر گاؤں میں ہونے والے میلوں میں پھرتا رہتا تھا۔"

"ہونہہ!" فائزہ نے نخوت سے سر جھٹکا۔ "آپ بھی اندر سے پینڈو ہی رہے عمر بھر اور اب یہ بچے بھی۔"

"ارے فائزہ بی بی! ہمارا یہ سب نخرہ شخرہ تو سب آپ کی بدولت ہے' ورنہ ہم نے تو ایک عمر درختوں سے کوؤں کے انڈے چراتے گزار دی۔" بابا نے ممی کے اپنی زندگی میں کردار کو سراہتے ہوئے کہا۔

"چلو۔۔۔ ٹھیک ہے بھئی ماہ نور۔۔۔ تم تیاری پکڑو اسلام آباد کی۔" بابا نے ممی کے ذرا سے اچھے موڈ کو دیکھ کر جھٹ پٹ فیصلہ داغا۔

"تم فرقان کو فون کر دینا۔ ماہ نور اسی کے پاس ٹھہرے گی نا!" پھر وہ فائزہ سے مخاطب ہوئے۔ یوں جیسے بحث ختم ہو چکی ہو۔

"مگر میں تو شاہ بانو کے ساتھ جا رہی ہوں۔" ماہ نور منمنائی۔

"شاہ بانو کے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت تمہیں ہرگز نہیں ملے گی۔" ممی نے فوراً" منع کرتے ہوئے یہ عندیہ بھی دے دیا کہ وہ اس کے اسلام آباد جانے پر راضی ہو گئی تھیں۔

"مگر فرقان ماموں کا گھر اور شاہ بانو کے بھائی کے گھر میں فاصلہ بہت زیادہ ہے' میں کیسے مینیج کروں گی۔"

"وہ جو تمہاری دوست ہے۔" ممی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جو تمہیں اتنے جوش و خروش سے ساتھ لے جانے پر مصر ہے۔ وہ خود ہی کوئی بندوبست کرلے گی اس کا بھی۔"

ممی نے ٹیبل پر بکھرے اپنے کاغذات سمیٹے اور اسٹڈی روم کی طرف چل دیں۔

"غنیمت جانو!" ممی کے جانے کے بعد بابا نے نیوز ویک ہاتھ سے رکھتے ہوئے ماہ نور کی طرف مسکرا کر دیکھا کہ اجازت مل گئی۔"

"بابا! آپ کبھی کھل کر ممی سے ہمارے لیے بات نہیں کرتے۔" ماہ نور نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"بھئی' میں رشتوں میں اور گھر میں طاقت کے توازن کا بڑا سخت حامی ہوں۔" بابا نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "تم لوگوں کی تربیت' پڑھائی' دوسری ضروریات' ہر چیز میں تمہاری ماں کا کردار مجھ سے زیادہ اہم رہا ہے اور یہ فطری بات ہے۔ یہ پاور میں ہے' اس کا حصہ مجھ سے زیادہ ہونا چاہیے۔"

"لیکن بالآخر بات تو آپ اپنی ہی منواتے ہیں۔" ماہ نور باپ کی بات کو سمجھتے ہوئے مسکرائی۔

"اس کو ڈپلومیسی کہتے ہیں۔" ان کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ ابھری۔

"پتا ہے کیا بابا!" ماہ نور نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے اور سردار چاچا سے بہت متاثر ہوں اور میں اکثر آپ دونوں کی شخصیات کا تقابلی جائزہ بھی لیتی رہتی ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔" بابا نے چونکتے ہوئے کہا۔ "پھر کوئی نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے یا نہیں۔"

"ایک نتیجہ تو بالکل اخذ ہوتا ہے۔" ماہ نور نے جواب دے کر اپنے ہونٹ بھینچے۔

"کیا؟" بابا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کہ آپ دونوں کی زندگیوں کی جہتیں کوئی بھی ہوں' لائف اسٹائل کتنا بھی مختلف ہو' آپ دونوں کی شخصیتوں کی کچھ خصوصیات بالکل ایک جیسی ہیں۔"

"اور اس کی وجہ "بے جی" ہیں۔ بے جی کے بتائے ڈو اور ڈونٹ۔ کیا کرنا چاہیے' کیا نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی شخصیت کی انکساری' عاجزی اور نرمی' آپ دونوں کی شخصیات میں گندھ چکی ہے' آپ دونوں ان عناصر کو اپنے خمیر سے نکالنا چاہیں بھی تو نہیں نکال سکتے۔"

"نیچرلی' بٹ نیچرل' یہ تو فطری سی بات ہے۔" بابا اس کی بات سے کچھ خاص متاثر نہیں ہوئے۔ "ماں کی شخصیت کے اثر کی تو میں نے تمہارے سلسلے میں بھی کچھ دیر پہلے مثال دی ہے۔"

"لیکن عظمیٰ پھوپھو تو ایسی نہیں ہیں۔" ماہ نور نے ان کی بات مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ وہ میاں جی' کی جلادی شخصیت کا اثر پکڑ گئیں۔" ماہ نور شرارت سے مسکرائی۔ "وہ خاتون ہیں اور آپ نے دیکھ ہی رکھا ہے کہ ان کا خالد انکل اور اپنے بچوں پر کیا مضبوط ہولڈ ہے۔"

"ہاں بھئی یہ تو ہے۔" بابا نے اتفاق کیا۔

"ان کو بے جی کی انکساری' عاجزی اور نرمی چھو کر بھی نہیں گزری۔" ماہ نور نے فاتحانہ نظروں سے بات کو دیکھا۔

"اگر تم کو کل سہ پہر نکلنا ہے تو پھر چلو اٹھو' تمہارے بازار والے کام کر آئیں۔" ممی نے اسٹڈی روم سے نکل کر کہا۔ "تم نے کٹنگ کرانی ہو گی اور جوتے بھی لینے ہیں' ایک دو نئے پل اوورز اور اسکارف بھی لے لینا' چلو اٹھو جلدی کرو۔" ممی چٹکی بجا کر ماہ نور کو اٹھنے کا اشارہ دیتے ہوئے اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئیں۔

"دیکھا تم نے!" بابا نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "یہ ہوتی ہے مدرہڈ (مامتا) کہاں اجازت دینے میں تامل تھا کہاں تمہاری تیاری کی فکر ہے۔"

"لکی آئی ایم۔" ماہ نور ہنستے ہوئے اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

☼ ☼ ☼

"خیریت آج اتنی صبح تمہارا ظہور کیسے ہو گیا؟ سورج نے اپنا رخ بدلا یا تم نے اپنے کمرے کی سیٹنگ بدل لی؟" بلال نے ناشتے کی میز پر پہلے سے موجود سعد کو دیکھ کر کہا۔

”سورج تو خیر ابھی نکلا ہی نہیں اور کمرے کی ترتیب بھی ویسی ہی ہے۔“ سعد کے چہرے پر چھائی سنجیدگی ایک لمحے کے لیے بلال کو چونکا گئی۔

”کچھ ایسا ہے کہ میری دسترس میں موجود وقت بتانے کا ہر ذریعہ ایک ہی وقت پر رک سا گیا ہے۔“ سعد کی اگلی بات نے ان کی حیرت دور کردی۔

”اوہ! گویا وقت منجمد ہو گیا تمہارے ہاں!“ انہوں نے بے فکری سے سرہلایا اور کرسی پر بیٹھ کر ٹوسٹ اٹھایا۔

”یوں ہی سمجھ لیں۔“ سعد نے مارجرین کاٹن ان کی طرف بڑھایا۔

”وقت کیا کہہ رہا ہے تمہیں... کب پگھلے گا؟“

”اس کی کچھ شرائط ہیں۔“ سعد ہنوز سنجیدہ تھا۔

”میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ بلال نے دوسرا ٹوسٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اس کا کہنا ہے کہ تبدیلی ضروری ہے' روٹین سے آف ہونا درکار ہے' مداخلت کی گنجائش نہیں' آزادی کی یقین دہانی کرائی جائے۔ اکاؤنٹس' اکانومی' نفع' نقصان پر چیک نہیں ہو گا۔“ سعد نے اپنے کپ میں گرم قہوہ انڈیلتے ہوئے کہا۔

”ہوں!“ بلال نے غور کرتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر یہ سب افورڈ ایبل نہ ہو تو؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے بلال کی طرف دیکھا۔

”تو پھر وقت منجمد ہی رہے گا۔ وہ کسی اور کام کے لیے بھی نہیں پگھلے گا۔“

”وقت بہت بڑا بلیک میلر نہیں لگتا؟“ بلال نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اسے ہونا پڑتا ہے۔“ سعد نے ترچھی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ورنہ انسان جس بے دردی اور سفاکی سے اسے گزارتا چلا جاتا ہے' وقت مزاحمت نہ کرے تو انسان اسے اپنے پیروں تلے روند کر رکھ دے۔“

”ہوں!“ بلال نے سرہلایا۔ ”اسی لیے شاید... یہ کہا جاتا ہے کہ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔“

”بالکل!“ سعد نے اسی سنجیدگی سے سرہلایا۔ ”وقت کروٹ بدلتا ہے تو انسان ہڑبڑاتا ہے' ورنہ تو وقت کو سیدھا لٹا کر انسان اس پر سے یوں گزرے اور پہنچ جائے نو ٹائم زون میں۔“ سعد نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

”کتنا آف مانگ رہا ہے یہ وقت۔“ بلال نے گھڑی پر نظر ڈال کر بات کو ختم کرنے کی کوشش کی' ان کا ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔

”ایک مہینہ کم از کم!“ سعد نے یوں شانے اچکا کر کہا جیسے یہ بہت معمولی سی بات ہو۔

”گزشتہ رپورٹس بہت اچھی ہیں وقت کے مصرف کی' اس لیے اعتراض بنتا نہیں۔“ بلال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اپنی دسترس میں موجود وقت بتانے کے ہر ذریعے سے کہہ دینا گرانٹڈ۔“

بلال نے اپنا بریف کیس اٹھایا ”ویسے یہ بڑی بلیک میلنگ ہے۔“ انہوں نے جاتے جاتے مڑ کر کہا۔

”خود ہی تو اپرچونیٹی کوسٹ اور اکانومک چوائس کا فرق پڑھاتے رہے ہمیشہ... اب میری ترجیح اپرچونیٹی کوسٹ بن جائے تو کیا کیا جائے۔“

سعد نے جواب دیا اور اپنا پسندیدہ گانا گنگناتا ہوا اٹھا۔ کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے ٹیبل پر رکھی ٹوکری سے ایک تازہ سرخ سیب اٹھایا اور اسے ہوا میں اچھالتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

”اس رکی کو تو سدا سے منفرد نظر آنے کا شوق ہے۔ سوراخ دار لے فوم بال پر سرخ ہی نہیں' کیسری رنگ بھی

پینٹ کرتا ہے اور ہونٹوں کی سپیدی پر نیلی لائنیں لگا کر' وگ کے لیے ہرے اور نیلے رنگوں کے ساتھ فاختائی رنگ کی آمیزش بھی کرلیتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی وگ قوس قزح کے رنگوں میں رنگی نظر آتی ہے۔ سب منفرد نظر آنے کے شوق کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔“

”پری! تمہیں ہر ایک کی ہر بات بری لگتی ہے' کبھی کسی کے کسی کام کی تعریف بھی کردیا کرو... رکی سرکس کا جوکر اس لیے نہیں بنا تھا کہ اسے کمانے کے لیے کام چاہیے تھا۔ رکی کو تو بس کچھ ایسا کرنا تھا جس سے وہ لوگوں کو ہنسا سکے' ان کے چہروں پر مسکراہٹ لا سکے۔ تم نے دیکھا نہیں' رکی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تماشائیوں کے چہروں کو صرف دیکھتا ہی نہیں' ان پر غور بھی کرتا ہے۔ وہ اس مسکراہٹ کی' چہرے کی اس خوشی کی تلاش میں ہے' جو اسے اطمینان دلا دے کہ وہ روح کو خوش کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔“

”سرکس چینیوں کے ہاں مقبول ہے' یہ رکی کم بخت جاپانی ہے۔ اسے سرکس میں کیا دلچسپی۔“

”پریا اور میری پیاری پری! رکی غریب ماں باپ سے بچھڑا بچہ ہے۔ اسے اپنے چینی' جاپانی' پاکستانی ہونے سے کچھ غرض نہیں۔ وہ تو ہم اس کی چپٹی ناک اور چیاں چیاں آنکھوں کو دیکھ کر اسے کبھی چینی' کبھی جاپانی سمجھتے رہتے ہیں۔“

”نہیں جی۔ جاپانیوں کی ناک گول اور ذرا سی اٹھی ہوتی ہے۔ چینی چپٹے ہوتے ہیں۔ صاف جاپانی لگتا ہے۔ چینی فرض کرنا حماقت ہے۔“

”چلو پھر جاپانی ہی سہی... اسے اس بات کے نمبر تو دے دو کہ وہ اپنا کام ڈوب کر کرتا ہے۔“

”ہونہہ! یہ کون سا مشکل کام ہے' مجھے دو اس کا کام۔ چٹکیوں میں کر کے دکھا دوں۔ لاؤ اس کے اسٹارز اینڈ اسٹرائپس والے بڑے بڑے بوٹ مجھے دو' میں انہیں پہن کر اس کی یونی سائیکل گھنٹہ بھر مسلسل چلا کر نہ دکھاؤں تو میرا نام بدل دینا۔“

”اور نہ دکھا سکو تو پھر تمہارا نام کیا رکھا جائے بدل کے... پری سے چڑیل یا پھر' چھل پیری؟“

”اور وہ جو اتنی مہارت سے پلیٹیں ہوا میں اچھال اچھال کر پکڑتا ہے یوں جیسے پیسہ کما رہا ہو پلیٹوں کا۔ مجھے صرف دو دن دو... میں پلیٹیں' ڈونگے' ڈشیں اور چمچے سب اسی طرح اچھال اچھال کر پکڑ لوں۔ اس کے بدلے اس سے بولو' مجھے دس منٹ صرف دس منٹ تاروں پر چل کر دکھائے' راڈز پر لہرا کر واپس آئے؟“

”پری او پری! رکی نے کبھی یہ دعوا ہی نہیں کیا کہ وہ یہ کرتب کر سکتا ہے۔ رکی تو صرف مسخرہ بننے کے لیے آیا تھا' تو بس وہ صرف مسخرہ ہے۔ یہاں تو سب ہی اپنا اپنا کام کرتے ہیں' کوئی دوسرے کا کرتب کیسے کرے بھلا۔“

”تو پھر میرے کرتب کیوں بدل دیتے ہو... کبھی تاروں پر چلاتے ہو' کبھی سوئیوں کے بستر پر لٹا دیتے ہو اور جب ملکہ بیمار پڑ گئی تھی تو سانپوں والا کرتب بھی میرے متھے لگا دیا۔ ٹھیک ہے جب سب اپنا اپنا کام کر رہے ہیں تو خبردار! جو مجھے موٹر سائیکل چلانے کو کہا کسی نے گول چکر میں۔“

”اوہو پریا... بھولی پری' غصیلی پری' ضدی پری تُو تو سرکس کی رانی ہے' ملکہ ہے اس سلطنت کی۔ تُو تو جم پل ہے سرکس کی۔ تیرا کسی سے کیا مقابلہ۔ تُو تو وہ بھی کر سکتی ہے' جو پہلے کبھی کیا نہ ہو تو نے بھی۔“

”کیا باقی ہے' جو نہ کیا ہو۔“

”اے پریا رانی... تُو کبھی رسالے دیکھ روس کے' چین کے سرکسوں کے۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں تیری۔“

”لاؤ مجھے دکھاؤ' میں صرف تصویریں دیکھ کر نہ کر کے دکھاؤں تو نام بدل دینا۔“

”رسالے تو ایک ہی بندے کے پاس ہیں۔“

”کس کے پاس؟“
”رکی… تمہارے جاپانی مسخرے کے پاس۔“
”رکی‘ رکی… ابھی جاکر پوچھتی ہوں اس سے۔ رکی‘ رکی… !کہاں ہو تم؟“
”رکی‘ رکی…!“ اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ ”رکی دیکھو! میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہی ہوں۔ تمہارا چہرہ نظروں سے اوجھل کیوں ہے‘ تمہاری ایک پیلی ایک سبز ٹانگ والی پتلون‘ تمہارا دھاری دار کوٹ‘ کوٹ کے نیچے نکلتا پاجامہ‘ تمہاری لمبی نقلی ناک تمہاری رنگ برنگی وگ‘ تمہارے سفیدی سے پھیلے ہوئے ہونٹ‘ تمہاری رنگ برنگ پینٹ کی ہوئی آنکھیں‘ سب مجھے نظر آرہی ہیں۔ مگر تم کہاں ہو… تم تو کہیں بھی نہیں ہو… تمہاری آواز بھی مجھے سنائی دے رہی ہے۔ تم مجھے پکار رہے ہو…“
”سارہ… سارہ…! خیال سے۔ تمہاری ایڑی گھوم گئی ہے تمہارے ٹوز غلط جگہ ٹک گئے ہیں۔ سارہ… سارہ خیال سے… ارے کوئی ہے… کوئی مدد کرنے والا… شی از فالنگ… وہ گر رہی ہے… وہ گر رہی ہے…“
”رکی! رکی…! تمہاری آواز مجھ تک پہنچ رہی ہے‘ مگر تم مجھے نظر نہیں آرہے۔“
”رکی‘ رکی!“ اس کی چیخیں کمرے کی حدود سے باہر نکلنے لگیں۔ دو منٹ کے بعد سیمی آنٹی کمرے کی لائٹ جلا کر اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ کمرے کی تاریکی دور ہوتی محسوس کرکے اس نے اپنی مضبوطی سے بند کی آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے وہی کمرا تھا‘ وہی درودیوار جن میں وہ دن کے چوبیس گھنٹے رہتی تھی اور وہی سیمی آنٹی جو اپنی نیند کے متاثر ہونے پر سامنے کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔
”رکی‘ رکی… کہاں ہو تم؟“ ایک سسکی کے ساتھ جملہ اس کے منہ سے نکلا اور ماضی سے اس کا ناتا ٹوٹ گیا‘ وہ حال میں موجود تھی۔
”سلیپنگ پلز لینا بھول گئیں تم شاید۔“ سیمی آنٹی نے خشک لہجے میں کہا۔
اس نے جواب میں سیمی آنٹی پر ایک اجنبی نگاہ ڈالی اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔
”رکی کو اب کیا یاد کرتی ہو؟“ سیمی آنٹی نے اسی کھردرے لہجے میں اسے یاد کرانے کی کوشش کی۔ ”بھولے سے پلٹ کر کسی کتے‘ بلی تک نے تو نہیں دیکھا …. رکی تو سیلانی بندہ ہے۔ بلیو ہیون سرکس کے ساتھ ساتھ شہر شہر‘ قصبہ قصبہ پھرتا‘ موجیں اڑاتا‘ ہنستا ہنساتا‘ ہزاروں لوگوں سے ملتا‘ ہزاروں چہرے دیکھتا… اسے یاد رہا ہوگا کہ…“
”بس کریں۔“ سارہ نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر ناراض نظروں سے سیمی آنٹی کی طرف دیکھا۔
”چلو‘ میں بس کردیتی ہوں۔“ انہوں نے بازو دائیں بائیں لٹکا کر شانے اچکائے۔ ”اگر تمہاری تسلی اس سے ہوتی ہے تو۔“
”لائٹ بند کردیں‘ مجھے نیند آرہی ہے۔“ سارہ نے بازو دوبارہ آنکھوں پر رکھ لیا۔
”ایک شرط پر۔“ وہ بازو سینے پر باندھتے ہوئے ڈیل کرنے لگیں۔ ”نو رکی شو اگین۔“
”آپ جائیں پلیز…“ سارہ نے ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ کلک کی آواز کے ساتھ لائٹ بند ہوئی اور کمرے میں دوبارہ تاریکی پھیل گئی۔
”زندگی‘ دن کو رات اور رات کو دن میں بدل بدل کر نہیں گزارنی۔ زندگی کا دن ایسے گزارو کہ رات خواہش کرے‘ میں اس کامیاب انسان کے لیے بازو وا کروں اور اسے اپنی آغوش میں لے لوں‘ میں اسے اپنے پروں میں سمیٹ کر تھپکوں اور یہ تھکا ہارا انسان مزے سے سو کر اپنی تھکن دور کرے اور دن بے چین ہو کہ کب رات کی تاریکی چھٹے اور یہ کامیاب انسان میری روشنی میں اپنے کام میں مصروف ہوجائے۔“ سارہ کے کانوں میں اٹکتی اردو

میں بولے گئے یہ لفظ گونجے۔
”تم تو ایسے ہی ہو گے رکی… ! رات تمہیں خوش آمدید کہتی ہوگی اور دن تمہاری طرف لپکتا ہوگا۔“ اس نے سوچا اور زور سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ مزید سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

”تم اسلام آباد جارہی ہو تو فلزا ظہور سے ضرور ملنا‘ بہت کمال کی آرٹسٹ ہے۔“ فاطمہ نے مگ میں کافی پھینٹتے ہوئے ماہ نور سے کہا‘ جو فاطمہ اور خدیجہ سے ملنے ان کے گھر آئی تھی۔
”فاطمہ آنٹی! مجھے ڈرائنگز اور پینٹنگز میں کچھ خاص دلچسپی نہیں ہے‘ وہ تو صوفی خالہ نے مجھے کینیڈا سے چار کولز کا ایک سیٹ بھیجا تھا جس کے ذریعے میں نے کینوس پر طبع آزمائی کرڈالی۔“ ماہ نور نے صاف گوئی سے کام لیا۔
”ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ بڑے بڑے مصور وغیرہ۔“
”فلزا ظہور کوئی بڑی آرٹسٹ تھوڑی رہی ہے۔“ فاطمہ آنٹی نے لکڑی کے نقشین جھولے پر جھولتے ہوئے کہا۔ ”بے چاری کوئلے کا ٹکڑا لے کر صحن کے پکے فرش پر تصویریں بناتی رہتی تھی ساری دوپہر‘ ہم اس سے کوئلہ لینے کے لیے بڑی منتیں کرتے تھے اس کی۔“
”آپ کوئلے سے کیا کرتی تھیں؟“ ماہ نور نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔
”ہمیں کیڑی کاڑا یعنی شٹاپو کا نقشہ بنانا ہوتا تھا‘ کبھی ہم اسکول سے چاک چرا لاتے تھے‘ چاک ختم ہوجاتے تو سلیٹ کی سلیٹیوں سے کام چلاتے۔ وہ بھی نہ مل رہی ہوتیں تو فلزا کی منتیں کرنی پڑتیں جس کے پاس کوئلہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔“
”وہ کوئلہ کہاں سے لیتی تھیں؟“ ماہ نور نے تجسس سے کہا۔
”ہم جس پرانے محلے میں رہتے تھے وہاں ایک بڑا سا آرا تھا۔“ فاطمہ نے اٹھ کر کافی میں ابلتا پانی ڈالتے ہوئے کہا۔
”آرا؟“ ماہ نور نے سوالیہ نظروں سے فاطمہ کو دیکھا۔
فاطمہ ہنس دیں۔ ”بھئی تم لوگوں کی وکیبلری بہت کم ہے۔ آرا مطلب وہ جگہ جہاں سے آگ جلانے کے لیے لکڑیاں ملتی تھیں۔“
”آپ لوگ لکڑیوں کی آگ جلاتے تھے؟“ ماہ نور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
”اور کیا!“ فاطمہ نے ماہ نور کو کافی کا کپ پکڑایا اور بھنے ہوئے نمکین کاجو کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔
”نا نہیں!“ ماہ نور نے ہاتھ کے اشارے سے کاجو کی پلیٹ لینے سے انکار کردیا۔ ”کولسٹرول کا خزانہ ہے یہ‘ میں نہیں کھاتی۔“
”تم سے زیادہ ویٹ کانشس لڑکی میں نے دوسری نہیں دیکھی۔“ فاطمہ قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔
”آپ کو کیا پتا میرا وزن مہینوں یا دنوں کے حساب سے نہیں‘ گھنٹوں کے حساب سے بڑھتا ہے اگر میں خیال نہ کروں تو۔“ ماہ نور نے منہ بنا کر کہا۔
”لڑکی! واک کی عادت ڈالو سارے مسئلے حل ہوجائیں گے۔“ خدیجہ نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
”آپ کا بڑا اسٹیمنا ہے خدیجہ آنٹی!“ ماہ نور مسکرائی۔ ”کل صبح میں نے آپ کو دیکھا۔ آپ کا بھاری اپر‘ اونی مفلر‘ ٹوپی‘ دستانے‘ فر والے بوٹ‘ کیا گولہ مولہ بنی آپ واک پر جارہی تھیں۔“
”میرے تو بھئی ٹانگوں میں خون رکنے لگتا ہے اگر میں واک نہ کروں تو۔“ خدیجہ نے پھینٹی ہوئی کافی ایک مگ

میں لے کر گرما گرم پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"اور واپسی پر چھینکیں ایسی کہ چھینکوں کا طوفان اٹھا ہو جیسے۔" فاطمہ نے اضافہ کیا۔

"خیر چھینکوں کا تو علاج ہے مگر ٹانگوں میں خون رکنے کا نہیں ہے۔" خدیجہ نے بے نیازی سے کہا۔

"اچھا فاطمہ آنٹی! آپ بتائیے۔ وہ آرے والا کوئلے کا قصہ تو درمیان میں ہی رہ گیا۔"

"ہاں!" فاطمہ نے خالی مگ میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تو بی بی! یہ جو سوئی کا مقام ہے نا جہاں پر گیس دریافت ہوئی تھی' اس کا نام ہم نے بھی اسی وقت سنا تھا' جب وہاں سے گیس دریافت ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ہر طبقے کے لوگ لکڑی' کوئلے یا پھر تیل کے چولہوں پر ہی گزارہ کرتے تھے۔"

"وہ آرا!" ماہ نور نے یاد دلایا۔

"ہاں ہاں تو اسی آرے پر ہر سائز کی لکڑی جلانے کو مل جاتی تھی' ایک طرف اس بندے نے کوئلے کا ڈھیر رکھا ہوتا تھا' تول تول کر کوئلے دیتا تھا' ہمارے گھروں میں کوئلہ نہیں جلایا جاتا تھا کیونکہ اس سے جو گیس پیدا ہوتی تھی' وہ صحت کے لیے مضر سمجھی جاتی تھی۔"

"پھر فلزا ظہور کے پاس کوئلہ کہاں سے آتا تھا؟" ماہ نور کی سوئی اسی ایک نقطے پر اٹک گئی تھی۔

"یہ ہی تو..." فاطمہ ہنس کر بولیں۔ "اس نے آرے والے سے بنا کر رکھی ہوئی تھی۔ ان کے گھر کا جو ملازم لکڑیاں لینے جاتا' یہ اس کے ساتھ چل دیتی اور ملازم لکڑیاں تلواتا' یہ کوئلے کے ڈھیرے کے گرد بکھرے کوئلے کے چھوٹے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر لفافے میں بھر لیتی۔"

"ہوں۔" ماہ نور مسکرائی۔

"اور پھر گرمیوں کی دوپہروں میں وہ کوئلے کے ٹکڑے جو شاہکار بنانے کے لیے معاون ثابت ہوتے' یہ ہم ہی جانتے ہیں۔" خدیجہ نے ہنس کر کہا۔

"کوئلے کی وجہ سے اس کی انگلیاں خراب ہوتیں' ناخن میلے ہو جاتے' کپڑوں پر' چہرے پر دھبے لگے ہوتے مگر اس کو پروا نہیں تھی۔ جو اس سے کہتے کہ بھئی کاربن پنسل استعمال کر لیا کرو یا کاغذ پر رنگین پنسلوں سے شکلیں بناؤ تو وہ صاف کہتی' مجھے ان کالی لکیروں سے محبت ہے' میں تو بھئی کوئلے کا استعمال ہی جاری رکھوں گی۔" فاطمہ کو جیسے پرانے دن یاد کرنے میں مزا آ رہا تھا۔

"ہم سب آگے پیچھے کی عمروں کی لڑکیوں نے میٹرک سائنس کے ساتھ کیا۔ فلزا ظہور نے آرٹس پڑھا' ہم ایف ایس سی کرنے چلیں۔ وہ فائن آرٹس پڑھنے لگی اور جب ہم سب ایف ایس سی میں ناکام ہو کر سر جھکائے آرٹس کے مضامین میں بی۔ اے اور پھر ایم۔ اے کر کے فارغ ہوئیں' فلزا ظہور نے کوئلے سے چارکول تک کا سفر کامیابی سے طے کر لیا تھا۔"

"لیکن میں نے کبھی ان کا نام نہیں سنا کہیں۔" ماہ نور نے تذبذب کا اظہار کیا۔

"کہاں سنتیں؟" فاطمہ ہنسیں۔ "جبکہ وہ تو کہیں اپنے کام کو ہائی لائٹ ہی نہیں کرتی۔ تم اسے پرانے محلوں کی گلیوں میں' پرانی تاریخی عمارتوں کے کونے کھدروں میں کینوس گود میں رکھے کام کرتے پاؤ تو پاؤ' کہیں نامور جگہ پر تو کوئی اس کو جانتا بھی نہیں۔"

"سنکی ہے۔" خدیجہ نے اٹھ کر مگ سمیٹتے ہوئے کہا۔ "یا تو بندہ کام کرے ہی نہیں' کرے تو تعریف' تنقید دونوں کے لیے پیش تو کرے۔ میں بالکل بھی اس کے آئیڈیے سے متفق نہیں ہوں۔"

"یہ جو ہوتے ہیں نا کلچرل شوز!" فاطمہ نے خدیجہ کے کمرے سے جانے کے بعد ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے

سرگوشی کی۔

"ان میں بھی جاتی ہے' اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہے وہاں' لیکن پیمانہ چھوٹا ہوتا ہے۔"

"ہائے۔" ماہ نور کو یہ بات سن کر مزا آیا۔ "مجھے ایسے ڈاؤن ٹو ارتھ لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ جن کو بس کام کی لگن ہوتی ہے' شہرت کی نہیں۔"

"کام سے تو سمجھو اس کو عشق ہے۔" فاطمہ نے ماہ نور کا ہاتھ دبا کر گویا اسے یقین دلایا۔

"عشق۔" ماہ نور نے یہ لفظ دہرایا اور اسے اچانک کچھ یاد آگیا۔

"فاطمہ آنٹی! عشق کتنی قسم کا ہوتا ہے۔" اس نے بغیر سوچے فاطمہ سے سوال کیا۔

"ان گنت قسمیں ہیں عشق کی۔" فاطمہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا یہ اچھی چیز ہوتی ہے۔" ماہ نور نے معصومیت سے پوچھا۔

"اچھی مگر خطرناک چیز ہے۔" فاطمہ نے اپنے لہجے میں ڈرامائی تاثر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں خطرناک کیوں؟" ماہ نور نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ عشق انسان کو بے خوف کر دیتا ہے' نتائج و عواقب سے بے پروا بندہ۔ آگا دیکھتا ہے نہ پیچھا۔ بس اندھا دھند زندگی گزارتا چلا جاتا ہے۔" فاطمہ نے آہستہ آہستہ سرہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا عشق بندے کی آواز میں سوز بھی پیدا کر سکتا ہے؟" ماہ نور کے ذہن میں کوئی بازگشت ہوئی تھی۔

"آواز میں سوز' اور دل میں گداز... اگر عشق سچا ہو تو سو فی صد پیدا ہو جاتا ہے۔"

"اس عشق کی نوعیت کیا ہوتی ہے' جو یہ دونوں خصوصیات پیدا کر دیتا ہے۔"

"کوئی بھی... حقیقی' مجازی۔"

ماہ نور نے گہرا سانس لیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ اس کے سامنے گزرے وقت کا ایک منظر رقصاں تھا اور اس کے ذہن میں ان گنت سوال تھے۔ فاطمہ ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی تھیں' اس کے ذہن میں اٹھتے سوالوں کے جواب کس کے پاس تھے' وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی۔

☼ ☼ ☼

فرقان ماموں کے ہاں ہر طرح کی سہولت ہونے کے باوجود اسے وہ آرام محسوس نہیں ہو رہا تھا' جو گاؤں میں سردار چاچا کے فارم اور ان کے گھر میں محسوس ہوا تھا۔ فرقان ماموں ایک سرکاری محکمے میں گریڈ بائیس کے ملازم تھے اور ان کے گھر کا ماحول ویسا ہی تھا جیسا گریڈ بائیس کے ملازموں کے گھروں کا ہو سکتا تھا۔ فرقان ماموں کے دونوں بچے امریکہ میں سیٹ تھے۔ سیما آنٹی پاکستان اور امریکہ ایک کیے رکھتی تھیں۔ گھر میں ملازمین کی فوج تھی' جو مفت میں موج کرتی پھرتی تھی۔

شاہ بانو اسے لینے کے لیے فرقان ماموں کے ہاں آئی تو گھر کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر ہنس دی۔

"واہ ماہ نور! تمہارے تو پیر زمین پر نہیں ٹکتے ہوں گے۔" اس نے کہا۔

جواب میں ماہ نور نے برا سا منہ بنایا۔ "سونے کے محل میں بند شہزادی والا حال ہے۔"

"اوہ... تم نے خود کو شہزادی فرض کر لیا۔" شاہ بانو ہنسی۔ پھر وہ جھرجھری لے کر بولی۔ "توبہ توبہ بھئی تم اس نمائش کی مصنوعی دنیا میں اتنے دن کیسے گزارو گی؟"

"یہ ہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔" ماہ نور روہانسی ہو کر بولی۔ "اس سے تو اچھا تھا میں یہاں آتی ہی نہیں۔"

"تمہاری اپنے ماموں سے ذرا بھی انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے نا!" شاہ بانو نے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔" ماہ نور نے گردن ہلا کر کہا۔ "یہ تو ممی کی ضد ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے، ورنہ ماموں سے خود ان کی بھی عمر بھر نہیں بنی، وہ بھی ماموں کو مصنوعی شخص کہا کرتی ہیں۔"

"چلو خیر ابھی تو چلو، باہر نکلتے ہیں۔" شاہ بانو نے اسے مایوسی سے نکالنا چاہا۔ "شاید تمہاری طبیعت بہل جائے۔" شاہ بانو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟" گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے ماہ نور نے شاہ بانو سے پوچھا، جو بڑی مہارت سے اپنے بھائی کی آلٹو ڈرائیو کر رہی تھی۔

"ہم نومیڈ آرٹ گیلری کی اسلام آباد والی برانچ کی طرف جا رہے ہیں۔" شاہ بانو نے گیئر بدلتے ہوئے جواب دیا۔ "سعید بھائی تمہارا نام رجسٹر کرا چکے ہیں نمائش کے لیے لیکن پھر بھی ہم ایک دفعہ کنفرم کر لیتے ہیں۔ ساتھ ایک نظر بھی ڈال لیتے ہیں گیلری پر۔"

ماہ نور کو یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے مصورہ بننے کا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا، ہاں اس کی ڈرائنگ شروع ہی سے بہت اچھی تھی، اتنی اچھی کہ میٹرک اور پھر ایف ایس سی کے دنوں میں اس کی تقریباً "سب سہیلیاں اپنی پریکٹیکل نوٹ بکس پر اس سے ڈایاگرامز بنوایا کرتی تھیں اور اس کے لیے وہ اس کی خوشامد بھی کر لیتی تھیں۔ لیکن اس نے کبھی سنجیدگی سے اپنی اچھی ڈرائنگ کو کسی تصویر کشی کے لیے استعمال کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ ایف ایس سی کے امتحان کے بعد جن دنوں وہ فارغ تھی، اس کی خالہ نے اسے ڈرائنگ میں استعمال ہونے والی چیزیں بھیجی تھیں جن میں کچھ پسٹلز، واٹر کلر پینسلز، اور چارکول ڈرائنگ شیٹس شامل تھیں۔ انہی دنوں اس نے چارکول پر جو طبع آزمائی شروع کی تو اسے لگا کہ وہ اچھی تصویر کشی کر سکتی تھی۔ جوش میں آکر اس نے تین ڈرائنگز بڑے کینوس پر بنا ڈالیں۔ شاہ بانو اور اس کی سہیلیاں اس کام سے کافی متاثر ہوئی تھیں لیکن میڈیکل کالج میں داخلہ نہ مل سکنے کی مایوسی کے دنوں میں اس کا تازہ تازہ جوش ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ چارکول ڈرائنگز کے کینوس اسٹور میں منتقل ہو گئے اور اس نے ممی کی ناراضی کے باوجود میڈیا اسٹڈیز میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بھی بابا ہی اس کے حق میں نامحسوس طریقے سے آگے آئے تھے اور انہوں نے خود جا کر اس کا داخلہ شہر کے ایک نامور کالج میں کروا دیا تھا۔ اس داخلے کے بعد پڑھائی شروع کرنے سے لے کر کچھ دن پہلے تک بھی اسے وہ ڈرائنگز یاد نہیں آئی تھیں اور شاید کبھی نہ آتیں، اگر شاہ بانو اسے ان کی یاد نہ دلاتی۔ اب کچھ دنوں سے وہ یہ سوچ سوچ کر محظوظ ہو رہی تھی کہ کیا خبر وہ تین ڈرائنگز اسے ایک اچھی مصورہ میں بدل دیں۔

"یہ رہا سیونتھ ایونیو اور آیا ہی چاہتی ہے نومیڈ آرٹ گیلری۔ اسلام آباد رہنے کے لیے بری جگہ نہیں ہے۔ کیا خیال ہے۔" کوئی موڑ مڑتے ہوئے شاہ بانو نے اسے مخاطب کیا۔

"ہوں۔" ماہ نور مسحور کن خیالوں میں کھوئی اچانک چونکی تھی۔ "کیا کہا؟" اس نے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔

"کہاں کھوئی ہوئی ہو محترمہ!" شاہ بانو نے خفگی سے کہا۔ "اتنے خوب صورت راستے میں آئے یقیناً" نہیں دیکھے ہوں گے۔"

"دیکھے ہیں۔ بہت منظم طریقے سے بنا ہوا شہر ہے۔" اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے تبصرہ کیا۔

"ویسے۔" اس نے گردن موڑ کر شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ "شہر خود بخود بنتے اور بگڑتے ہیں یا بنا کر بسائے جاتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔" شاہ بانو نے ایک عمارت کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "مجھے اتنی خبر ہے کہ شہر مجھے بسے بسائے ملے، میں ان کے ناموں سے واقف ہوں اور ان میں سے کئی خود اپنی نظروں سے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے سب شہر تقریباً" ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔"

وہ مسکرائی اور گاڑی پارک کر کے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ ماہ نور نے اپنی نظروں کے سامنے موجود عمارت پر نظر ڈالی، جس پہ "نومیڈ آرٹ گیلری" کا بورڈ آویزاں تھا۔

☸ ☸ ☸

سعدیہ کلثوم کی زندگی محدود اور اس کی دنیا خاصی مختصر تھی۔ وہ اپنے ماں، باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ سعدیہ کلثوم کو اپنی آنکھ کھولنے کے حالات تو قطعی یاد نہیں تھے۔ مگر جب اس نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنے اردگرد دنیا مختصر ہی نظر آئی۔ اس کے ابا اس زمانے میں بھی ایک چھوٹے سے قصبے کے ایک چھوٹے اور تنگ و تاریک محلے کی مختصر سی مسجد میں مولوی صاحب تھے اور وہ لوگ اسی مسجد کی چھت پر بنے دو مختصر سے کمروں میں رہائش پذیر تھے۔ ابا کا زیادہ وقت نیچے مسجد میں گزرتا اور اماں اس مختصر سی چھت پر دو ننھے منے کمروں کی صفائی ستھرائی، کھانا بنانے، کپڑے دھونے اور انہیں استری کر کے سنبھالنے کے کاموں میں دن سے رات تک مصروف رہتی تھیں۔ اس چھت سے ملحق کئی چھوٹی بڑی چھتیں تھیں، جن کے نیچے چھتوں کے سائز کے حساب سے ہی اونچی نیچی دیواروں پر کھڑے گھر موجود تھے۔ ان گھروں کے نقشے اور رہن سہن کیسا تھا۔

سعدیہ کو شاید اتنی خبر نہ تھی۔ اس کی دوستیاں اور تعلقات چھت سے چھت تک ہی محدود رہتے تھے۔ وہ اماں کو اپنے کاموں میں مصروف چھوڑ کر چھتوں کی درمیانی نیچی دیواریں ٹاپتی ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری چھت پر پہنچ جاتی۔ جہاں اکثر اسے اپنی ہی ہم عمر یا خود سے کچھ بڑی کچھ چھوٹی ہم جولیوں کی محبت میسر آتی تھی۔ وہ صبح سے شام تک ان ہم جولیوں کے ساتھ چھتیں ٹاپتی، دوڑتی، بھاگتی، شٹاپو، چھپن چھپائی، بندر کلہ اور گیٹیاں کھیلنے میں مشغول رہتی۔ اکثر اس کے جسم پر رنگ برنگ کپڑے ہوتے۔ شلوار پھول دار تو قمیص کسی ایسے رنگ کی جس رنگ کا کوئی پھول شلوار کے پرنٹ میں موجود نہ ہوتا۔ کبھی بدرنگی شلوار کے ساتھ کوئی پھول دار قمیص جس کے چاک کی سیونیں اکثر اونچی نیچی چھتیں ٹاپنے کے چکر میں ادھڑی رہتیں۔

محلے کی ایک خالہ نے کپڑے سینے کی سوئی کے ذریعے اس کے کانوں میں سوراخ کر کے کالے دھاگے پرو کر گرہ لگا دی تھی۔ اس کے کان کے یہ سوراخ کبھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔ اکثر پکتے رہتے اور ان میں سے پیپ دار مواد نکل نکل کر سوراخوں پر جمع رہتا۔ جسے چھیلنے میں اسے بڑا مزا آتا۔ اماں اسے اس بات پر بری طرح جھڑکتیں، کیونکہ مواد چھیلے جانے پر زخموں سے خون بہنے لگتا۔ مگر سعدیہ کو زخم چھیلنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اس کا ہاتھ خود بخود کانوں کی طرف جاتا اور پل بھر میں اس لیس دار مواد کو جو کبھی تو تازہ اور گیلا ہی ہوتا، پل بھر میں ادھیڑ دیتا۔ کانوں کے یہ زخم کافی عرصہ اس کے ساتھ رہے تھے اور کب ٹھیک ہوئے تھے، یہ سعدیہ کو یاد نہیں تھا۔

اس زمانے کی یادوں میں کچی امبیوں کو چوستے رہنا، کھٹی نارنگیوں کی پھانکیں نمک لگا لگا کر کھاتے ہوئے گندے سندے ہاتھوں سے گیند ہوا میں اچھال اچھال کر گیٹیاں کھیلنا بھی شامل تھا۔ اس کے یہ حالات دیکھ کر اماں اسے سخت لفظوں میں ڈانٹتی، جھڑکتی اور کئی مرتبہ سخت ہاتھوں سے پٹائی بھی کر دیتی تھیں، پھر انہوں نے پریشان ہو کر اس کو دو محلے چھوڑ ایک اسکول میں داخل کرا دیا۔ سعدیہ، کلثوم کو زندگی کا پہلا جھٹکا اس گورنمنٹ پرائمری اسکول میں جا کر لگا۔ اس سے پہلے جب وہ صبح صبح اٹھ کر نیند میں ڈوبی چہرے پر پانی کے چھپکے مار مار کر وضو کرتی تو اس کے لاشعور میں کہیں یہ اطمینان موجود ہوتا کہ وہ اپنے ابا کے پاس سیپارہ پڑھنے جا رہی ہے۔ جہاں اس کے ابا مولوی صاحب اور پڑھنے کے لیے آئے دیگر بچے شاگرد اور بے چاری مخلوق تھے۔ مولوی صاحب کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے اسے ان سب میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔

وہ اپنا سبق جلدی یاد کر لینے اور سنا دینے کے بعد بطور مانیٹر ان سب کے سروں پر سوار ہو سکتی تھی۔ وہ سرکنڈے

کی پتلی سی چھڑی پکڑے باری باری سب کے سر پر سوار ہوتی' ان کے سبق سنتی' غلطیوں پر زبانی سرزنش کے ساتھ بلا تکلف ان پر چھڑیاں برساتی' یوں وہ سب بچے سعدیہ کلثوم سے مرعوب رہتے' مگر گورنمنٹ پرائمری اسکول میں وہ ایک عام سی طالبہ تھی۔ کوئی اس کو مولوی صاحب کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ بلکہ وہ بچیاں جن پر صبح مسجد میں وہ چھڑیاں برسا رہی ہوتی' یہاں اسکول میں جتھا بنا کر اس کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ انہیں سعدیہ سے اپنے بدلے لینے کا نادر موقع ملا تھا۔

اس صورت حال پر سعدیہ کو پہلے پہل تو اسکول سے ہی نفرت ہونے لگی کیونکہ اسکول سے اس کا تعارف اچھا ثابت نہیں ہوا تھا مگر اسکول سے نجات کسی طور ممکن نہ ہوئی۔ اسکول نہ جانے کا ہر بہانہ اماں کے مصمم ارادے کے سامنے پورس کا ہاتھی ثابت ہوا۔ اس پر سعدیہ نے کھیل کود اور لور لور چھتیں ناپنے کے شوق کی تہ میں چھپے اپنے ذہن پر زور سے دستک دینے کا آغاز کیا۔ اس کی اس دستک کا جواب بہت عجیب تھا۔

''اتنا پڑھو' اتنی جان کھپاؤ کتابوں میں کہ سب سے ممتاز نظر آؤ' سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔'' دماغ کے جاگے سوتوں نے اسے مشورہ دیا تھا! اس روز سے ہی سعدیہ کلثوم کتابی کیڑا بن گئی۔ مولوی صاحب نے اسے قلم گھڑنا اور خوشخط لکھنا خوب سکھا دیا تھا۔ وہ پیار اور لگن سے بڑے شوق کے ساتھ تختی پر گاچنی (ملتانی مٹی) کا پوچا لگاتی' اسے ہوا میں لہرا لہرا کر سکھاتی اور پنسل سے لائنیں لگا کر خوشخط پورنے ڈالتی۔ اس کے اسکول کی استانیاں کچھ ہی ماہ میں اس سے متاثر ہو گئیں اور سعدیہ کلثوم مسجد کے علاوہ اسکول میں بھی اپنی ہم عمر لڑکیوں پر حاوی ہو گئی۔

دماغ کے اس مشورے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ اماں جنہیں اس کو پڑھانے لکھانے کا بہت شوق تھا' اس سے خوش رہنے لگیں۔ آہستہ آہستہ اسے اسکول سے محبت ہونے لگی۔ اسکول جس کے اندر استانیوں کی تعریفیں' کتابوں میں درج کہانیاں' آخری گھنٹے میں ہل ہل کر بلند آواز میں پہاڑے یاد کرنے کا سرور' آدھی چھٹی کے وقت استانیوں کے لیے اسکول کے باہر کھڑی ریڑھیوں سے چنا چاٹ' گول گپے' شکر قندی' سموسے خرید کر لانے کی معتبری شامل تھی۔ کبھی کبھار کوئی استانی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک پلیٹ چنا چاٹ' ایک آدھ سموسہ اسے بھی پکڑا دیتی اور وہ بڑے شوق سے یہ چیزیں کھاتی جن پر اکثر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوتیں۔

یہ سوغاتیں اسے اپنے گھر کے کھانے سے بہت زیادہ مرغوب تھیں' جو اکثر تو آس پڑوس کے گھروں سے چھوٹی کٹوریوں میں آئے ذرا ذرا سے سالن کی شکل میں مولوی صاحب کی نذر کیا جاتا یا اماں کے بنائے زیرے میں پکی آلو کی قتلیوں یا ذرا سی دال میں زیادہ پانی ڈال کر پکائے گئے کھانے پر مشتمل ہوتا۔ گھر سے اسکول میں خرچ کرنے کو تو پیسے ملتے نہیں تھے۔ اس لیے استانیوں کی یہ کرم فرمائی سعدیہ کلثوم کو بہت بھاتی تھی۔ وہ اسی طرح اپنا پیٹ بھر لیتی اور اسکول سے واپس آ کر اپنے مرغوب کاموں میں مشغول ہو جاتی۔

سعدیہ کلثوم کو زندگی کا دوسرا جھٹکا اس وقت لگا' جب مولوی صاحب کو اپنی تبدیلی کا خط ملا۔ وہ قصبے کی اس چھوٹی سی مسجد سے گاؤں کی مسجد میں تبدیل کر دیے گئے تھے۔ مولوی صاحب اور اماں خوش' جبکہ سعدیہ کا دل اس قصبے اس مانوس محلے اور اس پیارے اسکول کی پیاری استانیوں سے بچھڑ جانے پر بہت غمگین تھا۔ اسے اس گاؤں' مسجد اور گھر سے بغیر دیکھے ہی چڑ ہو گئی تھی۔ جہاں انہیں جانا' کام کرنا اور رہنا تھا۔

☼ ☼ ☼

نومیڈ آرٹ گیلری' ماہ نور کے لیے اچھا تجربہ ثابت ہوئی تھی۔ اس آرٹ گیلری کے ماحول میں جا کر اچانک اسے احساس ہوا تھا' جیسے ایسے ہی ماحول سے' ایسی ہی کسی جگہ سے متعلق تھی اور اب تک وہ بے جگہ زندگی گزارتی آئی تھی۔ اس نے نو آموز مصوروں کی فہرست میں اپنا نام رجسٹرڈ دیکھا اور اس کا دل کسی انجانے وقت کی

آمد کو محسوس کر کے خوش ہونے لگا تھا۔ نومیڈ آرٹ گیلری سے واپسی پر شاہ بانو اور اس نے شہر میں ادھر ادھر گھومنے میں دن گزارا۔ اس پر سے فرقان ماموں کے گھر رہائش کی بے زاری چھٹنے لگی۔

''چلو بھئی اللہ حافظ۔ کل صبح میں جلدی تمہیں لینے آجاؤں گی' سید پور کے لیے۔''

اس شام شاہ بانو نے فرقان ماموں کے گھر کے گیٹ پر اسے ڈراپ کرتے ہوئے کہا تھا اور اس دن کی مصروفیات کی خوش گواری کا یہ اثر تھا کہ اس روز رات تک اسے فرقان ماموں کے ہاں بھی بوریت محسوس نہیں ہوئی۔

☼ ☼ ☼

''سید پور کلچرل شو'' کا وہ پہلا دن تھا۔ ماہ نور کو اس منظم گاؤں کا سارا نقشہ بہت ہی متاثر کن لگ رہا تھا۔ اس روز ہینڈی کرافٹس کی نمائش ہو رہی تھی۔ دستکاری اور ہنر مند شاید اتنے پڑھے لکھے نہیں تھے مگر ان کو دیکھنے کے لیے آنے والے لوگ طبقہ اول اور پڑھے لکھے دانشوروں پر مشتمل تھے۔ ماہ نور بھی شاہ بانو کے ہمراہ مختلف ہنر مندوں کو دیکھتی اور ان کے ہنر کے کرشموں کو سراہتی ادھر ادھر پھر رہی تھی۔

''ارے واہ... وہ دیکھو! کمہار اپنے چاک پر برتن گھڑ رہے ہیں۔'' اچانک شاہ بانو نے ایک نسبتاً'' اونچی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔

''آؤ دیکھتے ہیں۔'' شاہ بانو آگے بڑھ گئی اور ماہ نور اس کا ساتھ دینے کو اس کے پیچھے چل دی۔

''یہ رہا مٹی کا پیالہ۔'' ایک کمہار جس کے گرد باقیوں کی نسبت ہجوم زیادہ تھا' کے ساتھ کھڑے اس کے بالکڑے (چھوٹے لڑکے) نے کہا۔ کمہار سفید تہ بند باندھے' سر پر سفید کپڑے کی پگڑی رکھے سر جھکائے اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس کے چاک کے پہیے پر رکھا اس کا پاؤں پہیے کو مہارت سے گھما رہا تھا۔

''یہ گلک ہے'' بالکڑے نے مٹی کے ایک تازہ تازہ تیار کیے ہوئے گیلے برتن کی طرف اشارہ کیا۔

''اور یہ جگ ہے۔'' اس نے ایک لمبے خدوخال کے برتن کی طرف اشارہ کیا۔

''اللہ! اس ان پڑھ' جاہل کمہار کے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں۔''

شاہ بانو کی آواز ماہ نور کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ جو غیر دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی' چونک کر کمہار کے ہاتھ دیکھنے لگی۔ ہاتھ واقعی چونکا دینے والے تھے۔ لاشعوری طور پر اس کی نظریں ہاتھوں سے ہوتی کمہار کے چہرے پر جا پڑیں اور اسے لگا' اس کا دماغ جیسے گھوم گیا ہو۔ وہ نظر کا دھوکا تھا یا حقیقت... کچھ لمحوں کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سامنے کا منظر' لوگ' آوازیں سب اس کے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

راشدہ رفعت

بلا عنوان

ادھر میرے بی اے کے پیپرز ختم ہوئے ادھر بڑی آپا کے فون پر فون آنا شروع ہوگئے۔ وہ مجھے کچھ دن کے لیے اپنے پاس بلانا چاہ رہی تھیں۔ گھر میں فارغ بیٹھ کر میں خود بوریت کا شکار تھی اور چھوٹے بھانجے بھانجیوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھی لیکن اماں کچھ متذبذب تھیں۔ وہ آج کے دور میں بھی نانی جان کے وضع کردہ اصولوں کو سینے سے لگائے بیٹھی تھیں جن کے مطابق بیاہتا بہنوں کے گھر غیر شادی شدہ بہن کا جاکر رہنا مناسب بات نہیں۔

پہلے تو اماں آپا کے فون آنے پر ٹال مٹول کرتی رہیں پھر آخر اصل وجہ بتا ہی ڈالی اور آپا تو سن کر حد درجہ خفا ہوگئیں۔

"کمال ہے اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ میں نورالعین کی بہن ہوں' کوئی اجنبی یا غیر تو نہیں۔ اگر بھرے پرے سسرال میں رہتی تب بھی آپ کا اعتراض بنتا تھا لیکن اب ایسی بات کہہ کر آپ نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ سرفراز تو خود نور کو چھوٹی بہنوں کی طرح عزیز رکھتے ہیں لیکن اگر آپ کو اعتبار نہیں تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔"

"لاحول ولا... ! سوچ سمجھ کر بولا کرو حور! خدانخواستہ مجھے کسی قسم کی کوئی بے اعتباری کیوں ہونے لگی۔ میں تو بس ویسے ہی...."

"تو پھر کیا مسئلہ ہے اماں! بس میں اس ویک اینڈ پر سرفراز کو بھیج رہی ہوں۔ وہ خود آکر نورالعین کو لے جائیں گے۔ سچ کہوں تو جب سے بچوں کو پتا چلا ہے کہ نور خالہ آنے والی ہیں۔ انہوں نے پوچھ پوچھ کر میرا ناک میں دم کردیا ہے کہ وہ کب پہنچ رہی ہیں۔ رشتوں کو ترسے ہوئے ہیں میرے بچے۔ ددھیال میں تو کوئی ان کے لاڈ اٹھانے والا موجود نہیں۔ خالہ' ماموں پر ہی جان چھڑکتے ہیں۔ نور یہاں آکر رہے گی تو بچوں کا جی بہل جائے گا۔ ورنہ بچوں کی اپنی چھٹیوں میں تو ایک عرصہ پڑا ہے۔ مجھے تو جانے کب آپ کے پاس آنے کا موقع ملے اور میں نے بچوں سے وعدہ کرلیا ہے کہ ان کی نور خالہ کو بہت سارے دنوں کے لیے اپنے پاس بلاؤں گی۔ اب آپ خود سوچیں کہ اگر میں نے...."

بڑی آپا حسب عادت نان اسٹاپ شروع ہوچکی تھیں۔

"اچھا ٹھیک ہے' سرفراز کو بھیج دینا' میں نور سے کہہ دیتی ہوں کہ تیاری کرے۔"

اماں بالآخر مان گئیں شاید نواسے' نواسیوں کی محبت غالب آگئی تھی ورنہ اماں جیسی اصول پسند خاتون کے لیے اپنے موقف سے پیچھے ہٹنا ناممکن سی بات تھی۔

بے چاری حور آپا بھی اپنی جگہ سچی تھیں۔ سرفراز بھائی اپنے والدین کی آخری اولاد تھے۔ بڑے بہن بھائی ان کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی شادی شدہ اور بال بچوں والے ہوگئے تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو والدین طبعی عمر گزار کر اللہ کو پیارے ہوچکے تھے۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ یوں اگر حور آپا کو خوش قسمتی سے سسرال کے جھنجھٹ نے

نہ پڑا' وہیں ان کے بچے دادا' دادی' چچا' پھوپھی جیسے رشتوں کی محبت سے بھی تقریباً" محروم رہے لیکن حور آپا چونکہ ہمارے گھر کی پہلی اولاد تھیں' سو ان کے بچوں کو ننھیال میں وی آئی پی پروٹوکول ملتا تھا۔ میرے نانا' اماں' ابا اور دونوں چھوٹے بھائی بھی بچوں پر جان چھڑکتے تھے۔ میں ان کی اکلوتی اور فیورٹ خالہ تھی' جو ان کی ہر الٹی سیدھی فرمائش پوری کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔

مجھے اندازہ تھا کہ بچے میری آمد کا کتنی بے چینی سے انتظار کررہے ہوں گے۔ اماں کی اجازت ملنے کا مرحلہ طے ہوا تو میں نے بھی جھٹ پٹ اپنی پیکنگ مکمل کرلی۔ دو دن بعد سرفراز بھائی مجھے لینے آگئے تھے۔

اماں نے مجھے ڈھیروں نصیحتوں سمیت ان کے ساتھ روانہ کردیا۔ آپا کے گھر میرا پرتپاک استقبال ہوا۔ بچے میری ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ کھانے کی میز پر انواع و اقسام کے لوازمات سجا کر آپا نے مجھے شرمندہ کردیا۔

"میں بہت دنوں کے لیے رہنے آئی ہوں آپا! یہ تکلف نہیں چلے گا۔" میں نے انہیں جتا دیا۔

"اچھا چلو۔ آج تو کھاؤ' پھر میں نے کچن کا چارج تمہارے ہی حوالے کرنا ہے۔ تمہارے بھانجے بھانجیوں کو جو الا بلا چاہیے ہوتا ہے' وہ مجھ سے اچھا تم بنا سکتی ہو۔"

ان کی مراد چائنیز کھانوں کی طرف تھی' جو بچے بہت شوق سے کھاتے تھے اور آپا بلاشبہ روایتی اور دیسی

کھانوں کی ماہر تھیں مگر چائنیز اور اٹالین بنانا ان کے بس کی بات نہ تھی اور کچھ میں خود بھی سوچ کر آئی تھی کہ آپا کو کچھ دنوں کے لیے ریسٹ دینا ہے کہ اوپر تلے کے بچوں نے حقیقتاً "انہیں گھن چکر بنا کر رکھ دیا تھا سو اگلے دن سے میں نے بخوشی کچن کا چارج سنبھال لیا۔ اگلے دن جب میں آپا کی فرمائش پر بطور خاص اماں والے طریقے سے قیمہ اور شملہ مرچ بنا رہی تھی تو آپا نے آواز دے کر مجھے بلایا۔ میں چولہے کی آنچ ہلکی کرکے باہر نکلی۔

"جی آپا کہیے۔" میں نے پوچھا اور پھر ٹھٹک کر رک گئی۔ آپا کے ساتھ ایک تیس بتیس سالہ لڑکی یا شاید عورت کہنا مناسب ہوگا' کپڑوں کا گٹھڑ کھولے بیٹھی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ زمرد ہوگی۔ میں نے آپا کی زبانی اس کا ذکر پہلے بھی سن رکھا تھا۔ وہ کڑھائیوں والے سوٹ اور بیڈ شیٹس وغیرہ بیچنے کے لیے قریبی قصبے سے آتی تھی۔ پچھلی بار آپا ہمارے ہاں رہنے آئی تھیں تو نہایت دیدہ زیب کڑھائی والے دو سوٹ مجھے تحفتاً دیے تھے۔ وہ انہوں نے زمرد سے ہی خریدے تھے۔

"زمرد آئی ہے کپڑے لے کر۔ دیکھ لو' تمہیں کوئی پسند آتا ہے تو۔"

آپا نے مجھے مخاطب کیا۔ زمرد جلدی جلدی مجھے کپڑے دکھانے لگی' ساتھ ہی آپا سے باتیں بھی کیے جارہی تھی۔ وہ بہت عرصے سے آپا کے ہاں آجارہی تھی۔ آپا کو اس کے گھریلو حالات سے مکمل آگاہی تھی اور آپا کی ہی زبانی مجھے بھی اس کے متعلق تھوڑا بہت پتا تھا۔

اس کا میاں ایک حادثے میں معذور ہوگیا تھا۔ پانچ بچوں کی کفالت کی ذمہ داری اس نے تن تنہا اٹھا رکھی تھی۔ کم عمری میں شادی کی وجہ سے وہ بتیس' تینتیس سال کی عمر میں پانچ بچوں کی ماں بن چکی تھی بلکہ اس کی بڑی بیٹی بھی اب چودہ' پندرہ سال کی ہوچکی تھی اور زمرد کو اس کا بڑھتا قد پریشانی میں مبتلا کر رہا تھا۔ اب بھی وہ آپا کے پوچھنے پر اپنی اسی بیٹی کے متعلق بتا رہی تھی۔

"نہ بی بی صیب! اب اسے ساتھ لے کر گھر گھر نہیں پھرتی۔ میرے حصے کا ایک گٹھڑ ہی اپنے سر پر رکھتی تھی نادہ۔ مجھے دونوں گٹھڑ اٹھانا اتنا مشکل نہیں لگتا تھا' جتنا اس کو لوگوں کی نظروں سے بچانا مشکل لگتا ہے۔ اسی لیے اسے گھر ہی چھوڑ آتی ہوں۔ میرے پیچھے پورا گھر سنبھالتی ہے۔ کڑھائی بھی زیادہ وہ ہی کرتی ہے۔ اب اس کے بیاہ کے لیے پیسے جوڑنا شروع کر رکھے ہیں۔ جیسے ہی برادری میں سے کسی نے رشتہ ڈالا اسے رخصت کردوں گی۔" زمرد میرے سامنے کپڑے پھیلاتے ہوئے آپا کو جواب دے رہی تھی۔

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا زمرد! اتنی چھوٹی سی بچی کی شادی کردو گی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے' بانس جتنا قد تو نکال لیا ہے مگر ہے تو چھوٹی نا' شادی کے قابل لگتی ہے تمہیں کہیں سے۔" آپا نے اسے لتاڑا تھا۔

"بی بی صیب! جب میری شادی ہوئی تب میں بھی ایسی تھی۔"

زمرد ہنسی تو اس کے شفاف موتیوں جیسے دانت بھی چمک اٹھے۔ اس کا سراپا بھی انتہائی متناسب اور دلکش تھا۔ ہاں چہرے کی رنگت قدرے سنولائی ہوئی تھی مگر اندازہ لگانا چنداں مشکل نہ تھا کہ وہ کسی زمانے میں بہت خوبصورت ہوگی۔ میں تو خیر یہ سوچ رہی تھی کہ اس نے دنیا کے ڈر سے بیٹی کو تو گھر بٹھا دیا تھا مگر خود کو دنیا کی نگاہوں سے کیسے چھپاتی ہوگی۔ آپا اب بھی اس سے اسی موضوع پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ اسے سمجھانا چاہ رہی تھیں کہ کم عمر بیٹی کی شادی میں وہ جلد بازی سے کام نہ لے۔

"ارے بی بی! ہماری عورت دیکھنے میں نازک لگتی ہے مگر اندر سے وہ بہت سخت جان ہوتی ہیں۔ ہم مزدور لوگ ہیں جی۔ بچے پیدا کرکے پال پوس بھی لیتے ہیں ساتھ ساتھ محنت مزدوری بھی کرتے ہیں' مجبوری ہے۔ پھر بتاؤ بی بی! کون سا سوٹ لے رہی ہو آپ؟"

اس نے گویا آپا کے ساتھ بحث سمیٹتے ہوئے اپنی دکانداری کا آغاز کیا۔ میں اتنی دیر میں لائٹ پرپل کلر کا ایک سوٹ منتخب کرچکی تھی' جس کے گلے اور دامن پر نفیس بیل کڑھی ہوئی تھی۔ میں نے سوٹ کی طرف اشارہ کرکے اپنی پسند سے آگاہ کیا تھا۔

"بس ایک سوٹ؟" وہ قدرے مایوس ہوئی۔

"ہاں' بو فی الحال مجھے یہ ہی پسند آیا ہے' باقی جن رنگوں کے ہیں' ان سے ملتے جلتے کپڑے میرے پاس پہلے بھی بہت ہیں۔"

میں نے بہانہ بنایا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے ایک' دو سوٹ اور بھی پسند آئے تھے لیکن میں جانتی تھی کہ میں جتنے مرضی سوٹ خریدوں' آپا مجھے ادائیگی نہیں کرنے دیں گی اور اگر میں نے دو تین سوٹ اکٹھے خرید لیے تو اماں خوب خفا ہوں گی' سو میں نے ایک ہی سوٹ لینے پر اکتفا کیا۔

آپا اب اس سے بھاؤ تاؤ کرنے لگی تھیں۔

"پندرہ سو سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گی جی۔" زمرد نے جیسے پیشگی آگاہ کیا۔ مجھے یہ بڑی جائز اور معقول قیمت لگی تھی۔ بازار میں ایسا سوٹ ڈھائی ہزار سے کسی طور کم نہ ملتا بلکہ اگر کوئی بڑی دکان ہوتی تو تین ہزار تک قیمت لگا سکتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ آپا جھٹ اسے پیسے تھما دیں گی لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپا نے نفی میں گردن ہلادی۔

"میں تو صرف اس کا ہزار روپیہ دوں گی اور وہ بھی تمہارا خیال کرکے' ورنہ پرسوں تمہارے علاقے سے ہی ایک اور عورت کپڑے بیچنے آئی تھی اور نو سو پر مان بھی گئی تھی بس کلر پسند نہیں آیا اسی لیے نہیں خریدا۔" آپا نے شاید نہیں بلکہ یقیناً "جھوٹ ہی بولا تھا۔

"بی بی صیب! آپ کڑھائی تو دیکھیں' کتنا باریک کام ہے اور کتنی صفائی سے کیا ہوا ہے۔" زمرد نے کپڑا آپا کی نگاہوں کے سامنے پھیلایا تھا۔

"ہاں ہاں دیکھ رہی ہوں۔ بالکل باریک سی بیل ہے اور کپڑا تو دیکھو' کتنا ہلکا ہے۔ اس کے ہزار روپے ہی بنتے ہیں۔" آپا اپنے موقف سے بالکل پیچھے نہ ہٹی تھیں۔

"کچھ تو جائز قیمت لگاؤ بی بی! میں تو آپ کو بالکل اپنی بہن سمجھ کر کپڑا بیچنے آتی ہوں اور دوسری عورتوں کی طرح منہ پھاڑ کر بہت بڑی رقم بھی نہیں مانگتی۔ یقین کرو بی بی! میں نے تو اپنی طرف سے بالکل مناسب معاوضہ مانگا ہے۔" زمرد لجاجت پر اتر آئی تھی۔

"بس گیارہ سو دوں گی۔" آپا نے جیسے احسان کیا۔

"بی بی صیب! کچھ تو اور دو۔ صبح سے پھرتے پھرتے یہ وقت ہوگیا ہے' صرف ایک سوٹ بکا ہے۔ پھر میرا مہینے بعد چکر لگے گا۔ اتنا پیسہ تو کرائے میں ہی اٹھ جاتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کتنی ویگنیں بدل کر دھکے کھاتے ہوئے آنا پڑتا ہے اور پھر صبح سے شام تک آپ کے شہر کی گلیوں میں پھر پھر کر ٹانگوں کا برا حال ہوجاتا ہے۔ میں نے گھر میں مہینے کا راشن ڈلوانا ہے جی۔"

اس نے دوپٹے کے پلو سے چہرے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے آپا کو عاجزی سے مخاطب کیا تھا۔

"بھئی زمرد! تم ناانصافی کر رہی ہو۔ مہینے بھر کا راشن کیا تم نے میرے پیسوں سے ہی ڈلوانا ہے۔ گیارہ سو بالکل صحیح قیمت لگائی ہے میں نے۔ تم نے دینا ہے تو دو ورنہ کوئی بات نہیں۔ کپڑے بہتیرے ہیں ہمارے پاس۔"

آپا نے بے رخی سے اس کا دکھایا ہوا سوٹ پرے کیا۔ میں بغور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے لہرانے لگے تھے۔ مجھے اس پر ترس سا آیا' میں جانتی تھی کہ آپا بھاؤ تاؤ کرنے کی ماہر ہیں۔ ہمارے گھر میں بھی زیادہ تر خریداری کا کام جب ہی نمٹایا جاتا تھا' جن دنوں آپا ہمارے پاس رہنے آئی ہوتی تھیں۔ وہ بہت مناسب قیمتوں پر دکانداروں سے بھاؤ تاؤ کرکے وہ چیزیں بھی خرید لاتی تھیں' جو اگر میں یا اماں خریدنے جاتے تو دکاندار کم نرخوں پر دینے کے بجائے ٹکا سا انکار کردیتے۔ ہم آپا کو اسی لیے تو خریداری کا ماہر قرار دیتے تھے۔ بارگیننگ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا مگر آج پہلی بار مجھے آپا کی بھاؤ تاؤ کی عادت سے کوفت ہو رہی تھی۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ فٹافٹ اس محنت کش عورت

کی ہتھیلی پر اس کا منہ مانگا معاوضہ رکھ دوں۔ بھلے سے وہ کچھ فالتو ہی مانگ رہی ہو مگر آپا اس کے چہرے پر پھیلتی مایوسی کو ہرگز خاطر میں نہیں لا رہی تھیں۔ وہ اپنی بتائی ہوئی قیمت پر اڑ گئی تھیں۔

"اچھا بارہ سو دے دینا۔" زمرد نے گویا تھک کر ہار مان لی۔

"بس ساڑھے گیارہ سو۔ چلو! سوٹ کے ساتھ کا دوپٹہ دے دو۔" آپا نے حتمی انداز میں کہا۔ زمرد نے دوپٹے اور شلوار کا کپڑا بھی چپ چاپ آپا کو تھما دیا۔ آپا نے بٹوا کھول کر ہزار روپے کے نوٹ کے ساتھ سو سو کے دو نوٹ زمرد... کو تھمائے اور ساتھ ہی جتا بھی دیا۔

"پچاس کا کھلا نہیں ہے۔ پچاس روپے لوٹا دو۔" زمرد نے چپ چاپ دوپٹے کا پلو کھول کر مڑا تڑا پچاس کا ایک نوٹ نکالا اور آپا کو واپس کر دیا۔ باقی پیسے اس نے گریبان میں سے بٹوا نکال کر احتیاط سے رکھے تھے۔

"آئندہ آنا تو کچھ فریش رنگوں کے کپڑے لانا۔ آج تو تمہارا سارا مال ہی پھیکے پھیکے رنگوں کا تھا۔"

"جی بی بی! پندرہ بیس دن بعد میں پھر آؤں گی ان شاء اللہ۔ جب آپ اپنے اور چھوٹی بی بی کے لیے اکٹھے دو تین سوٹ خرید لیں گی۔" وہ اپنی گٹھڑی باندھتی، مایوسی کو پیچھے دھکیلتی نئی امید کا سرا پکڑ کر کھڑی ہوئی۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی کہ کتنی آسانی سے اس نے دو وزنی گٹھڑ اپنے سر پر لیے اور پھر آپا اور مجھے سلام کرتے ہوئے وہ گٹھڑوں کو بنا ہاتھ سے سنبھالے متوازن قدموں سے چلتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئی۔

"آپا! آپ نے زیادتی کی بے چاری زمرد کے ساتھ۔ پندرہ سو ان سوٹ کے زیادہ تو نہیں تھے۔" اس کے جاتے ہی میں نے آپا کو احساس دلانا چاہا۔

"ارے اگر اسے کم لگتے تو ساڑھے گیارہ سو میں کبھی سوٹ نہ بیچ کر جاتی۔ کچھ نہ کچھ منافع ضرور اس کے پاس گیا ہے۔ ایسی بھی سیدھی نہیں ہے وہ۔ بس شکل سے بے چاری لگتی ہے۔"

"کچھ نہ کچھ منافع تو ضرور اس کے پاس گیا ہے آپا! مگر غریب اور ضرورت مند عورت ہے کچھ زائد منافع بھی مل جاتا تو کیا حرج تھا۔" میں نے ہولے سے کہا زمرد کی اداس صورت اب بھی میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔

"جی بنو! جب تم گھربار والی بنو گی تب تمہیں پیسے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔ اپنے شوہر کی خون پسینے کی کمائی کے ایک پیسے کو بھی خرچ کرتے ہوئے سو بار سوچنا پڑتا ہے اور یہ نہ سوچنے بیٹھ جانا کہ میں نے تمہیں سوٹ دلوایا ہے، اس لیے یہ بات کر رہی ہوں۔ میں تو تمہیں گرہستی کا ایک اصول بتا رہی ہوں، جو آئندہ آنے والی زندگی میں تمہارے کام آئے گا۔"

حور آپا نے مجھے پیار سے سمجھایا تھا۔ میں نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اتنے میں... دروازے پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ ساتھ ہی کسی فقیر کی زوردار صدا بھی سنائی دی۔

"جمعرات والا بابا ہوگا۔ جمعرات کے جمعرات آتا ہے۔" آپا نے مجھے بتایا۔

"کھلے پیسے تو شاید نہیں ہیں آپ کے پاس، میں دوں؟" میں نے قریب ہی پڑا اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ارے نہیں یوں کرو یہ پچاس روپے ہی اسے دے آؤ۔ میں ہر جمعرات کو بچوں کے نام کا سو، پچاس کا صدقہ اسی بابا کو دیتی ہوں۔"

آپا نے اپنی مٹھی میں دبا وہی مڑا تڑا میلا کچیلا سا نوٹ نکال کر مجھے دیا، جو ذرا دیر پہلے زمرد دے گئی تھی۔ میں نے ان کے ہاتھ سے نوٹ لیا اور دروازے پر جا کر ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ "ہٹا کٹا فقیر بابا" اپنا کشکول پھیلائے منتظر کھڑا تھا۔ میں نے نوٹ اس کے کشکول کے حوالے کیا اور دروازہ بند کر کے واپس پلٹ آئی۔ حور آپا فلور کشن سمیٹ رہی تھیں۔ میں نے کچن کی راہ لی، جہاں چولہے پر دھری ہنڈیا میری منتظر تھی۔

شہزادی عباس خلجی

وفا ہے حسنِ محبت

جنوں خیز بے رحم متلاطم لہریں جب سمندر کے سینے پر ادھم مچاتی، شور بپا کرتی ادھر سے ادھر بھاگتی پھرتی ہیں... اسے رگیدتی پھرتی ہیں تو یوں لگتا ہے، کوئی ان کے طوفانی تیوروں پر بندھ نہیں باندھ سکتا... کسی انہونی کا پیش خیمہ بنی سرسراتی ہوائیں اور خوف ناک جوار بھاٹا، پچھاڑیں کھاتے سمندر کو ہیبت ناک بنا دیتا ہے۔ بپھرے ہوئے پانی کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے، جیسے دنیا ہڑپ کر جائے گا۔ مگر کچھ دیر بعد اس طوفان کا نام و نشان تک نہیں ہوتا اور سمندر کسی مفتوح کی طرح چپ چاپ قصوروار نظر آنے لگتا ہے۔

سمندر کی یہ کیفیت وقتی ہوتی ہوگی مگر اسے لگا وہ اپنے اندر اٹھتی اتھل پتھل منہ زور ضدی موجوں کو کبھی پرسکون ہوتا نہیں دیکھ سکے گی۔ اسے گمان ہوا، وہ کبھی سکون اور لمبی نیند نہیں لے پائے گی۔

کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر کاٹتے کاٹتے اس کے پاؤں دکھ گئے تھے مگر بے چینی تھی کہ اس کا سکون تہس نہس کرنے پر تلی تھی۔

نم آنکھوں کو جھپک کر چہرہ اوپر اٹھا کر اس نے طویل سانس خارج کیا۔ گویا سانس کے ذریعے اندر موجود وسوسے، فکر و پریشانی خارج ہو جائیں گی۔ مگر ایسا ہوا نہیں تھا۔

تھک کر وہ صوفے پر ٹک گئی اور اندر بھرے خوف

ناولٹ

کو دبانے کے لیے سر جھٹکا اور کمرے میں جلتے نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اپنی دائیں ہتھیلی پر لگی مہندی کے نقش و نگار دیکھنے لگی۔ اسے مہندی کا بے حد شوق تھا۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ وہ ہاتھوں کو سادہ رہنے دے مگر مہندی دیکھنے کی مصروفیت بھی عبث رہی۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر ٹہل رہی تھی۔ وسوسوں، اندیشوں کی بھیانک سرسراہٹ اسے عدم تحفظ کا شکار کر رہی تھی۔

ابھی کل تک تو سب ٹھیک تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی سہل بلکہ بے حد خوش گوار گزر رہی تھی۔ بے حد پیار کرنے والا شوہر تھا۔ پورے گھر میں خصوصاً ان کے اپنے کمرے میں سجاوٹ میں اس کی پسند کو

مد نظر رکھا گیا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر ہلکا مسٹرڈ پینٹ کیا گیا تھا۔ دائیں جانب قد آدم کھڑکی پر پڑے پردے وہ پوری مارکیٹ گھومنے کے بعد خرید کر لائی تھی۔ گہرے نیلے دبیز پردوں پر دیواروں کے ہم رنگ جالی دار پردے اطراف میں بندھے تھے۔ بائیں جانب بنی دیوار گیر الماری میں ایک بڑا حصہ بک شیلف کے طور پر استعمال ہوتا تھا' جس میں اس کی پسند کے مصنفین' شاعر و نقاد کی کتب ترتیب سے سجی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر اس کے ہاتھ کی بنی بڑی سی پینٹنگ لگی تھی۔ جس میں دیہی ماحول بے حد خوب صورت انداز میں پینٹ کیا گیا تھا۔ پس منظر میں دکھتے آسمان کے نیلگوں رنگوں کے آگے سرسوں کے لہلہاتے کھیتوں میں بنی بل کھاتی کچی پکی پگڈنڈیوں پر کسیاں اور دیگر اوزار تھامے آتے جاتے کسان اور سروں پر گھڑے اٹھائے دوپٹے کے پلوؤں سے آدھا چہرہ چھپائی دوشیزاؤں سے سجا منظر شہری زندگی کی برق رفتاری میں بھاگتے پھرتے لوگوں کی نسبت ایک ٹھہراؤ اور سکون کا تاثر دے رہا تھا۔ وہاں زندگی ہی زندگی تھی۔ امن ہی امن تھا۔ پینٹنگ اس کے ذہنی ٹھہراؤ سکون کی عکاس تھی۔

پینٹنگ سے ہوتے ہوئے نظریں اوپر لگی وال کلاک کی جانب اٹھ گئیں۔ رات کے ڈھائی بجے کا وقت تھا مگر اس وقت بھی اسے نیند جیسی نعمت کے حصول کا ایک فیصد بھی امکان نہ تھا۔

''وہ کیوں آرہی ہے؟'' سرسراتا ہوا سوالیہ نشان ایک دفعہ پھر اس کے اندر زہر بھرنے لگا تھا۔

صوفے پر بیٹھ کر اس نے اپنے ہاتھوں سے شدید دکھتے سر کو ہلکا ہلکا دبایا۔ شام کو معمول کے مطابق چائے بنا کر وہ امی اور صالحہ کے پاس آبیٹھی تھی۔ صالحہ بی ایس سی کے سال اول میں تھی اور اس سے چھوٹی اسما میٹرک کے امتحانات دے رہی تھی۔ اس نے دونوں کو نند کی بجائے ہمیشہ بہنیں سمجھا تھا۔ صرف سمجھا نہیں تھا بلکہ اپنے حسن سلوک سے یہ ثابت بھی کر دیا تھا کہ نند' بھاوج کے بیچ مخصوص چپقلش ہو' یہ ضروری نہیں۔ رشتے بنانے میں انسان کا اپنا ہاتھ ہوتا ہے۔

چائے کی ٹرے رکھ کر اس نے امی کے چہرے پر خوشی اور نندوں کے جوش و خروش سے دمکتے چہروں کو خوش گوار حیرت سے دیکھا اور اپنا کپ تھامے کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے وجہ دریافت کرنے لگی۔

''بھابھی! ارسہ آپی آرہی ہیں کل۔'' سب سے پہلے اسما بولی۔

''اف اللہ! کتنے عرصے بعد دیکھیں گے نا ہم انہیں۔ پتا نہیں کیسی ہوگئی ہوں گی' پہلے تو بہت پیاری ہوتی تھیں ارسہ آپی۔'' صالحہ بھی چشم تصور سے ''آپی'' کے سراپے کو سوچتے ہوئے بولی تو باوجود حافظے پر زور ڈالنے کے وہ اس نام کی کوئی شناسا خاتون دریافت نہ کرپائی۔

''امی! کون ارسہ؟''

''ارے! تمہارے امین انکل کی بیٹی ارسہ اور کون... کتنے سالوں بعد پلٹی ہے میری لاڈو... اسی آنگن میں پلی بڑھی ہے۔ پیدا تو امین کے ہاں ہوئی تھی مگر سارا دن میرے پاس ہی گھسی رہتی تھی۔'' امی کا چہرہ بھی چمک رہا تھا مگر حوالہ سنتے ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

''ارسہ... امین انکل کی بیٹی۔''

''جانے کب واپس آئی ہے پاکستان... کسی کو خبر ہی نہ ہوئی۔ میری صالحہ کی طرح ہی رہی ہے ہمیشہ' اس بچی کے نصیب ہی خراب نکلے۔ یہاں آکر بھی اس نے خود کو قید کرلیا کہ معاشرہ مطلقہ کو کیا کچھ نہیں کہتا' مگر ہم تو اس کے اپنے تھے۔ ہمیں تو بتاتی۔ میری نازک سی بچی پر جانے کون سے دکھوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔''

ذکر کرتے کرتے وہ آبدیدہ سی ہوگئیں تو وہ چاہتے ہوئے بھی انہیں دو لفظ تسلی کے نہ کہہ پائی۔

''امین کے کہنے پر ہی آج فون آیا ہے اس کا۔ طبیعت خراب ہے اس کی۔ میرا تو بس نہیں چل رہا' اڑ کر اس تک پہنچ جاؤں مگر یہ بڑھاپا اپنے ساتھ ساتھ تکلیفیں بھی اتنی لے کے آیا ہے کہ انسان چاہ کے بھی کچھ نہیں کرسکتا۔

اے صالحہ! اپنے بھیا کو فون ملا کر میری بات کروا' ابھی جا کے اس کی خبر گیری کرے۔ اس کی اپنی ماں حیات نہیں تو کیا ہوا' میں ابھی زندہ ہوں۔''

جملے کا پہلا حصہ صالحہ سے کہہ کر وہ آپ ہی آپ بولے گئیں مگر سن کون رہا تھا۔

زرد پڑتی رنگت کے ساتھ اس نے کپ ٹرے میں رکھے اور صوفے کی ہتھی کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کبھی کبھی سہارے کس قدر اہم ہوجاتے ہیں۔ اگر صوفہ تھام کر نہ اٹھتی تو اسے یقین تھا کہ وہ اپنے کپکپاتے پیروں پر کبھی کھڑی نہیں ہوسکے گی۔

پھر وہاں کیا بات ہوئی۔ اس کے علم میں نہیں۔ وہ چپ چاپ معمول کے کام نپٹاتی رہی۔ گھڑی نے آٹھ اور پھر نو بجنے کا اعلان کردیا تھا۔ اس کے دل کو پنکھے سے لگ گئے تھے۔ وقت گزر کر نہیں دے رہا تھا۔

احسن بہت دیر سے گھر لوٹا تھا۔

''بہت تھک گیا ہوں یار... سر میں درد ہو رہا ہے۔''

کمرے میں آکر بیڈ پر ڈھیر ہو کے کنپٹیاں دباتے ہوئے احسن نے کہا تو وہ فوراً' پاس بیٹھ کر سر دبانے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر تیل کی شیشی اٹھا لائی اور مالش کرنے لگی۔

''اس سے کچھ سکون ملے گا احسن! پھر میں آپ کے لیے چائے بناؤں گی۔''

احسن کے چہرے پر کچھ غیر معمولی نہ پا کر وہ مطمئن ہوئی تھی۔ ہتھیلی تیل پر لے کر وہ پوری دل جمعی سے سر میں مساج کرنے لگی تھی۔

''آپ آج بہت دیر سے گھر آئے ہیں۔''

''ہاں یار! وہ امی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے ارسہ کا بتایا تو آفس سے سیدھا وہیں چلا گیا تھا۔ کچھ طبیعت خراب تھی اس کی۔''

''اب کیسی ہیں وہ؟''

''تبدیلی آب و ہوا کے باعث بخار ہوگیا تھا۔ اب تو کچھ بہتر ہے۔'' اس نے یوں بتایا جیسے یہ کوئی معمول کی بات ہو۔

''امی بہت پریشان تھیں شام سے۔'' لہجے کو حتی المقدور نارمل رکھنے کی جدوجہد میں اس کی آواز مدھم ہوگئی۔

''پریشان تو ہونا ہی تھا' امی کی چہیتی جو تھی۔ فون پر ہی مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ اپنے ساتھ لے کر آنا۔ میں کیسے اصرار کرتا مگر امی کو کون سمجھائے۔ ارسہ نے کل ہی آنے کا وعدہ کیا تو امی نے میری جان بخشی۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔

ماذیہ کو سانس رک رک کر آنے لگا۔ کسی خدشے نے اسے بری طرح دبوچا تھا۔

''یوں لگتا ہے ماہ و سال نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا' ویسی کی ویسی ہے۔ روشن چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں... بات کرتے ہوئے مخاطب کو لاجواب کردینے والا انداز... سب کچھ پہلے جیسا ہے۔''

شاید سر درد میں کمی آئی تھی یا احسن کے بہت سالوں پہلے کے پسندیدہ موضوع نے درد کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

''اور اس کا بیٹا اذان... گول مٹول' گورا چٹا سا۔ بہت جلد مجھ سے مانوس ہوگیا۔ دل چاہا' اسے ساتھ ہی لے آؤں... ننھے فرشتے تو ہر ایک کی توجہ کھینچ لیتے ہیں یار!''

ماذیہ نے دیکھا۔ احسن کی بند آنکھوں کے نیچے لبوں پر بے حد حسین مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔ مالش کرتے اس کے ہاتھ سست ہوگئے۔

''بچے بھی کتنا حسین تحفہ ہیں رب کا... کتنی بڑی نعمت ہیں۔ خوش نصیب ہیں جنہیں اولاد سے نوازا جاتا ہے۔''

بالکل صداقت سے روانی میں بولتے ہوئے اس نے ماذیہ کو دکھ کی کھائی میں دھکیل دیا تھا۔ جس میں اس کا شعوری طور پر ایک فیصد بھی ہاتھ نہ تھا۔ ماذیہ کی انگلیوں کی حرکت رک گئی۔

اسے محسوس ہوا کسی نے بھاری پتھر اس کی کلائی پر دے مارا ہے اور اس کی انگلیوں کا بازو سے رابطہ جوڑے رکھنے والی رگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ جوڑ چیخ گئے

ہیں۔ احسن نے آنکھیں کھول کر اپنے بالوں میں ساکت ہاتھ کو تھام کر پیار سے پوچھا۔ "تھک گئی ہو؟"

"ہاں بس... ویسے ہی غنودگی سی آرہی ہے۔" وہ زبردستی مسکرائی اور اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔

واش بیسن کا نل کھولے تیزی سے بہتے ٹھنڈے جھاگ جیسے پانی کے نیچے دونوں ہاتھ رکھے ہونٹ سختی سے بھینچے وہ اُمڈتے آنسو روکنے کی پرزور کوشش کرتی رہی۔ مگر کبھی کبھی کوشش ایسے ہی رائیگاں جاتی ہے۔

کیسا لگتا ہے جب ان ہونٹوں پر کسی دوسری عورت کے لیے ایسی مہکتی مسکراہٹ ہو جنہیں آپ اپنا حاصل مانتے ہیں۔

"دوسری عورت... دوسری عورت وہ خود ہے یا ار...؟" آئینے میں دکھتے عکس کے چہرے پر جابجا نمودار ہونے والی سیاہ لکیروں سے جیسے خون رسنے لگا تھا۔ وہ تڑخ رہی تھی، چیخ رہی تھی۔

بزور طلسم وہ چھ سال قبل کیمپس کے ان چلچلاتی گرمیوں والے طویل دنوں میں جا پہنچی، جب یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے سالانہ کتب میلے میں احسن فراز سے ہونے والی اتفاقیہ ملاقات اس کی زندگی کا حاصل ٹھہری تھی۔ دونوں کو ایک ہی کتاب مطلوب تھی اور آخری کاپی ہونے کی بدولت ہونے والی متوقع بحث سے قبل ہی ماذیہ حیدر کتاب اسے سونپ کر خود دستبردار ہو گئی۔ جس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد اسے کچھ اور دیکھنے کی تمنا نہ رہی تھی۔ نرم لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتا وہ چوڑا چکلا وجود بے حد پرکشش اور جادوئی شخصیت کا مالک تھا۔

اس وقت کی اتفاقیہ ملاقات بعد میں سلام دعا سے ہوتی ہوئی دوستی میں بدل گئی۔ فزکس اور فائن آرٹس کا بھلا کیا ملاپ تھا۔ مگر محبت بھلا کب دیکھتی ہے۔ کب کچھ سوچنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ وہ تو بس اسیر کرکے چھوڑتی ہے۔ چنانچہ فائن آرٹس کی نازک اندام کومل کومل جذبوں والی خاموش طبع ماذیہ اپنے لب سیے اس کی چاہت میں سلگنے لگی، جو کسی اور کے ہی قفس میں مقید ہونے کے لیے تڑپتا تھا۔

گراؤنڈ میں کتابیں سامنے رکھے یا طویل راہداریوں میں سست روی سے چلتے ہوئے ماذیہ اس کے چہرے کو نظروں کے حصار میں لیے رکھتی، جو کسی اور کے تصور سے اجلا رہتا۔ کسی اور کی بے اعتنائی سے شکستہ سا رہتا۔

وہ بڑے حوصلے سے "کسی" کے حوالے سے اس کے جذبات سنتی رہتی۔ ہونٹوں پر مہر لگائے اسے ٹوٹتا دیکھتی رہتی۔

وہ حوصلے کی انتہا کرتے ہوئے اپنی محبت کو آزمائے چلی جاتی۔ جانے وہ کون تھی مگر احسن کے اندر موجود تھی۔ وہ چلی تو گئی تھی مگر اس کا ذکر اس کی باتوں میں، حوالوں میں میٹھی میٹھی سی مہک دیتا رہتا۔ اس کی شکست خوردگی دیکھ کے ماذیہ اپنی محبت کو پس پشت ڈال کر چپکے چپکے بارہا دعا کرتی کہ کاش! وہ لڑکی واپس آجائے۔

"پھر میرا کیا ہوگا؟" یہ اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ محبت اس کی آنکھوں کے سلوٹ زدہ خوابوں، اس کے خشک باہم پیوست ہونٹوں اور خون کے دھڑکتے لوتھڑے تک ہی مقید تھی اور اس نے کبھی ان سب سے آگے محبت کو لے جانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

ہاں! مگر جب سفیدے کے قطار اندر قطار لگے درختوں والی روش پر چلتے ہوئے احسن سینے پر ہاتھ باندھے دور خلاؤں میں اسے کھوجتے ہوئے شکوہ کناں ہوتا تو وہ اس کی شکایتوں، شکوؤں سے پر باتوں کا بس ایک ہی جواب دیتی۔

"رب العزت اپنے بندے سے ستر ماؤں سے بھی بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ اگر کبھی وہ آپ سے بہتر چیز چھینے تو بہترین سے نواز دیتا ہے۔"

اس کے وثوق سے کہنے پر وہ مڑ کر ماذیہ کی آنکھوں میں دیکھتا اور دھیرے سے زخمی مسکراہٹ اس کی جانب اچھال دیتا۔

"اس سے بہتر کیا ہوگا... اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے بھلا؟" وہ ایک بار پھر کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائے

ہوئے بڑبڑاتا۔

"کیا اور کیوں کا بھید انسان جان لیتا تو رب کی جانب سے رحمت کا طلب گار کیسے رہتا؟"

سوال کے جواب میں سوال آتا تو غیر مرئی نقطے سے اس کا ارتکاز ٹوٹتا۔

"اتنی بڑی بڑی باتیں کرنا کہاں سے سیکھ لی ہیں اس ننھی سی لڑکی نے؟" اس کی مسکراہٹ ماذیہ کو ہمیشہ مسحور کردیا کرتی تھی۔

"محبت سکھاتی ہے۔"

"کسی سے محبت کرتی ہو؟"

"کس سے کرسکتی ہوں؟"

"میں کیا جانوں۔"

"میں بھی نہیں جانتی۔"

"پگلی!"

"ڈرامے باز۔"

وہ اس کے خفگی سے کہنے پر کھلکھلا اٹھتا اور وہ پھر اس کی چمکتی آنکھوں میں ٹمٹماتی نم سی ہنسی سے سحرزدہ ہوجاتی۔

دونوں ہی محبت کے ڈسے ہوئے تھے۔ ایک ناکام تھا تو شاد دوسرا بھی نہ تھا۔

بائیک پہ سوار وہ بے مقصد کینال روڈ ناپتے پھرتے۔ گرم ہوا کے تھپیڑے خوش گوار تو نہ لگتے مگر ماذیہ کے لیے اس کے ساتھ بے مقصد سا سفر بھی قیمتی متاع کی طرح تھا۔ اس کی دنیا انہی دو پہیوں پر بیٹھ کر شروع ہوتی۔ انہی پر ختم ہوجاتی تھی۔ بارش' جاڑا' بہار' تپش' انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ خود کو بانٹتے بانٹتے بہت سے موسم دیکھے تھے۔ احسن تو اس کے ساتھ دل کا درد بانٹتا تھا مگر وہ یہ بھی نہ کرسکی۔ اس کے پاس بانٹنے کو معمول کی باتوں کے سوا کچھ نہ ہوتا' پھر اچانک۔۔۔

اوائل اگست کی ایک برسات میں برگد کے گھنے پیڑ تلے پناہ لیتے ہوئے احسن نے اسے زندگی کی نوید سنا دی تھی۔

اس نے اس مسافر کی طرح تھک کر پڑاؤ ڈال دیا تھا' جو سالہا سال پاپیادہ چلتے رہنے کے بعد زخم زخم شل پاؤں اور خشک پیاسے ہونٹ لیے کسی جگہ ٹوٹتے ہوئے شہتیر کی مانند گرگیا ہو کہ اب جو ہو اس کا مقدر۔ اس بے چین' بے کل سے مسافر نے خود کو ماذیہ کی پناہ میں دے دیا تھا۔ تپتی ریت سے بنے آبلوں پر ماذیہ کے ٹھنڈے ہاتھ مرہم کے پھاہے بن گئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کسی اور کی محبت کی ناآسودہ تپش سے بے حال ہے' اس نے اسے اپنے دامن کی ملائمت و ٹھنڈک میں سمیٹ لیا تھا۔

ماذیہ کو لگا' اس کی بے آواز دعائیں مستجاب ٹھہری ہیں۔ اس کے کسی پسندیدہ عمل کے بدلے میں جھولی ستاروں سے بھردی گئی تھی۔ "زندگی اس قدر حسین بھی ہوتی ہے؟" احسن کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اس نے سیکڑوں بار خود سے پوچھا تھا۔

"اتنی آسانی سے محبت آپ کی جھولی میں ڈال دی جاتی ہے؟" بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

اسے پاس دیکھ کر۔۔۔ اسے چھو کر بھی نہیں۔

"بے شک عطا کرنے والی ذات کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں۔ وہ بڑا بے نیاز ہے' جسے چاہے نواز دے۔"

جذبۂ تشکر میں ڈوب کر وہ مسکرائی تھی اور کیمرے کے فلیش نے احسن کے پہلو میں بیٹھی ماذیہ کی مسکراہٹ سے چمکتے اس حسین ترین منظر کو ہمیشہ کے لیے امر کردیا تھا۔

نکاح کے مقدس بندھن نے دونوں کو محض ازدواجی رشتے میں نہیں باندھا تھا بلکہ اس کی طاقت نے احسن کے دل کو بھی پھیر دیا تھا۔ بولتے بولتے وہ چپ اب بھی ہوجاتا تھا جیسے بھول گیا ہو کہ بات کیا کررہا تھا مگر ماذیہ نے اپنی خدمت گزاری' وفا د محبت کے ذریعے اس کے دل کو حال میں جینا سکھا دیا تھا۔ اسے زندہ کردیا تھا۔

وہ ایک شوہر پرست عورت تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ وہ تو بانصیب لوگوں میں شامل ہوچکی تھی۔ اسے محبت عطا کردی گئی تھی۔ محبت اپنا اثر رکھتی ہے۔ اس کی سحر انگیز طاقت ور لہریں دوسرے فریق کے دل میں بھی سوتے پھوٹنے پر مجبور کردیتی ہے۔ احسن بھی رفتہ رفتہ اپنے خول سے باہر آگیا تھا۔

"میں شکر گزار ہوں اللہ کا کہ مجھے تم جیسی شریک حیات نصیب ہوئی۔" ماذیہ کے شانے پر سر رکھ کر اس نے بارہا اقرار کیا تھا۔ اس کے اندر تک ٹھنڈک سی اتر جاتی اور وہ چپکے سے ان لمحوں کے ہمیشگی ہونے کی دعا کرتی۔

گھڑی نے تین بجے کا اعلان کیا تھا۔

اس کی نظروں نے گھڑی کی سوئیوں سے بیڈ پر سوئے وجود تک کا سفر کیا تھا۔ جہاں اس کا محبوب شوہر محو خواب تھا۔

ذہین آنکھوں پر سجی پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ کھڑی ناک کے نیچے عنابی ہونٹ اور ٹھوڑی سے اوپر زیریں لب کے قریب باریک سا تل۔

"بھلا لڑکوں کے چہرے پر تل کا کیا کام؟ یہ تو لڑکیوں کی خوب صورتی میں اضافے کے لیے ہوتا ہے۔" وہ ہمیشہ چھیڑتی تو احسن کھلکھلا کے ہنس پڑتا۔

سکون اور نیند اس کے وجیہہ وجود کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ وہ سوتے ہوئے کسی معصوم بچے کی طرح لگتا اور ماذیہ کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا کرتا۔

وہ محویت سے اپنے محبوب کی پیشانی پر بکھرے بال دیکھے گئی۔ سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔

ہلکی سی کسمساہٹ کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ماذیہ یک دم گڑبڑا گئی۔ نیم روشن کمرے میں وہ چند لمحے ناسمجھی سے دیکھتا رہا' پھر بولا۔

"ماذی! طبیعت تو ٹھیک ہے؟" خمار آلود تشویش بھری آواز ابھری۔

"ہاں میں وہ۔۔۔ میں۔۔۔ پانی پینے اٹھی تھی۔" وہ یوں گھبرائی گویا چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔

انگلیاں چٹخاتی وہ نظریں نیچی کیے بیٹھی رہی جن میں نمی اتر رہی تھی۔

"پی لیا؟" وہ فکرمند ہوا تھا اس وقت اسے جاگتا دیکھ کے۔ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس کا دل بھر آیا۔

"تو پھر آؤ۔۔۔ سو جاؤ چندا!" اس نے بازو پھیلا کر کہا۔

سست روی سے اٹھ کر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے برابر جاکر لیٹ گئی۔ احسن نے دوسرا بازو اس کے اوپر رکھ لیا۔

ضبط کیے ہوئے آنسو پلکوں کی باڑ پھلانگ کر باہر نکل آئے تھے۔ کچھ دیر وہ گھٹ گھٹ کر روتی رہی' پھر اس کے دل میں آیا' وہ اپنے خوف کو زبان دے ڈالے۔

"مجھے۔۔۔ بہت ڈر لگ رہا ہے احسن!" وہ دھیرے سے بولی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔

ماذیہ نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک بار پھر سوچکا تھا۔

عورت کے قدم اپنی سسرال میں اس وقت مضبوط ہوتے ہیں' جب اس کی گود میں ننھے پھول مہکنے لگیں مگر پانچ سال گزرنے کے بعد یہ سعادت اس کے حصے میں نہیں آئی تھی۔

احسن کو بچوں کا بہت شوق تھا مگر اس کمی کا ذکر اس نے کبھی ماذیہ سے نہیں کیا تھا۔

"قدرت کے کاموں میں دخل اندازی کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔" ماذیہ کے دبی زبان میں کہنے پر وہ دھیرج سے سمجھاتا۔ "اس نے تم جیسی نیک اور وفاشعار بیوی سے نوازا ہے تو جب اولاد کی خوشی دینی ہوگی' وہ دے دے گا' تم کیوں فکر کرتی ہو۔"

احسن ان شوہروں میں سے نہ تھا' جو بیوی کے معاملے میں اظہار میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ ماذیہ اس کے سادہ سے اظہار چاہت پر کھل اٹھتی۔ پہلے سے بھی زیادہ خلوص زیادہ ایثار اور محبت سے رشتوں کو نبھاتی۔

"گھر کو جنت بنانے میں عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔"

امی کی کہی بات اس نے ثابت کردی تھی۔ اس بات کا اعتراف وہ خود کرتی تھیں۔

یہ گھر اس کی کل کائنات تھا۔ جہاں امن تھا، رشتے تھے اور اس کی محبت۔ مگر اس پرسکون نگری کے دریا میں پہلا کنکر ارسہ کی آمد تھی۔ جس نے تحفظ، مان اور سکون کے احساس کو یک دم تلپٹ کر ڈالا تھا۔

☆ ☆ ☆

ماذیہ اس پتنگے کی طرح تھی، جو ساری رات شمع کے گرد دیوانہ وار چکر کاٹتا ہے۔ اس کے گرد طواف کرتے ہر چکر میں قطرہ قطرہ اپنی جان کا نذرانہ محبوب کے قدموں میں ڈالتا جاتا ہے اور صبح سے قبل ہی بے دم ہو کر گر پڑتا ہے۔ گویا اس کے عشق کی معراج یہی ہو، اس کی بقا یہی ہو۔

محبت سے لبریز محض ایک رات کی زندگی۔۔۔

بیڈ پر لیٹی وہ سن سی آنے والے وقت کو سوچ رہی تھی۔ احسن اٹھ کر آفس جا چکا تھا، مگر اسے جگایا نہیں کہ رات کو جاگتی رہی تھی دیر تک۔

"ناشتا کس نے بنایا ہوگا۔ اسما، صالحہ تو صبح کالج، اسکول کی تیاری میں ہی لگی ہوتی ہیں تو کیا امی نے۔۔۔"

اسے شرمندگی نے آ گھیرا۔ اتنے سالوں کی روٹین میں جب سے اس نے کام سنبھالا تھا، ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر فریش ہوئی اور باہر آ گئی۔ امی رانی کے ساتھ مل کر پالک بنا رہی تھیں۔ وہ جلدی سے آگے بڑھی۔

"لائیں امی! میں بناؤں۔"

"نہیں بیٹی! پہلے ناشتا تو کر لو۔"

"جی اچھا!" وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ ناشتا کس کے حلق سے اترتا۔ گرم گرم چائے انڈیل کر وہ رانی کے ساتھ مل کر صفائی میں جت گئی۔

ڈرائنگ روم کے پردے، کشن، صوفہ کور زبدل کر ٹھیک سے ڈسٹنگ کر کے ایئر فریشنر اسپرے کیا اور دروازہ بند کر کے کچن میں آ گئی۔

مہمان خاص کی آمد شام تک متوقع تھی۔

آنے والے وقت کے لیے ماذیہ اپنا صبر مجتمع کر چکی تھی۔

احسن اس کے صبر کا ہی تو انعام تھا۔ اب بھی اسے یہی کرنا تھا۔

امی کو کھانے سے لے کر صفائی ستھرائی تک ہر چیز میں نفاست اور سلیقہ درکار تھا۔ ارسہ کی پسند کا پالک گوشت وہ اپنے ہاتھ سے بنا رہی تھیں۔ کالج سے آتے ہی صالحہ و اسما بھی کچن میں آ پہنچیں۔ سلاد بن رہا ہے، مختلف طرح کے میٹھے بن رہے ہیں۔

سات سال بعد امی کی چہیتی بیٹی اور صالحہ و اسما کی سب سے اچھی آپی گھر آنے والی تھی۔ ہر کوئی مسرور تھا۔ ہر کوئی مصروف تھا۔

مصروف تو وہ بھی بہت تھی اور خود کو مطمئن و پرسکون رکھنے میں اسے کتنی جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی یہ صرف وہی جانتی تھی۔ تمام کام نپٹا کر کھانوں کو دم لگا کر شدید تھکن لیے وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے سرپٹ بھاگتے ہوئے قیامت کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

اس کے لیے تو یہ قیامت ہی تھی۔

اپنے محبوب شوہر کی محبت گم گشتہ کو سامنے دیکھنا بہت جی داری کا کام تھا۔ اور ماذیہ خود میں اتنی ہمت نہیں مجتمع کر پا رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اس کا جی چاہا کمرا بند کر لے اور اس وقت تک نہ کھولے جب تک وہ آ کر واپس نہ چلی جائے۔

وہ ارسہ کی آمد پر اپنے محبوب کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ امی کی اس کی جانب لگاوٹ اور نرمی کے مظاہرے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ لاکھ کوشش کرتی مگر نہ تو اس میں اتنا حوصلہ تھا نہ ظرف۔۔۔

کیوں کہ وہ احسن کی صرف بیوی نہیں تھی، اس کی ہمراز بھی تھی۔ ارسہ کے لیے اس کی شدتوں سے واقف رہی تھی۔

روٹھ جانے والی محبت کے لیے ماذیہ نے ہمیشہ اپنا کندھا پیش کیا تھا تو اب کیسے وہ اسے سامنے دیکھ سکے گی۔

وقت کو پہیے لگ گئے تھے۔ گھڑی پر جمی اس کی نگاہیں سوئیوں کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں اور اس کے دل کی رفتار مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ شام نے رات کے آنچل میں منہ چھپا لیا تھا۔ کمرا مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ماذیہ نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ تاریکی سے ایک دم روشنی میں آنے پر آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی، پھر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آئینے کے سامنے آ گئی۔

خاکی رنگ کا ملبوس شکن زدہ تھا۔ اس نے ہاتھوں سے اس کی سلوٹیں کھولنے کی کوشش کی، پھر ہاتھ سے چہرے کے گرد بکھرے بال کان کے پیچھے اڑسے۔ صحت مند گلابی چہرے پر اس وقت زردی سی کھنڈی تھی۔ تھوڑا دور ہٹ کر اس نے سر سے پاؤں تک خود کو نظروں سے ٹٹولا۔

اس نے کبھی اپنا کسی کے ساتھ موازنہ نہیں کیا تھا مگر آج وہ یہ کر رہی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔

"جانے کیسی ہوگی وہ۔۔۔؟" اس کی خود کلامی بڑبڑاہٹ سے زیادہ نہ تھی۔ آئینے میں اپنے ہی عکس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے آج وہ اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔

درمیانے قد پر گندمی مائل گلابی کھلتی رنگت و گہری سیاہ آنکھیں، ہلکے گلابی بھرے بھرے ہونٹ، عام سے نین نقش، بات کرنے کا انداز بھی دل نشین نہ تھا، گفتگو سے ذوق جھلکتا نہ ہی فلسفہ کی آمیزش ہوتی۔

"تو پھر مجھ میں کیا تھا، جس نے مجھے احسن جیسے مکمل شخص کا ساتھی بنایا۔" وہ پھر بڑبڑائی۔

یہ وہ سوال تھا، جس کا جواب عطا کرنے والی ذات کے علاوہ کسی کے پاس نہ تھا۔

تقدیر ہمیشہ دور کھڑی اس کے بھولپن پر مسکرایا کرتی۔

"ارے پگلی! جو جس کے مقدر میں ہوتا ہے، اسے مل جاتا ہے۔" تقدیر کہتی۔

"میرا مقدر اتنا حسین کیسے ہو سکتا ہے، میں تو بہت گنہگار، ادنیٰ سی بندی ہوں رب کی۔" وہ استفسارانہ پلکیں جھپکتی تو تقدیر زور سے ہنس پڑتی۔

"زندگی کی فصیل میں خوابوں کی تعبیر وہ چور دروازہ ہے، جو صرف بصیرت رکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ امید کی مشعل اسے رستہ دکھاتی ہے اور وہ اس گپ چپ سے رستے پر چل کر اپنے خواب کو مجسم صورت میں پا لیتا ہے۔۔۔ مگر ملتا اسے ہی ہے، جو لگن رکھتا ہو۔"

تقدیر کسی سیانی بڑھیا کی طرح سر دھنتے ہوئے کہتی۔

"اچھا! مگر میں نے تو کبھی خود کو احسن کے قابل نہیں جانا، پھر میری جھولی جواہر سے کیوں بھر دی گئی؟"

وہ ششدر سی تقدیر کا منہ دیکھے جاتی۔

"تو تو پگلی ہے۔۔۔ سمجھتی نہیں، اس عطا پر اپنے رب سے راضی ہو جا۔ اس ٹھنڈے میٹھے چشمے سے سیر ہو کے پانی پی لے، جو تیری ملکیت قرار دے دیا گیا۔"

تقدیر اسے ہولے ہولے تھپکتی ہوئی چلی جاتی اور وہ مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیتی۔۔۔ مگر آج تو چین و سکون اس سے ڈر کر بھاگ رہا تھا۔ بے کلی اس میں یوں شکنجہ گاڑے بیٹھی تھی گویا عرصے سے تاک میں ہو۔

"میں احسن کی ساتھی بنا دی گئی تو اب۔۔۔ اب وہ کیوں آ گئی ہے۔۔۔ وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔۔۔"

دماغ کے کسی بہت حساس حصے میں باریک سی نوکیلی کیل کوئی مسلسل ٹھونک رہا تھا۔

"شاید میں بہت بدگمان ہو رہی ہوں۔۔۔ شاید ایسا نہ ہو جو میں سوچ رہی ہوں۔ وہ صرف ملنے ہی آ رہی ہو۔"

"اس کا صرف ملنے آنا بھی میرے لیے کتنی بڑی قیامت ہے، کوئی میرے دل سے پوچھے۔" دلیل بری طرح مسترد ہوئی تھی۔ جی کڑا کر کے رکھنے کا عہد بھربھری ریت بن رہا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی اور الماری میں سے سفید سوٹ نکال کر واش روم کی جانب بڑھ گئی۔

کپڑے بدل کر آئینے کے سامنے کھڑی بال

سلجھانے لگی۔

"اس سفید لباس میں تمہاری سونے جیسی رنگت میں گھلی گلابیاں مزید نمایاں ہوجاتی ہیں۔" احسن کا کہا گیا سراہتا ہوا فقرہ اس کی سماعتوں میں اترا۔

"یوں لگتا ہے گندم کے بھرے بھرے سنہری خوشوں کو دھند کی دبیز چادر نے لپیٹ کر سحر آفرین کردیا ہو۔"

وہ احسن کی عجیب بے تکی سی تشبیہہ پر کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ محبوب کی ایک پیار بھری نگاہ اور سراہتا ہوا ایک جملہ بھی اس عورت کی معراج ٹھہرتی ہے' جو اس کے عشق میں پور پور ڈوبی ہو۔

گھنے بالوں کی ڈھیلی سی چٹیا بنائی اور ہونٹوں پہ نیچرل کلر لپ اسٹک لگا کر وہ باہر نکل آئی۔ اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کرکے ایک لمحے کو اپنا خوف زائل ہوتا محسوس ہوا۔ ڈھیلے ڈھیلے انداز میں بیٹھی وہ کسی نامانوس سی آواز سننے کی منتظر تھی ڈور بیل بجی۔

"السلام علیکم!" دروازے سے ہی چہکتی ہوئی میٹھی سی آواز کے ساتھ ہی سب کے چہرے کھل اٹھے۔

کچھ لمحوں قبل زائل ہوتا خوف پھر سے اسے دبوچنے لگا۔ وہ اس آواز کی جانب دیکھے بنا غیر محسوس طریقے سے الٹے قدموں پلٹ گئی۔

کمرے میں جاکر واش روم میں بند ہوگئی اور واش بیسن پر جھک کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ کسی نے جلتے ہوئے کوئلے اس کی آنکھوں پہ رکھ دیے تھے۔ گرم آنسو رفتار سے بہتے چلے جارہے تھے۔ اور وہ شدومد سے اپنے رب سے حوصلے و صبر کی طلب گار تھی۔

"رحم فرما میرے مالک... صبر عطا کر۔" وہ اپنے قدموں کے اسی مضبوطی سے اس گھر میں جمے رہنے کے لیے دعاگو تھی۔

"بھابھی... ! بھابھی کہاں ہیں آپ؟ مہمان آگئے ہیں۔" صالحہ نے کمرے میں آکر آواز لگائی تھی۔ اس نے جلدی سے تولیے سے چہرہ رگڑا اور دوپٹا درست کرتی باہر نکلی۔

صالحہ جاچکی تھی۔ وہ کچن میں پہنچی اور برتن نکال کر ٹرے میں کولڈ ڈرنکس رکھ کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

سرسری سی اک نظر کے ساتھ مسکرا کر سلام کرتے ہوئے ماذیہ سب کو پیش کرنے لگی۔

سلام کے جواب میں ایک گہری جانچتی نظر اس پر ڈالی گئی۔

سفید ملبوس میں چمکتا سنہرا رنگ کمر سے نیچے تک بل کھاتی خوبصورتی سے گندھی چوٹی اس کا عام سا سراپا بھی خاص بنارہی تھی۔ دھلا دھلایا چہرہ ہلکا نم سا تھا اور آنکھوں میں گلابی ڈورے سے تیر رہے تھے جیسے آنسو ابھی بہہ کر نکلے ہوں۔ اس کے سنہری چہرے پر پھیلا گلابی سا سوز ایک انوکھی سی تاثیر پیدا کررہا تھا۔ عجب سا حزن تھا۔ تمام تر ملاحت کے باوجود اس کے چہرے پر کرب کی ایک لکیر سی تھی۔

مگر ارسہ اسے ایک عورت کی حیثیت سے نہیں' احسن کی بیوی کی حیثیت سے جانچ رہی تھی۔ بدمزا ہوکر نظریں ہٹالیں گویا ماذیہ اس کی توقعات کے برعکس نکلی تھی۔

کولڈ ڈرنکس دینے کے بعد ماذیہ نے کونے میں رکھا سنگل صوفہ بیٹھنے کے لیے منتخب کرلیا۔

بڑے حوصلے سے نگاہ اٹھا کر اس عورت پر ڈالی' جو اس کے شوہر کے لیے بہت عرصہ آبلہ بنی رہی تھی۔ اٹھی نگاہ جھکنا بھول گئی تھی۔

حسن مجسم صورت میں بیٹھا تھا۔

ہلکی گلابی شیفون کی ساڑھی سانچے میں ڈھلے وجود پر خوبصورتی سے لپیٹے ٹانگ پر ٹانگ جمائے رعونت سے بیٹھی وہ کسی ریاست کی شہزادی سے کم نہ لگ رہی تھی۔

سیاہ سینڈلز کی پٹیاں اس کی سفید پنڈلی کے گرد لپٹی تھیں۔

"آپی! آپ تو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگئی ہیں۔" صالحہ کے تعریف کرنے پر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ کندھوں سے نیچے تک سنہری ریشم کے لچھے جیسے

بال جھٹک کر ہنسنے کا انداز بھی نرالا تھا۔

امی آکر دوسری جانب اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھیں۔ ارسہ کا رخ بدلا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے سر ہلاتے ہوئے امی کی بات سن رہی تھی۔

"میری بچی سالوں بعد واپس پلٹی ہے۔ میری تو آنکھیں تجھے دیکھنے کو ترس گئی تھیں ارسہ!"

اس کے لیے امی کی محبت ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ جب بھی ذکر کرتیں ان کی آنکھیں خشک نہ رہتی تھیں اور اب تو وہ ان کے سامنے تھی' چنانچہ ان کا اختیار کھونا فطری بات تھی۔

چینی کی گڑیا ان کے وجود میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ ممتا کی گرمی اسے پگھلا رہی تھی۔

"بڑی عجیب زندگی گزاری ہے میں نے امی... پردیس میں ایک جلاد صفت آدمی کے ساتھ اتنے سال کیسے کاٹے ہیں۔ یہ میں ہی جانتی ہوں۔"

اس کا "امی" کہنا ماذیہ کو بڑا عجیب لگا۔

"بس میری بچی! نہ رو... پھولوں جیسی صورت کوئلوں میں مل گئی جاکے' مجھے پتا ہوتا تو میں کبھی تجھے جانے نہ دیتی یہاں سے۔" وہ اسے ساتھ لپٹائے بیٹھی تھیں۔

"اچھا ہوا جو قصہ ہی ختم ہوگیا' اب میں تجھے کہیں نہیں جانے دوں گی' یہیں رہے گی تو میرے پاس... اپنی ماں کے پاس۔" تھپکتے ہوئے انہوں نے اس کے سر پر بوسہ دیا۔

ماذیہ کا دل کٹ کر گرنے لگا۔ ایک بار پھر اسے لگا' اس کی آنکھوں کے آگے آنسوؤں کا پردہ حائل ہوجائے گا اور سب اس کی نظروں سے اوجھل ہوجائیں گے۔

گود میں ایک ڈھائی سالہ بچہ اٹھائے اسما کمرے میں داخل ہوئی۔ ماذیہ کے اندر کا جوار بھاٹا یکدم تھما تھا۔

سرخ پھولے پھولے گالوں والا اذان بھاگ کر اپنی ماں کے پاس گیا تھا۔

"ماما! ماما! یہ آنٹی نے مجھے چاکلیٹ دی ہے۔" اسما کی دی گئی چاکلیٹ پر خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ اس نے اپنی ماں کو اطلاع دی۔

"آپ نے آنٹی کو تھینکس بولا پھر؟" ارسہ نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا تو بچے نے نفی میں سر ہلادیا۔

"تو جائیں' اب کہہ دیں۔" وہ مڑا اور اسما کے سامنے جاکھڑا ہوا اور اپنا ننھا سا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"تھینکس آنٹی!" اسما اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کمرے میں باقی سب افراد بھی مسکرا اٹھے۔ بہت دیر سے خاموش بیٹھی ماذیہ نے پہلی بار منہ کھولا۔

"اذان... یہاں آئیں میرے پاس!" اس کے اندر کی ممتا ہمکنے لگی۔ بچے کی شفاف آنکھوں کی چمک اس کے دل میں گدگدی سی کررہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس تک پہنچا تو بے اختیار ہوکر ماذیہ نے اسے گود میں بٹھالیا۔

"کیا نام ہے آپ کا؟" اس کے گلنار سے چہرے پر پھیلی معصومیت کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"اذان!"

"بہت پیارا نام ہے' بالکل آپ کی طرح۔" اس کے پھولے گال کو چھو کر ماذیہ ہنسی اور اس کے ہاتھ میں پکڑی چاکلیٹ کا ریپر اتارنے لگی۔

"اذان! آپ ابھی یہ چاکلیٹ نہیں کھائیں گے۔ یہاں آئیں میرے پاس۔"

قدرے ترشی سے کہہ کر گویا ماذیہ کو ریپر اتارنے سے روکا گیا تھا۔ ماں کی آواز پر بچہ خود کو چھڑا کر اتر گیا۔ اس کی ایک دوستانہ سی کوشش بے سود گئی تھی۔ سبکی کے احساس سے اٹھ کر وہ باہر آگئی اور کھانے کے برتن لگانے لگی۔ ڈرائنگ روم سے احسن کی آتی آواز نے تیزی سے کام کرتے ہاتھوں کو روکا تھا۔ اس نے سوچا۔

"اچھا ہوا کہ وہ باہر آگئی۔ جانے کیا تاثرات ہوں گے احسن کے۔"

غائب دماغی سے وہ کچن سے ڈائننگ ٹیبل تک لوازمات لاکر رکھتی رہی اور پھر سب کو کھانے کی اطلاع دینے چلی گئی۔

کھانے کے دوران ہوتی گفتگو سے وہ یکسر لاتعلق

تھی۔ وہ تو اس وقت سلے لبوں والی اس کنیز کی طرح تھی جس کا کام محض حکم بجالانا تھا اور وہ یہ کر رہی تھی۔

وہ کمرے میں آ گئی۔ دل تھا کہ دھڑکن رو کے چپ سادھے پڑا تھا کسی نے اسے ساتھ کھانے کے لیے نہ کہا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ احسن نے آتے ہی ماذیہ کو نہ پکارا تھا۔ وہ ایک بار وہ کھانے کی ٹیبل پر ضرورت کی چیزیں دینے گئی مگر احسن گود میں بیٹھے اذان کو ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر کھلانے میں اس قدر محو ملا کہ ماذیہ کی موجودگی ایک بار پھر بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ سر تھامے اپنے کمرے کے وسط میں کھڑی وہ اپنی زندگی میں آئے اس موڑ پر ساکت و صامت تھی۔

"اب کیا ہو گا؟" سر سراتا سوال پھن پھیلائے کھڑا تھا۔

قہقہوں کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ عجیب وحشت میں گھر کر اس نے دروازہ بند کر دینا چاہا مگر اپنے نام کی پکار اس کو ایک بار پھر وہاں لے گئی۔

"بیٹی! مجھے کمرے تک چھوڑ آؤ ذرا عشاء کی نماز کا وقت بھی نکلا جا رہا ہے۔"

گھٹنوں کے درد میں مبتلا امی کو روزانہ ہاتھ تھام کر کمرے تک چھوڑنے کی ذمہ داری اسی کی تھی، خواہ کوئی پاس ہو یا نہ ہو اور ماذیہ نے اس ذمہ داری کو ہمیشہ خوش اسلوبی سے نبھایا بھی تھا۔

باقی سب صوفے پر بیٹھے سالوں پہلے ہونے والی کسی شادی کی تقریب کی درست جزئیات یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ماذیہ نے کسی پر بھی نگاہ ڈالے بنا آگے بڑھ کر امی کا ہاتھ تھاما اور باہر نکل گئی۔

"کیا آج کے دن میری موجودگی کو محسوس ہی نہیں کیا جا رہا... اتنے آرام سے میری نفی کر دی گئی ہے؟

اور احسن.....

میرا محبوب شوہر... کیا وہ بھی مجھے بھول بیٹھا ہے؟"

امی کو کمرے میں چھوڑ کر وہ کچن میں کافی دیر غائب دماغی سے کھڑی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی گویا سوچ رہی ہو وہ یہاں کیا کرنے آئی تھی۔ پھر اِدھر اُدھر بکھرے برتن سمیٹ کر سنک میں رکھنے لگی۔

"آج یہ میرے ساتھ سوئے گا... ہے نا اذان؟"

صالحہ اسے گود میں اٹھائے اپنے کمرے کی جانب جا رہی تھی۔ وفور حسرت سے اس کی آواز کھنک رہی تھی۔ بچے تو یونہی سب کو اپنا دیوانہ بنا لیتے ہیں اور اذان تو تھا بھی اتنا پیارا اور معصوم... پھر کیسے نہ سب کی توجہ کھینچتا۔

اسما اس کے پیچھے پیچھے لپک رہی تھی۔

"بس کرو تم اب اذان کو میرے ساتھ بھی کھیلنے دو۔" اسما نے اذان کو اپنی گود میں لینا چاہا۔

ماذیہ نے کچن میں سے دونوں نندوں کے والہانہ پیار کو حسرت سے دیکھا۔ کاش! بچے کا سکھ وہ بھی انہیں دے پاتی۔ وہ دونوں لڑتے لڑتے اپنے مشترکہ کمرے میں چلی گئیں۔ ماذیہ کو کھڑے کھڑے خلجان ہونے لگا۔

ڈرائنگ روم میں اس کے شوہر کے ساتھ وہ عورت موجود تھی، جو اس کی محبت رہ چکی تھی "اس کا روگ رہی تھی۔

اس کا دل دھڑ دھڑ جلنے لگا۔

باہر نکل کر وہ اس طرف دیکھنے لگی۔ اس کے اندر کی حاسد عورت اسے بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔ اسے لگا کوئی اسے دونوں ہاتھوں سے زور زور سے دھکے مار رہا ہے۔

"جاؤ! جاؤ! اپنی دنیا بچالو..."

عجیب وحشت میں گھری وہ یک ٹک ڈرائنگ روم کے دروازے پر پڑے پردے کو گھورتی رہی اور پھر کسی جادو کے زور سے چلتی ہوئی دروازے تک گئی۔

"ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔" ارسہ کی مترنم آواز چند مبہم سے الفاظ اس کی سماعتوں میں انڈیل کر خاموش ہو گئی۔

ماذیہ نے انہیں سمجھنے کی کوشش کی اور منتظر رہی کہ بات جاری رہے مگر اس ادھورے فقرے کے بعد کچھ لمحوں تک کوئی آواز نہ آئی تو ماذیہ نے دروازے پر

پڑے بھاری پردے کی دائیں جانب باریک سی جھری سے اندر دیکھا۔ گو اس غیر اخلاقی حرکت پر اس کا دل آمادہ نہ تھا مگر اس کے اندر کی حاسد اور شکست ریخت کا شکار عورت اسے یہ سب کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

سامنے سنگل صوفے پر احسن بیٹھا تھا اور اس کے بائیں طرف ارسہ اس کے چہرے پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی۔ ساڑھی کی خوبصورتی سے بنائی گئی فال پر ہاتھ دھرے وہ احسن کو ہی دیکھے جا رہی تھی۔ ماذیہ کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ ساڑھی احسن کے پسندیدہ ملبوس میں سے تھی اور ارسہ پر توجچ بھی بہت رہی تھی۔

"میں نے سوچا احسن نے شادی کرلی ہے تو ضرور کسی حسین مہ جبین سے کی ہوگی۔ جس نے تمہیں میری اسیری سے نکالیا۔" وہ بولی تو اس کے لہجے میں خود اعتمادی بھری تھی۔ ماذیہ کی آنکھیں سلگنے لگیں۔

"ہر وہ عورت حسین ہے، جسے اس کا شوہر دل کی ملکہ بنا کر رکھے۔" ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ احسن بولا۔

"تو وہ تمہارے دل کی ملکہ ہے؟" استہزائیہ انداز تھا یا سوالیہ، ماذیہ سمجھ نہیں سکی۔

"کیا یہ بچوں جیسی باتیں کرنا ضروری ہیں؟" احسن نے کہا مگر ارسہ نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"کیا وہ تمہارے دل کی ملکہ ہے؟"

"بے شک۔"

"کبھی یہ تم مجھے بھی کہا کرتے تھے۔"

"وہ میرا ماضی تھا۔"

"تو کیا ماضی جھوٹ تھا؟"

"میں نے ایسا نہیں کہا۔"

"پھر کیا کہا؟"

"ماضی گزر گیا ہے ارسہ!"

"یوں کہو، تمہاری زندگی سے اب میں گزر گئی ہوں۔"

"تم اپنی مرضی سے گئی تھیں۔"

"تم مجھے روک سکتے تھے۔"

"میں نے بہت روکا تھا۔"

"دل سے روکتے، میں کبھی نہ جا پاتی۔"

جذبات سے بھرے لہجے میں کہی بات نے احسن کے لبوں پر مہر لگا دی۔

ماذیہ کا لرزتا کپکپاتا ہاتھ پردے پر ٹک گیا، جسے اس نے مضبوطی سے تھام لیا۔

"میں ضدی ہوں، خود سر ہوں، شدت پسند ہوں، ایسے ہی خفا ہوتی تھی۔ ایسے ہی روٹھ کر چلی جایا کرتی تھی مگر تم ہمیشہ مجھے منا لیا کرتے تھے۔ روک لیا کرتے تھے، پھر اس وقت تم نے کیوں چپ سادھ لی تھی؟"

وہ جیسے احسن کا گریبان پکڑے شکوہ کناں تھی۔

ماذیہ اس کے مان سے پُر لہجے پر اپنی جگہ جمتی جا رہی تھی۔ پتھر کی مورتی بھلا کب کچھ سنتی ہے، کب کچھ محسوس کرتی ہے، وہ صرف اپنے اندر اٹھتے شور کو واضح سن رہی تھی، جو اس کے کان پھاڑے دے رہا تھا۔

"صرف ضد میں، میں نے سفیان سے شادی کرلی۔ اس جیسے شکی مرد کے ساتھ شادی میری زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی احسن! ایسی غلطی جس کا خمیازہ زندگی دے کر چکایا جاتا ہے۔ وہ انسان نہیں، جانور ہے۔ ان سات سالوں میں کوئی دن ایسا نہیں تھا جب اس نے مجھے تمہارے ساتھ وابستگی کے طعنے نہ دیے ہوں۔ کوئی موقع ایسا نہیں تھا جب تمہارے حوالے کے تیر اس نے میرے جسم میں پیوست نہ کیے ہوں۔"

وہ اس بوڑھی غم زدہ عورت کی طرح اپنا آپ بیان کر رہی تھی، جسے عرصہ دراز بعد مونس و غم خوار نصیب ہوا ہو اور وہ ہمکتے بلکتے اذیت کی تہہ میں جمی پور پور اسے دکھا دینا چاہتی ہو۔

"مجھے... مجھے تمہاری بددعا لگ گئی احسن! کہ میں ایک مطلقہ روپ میں تمہارے پاس آگئی ہوں۔" بھیگی آواز میں وہ ہنس پڑی۔

خاموشی سے بہت سے لمحے سرک گئے۔

"میں نے تمہیں کبھی بددعا نہیں دی ارسہ!" بہت

دیر بعد وہ بولا تھا۔ احسن کے لہجے میں گھلی افسردگی ماذیہ کے پیروں سے جان نکالنے لگی۔

احسن نے نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ بے شک آنکھیں جذبات کی عکاس ہوتی ہیں۔ اس کی نظر میں بھی کوئی جذبہ ہولے ہولے ہلکورے لے رہا تھا۔ شاید ترس... ہمدردی... ضبط یا گزرے دنوں کا تاسف۔ کچھ تو تھا جو ماذیہ کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"تم نے تو کہا تھا تم کبھی شادی نہیں کروگے؟" نیم سنجیدہ انداز میں ہنستے ہوئے ارسہ نے کہا۔

ماذیہ کا پورا جسم کان بن گیا۔ کیا جواب آتا ہے...؟ کس لہجے میں میں آتا ہے...؟

"کہتے تو ہم بہت کچھ ہیں مگر تقدیر ہمارے فیصلوں پر کبھی نہیں چلتی۔" ٹھہرے ہوئے پُرسکون لہجے میں جواب آیا۔

چینی گڑیا کی نقرئی گھنٹیوں کی سی آواز گونجی مگر اس میں طنز کی اتنی کاٹ تھی کہ وہ کانوں کو بھلی نہ لگ رہی تھی۔

"ہاں میں جانتی ہوں... انسان اپنی صفائی میں بودی سے بودی دلیل دے سکتا ہے۔"

"شاید تمہیں بودی لگے، مگر ہے یہ اٹل حقیقت۔"

"حقیقت تو مجھ سے محبت بھی تھی... دیوانہ وار... والہانہ... شدید..."

ماذیہ کو ارسہ اس ناگن کی طرح لگی، جو قطرہ قطرہ اس کے شوہر میں زہر اتار رہی ہو۔ اس کا دل کہنے لگا آگے بڑھ کر اس سنپنی کا سر کچل دے مگر منوں وزنی قدم اٹھانا محال لگتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے برف کی سل پر لا کھڑا کیا تھا اور وہ چاہ کر بھی برف پر جمے تلوے اٹھا کر چل نہیں سکتی اور اگر اس نے ایسی کوشش کی بھی تو پیروں کی کھال اکھڑ کر برف سے ہی چپکی رہ جائے گی۔

"اف خدایا..." وہ کراہی۔

"یہ عورت کیا کرنا چاہتی ہے آخر... اب کیوں ان زخموں کو ادھیڑ رہی ہے جنہیں سینے میں، میں نے اپنی انگلیاں لہولہان کرڈالیں مگر آہ تک نہ کی..."

"پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ ماہ و سال میرے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہوگئے جن سے بچنے کی خاطر میں فرار ہوئی تھی، بے وقوف تھی۔ جہاں زندگی چھوڑ گئی تھی بھلا اس سے فرار کیسے ممکن تھا۔"

کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائے وہ دھیمی مسکراہٹ سے یوں بول رہی تھی جیسے آج سب کہہ دینے کا دن تھا، اگر اس نے ذرا بھی سلسلہ کلام توڑا تو دوبارہ کبھی موقع نہیں مل پائے گا۔

"جب یہاں سے گئی تو لٹی پٹی بے حال تھی۔ پھر انا کے بوجھ میں اپنی ہی روح کو کچل کر جینے کی کوشش میں تھک کر چور لوٹی۔ میرے ہاتھ تو اب بھی خالی ہیں اور دل... دل بھی پاس نہیں ہے، وہ تو سات سال پہلے ہی یہاں چھوڑ گئی تھی... تمہارے پاس۔"

آخری الفاظ بہت آہستگی سے کہے گئے تھے مگر لرزتی کانپتی ماذیہ پر پہاڑ کی طرح گرے تھے۔

احسن نے کارپٹ سے نگاہ اٹھا کر بغور اس کی جانب دیکھا۔

گہری آنکھوں پر سجی خم دار پلکوں کی جھالر، کمان سی تنی بھنویں، اخروٹی رنگ ریشمی بال، خوبصورت نقوش... ایک ایک نقش وہی تھا، جس سے اس نے والہانہ محبت کی تھی۔ جس کی خاطر وہ دنیا تیاگ دینے کو تیار تھا۔ وہ ویسی ہی تھی اب بھی۔ سراپا حسن، سراپا ٹھنڈک...

مگر پہلے اور آج میں بہت فرق تھا۔ تب وہ بے نیاز رہتی تھی آج وہ... نیازمند کھڑی تھی۔

"احسن! کیا تم اب بھی... اب بھی مجھ سے..."

ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوتے نامکمل سے جملے میں پوشیدہ سوال اس شخص سے تھا، جو اسے اپنا آخری سہارا لگ رہا تھا۔

احسن اس کے چہرے پر رقم تحریر پڑھ سکتا تھا۔ آنکھیں موند کر اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا لیا، جیسے تھکن سے چور ہو چکا ہو۔

دھندلائی ہوئی آنکھوں کو سختی سے رگڑ کر ماذیہ نے اپنے شوہر کو دیکھنے کی کوشش کی۔

احسن کا جواب اسے ایک بار پھر حیات کی نوید بھی دے سکتا تھا اور زندہ لاشہ بھی بنا سکتا تھا۔ اس کے منہ سے ادا ہونے والے لفظ اسے اس مسافر کی طرح دربدر بھی کر سکتے تھے، جسے سالوں بعد منزل سامنے آنے کے بعد پھر بھٹکا دیا جائے اور سفر کی تمام صعوبتیں ختم کر کے منزل کا نشان بھی دے سکتے تھے۔ اندر اٹھتی درد کی لہروں سے اس کے لب کپکپا اٹھے۔

اسے گمان ہوا وہ کوئی جواری ہو، جو اپنے سارے پتے کھیل لینے کے بعد آخری پتے پر بازی لگائے بیٹھا ہو اور ہار و جیت کے بیچ بس لمحوں کا فاصلہ ہو۔ اور تب اس پر یکایک یہ حقیقت آشکار ہو کہ زندگی سے بڑھ کے تو کچھ بھی نہیں۔ اگر وہ جیت جاتا ہے تو سب کچھ اس کی جھولی میں آگرے گا لیکن اگر وہ ہار جاتا ہے تو۔۔۔

اگر وہ ہار جاتا ہے تو اس کی زندگی اس سے چھین لی جائے گی۔ اس لمحے جواری کا ہاتھ خوف سے کپکپا اٹھتا ہے۔ وہ اس آخری پتے کو پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ ہار اور جیت کے درمیان حائل اس بال جیسی لکیر کو پاٹنا ہی نہیں چاہتا۔

ماذیہ اسی جواری کی طرح دم سادھے کھڑی تھی۔ وہ اپنے شوہر کا جواب نہیں سننا چاہتی تھی۔

وہ جواب ماذیہ کے حق میں بھی ہو سکتا تھا۔ مگر وہ زندگی اور موت کے بیچ اس لمحہ پر سٹہ کھیلنے کو تیار نہ تھی۔ اس کا جی چاہا وہ احسن کو آواز دے لے، اسے بلا لے۔ وہ اندر داخل ہو جانا چاہتی تھی مگر اس کے پاؤں جسم کا بوجھ ڈھونے سے انکاری تھے۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ صحن کے آگے برآمدہ نیم تاریک تھا۔ بائیں جانب کونے میں بنے دو کمرے میں سے ایک روشن تھا، جہاں امی نماز ادا کر رہی تھیں۔ اس نے اوپر کی منزل کی جانب دیکھا، جہاں صالحہ اور اسما اپنے کمرے میں اذان کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔

کاش کوئی آجائے۔

غیبی مدد کیسے وقت پر ہوتی ہے آخر۔

رحمت کا فرشتہ کون سے چور دروازے سے داخل ہوتا ہے۔۔۔

کوئی تو آئے۔۔۔ کوئی تو میری راجدھانی کو ریزہ ریزہ ہونے سے بچائے۔۔۔ کوئی تو اس شب خون مارنے والی عورت کے منہ پر طمانچہ مارے۔

بوجھل ترین خاموشی تین نفوس پر۔۔۔ قیامت بن کر بیت رہی تھی۔ ان میں سے دو وجود سراپا سماعت بنے ہوئے تھے۔ کہے جانے والے الفاظ ایک کے لیے نوید حیات ہوتے تو دوسرے کے لیے مژدۂ موت۔۔۔

احسن نے صوفہ کی پشت سے سر اٹھایا اور آنکھیں کھولیں۔ چند لمحے ارسہ کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ بے حد دلفریب انداز میں مسکرایا۔۔۔ دروازے کی چوکھٹ کے اس پار کھڑی ماذیہ اپنی محبوب ہستی کی یہ مسکراہٹ پہچانتی تھی۔

فیصلہ کن۔۔۔ مطمئن سی مسکراہٹ۔۔۔ گویا فیصلہ ہو چکا ہے۔

"اب بھی میں تم سے کیا ارسہ۔۔۔؟؟" اس تمام عرصے میں پہلی بار وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تھا جیسے سات سال پہلے بولا کرتا تھا۔

"محبت احسن!" اس قدر صاف طور پر کہتے ہوئے اس کا لہجہ ذرا بھی متزلزل نہ ہوا۔ نہ ہی اس کے لب کپکپائے۔ جانے خود غرضی کی کون سی انتہا تھی، جب ایک انسان خود کو بلند کرنے کے لیے اپنی تسکین کی خاطر کسی دوسرے بشر کی ہڈیوں کو سیڑھی بناتا روندتا ہوا گزرتا چلا جاتا ہے۔ ارسہ اسی سفاکی بے حسی و ڈھٹائی سے کسی کے شوہر کے سامنے گزشتہ محبت کی دہائی دے رہی تھی۔

"محبت۔" احسن بڑبڑایا۔

"تمہیں یہ لفظ بولتے ہوئے دقت نہیں ہوتی ارسہ؟" سوال کاٹ دار تھا۔

"نہیں۔۔۔ کیوں کہ میں نے محبت کرنا تم ہی سے سیکھا ہے۔"

"مگر میں نے محبت نبھانا اپنی بیوی سے سیکھا ہے۔" بے حد نرمی سے کہا گیا۔ ارسہ کے نیم وا لب سختی سے باہم بھینچ گئے۔ وہ احسن کے ساتھ سات سال پہلے کا سفر کر چکی تھی۔ اس موقع پر کسی "تیسرے" کا

ذکر خاصا ناگوار گزرا تھا۔

"ماذیہ نے مجھے سکھایا ہے وفا کرنا۔۔۔ اس کی روح میں جھانک کر میں نے سمجھا کہ انسانوں کو ایک دوسرے کا لباس کیوں قرار دیا گیا ہے۔۔۔ ہاں وہ ایسی ہی ہے جس نے مجھے اس حالت میں ڈھانپا جب میں تار تار برہنہ روح لیے محبت کے پیچھے بھاگتا پھرتا تھا۔۔۔ اس نے میرا ہاتھ تب تھاما، جب میرا لڑکھڑاتا وجود ڈھے جانے کو تھا۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

"ایک عمارت کو نئے سرے سے بنانا آسان ہے ارسہ! کسی منہدم کھنڈر کو پھر سے مضبوط بنیادوں پر تعمیر کرنا بہت مشکل ہے۔ ماذیہ نے اپنا سب کچھ تج کے مجھ پر چاہت کی برسات کی اور اب جب میرے اندر باہر میرے گھر کی ہر شے اس کے ہاتھوں کی خوشبو سے مانوس ہو چکی ہے، تب تم میرے سامنے اس محبت کا سوال اٹھائے کھڑی ہو، جو سات برس پہلے انا کے سامنے ہیچ ٹھہری تھی؟؟؟"

ارسہ حیرت سے اس شخص کا بالکل بدلا ہوا روپ دیکھ رہی تھی۔ جس پر بہت سالوں بعد پہلی نظر ڈالتے ہی وہ پھر سے اسیر ہو گئی تھی۔ یہ وہ احسن نہ تھا، جسے وہ جانتی تھی یہ تو کوئی اور ہی تھا۔

"جو میرے ساتھ ہوا۔۔۔ وہ میں ماذیہ کے ساتھ نہیں کر سکتا۔"

بات ختم کر کے احسن کے پر وقار سنجیدہ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ سج گئی تھی۔ ماذیہ نے احسن کی مسحور کر دینے والی مسکراہٹ بغور دیکھی اور سحر زدہ ہو گئی جیسے پانچ سال قبل ہوئی تھی اور آج تک اس سحر سے نہیں نکل پائی تھی۔ اسے لگا، وہ پھر سے احسن کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔

اب وہ ارسہ کی دائیں طرف دیوار پر لگی ماذیہ کے ہاتھ سے بنی پینٹنگ دیکھ رہا تھا، جس میں بے حد نفیس رنگوں کے امتزاج سے کلمہ طیبہ خوش خطی سے لکھا گیا تھا۔ الفاظ کے کناروں پر سفید رنگ اتنی مہارت سے بھرا گیا تھا کہ دیکھنے والے کو لفظوں سے روشنی پھوٹنے کا گمان ہوتا تھا۔

"ماذیہ کہتی ہے کہ ہمارا رب اس قدر رحیم و کریم ہے کہ جب ہم سے کچھ بہتر چھینتا ہے تو بہترین سے نواز دیتا ہے۔ بے شک وہ صحیح کہتی ہے۔"

لفظوں میں تیقن لیے وہ مسکراتی نگاہیں پینٹنگ پر جمائے اسے تکے جا رہا تھا۔

یہ لفظ نہیں تھے۔ زندگی کی بشارت تھے۔

ہچکیوں سے روتا جان کنی کے عالم میں کھڑا ماذیہ کا خاکی پتلا اپنے محبوب کی نرم پھار جیسی بات سہہ نہ سکا۔ پردے کو مضبوطی سے تھامے مٹھی ڈھیلی پڑ گئی اور وہ اسے پکڑے پکڑے ہی کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین پر آ رہی۔ مگر بند ہوتی بھیگی آنکھوں نے پردے کی سرسراہٹ پر احسن کو چونک کر اٹھتے اور پریشان حالت میں والہانہ اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا۔

محبت کی بساط پر اسے مات نہیں ہوئی تھی۔

محبت خواہ کتنی ہی منہ زور اور طاقتور کیوں نہ ہو، وفا شعاری و خلوص و ایثار میں لپٹی نرم نرم ٹھنڈی پھوار جیسی روح کو تھپکیاں دیتی انمول چاہت ہمیشہ اس پر سبقت لے جاتی ہے۔

✡

قرۃ العین چنا

حاصل لاحاصلیت

آج کا دن اپنی شروعات کے ساتھ ہی بہت تھکا دینے والا ثابت ہوا تھا۔ میں ابھی ابھی فاخر کے اسکول سے واپس آئی تھی۔ آج ان کے اسکول میں ٹیچرز پیرنٹس میٹنگ تھی۔ عاقب تو آفس کی مصروفیات کی وجہ سے جا نہ پائے۔ سو مجبوراً" مجھے ہی جانا پڑا۔

ایک بجنے میں دس منٹ تھے' جب میری واپسی ہوئی۔ کچن کا سارا کام جوں کا توں ہی پڑا تھا۔ کاؤنٹر پر پھیلے چائے ناشتے کے برتن' جگہ جگہ بکھرے کپ اور پانی کی بوتلیں۔ جو وقتاً" فوقتاً" بچے اور بڑے پی کر واپس رکھنے کی زحمت سے بچنے کے لیے کاؤنٹر پر ہی دھر کے چلے جاتے۔

میں نے ایک لمبا سا سانس لیا۔

جٹھانی صاحبہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ بڑی فرصت سے پلنگ پر بیٹھی ٹی وی دیکھنے میں مشغول تھیں۔

سچ کہتی ہیں امی (میری ساس) انہیں بس فیشن اور ٹی وی پروگرامز سے دلچسپی ہے۔ اور میں کہیں بھی چلی جاؤں مجال ہے جو وہ میرے حصے کا کام کردیں۔ چاہے جتنی بھی دیر ہو جائے۔ تھکے ہارے واپس آکر خود ہی کرنا ہوتا۔

"آگئیں تم؟ بہت دیر نہیں کردی تم نے؟" مجھ پر نظر پڑی تو ٹی وی آف کرکے باہر آگئیں۔

"خیر دیکھو تو دھوپ اور گرمی میں کیسی سنولا سی گئی ہو۔ پہلے دو گھڑی بیٹھ کر پانی تو پی لو' پھر کام بھی کرتی رہنا۔"

ابھی میں دیر سے آنے کا سبب بیان بھی نہ کرپائی تھی کہ انہوں نے دوسری بات بھی شروع کردی۔ اور پھر یہ تو ریحانہ بھابھی کی پرانی عادت ہے' بنا کہے مشورہ دینے کی۔

میں کچن میں کھڑی کام کررہی تھی اور ان کے چہرے پر ذرا بھی شرمساری نہیں تھی۔ جھوٹے منہ بھی نہیں کہا کہ میں دو گھڑی دم لے لوں' کچن وہ سمیٹ لیتی ہیں۔ لیکن وہ ایسا کیوں کہتیں۔ اگر سمیٹنا ہوتا تو میری آمد سے قبل ہی نہ سمیٹ لیتیں۔ پر ان کے نازک مزاج کو کہاں منظور تھا' اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنا۔

جب سے میری شادی ہوئی تھی' انہوں نے ہر کام سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ گھر کے متعدد کاموں کے علاوہ ساس سسر اور دیور کے ذاتی کام بھی میں ہی نبٹایا کرتی تھی۔ وہ ایک وقت کا کھانا بنالیں تو وہی احسان کافی ہوتا۔

میری ساس کو کچھ سال پہلے فالج کا اٹیک ہوا تھا' جس کے بعد وہ مکمل طور پر بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایسے میں ان کی دیکھ بھال' پرہیزی کھانا اور فزیو تھراپی کی روزانہ پریکٹس کے لیے میں کیسے وقت نکالتی تھی۔ وہ مجھے ہی پتا تھا۔ اوپر سے بھابھی کے طنز۔

"کیسی سوکھ کے کانٹا ہو گئی ہو' ذرا بھی پہلے جیسی رونق نہیں رہی۔ دیکھو تو' آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں تمہارے۔"

بھابھی کی یہ باتیں سن کر کبھی کبھی مجھ سے بھی آئینے میں اپنی صورت نہیں دیکھی جاتی۔ بھابھی کی کہی باتیں جی جلاتی تھیں۔ دو اسکول جانے والے بچوں' شوہر' ساس' سسر' دیور اور گھر کی ذمہ داریوں نے میری تمام توانائیاں نچوڑ کر مجھے ادھ موا سا کردیا تھا۔

"اب ہر کوئی ریحانہ بھابھی جیسا تو ہو نہیں سکتا۔ بے مروت' اور خود غرض۔ اپنے علاوہ انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔"

"سچ عائزہ! ان گھر کے چکروں میں تم نے خود کو کھپا دیا ہے۔" وہ ہر وقت مجھے احساس دلاتیں یا شاید ورغلاتیں۔

"کیا ملے گا تمہیں ان فالتوں لوگوں کے لیے خود کو گنوا کر؟ کیا پایا ہے تم نے مفت کی ملازمہ بن کر؟" وہ منہ بنا کر کہتیں' وہ چلی جاتیں اور میں دیر تک کڑھتی رہتی۔

"آخر وہ مجھے یہ سب کیوں سناتی ہیں خود تو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ اوپر سے مجھ پر بھی تنقید کرتی ہیں۔"

میں اکثر خود سے ہی الجھ پڑتی۔

☼ ☼ ☼

ایک دن میں نے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ بہت سونی سونی سی لگی' جبکہ ریحانہ بھابھی کی سنگھار میز ہر وقت سولہ سنگھار کے تمام لوازمات سے سجی ملتی۔ جن کا استعمال ان کی روزانہ روٹین کا حصہ تھا۔ وہ خود پر توجہ بھی بہت دیتی تھیں۔ اسی لیے ہر وقت چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں حالانکہ میری طرح ان کی آنکھیں بڑی تھیں نہ ہی رنگت کھلتی ہوئی تھی۔ بس سب ان کریموں کا کمال تھا۔

میں نے اپنی شکل دیکھی۔ مرجھایا چہرہ' پھیکی رنگت اور بجھی بجھی آنکھیں۔ میں نے آہستہ سے اپنے چہرے پر انگلیاں پھیریں۔ سچ کہتی ہیں ریحانہ بھابھی' میں نے بہت کچھ گنوا دیا ہے۔

ایک انجانا سا بوجھ میرے سینے پر آدھرا۔ میں خود سے نظریں چرا کر باہر نکل آئی۔ ریحانہ بھابھی کچن میں ہی کھڑی تھیں۔ وہ جوسر میں اپنے لیے تازہ پھلوں کا جوس بنا رہی تھیں۔

میں خود پر ضبط کے بند باندھتی امی کے لیے پرہیزی کھانا تیار کرنے لگی۔ پھر ابو کی پسند کی کھیر بھی بنانی تھی۔ میں نے ایک برتن میں چاول بھگو کر رکھے۔ فاخر کے لیے نوڈلز بنالیے اور ساتھ میں گھر والوں کے لیے سبزی کا سالن۔ میں نے خود کو دیکھا' میں وہاں نہیں تھی۔ میری جگہ تو ایک مشین کھڑی تھی جس کے آٹھ آٹھ ہاتھ تھے اور جو ایک وقت میں چار چار کام نمٹا رہی تھی۔

سالن تیار کرکے ابھی میں نے آٹا گوندھنا شروع کیا تھا کہ ابو نے پکار لیا۔

"بیٹا! ظہر کا وقت ہو رہا ہے' میرا سفید کرتا استری کردو۔" ان کی بے وقت کی فرمائش سن کر میرے ضبط کی حدیں ٹوٹنے لگیں لیکن میں خاموشی سے ہاتھ دھو کر آئی اور ان کا کرتا استری کرنے لگی۔

کبھی کبھی یوں ہڑبڑاہٹ میں ایک کام کو بیچ میں چھوڑ کر دوسرا کرتے ہوئے کتنی چڑچڑاہٹ ہوتی ہے' ویسا ہی میں بھی محسوس کررہی تھی۔

"آخر میں ہی قربانی کا بکرا کیوں بنی ہوئی ہوں؟

ریحانہ بھابھی بھی تو ہیں۔ کتنے دھڑلے سے سسرال میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ مجال ہے جو کوئی ان سے کچھ کہے بھی۔ ایک میں ہی اللہ میاں کی گائے مل گئی ہوں گھر والوں کو' لیکن نہیں... اس میں گھر والوں کا کیا قصور ہے۔ قصور تو میرا ہی ہے۔ مجھے ہی شوق چرایا تھا ضرورت سے زیادہ اچھا بننے کا۔ چپ چاپ ہر ذمہ داری کو اپنے سر لینے کا اور خاموشی سے سب کے کام کردینے کا۔ قصور تو میرے والدین کا ہی ہے' جنہوں نے میری تربیت ہی ایسی کی ہے' جو میں کسی کو "نہ" نہیں کہہ پائی۔ سب کا درد اپنے سینے میں لیے پھرتی ہوں۔ سب کی ضرورتوں کا خیال رکھتی ہوں' مجھے ہی انکار کرنا نہیں آتا۔ اگر مجھے بھی تھوڑا بہت ڈھٹائی کا سبق پڑھالیا جاتا تو آج مزے سے بیٹھی میں بھی ٹی وی پر کوئی دلچسپ فیشن شو دیکھ رہی ہوتی۔"

کرتا استری ہوگیا تھا۔ میں نے آنسوؤں کو اپنے اندر اتار کر استری کا پلگ نکالا۔ کچن کا کام نبٹاتے نبٹاتے دوپہر کے ساڑھے تین بج چکے تھے' پھر فاخر کو تیار کرکے ٹیوشن پر بھیجا اور واشنگ مشین نکال کر کپڑے دھونے کھڑی ہوگئی۔ ریحانہ بھابھی اپنے بچوں کے اور شوہر کے کپڑے الگ دھوتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

امی کی طبیعت اچانک ہی خراب ہوگئی تھی۔ انہیں دمہ کا اٹیک ہوا تھا جو ان کی پرانی بیماری تھی مگر اس دفعہ تکلیف شدید تھی۔ میں سب کچھ بھول بھال کر ان کی تکلیف پر تڑپ اٹھی۔

ساری رات انہیں اسپتال میں ہی رکھا گیا تھا۔ صبح قریباً" ساڑھے دس بجے عاقب اور عمیر بھائی انہیں گھر لے کر آئے تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ نحیف لگ رہی تھیں۔ معمولی سی بات کرتے ہوئے بھی ان کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ سب نے انہیں منع کیا کہ وہ کوئی بات نہ کریں۔ سکون سے رہیں۔

"آپ آرام کریں۔ آپ کی صحت کے لیے آرام بہت ضروری ہے۔" ریحانہ بھابھی نزاکت سے تاکید فرما کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ حسب سابق سب کچھ مجھے ہی دیکھنا پڑا۔

گھر کی ذمہ داری' بچوں کے سو کام اور ایک بیمار کی تیمار داری جان کو کتنے عذاب میں ڈالتی ہے' وہ میں خوب محسوس کررہی تھی مگر میرے ماتھے پر ایک بھی بل نہیں تھا۔

"ہیرا ہے ہیرا میری چھوٹی بہو۔" امی کے پیر دھلوانے کے لیے میں ٹب میں نیم گرم پانی لے کر آرہی تھی' جب ان کی آواز نے میرے قدم روک دیے۔ وہ عیادت کے لیے آئی ایک پڑوسن سے مخاطب تھیں۔

"خدا اسے دو جہاں کی خوشیاں دے۔ نجانے اللہ کو میری کون سی نیکی پسند آگئی' جو اتنی گنوں والی بہو میرے نصیب میں لکھ دی۔ ریحانہ سے تو میں کوئی امید ہی نہیں رکھ سکتی۔ اس قدر کاہل اور ڈھیٹ ہے کہ مت پوچھو' ساری والدین کی تربیت ہوتی ہے۔ سمجھداری' متانت' فرماں برداری' رکھ رکھاؤ اور اخلاق... کون سی خوبی ہے' جو عائزہ میں نہیں ہے۔ اگر آج میری سگی بیٹی ہوتی تو شاید اتنا صبر اور حوصلہ اس میں بھی نہ ہوتا۔ شاید وہ بھی میری اتنی خدمت نہ کرپاتی' جتنی عائزہ کررہی ہے۔"

بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جہاں امی کے لفظوں نے میرے مان و رتبے کو بڑھا دیا' وہیں اپنی جگہ میں شرمسار بھی ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی' ریحانہ بھابھی کی باتوں کی وجہ سے میرے ذہن میں بھی خناس بھر گیا تھا جو کہ امی کی باتوں کے اثر سے زائل ہونے لگا۔ کاش! میں انہیں بتا پاتی کہ بے شک میں نے خود کو گھر کے کاموں میں کھپا دیا ہے۔ اپنی خوبصورتی کو ضائع کیا ہے لیکن بدلے میں بہت کچھ کمایا بھی تو ہے۔

کسی کا فخر' کسی کا مان' ماں باپ کی تربیت و پرورش کی سرخروئی اور اچھے لفظوں میں اپنا تذکرہ۔ یہی تو ہوتا ہے حاصل زیست...

☼

آسیہ رزاقی

آخری کوشش

"صغریٰ!... اری او صغریٰ! بچی ذرا دوڑیو' ادھر تو آ۔"

اماں کی آواز صور اسرافیل سے کچھ ہی کم ہوگی۔ رافعہ بھی ان کی پکار کا مقصد سمجھتی تھیں جھنجلا گئیں۔

"اماں! حد ہے صبح صبح ہی آپ کو ضرورت پڑ گئی۔"

"ارے! پوری رات الجھن میں گزر گئی میری۔ کمبخت نہ یاد آیا۔ نہ نیند آئی۔ اب بھی کیا سارا دن اسی عذاب میں گزار دوں؟ تمہیں خیال ہوتا ماں کا تو کاہے کو صبح صبح تمہاری رانی نوکرانی کو پکارتی؟ ارے! آگئی صغریٰ۔ جا تو اوپر بڑی آپا سے پوچھ کر آ۔ جمیلہ پھپھو کے بیٹے کا بھلا کیا نام ہے' اچھا سا۔ دوڑ جا۔ میرا نام لے کر پوچھیو" مزید تاکید کی۔

"کیوں؟ آپ کا خیال ہے' میرا نام لینے سے نہیں بتائیں گی؟"

رافعہ کی تیوری پر بل اماں کو نظر نہ آئے۔ گردن موڑ کر بولیں۔ "کیا جانوں؟ اری تو ابھی یہیں کھڑی ہے... اور ٹکر ٹکر گھور کیوں رہی ہے؟ ہاں! بتا کیا کہے گی؟"

"میں کہوں گی' نانی پوچھے ہیں' ثمینہ کے بیٹے کا اچھا سا نام بتاؤ۔" صغریٰ بولی۔

رافعہ نے طنز بھری نظریں اماں پر گاڑ دیں۔ جو اپنے سوال کے بگڑے انداز کو دیکھ کر تلملا گئیں۔

"کمبخت' آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ مجھ سے

مکمل ناول
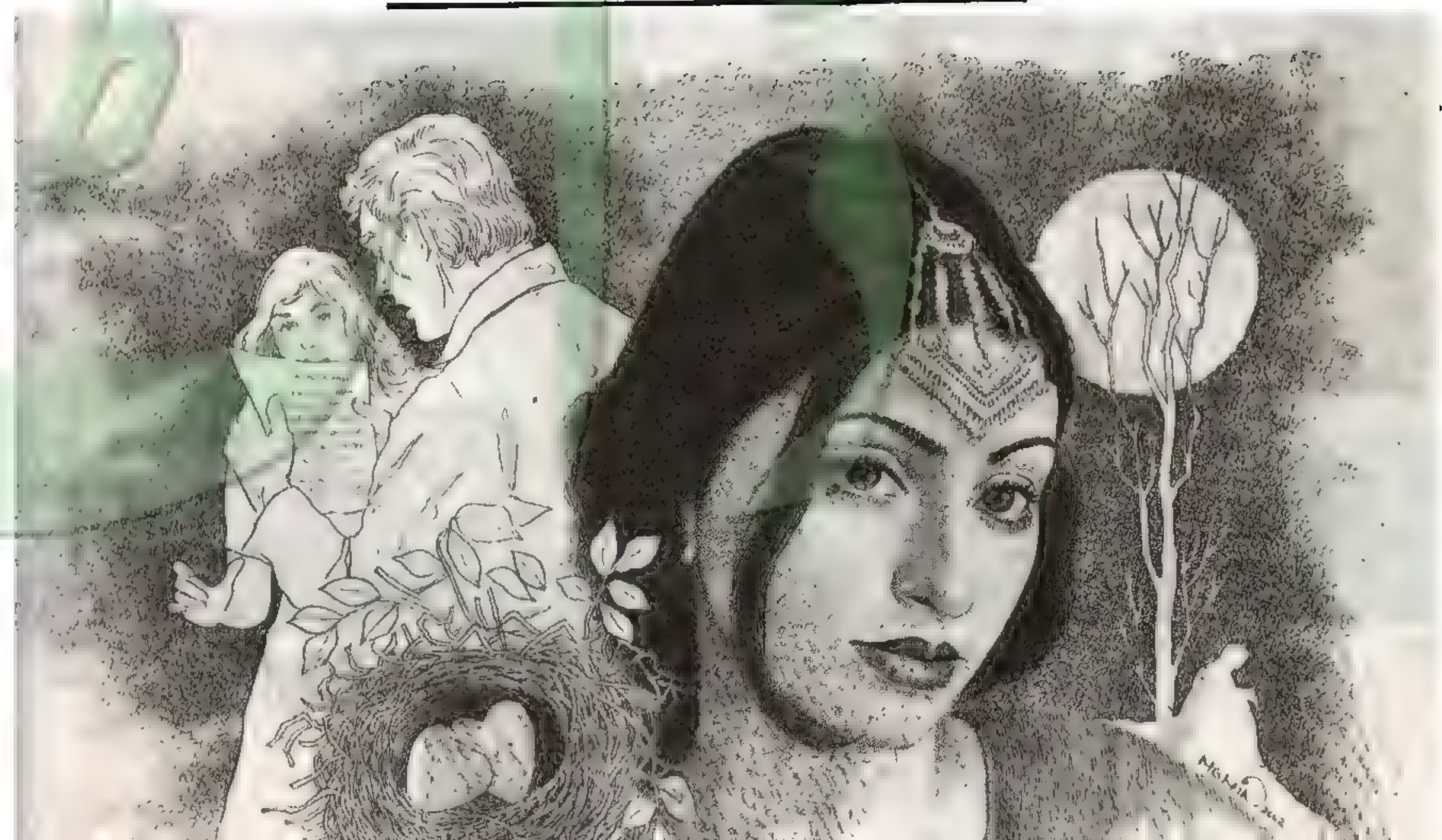
زیادہ بھلکڑ ہیں سب۔ ارے جمیلہ پھوپھو کے بیٹے کا نام پوچھ کر آنا مراد۔"

گردن تو صغری نے یوں ہلائی گویا سب سمجھ گئی۔
"ہاں جی! وہ نامراد۔۔۔"

"دفع ہو منحوس۔ عائزہ میری بچی! ادھر آ۔" نواسی نظر آگئی۔ دل کو چین ملا۔

"اماں! عائزہ کو اسکول جانا ہے۔ دیر ہو جائے گی۔ کیا آفت آگئی کہ صبح صبح اپنی جمیلہ پھوپھی یاد آگئیں۔ افوہ چلو عائزہ جلدی ناشتا کرو۔ وین والا روز شور کرتا ہے کہ عائزہ کی وجہ سے سب بچوں کو لیٹ ہونا پڑتا ہے۔"

"بس بیٹا! سب کی سنو۔ میری نہ سننا۔ رات میری کیسی عذابوں میں گزری کس سے کہوں۔ ہائے! یہ میری یادداشت۔ تم کو میرا خیال ہوتا تو کاہے کو میں۔۔۔" بات پوری نہ ہوئی۔ رافعہ نے بیچ میں ہی لقمہ دیا۔

"اچھا! ٹھیک ہے۔ رمیز نام ہے جمیلہ پھوپھی کے بیٹے کا۔ اب جاکر سو جائیں۔ نیند پوری کرلیں۔ گیارہ بجے جگا دوں گی خواہ مخواہ اپنی جان الجھن میں ڈالتی ہیں۔ فائدہ ہے کچھ؟"

"تم فائدے نقصان کے چکر میں رہنا۔ میری رات کس طرح کٹی ہے۔ میں جانوں یا میرا خدا۔ جاگ جاگ کر حشر ہو گیا۔ نہ یاد آنا تھا' نہ آیا۔ ہائے! یہ میرا مغز۔"

"اسی لیے کہہ رہی ہوں جاکر سو جائیں۔ طبیعت نہ خراب ہو جائے۔ نیند پوری کرلیں۔"

"اچھا! جاتی ہوں چائے تو بھیج دو۔"

روز کا یہی معمول تھا۔ کوئی بات یاد نہ آئے۔ اوپر بھیج کر بڑی آپا سے معلوم کرانا ضروری۔ رافعہ کو افسوس ہوتا تھا کہ جہاں اماں بھولنے میں ید طولی رکھتی تھیں' اوپر والی بڑی آپا کی یادداشت غضب کی تھی۔ مجال ہے' پچاس برس پرانی کوئی بھی بات وہ بھولی ہوں۔ خاندان کا جھگڑا۔ کسی رشتے ناتے کی رنجش۔ بلکہ اپنی پیدائش سے پہلے کے واقعات بھی یوں یاد تھے جیسے بچشم خود دیکھے ہوں۔

ستم ظریفی تو یہ تھی کہ اوپر والی بڑی آپا رافعہ کی ساس تھیں۔ سگی خالہ تھیں۔ مگر اپنی اماں کی بھول کی عادت کی وجہ سے وہ ساس سے طنزاً" کچھ نہ کچھ سننا پسند نہیں کرتی تھیں۔ برداشت تو کرنا پڑتا تھا۔ وہ چاہتی تھیں' اماں کا اوپر والوں سے رابطہ کم سے کم ہو۔

خالہ امی تو جیسے رشتے کی نزاکت سے بے نیاز تھیں۔ انہیں صرف ایک رشتہ یاد تھا۔ ساس بہو کا۔ مجبوری تھی کہ بہن کو بہن ہی کہنا پڑتا تھا' مگر بھانجی کا رشتہ فراموش کرکے صرف بہو ہی سمجھتی تھیں۔ اماں بھی اس معاملے میں بہن کی ہمنوا تھیں۔

"یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ تم جانو' تمہاری ساس۔ میری تو وہ بہن ہیں۔ بہن ہی رہیں گی۔" بے نیاز اماں بھی تھیں۔

مکان نانا ابا کا تھا۔ اوپر بھی پوری مکانیت تھی۔ نانا ابا نے نچلا حصہ اماں کے نام کر دیا تھا۔ اوپر کا حصہ بڑی آپا کو۔ اگلا چھوٹا لان بھی بڑی کو ملا۔ چھوٹی کو پچھلا گراؤنڈ دے دیا۔ رافعہ اکلوتی تھیں۔ بڑی کے تین بیٹے ایک بیٹی۔

چھوٹی خالہ عام طور پر تو پنڈی کی رہائش رکھتی تھیں۔ وہاں ان کے سسر کا خاصا بڑا بنگلہ تھا۔ ان کا ایک بیٹا' ایک بیٹی تھی۔ رافعہ کی چھوٹی خالہ کی بیٹی سے بہت دوستی تھی گو کہ وہ رافعہ سے عمر میں کم تھی۔ بڑی خالہ کی بیٹی شمسہ ہم عمر ہونے کے باوجود رافعہ سے خار کھاتی تھی۔ وہی نند بھاوج والی سیاست۔

شمسہ خاصی تیز طرار قسم کی نند تھی۔ سسرال سے جب بھی آتی' کئی دن رہتی۔ نیچے آکر کھوجتی نظروں سے ہر چیز کا جائزہ لیتی۔ اعتراض کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اسی لیے رافعہ کی اس سے کبھی دوستی نہ ہو سکی۔ اسے یہ بھی شکوہ تھا کہ رافعہ' سمیعہ کو اس پر ترجیح دیتی ہے۔ حالانکہ حق اس کا ہے یعنی حق تو اپنا جتانا' مگر رویہ درست نہ رکھنا۔

"دنیا سے انصاف اٹھ گیا ہے۔" وہ شوہر سے نند کی شکایت کرتیں۔ "شمسہ کو دیکھو۔ چاہتی ہیں' میں کسی سے ملوں نہ کسی سے بات کروں' بلکہ ان ہی کی سنوں

اور سنے ہی جاؤں۔ بھئی! سمیعہ سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ اسے کیسے چھوڑ دوں؟ کزن ہے وہ۔"

"کزن تو شمسہ بھی ہے۔ اس سے دہرا رشتہ ہے۔ تمہیں خواہ مخواہ اس سے کد ہے۔" بار بار کا واویلا سن کر کبھی تو وہ بول ہی پڑتے۔

"مجھے کد ہے؟ لو اور سنو۔ شمسہ کو ہی مجھ سے اور سمیعہ سے بیر ہے۔ بہن سے کبھی کہہ کر دیکھیں کہ مجھے صرف بھابھی نہیں' کبھی کزن ہی سمجھ کر بات کرلیں' مگر جب بھی بات کریں گی طنز سے۔"

آج عدنان کمرے سے آکر سستی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ "عائزہ بیٹا! ذرا اخبار اٹھا کر لانا۔"

"افوہ! دو قدم جاکر خود ہی اٹھالیں اخبار۔" رافعہ چڑ گئیں۔ "عائزہ کون سی اتنی پھرتیلی ہے۔ ست کاہل۔ گھنٹہ بھر سے واش روم میں گھسی ہوئی ہے روز دیر ہو جاتی ہے اسے۔ وین والا الگ ہارن پر ہارن دیا کرتا ہے۔ کبھی تو خیال کرلیا کریں۔ وقت کتنا قیمتی ہے۔"

"تم کبھی نہ کرنا میرا خیال۔" وہ چڑ گئے۔ "صبح صبح خالہ جانی سے منہ ماری کرتی ہو۔ میری نیند کا ہے کچھ خیال؟ عائزہ کی وین نکل جائے تو میں لے تو جاتا ہوں اسے۔ کبھی ناغہ نہیں کیا۔"

"میں منہ ماری کرتی ہوں۔ لو بھلا۔ اماں ہی صبح سویرے کبھی نام' کبھی مقام کے لیے صغری کو پکارا کرتی ہیں اوپر بھیجنے کے لیے۔ میں تو بولتی بھی نہیں۔ انہیں کچھ بھول جائے تو آفت مچاتی ہیں۔"

"وہ بھول جاتی ہیں۔ تم کو تو سب یاد ہوتا ہے۔ بتا دیا کرو۔ البتہ تم یہ بھول جاتی ہو کہ اچھی بیوی' شوہر کے اشارے کو حکم سمجھ کر ہر کام کرتی ہے۔ اصولاً" تو تمہیں ہی اخبار لاکر میز پر رکھ دینا چاہیے۔"

"اچھا! میں ناشتا نہ بناؤں؟ پھر کہیں گے تمہیں میری فکر ہی نہیں۔ ناشتے تک کی پرواہ نہیں۔"

"افوہ! وکالت کیوں نہ پڑھ لی تم نے؟ کہ کبھی انصاف ہی کرلیتیں۔" اٹھ کر اخبار لینے چل دیے۔ رافعہ نے ان کے ست قدم دیکھ کر تاسف سے

سوچا۔ "بے چارے تھک جاتے ہیں۔ دو گھروں کے اخراجات۔ تنہا کمانے والے۔ عادل فوج میں تھا' مگر گھر میں کچھ دینے کے بجائے ماں اور بھائی سے کچھ نہ کچھ وصول ہی کرلیتا تھا۔ دوسری ساہوکار ان کی خالہ جانی تھیں۔ اماں ہیں جو بھانجوں کی ہر فرمائش پوری کرنے کو ہمہ تن تیار۔ انہیں یوں تو کوئی بات یاد نہ آتی۔ بھانجوں کی پسند ناپسند کا بہت خیال رہتا۔

"رافعہ! نہاری بہت دن سے نہیں بنی۔ عادل کو بہت پسند ہے۔ گوشت منگوا دیتی ہوں۔"

"عامر کتنے دن سے بنولے کی کھیر کا کہہ رہا ہے۔ اے رافعہ۔ بنولے منگالے۔ میں بنوا دوں گی۔"

"اری رافعہ۔ عدنان کو رساول کتنی پسند ہے۔ گنے کا رس منگالو۔ میں خود گھوٹا لگادوں گی۔ سب کھالیں گے۔" ان کی یادداشت کتنی بھی کمزور کیوں نہ ہو۔ بڑی کی بہت مضبوط تھی۔

"اف! پراٹھا جل رہا ہے۔ عائزہ! جلدی کرو۔ وین والا آکر شور کرے گا۔"

انہیں سب کی فکر تھی۔ ہر کام محنت سے ' توجہ سے کرتیں۔ وہ حساس اور ذمے دار خاتون تھیں۔ شوہر ' بچے ' اماں۔ ان کی نگاہ ہر طرف ہوتی۔ ابھی ناشتا شروع ہوا تھا کہ زینے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر آواز۔

"اوہو! ناشتا ہو رہا ہے۔ بھابھی! میرے لیے بھی اپنے جیسا پراٹھا بنا کر لائیں۔ خستہ ' کرارا ' خوش رنگ ' خوش شکل۔"

عادل آگیا تھا۔ گھر میں صرف عادل ہی رافعہ کو بھابھی کہتا تھا ' شمسہ نام لے کر بات کرتی۔ عامر آپا کہتا۔ بچپن سے آپا کہتا آیا تھا۔ کسی نے کہہ بھی دیا کہ ایک ہی بھابھی ہے اسے بھی آپا کہتے ہو۔ تو فورا" جواب دیا۔

"تو وہ آپا جو ہیں۔ جیسے شمسہ آپا۔"

"اور عادل کی بیوی بھی خاندان کی ہوئی تو اسے کیا کہو گے؟"

"نام لوں گا۔ یقینا" چھوٹی ہو گی مجھ سے۔"

رافعہ پراٹھا لے آئیں۔ تو عادل میز پر ڈٹا ہوا تھا۔

"کتنی دفعہ تم سے کہا ہے۔ میز کے اوپر چڑھ کر نہ بیٹھا کرو۔ کھانے پینے کا سامان رکھا ہوتا ہے۔ بچوں کو کیا سکھاؤ گے تم۔"

"بیٹھنے دو۔ جہاں جی چاہے بیٹھے۔ بچے جاچکے ہیں۔" عدنان ' بھائی کے گرویدہ تھے۔

"کتنی چھٹیاں کرتے ہو۔ اتنی آزادی ہے فوج میں؟ اسکول کالج کی طرح یہاں بھی۔"

"رات کو آیا ہوں بھابھی! کل چلا جاؤں گا۔ فکر نہ کریں۔ یونٹ ادھر آئی ہوئی ہے تو مجھے آزادی ہے۔"

"ارے بھابھی! یہ خالہ جانی کدھر ہیں؟ سلام تو کرلوں۔" عادل ناشتا چھوڑ کر بھاگا۔

رافعہ نے سلام کی زوردار آواز سنی۔ عدنان کو گھور کر دیکھا۔ "منع نہیں کرسکتے تھے۔ ساری رات جاگ کر اب تو سوئی تھیں۔ طبیعت خراب ہوئی تو..."

"اس نے موقع ہی کب دیا منع کرنے کا۔ آجائے گا ابھی۔"

"یہ فوجی بھی کس قدر جلد باز ' بے حس ' خود غرض اور بے فکرے ہوتے ہیں۔ توبہ!"

"تم کبھی سچ نہ بولنا۔" عدنان بھائی کے خلاف نہیں سن سکتے تھے۔ "فوجی اگر خود غرض اور بے حس ہو جائیں تو دنیا میں کوئی بے غرض نہ ہو۔ یہ جو آپ عیش کررہی ہیں ' ان ہی بے حس اور بے فکروں کی بدولت۔ ورنہ پڑوسی ملک ہم کو ہڑپ کرنے کو تیار ہے۔"

"خالہ جانی! آپ کے لیے خصوصی ناشتا تیار ہے آیئے۔ نوش جان فرمایئے پراٹھا ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ کیسا حسین ' خوش رنگ ہے اور آملیٹ۔ واہ وا..."

خالہ جانی کو بڑے پیار سے کندھوں سے پکڑ کر لا رہا تھا۔ کرسی پر بٹھا کر پراٹھا آملیٹ سامنے رکھا۔ چائے انڈیلی۔

خالہ جانی خوشی سے بے حال۔

"ارے چندا! میں لے لوں گی چائے بعد میں۔ پہلے پراٹھا تو نگل لوں۔ کھایا کب جاتا ہے۔ دانت نگوڑے جواب دے گئے ہیں۔" رافعہ کو جھلاہٹ ہوئی۔

"اماں! آپ ڈبل روٹی لے لیں۔"

"ڈبل روٹی کیوں لیں اتنا خستہ پراٹھا ہے۔ میں چوری بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا۔"

پھرتی سے پراٹھا مسلنے لگا۔ رافعہ کا جی سلگ گیا کتنا اچھا خستہ پراٹھا تھا۔ اماں کو مگر قدر نہیں۔ کیسا حشر کیا ہے عادل نے۔ اف پھر چمچے سے خالہ کے منہ میں چوری ڈالی۔ چائے کی پیالی منہ سے لگادی۔ اماں ہیں کہ بھانجوں سے عشق تھا۔ عادل سے کچھ زیادہ۔ وہ گھسا رہتا تھا ان کے پاس۔ اماں بھی اس کی ہر خواہش دل و جان سے پوری کرتیں۔

"اللہ رکھے کیسا خدمت گزار بچہ ہے۔ تم بیٹی ہو۔ مگر کبھی توفیق نہ ہوئی کہ بیمار ماں کو کچھ اپنے ہاتھ سے کھلا پلا دو۔ اس بچے کی سعادت ہے کہ میرا احساس کرلیتا ہے۔" عادل کے جانے کے بعد رافعہ کا دل جلانے کا انتظام کیا۔

"بس رہنے دیں اماں! سعادت۔ جانتی ہوں ساری سعادت۔ ویسے انعام میں کیا دیا آپ نے؟"

لہجہ خاصا چبھتا ہوا تھا۔ اماں کو فورا" اپنے سر کی خشکی کا خیال آگیا۔

"ائے ہئے۔ موئی خشکی ہے کہ عذاب۔ کھجا کھجا کر سر زخمی کرلیا۔ اس کا کوئی علاج تو ہوگا۔" کہتی ہوئی بات ٹالتی چلی گئیں۔

دوپہر کو رافعہ تیل کی شیشی لے کر ان کے کمرے میں گئیں۔

"آیئے۔ آپ کے سر میں تیل ڈال دوں۔ خشکی بہت نہ بڑھ جائے۔"

اماں جو الماری کھولے کچھ کررہی تھیں اچھل پڑیں۔ خانے میں کپڑوں کے نیچے کچھ چھپا کر مڑیں۔

"توبہ ہے۔ لے کے ڈرا دیا ائے بچی۔ کوئی آواز ہی نہ آئی۔"

"تو۔ ڈرنے کی اس میں کیا بات ہے۔ بینڈ باجا لے کر آتی۔ تب خوش ہوتیں۔"

اماں ترچھی نظروں سے بیٹی کو گھورنے لگیں ' پھر بال کھول کر رافعہ کے سامنے بیٹھ گئیں۔ تیل بالوں میں انڈیلتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

"رقم کم تو نہیں ہے؟"

سر جھٹک کر منہ اونچا کیا۔ بن کر پوچھا۔ "کیسی رقم؟"

"وہی جو تلاش کررہی تھیں۔ ادھر ادھر جو چھپا کر رکھتی ہیں۔" مالش شروع کردی۔

"اوئی۔" اچھل پڑیں۔ "کون سی رقم ادھر ادھر چھپاتی ہوں۔ ہوش میں ہو تم۔" کہہ کر اٹھ گئیں۔

رافعہ نے انہیں پکڑلیا۔ "چلیں کدھر؟ بیٹھیں! پھر کہیں گی کہ تیل تھوپ دیا۔ آپ کی عادت ہے۔ مجھ سے ہر بات چھپانے کی ' میں کیا غیر ہوں یا دشمن ہوں جو نظر لگادوں گی۔"

"بس بی بی! شکریہ کہ تم نے اتنی زحمت کی اور غیر کیا ' نظر تو اپنوں کی بھی لگ جاتی ہے۔ چلو خیر آج تم کو ماں کا خیال آ ہی گیا۔"

"مجھے کیا خیال آتا۔ آپ کے داماد نے زبردستی مجھے بھیجا ہے بھانجے ہیں آخر چاہنے والے ' کہنے لگے خالہ جان کے بال دیکھو۔ الجھے چڑیا کا گھونسلہ بنے ہوئے ہیں تم تیل ہی لگا دیا کرو۔ کنگھا کردیا کرو۔ اب مجھے کیا خبر تھی کہ فرصت میں آپ رقم سنبھال رہی ہوں گی۔"

اماں بھنا گئیں۔

"بس بی بی! معاف کرو ' بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ابھلا۔ میں کنگھا بھی کرلوں گی خود ہاتھ پیر سلامت ہیں میرے۔ تمہاری مدد نہیں چاہیے مجھے۔ لو بھلا۔" رقم کی بات گول کردی۔

"خفا نہ ہوں اماں! میں تو بس اس لیے کہہ رہی تھی کہ آپ کی کون سی آمدنی ہے جو غیر مستحق پر لٹاتی ہیں ' منع نہیں کرتی بس سمجھا سکتی ہوں ' آپ صغریٰ کو دیں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔ غریب ہے۔ نادار کے دل سے نکلی دعا آسمان تک پہنچتی ہے۔ اور رحمتوں کی بارش کردیتی ہے۔ مگر آپ..."

"ہاں ' ہاں بولو! میں کنجوس ہوں۔ میں نے کیا کہتے ہیں۔ لوگوں کی رقم ہضم کر رکھی ہے۔ مفت میں کام کرواتی ہوں صغریٰ سے۔ اے بی بی! کل سے اس کی تنخواہ تمہاری ہتھیلی پر رکھوں گی ' ذرا اوپر بھیج دیتی ہوں۔ بس مجبور جو ہوں۔ تمہارے بچے ٹھہرے نواب۔ ان کا میرا ناتا ہی کیا ہے ' جو وہ میرا کام کریں گے یا میری بات سنیں گے؟"

بہت بگڑ گئی تھیں۔ رافعہ منہ بنا کر تیل کی شیشی اٹھا کر کمرے سے باہر آگئیں۔ اماں کے سر میں تیل چمک رہا تھا۔ مگر ان کو منانا آسان نہ تھا۔ کچھ کہنا مزید بھڑکانے کا سبب بن سکتا تھا۔ دوپہر کو کھانے پر بلانے پر بھی نہیں آئیں۔ عائزہ اسکول سے آئی تو اپنا اور نانی کا کھانا لے کر کمرے میں آگئی۔

"نانو! آجائیں مزے دار گرم گرم طاہری ' کھیرے کا

رائتہ اور مونگ کے مسالے دار پاپڑ۔ احد سے چھپا کر لائی ہوں۔ ورنہ وہ پیٹو ایک بھی نہ چھوڑتا۔ اس کا معدہ تو جن کا معدہ ہے لکڑ ہضم۔ پتھر ہضم۔"

"ہئے ہئے بچی۔ کیسا منہ پھاڑ کر بھائی کو جن کہہ دیا۔ توبہ! ایک ہی بھائی ہے، نظر لگ جاتی ہے۔" احد میں نانی کی جان تھی۔

"اور کس طرح کہتے ہیں؟ وہ چاہتا ہے کہ وہ سب اچھی سے اچھی چیز کھالے۔ مجھے کچھ نہ ملے۔ کل کس طرح میرے ہاتھ سے حلوہ اچک کر لے گیا تھا اور امی سے کہہ رہا تھا "عائزہ کو بوٹیاں نہ کھلائیں۔ موٹی ہو رہی ہے۔ آئس کریم خود ہی کھا گیا۔ میں نے اپنا حصہ مانگا تو بولا۔" ذرے ذرے پر مہر لگی ہے۔ میں اپنی قسمت کا کھاتا ہوں تم اپنے نصیب کا۔ تم ہو بدنصیب۔"

نانی کو نواسے پر بہت غصہ آیا۔ خفگی بھول بھال کر نواسی کی دل داری کی خاطر کھانے میں شریک ہو گئیں اور دل میں اس کمبخت پیٹ کو برا بھلا بھی کہتی رہیں جو بھوک کی برداشت نہ رکھتا تھا۔ ورنہ تو رافعہ کو مزید کلسایا جاسکتا تھا۔ کھانا تھا بھی مزے دار۔ رافعہ کے ہاتھ میں ذائقہ تو تھا۔ ڈٹ کر کھایا۔ پھر رازداری سے بولیں۔

"میں کہوں عائزہ! ماں کہاں ہے تمہاری۔ آواز نہیں آرہی کھاپی کر سو گئی کیا؟"

"کھانا تو امی نے کھایا ہی نہیں۔ صغری بتا رہی تھی کہ پکا کر چلی گئیں۔ میں نے جا کر دیکھا تو لیٹی رو رہی تھیں۔ کہنے لگیں "بھوک نہیں ہے۔ تم لوگ کھالو۔"

"ہئے ہئے بچی۔ شاباش ہے۔ ماں بھوکی پڑی رو رہی ہے اور تم خوان سجا کر ادھر لے آئیں۔ واہ بھئی! یہ ہے آج کی اولاد۔ ارے! پوچھا تو ہوتا کیوں رو رہی تھی اور میں کمبخت بھی پیٹ بھر کر بیٹھ گئی۔"

"نانو! پوچھا تھا۔ بولیں "سر میں درد ہے بعد میں کھا لوں گی۔"

"اچھا باتیں نہ بنا۔ جا کر ماں کو کھانا کھلا۔ نگوڑی پکا ریندھ کر تھک کر پڑ گئی۔ ہاہا۔ میری بچی بھوکی روتی رہی اور میں۔۔۔"

"نانو! نگوڑی کسے کہتے ہیں؟ سلیقہ شعار کو یا بدتہذیب کو؟"

"چل ہٹ پگلی۔" ہنس دیں۔

عائزہ نے شکر ادا کیا۔ رافعہ نے خوب سمجھا کر بھیجا تھا۔ گل پھندنے خود اس نے لگالیے۔ بھوکی، رونا دھونا وغیرہ، نانی آسانی سے تو قائل ہوتی نہ تھیں انہیں چونکانا پڑتا تھا۔ غنیمت کہ کئی دن انہیں کسی بھولی بھٹکی بات کے لیے صغری کو اوپر دوڑانا نہ پڑا۔

✲ ✲ ✲

رافعہ ساس کی خیریت معلوم کرنے اوپر گئیں۔ وہاں عادل موجود تھا۔ اس کے لیے خصوصی طور پر بنایا گیا حلوہ کھا کر نیچے آئیں تو اماں کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھیں۔

"ائے ہئے! یہ تو برا ہوا۔ افسوس بے چاری بچی لاوارث ہو گئی۔ یہ کیسی خبر سنادی تم نے رفو۔ اب اس کا کیا ہوگا۔ میرے کلیجے میں تو پنکھے لگ گئے۔ ہا۔ کہاں جائے گی نگوڑی۔ وہاں سب کیا کہہ رہے ہیں۔ کون اس کی سرپرستی کرے گا۔ ارے کسی سے نکاح ہی پڑھا دیتے۔ کوئی ٹھور ٹھکانا ہو جاتا۔ ہائے! کیسی آفت آگئی بچی پر۔۔۔"

مزید ہائے وائے کر کے فون رکھ دیا۔ رافعہ اپنے کمرے میں آگئیں۔ نہ جانے کس کا فون تھا اور کس پر آفت آگئی۔ رات کو زینے کی طرف جاتے دیکھا۔ مسکرا دیں۔ یقیناً" بڑی آپا سے کسی اہم معاملے پر مشورہ کرنا ہوگا ورنہ چھوٹی موٹی بات کے لیے صغری تو تھی ہی اور وہ اب صبح آئے گی۔ صبح تک انتظار کرنا اماں کی برداشت سے باہر تھا۔

"کر آئیں مشورہ؟ کیا فیصلہ ہوا؟" رات کھانے کے وقت نارمل انداز میں پوچھ لیا۔

کرسی پر ہی اچھل پڑیں۔ لقمہ ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ بیٹی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "اوئی کون سا مشورہ؟"

"کھانا کھائیں۔ ویسے ہی پوچھ رہی تھی کہ اوپر جو گئی تھیں۔ کچھ طے تو ہوا ہوگا۔" رافعہ نے تکا چلایا تھا جو نشانے پر جا لگا۔

"ہاں! وہ۔۔۔ تم کو بتانا چاہ رہی تھی، بے آسرا بچی کو اکیلے گھر میں چھوڑا بھی تو نہیں جاسکتا۔ ہمارے سوا اس کا اور ہے ہی کون؟"

عدنان نے پوچھا۔ "خالہ جان کس بچی کا ذکر ہے؟" اماں تفصیلاً" کچھ بتا رہی تھیں۔ رافعہ، احد کو کھلانے ڈانٹنے میں منہمک تھیں سنا نہیں۔ پھر عدنان نے حیرت سے کہا۔

"مگر۔۔۔ ہم اسے رکھیں گے کہاں خالہ جان؟"

"اے بھئی! رکھنا کیا۔ میرے کمرے میں رہے گی۔ میرے پاس۔"

"یہ کس کا ذکر ہے؟" رافعہ اب متوجہ ہوئیں۔

"وہی شفیع کی بیٹی تمہارے چچا شفیع۔ ارے! ان کی فوتگی پر ہم گئے تھے نا۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ اب۔۔۔ کیا ہو گیا؟"

"شفیع کی بیوی بھی تین دن ہوئے گزر گئی۔ اب بیٹی رہ گئی اکیلی۔ کوئی ولی وارث نہیں۔ تو بھئی! آخر خاندان تو اپنا ہے۔ ہم اس کے بارے میں نہیں سوچیں گے تو باہر سے کون آئے گا۔"

"اوہ! تو یہ مشورہ کرنے اوپر گئی تھیں آپ۔ مگر یہ ہمارے خاندان سے تعلق ہے۔ خالہ امی سے نہیں۔"

"ہاں! ان کا اس معاملے سے تعلق تو نہیں۔ انسانیت کا رشتہ تو ہے۔ بس۔"

"پھر کیا فیصلہ ہوا؟"

"یہی کہ میں اسے لے آؤں۔ ابھی بتایا تو تھا عدنان کو۔ تم کیا سو رہی تھیں؟"

"لے آؤں؟ مطلب۔ عارضی طور پر۔۔۔ یا۔۔۔"

"مستقل۔ وہ میری سرپرستی میں رہے گی۔ رفو اور ارشاد بہت فکر مند ہیں اس کی طرف سے۔ کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔"

"تو رفو چچی اور ارشاد چچا اسے رکھ لیں۔ ان کی تو اولاد بھی نہیں ہے۔"

"کچھ مسئلے ہیں ان کے ساتھ۔ ویسے زارا کی وفات پر رفو ہی اس کے ساتھ تھیں، بلکہ ارشاد بھی کئی دن وہیں رہے۔ بہت ہمدرد اور غم گسار ہیں۔ ایک شہر میں رہنے کی وجہ سے تعلقات بھی زیادہ تھے۔ مجھے تو تمہارے باپ کی تاکید یاد آتی ہے۔ وہ چاہتے تھے میں ان کے خاندان کے سب لوگوں سے پہلے کی طرح ہی سلوک کروں۔ سب کا خیال رکھوں۔ خود وہ بھی زندگی بھر یہی کرتے رہے۔ کسی کی شادی کر رہے ہیں۔ کسی کی پڑھائی کا خرچا اٹھا رہے ہیں۔"

"ابا نے تو خیر سب کے ساتھ ہی اچھا سلوک کیا۔ مگر آپ کی آمدنی ہی کیا ہے جو آپ اس کی ذمے داری لے رہی ہیں۔ جانتی ہیں، کتنے اخراجات ہوتے ہیں اور پتا نہیں کس مزاج اور عادات کی لڑکی ہوگی۔"

"سب سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔۔۔ اور میری آمدنی کی تم کو کیا فکر؟ تم میرے گھر میں رہتی ہو، کہیں اور رہتیں، کرایہ دیتیں کہ نہیں؟ سمجھ لو۔"

رافعہ ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھنے لگیں۔ بہت سنجیدہ تھیں اماں۔

"اچھا۔۔۔ تو میں اب کرایہ بھی دوں آپ کو؟ یہ مشورہ دیا ہے آپ کو بہن نے؟"

"وہ کیوں مشورہ دیتیں؟ میں کہہ رہی ہوں، دو روٹی وہ بچی بھی کھالیا کرے گی تو کون سا لاکھوں خرچ ہو جائے گا۔ تم کرائے کے خرچ میں اسے لگالینا۔"

"اماں! ابھی سوچ لیں۔ گھر آپ کا ہے۔ یہاں لڑکوں کی آمدورفت بھی ہے۔ کس طرح نگرانی کریں گی۔ مجھے تو بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔"

✲ ✲ ✲

اماں بے حد مطمئن تھیں۔ رفو چچی کو فون کرتی رہتی تھیں۔ نہ جانے کون سے مسائل تھے جو وہ لڑکی کی ذمے داری لینے سے گریزاں تھیں۔ کئی دن کے بعد رازداری سے بتایا۔

"آج سات بجے کی ٹرین سے آرہی ہے۔ اب یہ معاملہ ہے کہ اسے پہچانے گا کون؟ میں اسٹیشن جا نہیں سکتی۔"

رافعہ نے سرد آہ بھری۔ "میں ہی پہچانوں گی اور جاؤں گی بھی میں۔"

اماں پراسرار طور پر مسکرائیں۔ منہ دوسری طرف کرلیا۔ گویا مرحلہ طے ہوگیا۔ رات کو عادل کی ترقی کی خوشی میں خالہ امی نے دعوت کا انتظام کر رکھا تھا۔ رافعہ کی شرکت بھی لازمی۔ اسٹیشن جانا بھی ضروری۔ اماں کے تقاضے۔

"جلدی جاؤ! کہیں ٹرین آکر چلی گئی تو بچی اسٹیشن پر پریشان ہوگی۔ اکیلی ہے۔ ڈرے گی۔"

"اچھا۔۔۔ جاتی ہوں' ٹرین لیٹ ہوئی تو مجھے آنے میں دیر لگے گی۔ آپ خالہ امی کا سامنا کریں گی۔ عدنان اسے پہچانتے تو انہیں ہی بھیجتی۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ تم جاؤ۔۔۔ دعوت میں دیر سے شریک ہوجانا۔"

عدنان کو مطلع کرکے احد کو ساتھ لیا۔ ڈرائیور کے ساتھ اسٹیشن پہنچیں۔ ٹرین حسب معمول لیٹ تھی۔

انتظار کی کوفت کے علاوہ احد کی فرمائشیں۔ جو بچہ گھر میں سو سو نخروں کے بعد بمشکل کھانا کھاتا ہو' وہ اسٹیشن پر بکنے والی کھانے کی ہر چیز کھانے کی ضد کرے۔ تعجب تو ہوگا۔ رافعہ اسے لاکر پچھتا رہی تھیں۔

پلیٹ فارم پر بھاگ دوڑ ہوئی۔ ٹرین آرہی تھی۔ وہ ٹرین کے کھلے دروازے سے مسافروں کے اترنے کا نظارہ کرتی رہیں۔

شاید آخری مسافر عائشہ ہی تھی۔ ڈری سہمی' مضطرب' بے چین۔ رافعہ نے آگے آکر آواز دی۔ وہ اتر چکی تھی' گھبرائی ہوئی۔ رافعہ نے اسے گلے لگالیا' پیار کیا' چہرے سے ہی معصوم اور دنیا کے معاملات سے بے خبر لگ رہی تھی۔ بیگ احد نے اٹھالیا۔

رافعہ اسے باہر گاڑی کے پاس لے آئیں۔ گھر کے گیٹ سے گلی کے موڑ تک گاڑیوں کی قطاریں مہمانوں کی آمد کی خبر دے رہی تھیں۔ سٹپٹائی ہوئی عائشہ کا ہاتھ پکڑ کر رافعہ اسے اندر لے آئیں۔ احد تو گاڑی سے اترتے ہی اندر بھاگ گیا تھا۔

اماں ابھی نیچے ہی تھیں۔ بچشم نم عائشہ کو گلے لگالیا۔ عائشہ پر رقت طاری ہوگئی۔ کچھ دیر یہ غم ناک سین رافعہ نے دیکھا۔ ابھی وہ اندر جانے والی تھیں کہ عادل زینے سے اترتا نظر آیا۔

"بھابھی جان! مسئلہ کیا ہے؟ خالہ جانی! کتنا انتظار کروائیں گی؟ ہائیں! یہ کیا سین ہے۔"

وہ نیچے اتر آیا تھا اور خالہ جانی کو کسی سے لپٹے روتے ہوئے دیکھ کر حیران ہورہا تھا۔

"بھابھی! کیا چکر ہے؟ ہوا کیا ہے؟ آپ کہاں تھیں؟ تین بار آکر دیکھ گیا ہوں۔" رافعہ نے بھیگی پلکیں دوپٹے سے خشک کیں۔ اشارے سے کہا۔

"تم چلو! میں آتی ہوں اور اماں کا کھانا نیچے بھیج دینا۔"

اماں عائشہ سے الگ ہوکر اسے صبر کی تلقین کرنے لگیں' پھر عادل سے تعارف کروایا۔

"بھتیجی ہے میری' ابھی ٹرین سے اتری ہے۔ تھک گئی ہے۔ میں تھوڑی دیر میں اسے لے کر آتی ہوں۔"

رافعہ کو الجھن سی ہوئی۔ بھلا عائشہ کو اوپر لے جانے کی کیا تک ہے؟ غم کے ماحول سے آکر یک دم خوشی کی محفل میں شرکت۔ مگر کچھ بولیں نہیں۔ تیار ہونے اندر چلی گئیں۔ اماں' عائشہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ حیران عادل سوچتا ہوا اوپر چلا گیا۔ "کون سی بھتیجی۔ میں کیوں نہیں جانتا پھر۔۔۔"

اوپر کھلے فراخ ٹیرس پر کرسیاں' میزیں لگی ہوئی تھیں۔ خاصی آرائش کی گئی تھی۔ گھر کے صحن کو ہوٹل کا پنڈال بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ خالہ امی ہم عمر خواتین کے جھرمٹ میں رونق محفل بنی بیٹھی تھیں۔ شمسہ بھی بھڑک دار لباس میں قہقہے لگا رہی تھی۔ رافعہ کے سلام کے جواب میں خواتین نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ بعض نے گلے لگایا۔ خالہ امی پان چباتے ہوئے بولیں۔

"آگئیں۔۔۔ شکریہ عزت افزائی کا۔۔۔ بہت جلدی کی آنے میں۔"

پھر دوسری خواتین کی طرف متوجہ ہوکر بولیں۔ 'ہماری بہو کو ہمارے کسی معاملے' مسئلے سے سروکار نہیں۔ دیکھ لو! بے نیازی کا عالم۔ دور' دور سے لوگ آگئے میری خوشی میں شریک ہونے۔ ان کا اتنا بھاری پانچہ ہے۔ اب بھی عادل بلانے گیا تو آئیں۔"

پان کے ساتھ لگتا تھا رافعہ کو بھی چبا رہی ہیں۔ وہ دوسری طرف جاکر سب سے ملنے لگیں۔ یقین تھا کہ ساس صاحبہ ابھی تک ان ہی کے ذکر میں مصروف ہوں گی۔ کوئی موقع رافعہ کو ذلیل کرنے کا چھوڑتی نہ تھیں۔ کبھی بھانجی سمجھا ہی نہیں۔ صرف بہو تھیں وہ۔ ناپسندیدہ بہو۔ عدنان پر بھی غصہ آیا۔ انہیں علم تھا کہ وہ ضروری کام سے گئی ہے مگر بتایا نہیں۔

اماں کے ساتھ عائشہ بھی تھی۔ اسٹیشن والی گھبرائی ہوئی' روتی صورت کے برعکس نکھری ستھری' سنجیدہ اور معصوم۔ کپڑے بھی اچھے تھے۔ نہا کر سلیقے سے بال سنوار کر آئی تھی۔ لمبی چوٹی میں گلابی ربن کا پھول۔ پیاری لگ رہی تھی۔ رافعہ نے عائزہ کو بلاکر عائشہ کو اس کے سپرد کیا۔ اماں سے سرگوشی میں کہا۔

"اسے کیوں لے آئیں ساتھ؟"

"تو اسے خالی گھر میں چھوڑ آتی؟"

"یہاں لوگ۔۔۔ لڑکے بھی ہیں۔۔۔ اچھا نہیں لگتا۔ خالہ پسند نہیں کریں گی۔"

"تو نہ کریں پسند۔ کوئی تو پسند کر ہی لے گا۔ اچھا ہے۔ شادی میں آسانی ہوگی۔"

اماں کی دور اندیشی رافعہ کو پسند نہ آئی۔ عادل ادھر ہی منڈلا رہا تھا' یقیناً" اس کی توجہ عائشہ پر تھی۔ کھانے کے فوراً" بعد وہ عائشہ کو لے کر نیچے آگئیں۔ ساس کے اعتراض کی پروا ہی نہ کی۔

"دیکھا تم نے؟ ابھی کھانا ختم ہوا ہے۔ مہمان گئے نہیں۔ بہو بیگم کو بھاگنے کی پڑگئی۔"

وہ عائشہ کو لے کر نیچے آگئیں۔ اماں کے کمرے میں ایک دلچسپ منظر آیا۔ پلنگ پر کپڑے ہی کپڑے پھیلے پڑے تھے۔ چپلیں ادھر ادھر۔ کھلا بیگ اعلان کر رہا تھا کہ عائشہ نے بہت عجلت میں تیاری کی ہے۔ اماں کی عجلت۔ وہ جلدی جلدی کپڑے سمیٹنے لگی۔

"تائی امی نے میرے سارے کپڑے چیک کیے۔ پھر۔۔۔ اتنی جلدی کی۔ رکھنے کا وقت نہ رہا۔"

وہ سب سمیٹ کر جوتے چپل ایک کونے میں رکھ آئی۔ رافعہ کے کندھے پر سر رکھ کر منمنانے لگی۔

"آپا! میں کوئی غلطی کروں تو ٹوک دیا کریں۔"

لڑکی سمجھ دار ہے۔ انہوں نے اسے لپٹالیا۔ "ضرور ٹوکوں گی۔ تم میری چھوٹی بہن ہو۔ میں تو اماں کو بھی ٹوک دیتی ہوں۔ تمہیں کیوں بخشوں گی؟ میں اماں کی عادت کو بھی خوب جانتی ہوں۔"

پھر وہ اس سے اس کی اماں کی وفات کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ وہ بتاتی رہی۔ ماں کی بیماری۔ آمدنی کا فقدان' ماموں کی برائے نام امداد' ممانی کا تحقیر بھرا سلوک' اپنی بے بسی۔

"ابا نے اپنی زندگی میں اوپر کا مکان کرائے پر دے دیا تھا۔ بس کل آمدنی وہی تھی۔ ماموں بہن کا خیال کرکے جو کچھ دیتے' سو دفعہ جتاتے۔ بہن کے مرتے ہی بھانجی سے لاتعلق ہوگئے۔ مگر ممانی نے تجویز پیش کی کہ تم میرے پاس آکر رہو۔ کرایہ میں وصول کروں گی۔ تمہارے لیے پیسہ جمع کردوں گی۔ رافعہ چچی نے مخالفت کی۔ ان ہی نے تائی امی کو سب کچھ بتایا۔ پھپھو بھی اپنا حق مانگنے کے لیے روز شور کرتیں۔ رفو چچی اور ارشاد چچا نے بہت سمجھا کے مجھے یہاں بھیج دیا۔ پورا گھر بھی کسی کو کرائے پر دے دیا ہے۔"

"اچھا! ٹھیک ہے۔ اماں نے ذمہ داری لی ہے۔ اب بے فکر ہوجاؤ۔ میں معلوم کرلوں گی کہ گھر کس کو دیا ہے۔ اماں ابھی اوپر بھانجوں کے دل بہلا رہی ہوں گی۔ دیر سے آئیں گی۔ تم سوجانا۔ دروازہ بند کرلو۔"

اسے سمجھا بجھا کر اپنے کمرے میں آگئیں۔

ناشتے پر عدنان کا تعارف عائشہ سے ہوا۔ وہ بہت

خوش ہوئے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"واہ بھئی! اللہ کی رحمتیں دو دو۔ قدرت نے بلی بلائی بیٹی ہمیں دے دی۔ اب ہم اس فکر سے آزاد ہو گئے کہ کب عائزہ اس قابل ہو گی کہ ہمیں چائے بنا کر دے گی یا نئی نئی ڈشز بنا کر کھلائے گی۔ بس! آج سے مجھے بابا کہنا۔ ٹھیک ہے؟"

عائشہ جھینپ رہی تھی۔ عدنان کو وہ اچھی لگی۔

"بھائی جان! ابھی آپ اتنے بوڑھے تو نہیں ہوئے کہ میں بابا کہوں۔" سب ہنسنے لگے۔

ناشتا ہو رہا تھا کہ عادل شور کرتا آیا۔

"ہائیں! یہاں ناشتا ہو رہا ہے۔ بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔ اور ہمارا گھر سائیں سائیں کر رہا ہے۔" کرسی پر عین عائشہ کے سامنے ڈٹ گیا۔ عامر نے چند نان ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔

"آپا! اماں سو رہی ہیں اور مجھے نان کے سوا کچھ ملا نہیں۔۔۔ کچھ ہے؟"

رافعہ نے صغریٰ کو پکارا پھر عائشہ سے کہا۔

"وہ پراٹھے بنا رہی ہے۔ تم نان گرم کرلاؤ' عادل کے لیے۔"

عادل عائشہ کو دیکھ رہا تھا۔ عامر بھی۔

"میری بیٹی ہے یہ۔ تمہاری بھتیجی۔" عدنان نے ان کی نظروں کے سوال سمجھ کر کہا۔

"واہ۔ بھتیجی۔ وہ بھی دو دو' یہ تو کمال ہو گیا۔"

عائشہ کچن میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد صغریٰ پراٹھا اور نان گرم کر کے لے آئی۔ رافعہ کو تاسف نے گھیر لیا۔ عائشہ کا ناشتا ابھی پورا نہ ہوا تھا۔ مگر اس کی احتیاط انہیں پسند آئی۔ عادل' عامر کا صبح صبح آنا اتفاق تھا یا عائشہ اس کی وجہ تھی۔ عادل تو آتا رہتا تھا۔ عامر بہت کم نیچے آتا تھا۔ صبح تو یونیورسٹی جانے کی تیاری میں اس کا نیچے آنا محال تھا۔

"تم بھی آج چھٹی کرو گے اپنے بھتیجے بھتیجی کی طرح؟" انہوں نے عامر سے طنز بھری سوال کیا۔

"نہیں! ناشتا کر کے چلا جاؤں گا۔" عامر کے چہرے پر لکھی مایوسی کی تحریر خاصی واضح تھی۔

عادل البتہ احد کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ گو کہ صغریٰ کے پراٹھا اور نان لانے پر اس کے چہرے پر بھی کچھ تغیر ہوا تو تھا۔ رافعہ نے صغریٰ کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات دیں۔

عادل نے کہا۔ "بھابھی! رات کا کافی کھانا بچا ہوا رکھا ہے۔ آپ نہ بنوائیں۔ میں نیچے لے آؤں گا۔ سب مل کر کھالیں گے۔"

رافعہ نے سر ہلایا' مگر آرڈر واپس نہ لیا۔ ساس کی طبیعت سے واقف تھیں۔ ممکن ہے وہ نیچے کھانا نہ بھیجیں یا اوپر ہی بلالیں سب کو۔

وہ اپنی اور عائشہ کی چائے لے کر اس کے کمرے میں آگئیں۔ وہ کمرہ درست کر چکی تھی۔ چادر تہہ کر رہی تھی۔

"تم نے ناشتا بھی پورا نہیں کیا۔ چائے چھوڑ کر آگئیں۔ اور یہ ایک نان بچا ہے۔ چلو! ہم تم آدھا آدھا کھا لیتے ہیں۔ مزے کا ہے۔ ویسے مجھے تمہاری وہاں سے آجانے والی حرکت پسند آئی۔ لڑکیوں کو محتاط رہنا چاہیے۔"

"تو اور میں سوچ رہی تھی کہ آپ برا نہ مان جائیں۔" وہ نان اور چائے لے کر بیٹھ گئی۔

"آپ۔۔۔ میری غلطی پر مجھے ضرور ٹوک دیا کریں۔" چائے ختم کر کے اس نے پھر یاد دلایا۔

"تم اچھی لڑکی ہو۔ شاید مجھے ضرورت ہی نہ پڑے۔ اچھا کل تو تم نے سرسری سا بتایا تھا۔ اب ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ زارا چچی اچھی صحت والی تھیں۔ انہیں کیا بیماری ہو گئی کہ چٹ پٹ ہو گئیں؟"

عائشہ کے چہرے پر غم کے بادل چھا گئے۔ اندر اندر گھل رہی تھی۔ رافعہ کی ہمدردی نے اظہار کا راستہ کھول دیا۔ وہ جیسے منتظر ہی تھی کسی ہمدرد لہجے محبت آمیز الفاظ کی۔ وہ رافعہ کے ہر سوال کا جواب دیتی چلی گئی۔

زارا کو کوئی بیماری نہ تھی۔ صرف فکریں اندیشے' عزیزوں کی بے اعتنائی' اور خود غرضیاں' عائشہ کے مستقبل سے ہراساں' بلڈ پریشر نے تاک لیا۔ مایوسی

نے قبضہ جمالیا۔ کمزوری بڑھتی گئی۔

سب سے بڑھ کر تکلیف بانو پھپھو نے پہنچائی۔ انہیں ابا کی بہن ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اس لیے گھر میں ان کو حصہ چاہیے تھا۔ زارا نے ارشاد اور رفو کو ہمراز بنایا۔ اوپر والے کرایہ دار بہت اچھی کمپنی میں تھے۔ جب کمپنی ان کی تنخواہ بڑھاتی وہ از خود کرائے میں اضافہ کر دیتے۔ دال روٹی کا آسرا تو تھا۔

پھر ان سب نے ایک وکیل کو بلا کر معاملات طے کیے۔ گھر عائشہ کے نام رجسٹرڈ کرایا۔ یہ خبر پھپھو کو ملی۔ وہ بہت بگڑیں۔ ہمیشہ وہ جب بھی آتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے فساد ضرور کرتیں۔ ان کا خیال تھا' ان کے بھائی دولت چھوڑ گئے ہیں جن پر زارا قابض ہے۔ ان کے بیٹے بھی ساتھ آتے تھے۔ وہ بھی ممانی سے بدتمیزی کرتے۔ زارا کے سلیقے اور کفالت کی زندگی گزارنے کی عادت نے سب کو اس مغالطے میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ واقعی پیسے والی ہیں۔ پھپھو بینک بیلنس کی ٹوہ میں رہتیں۔

زارا ان سے ڈرنے لگی تھیں۔ وہ عائشہ کی طرف سے پریشان تھیں۔ پھپھو نے تو وارننگ دی تھی کہ ان کے بھائی کے گھر کی عائشہ اکیلی مالک نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی عدالت کے ذریعے اس فیصلے کو چیلنج کریں گی۔ کیونکہ اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے جائیداد پر بھتیجے بھانجوں کا حق ہوتا ہے۔ وہ یہ حق لے کر رہیں گی۔

"آخری دن بھی وہ بیٹوں کے ہمراہ حملہ آور ہوئی تھیں' اور وہ۔۔۔"

ہچکیوں سے اس کا جسم تھرتھرانے لگا۔ آواز گلے میں پھنس گئی۔ رافعہ نے تسلی دی۔ اماں آگئیں۔ سب سن کر سمجھانے لگیں۔

"شکر کر بچی! ان لالچی لوگوں سے بچ گئی۔ اب یہاں بے فکر ہو کر رہو۔ ارشاد اور رفو' بانو سے ڈر گئے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ اور اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ عدنان سے میں نے بات کر لی ہے۔ وہ تمہارا داخلہ کالج میں کروا دیں گے۔ جو ضروری کاغذ' آرم

فارم ہیں تمہارے پاس۔ ارے! وہی نتیجے کے سرٹیفکیٹ' وغیرہ سب رکھ لو۔"

رافعہ اماں کی عجلت پسندی کو داد دیتی اپنا اور عائشہ کا مگ لے کر باہر آئیں۔ عدنان آفس جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

عائشہ کا داخلہ ہو گیا۔ وہ بہت خوش تھی۔ کالج سے آکر وہ کسی کام میں ہاتھ بٹاتی۔ رافعہ منع بھی کرتیں۔ مگر وہ اکثر چائے بنا لیتی۔ کبھی کوئی ڈش تیار کر کے داد وصول کرتی۔ عائزہ بھی عائشہ کے ساتھ لگی رہتی۔ دونوں ساتھ بیٹھ کر پڑھتیں۔

نئی بات یہ ہوئی کہ عامر اکثر نیچے آنے لگا۔ اکثر تو شام کی چائے میں شریک ہو جاتا۔ عائشہ بہت محنت کر رہی تھی۔ شام کو صغریٰ نظر نہ آئی تو رافعہ نے کئی بار پکارا۔ مگر وہ گھر میں تھی کہاں جو بولتی۔ اوپر سے آئی تو رافعہ نے اسے پکڑ لیا۔

"کہاں غائب تھی صغریٰ! کب سے بلا رہی ہوں۔ کھانا کب پکے گا؟ کچھ ہوش ہے۔"

"وہ اماں جی نے بڑی آپا کی طرف بھیجا تھا۔ کچھ پوچھنے کو۔"

"اچھا! پھر پوچھ آئی ہو"

"ہاں جی! اماں نے کہا' آپا سے پوچھ لینا کہ ڈاکٹر رحیم خان کہاں رہتے تھے۔"

رافعہ نے اسے کچن کی طرف روانہ کیا اور خود آکر اماں سے کہا۔ "آپ نے خالہ امی کے پاس صغریٰ کو کچھ پوچھنے کے لیے بھیجا تھا؟"

"ہاں! تو تمہاری شان میں کیا گستاخی ہو گئی۔"

"یہ میں نے کب کہا۔ مگر کام کے وقت کم از کم نہ بھیجا کریں۔ وہاں ان کی ملازمہ کے پاس جا کر چپک ہی جاتی ہے۔"

"اچھا! اب آگئی ہے تو کیا بتایا بڑی آپا نے؟"

"سوال سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کی بڑی آپا کے' نہ صغریٰ کے۔"

"اے ہے! اپنے مغز کا کیا علاج کروں۔ یاد کر رہی تھی کہ ہم جب رحیم یار خان جا کر رہے تھے۔ تو پہلے فیکٹری میں رہے تھے۔ پھر ڈاکٹر کے پڑوس والے گھر میں جا کر رہے تھے کہ گلی کے اس جنات والے گھر میں۔"

"تو۔ ایسی بات مجھ سے ہی پوچھ لیا کریں۔ خالہ امی کو بھلا کیا خبر۔ ایسا مشکل سوال دے کر روانہ کر دیا۔ جو نہ اس کی سمجھ میں آیا نہ خالہ امی کے پلے پڑا۔ آخر اس کیا کیا ضرورت آپڑی۔"

"بس! ایسے ہی۔ خالی دماغ شیطان کا گھر۔ اچھا! پھر تم ہی بتا دو۔"

"ہم پہلے ڈاکٹر کے پڑوس میں، اس کے بعد گلی میں رہے تھے۔"

"او ہو! اچھا، ڈاکٹر کے بعد والے گھر کے اوپر جو کرائے دار تھے۔ ان کا کیا نام تھا؟"

"اف اماں۔ ان سے کیا کام آپڑا؟ اتنی پرانی بات۔ اب نام یاد نہیں۔ ہاں! ان کی بیگم عثمانیہ کہلاتی تھیں۔ ان کے نام سے کام چل جائے گا آپ کا؟"

"اللہ بھلا کرے۔ بھئی عثمانیہ کا بیٹا ہمارے سامنے پیدا ہوا تھا۔ جوان ہو گیا ہو گا۔"

"ہائیں! اب اس بیٹے کو کیوں یاد کر رہی ہیں؟"

"اے بچی! اپنی عائشہ کے ساتھ اچھا جوڑ رہے گا۔ عثمانیہ سے رابطہ ہو جائے تو پوچھوں۔" اب رافعہ کی سمجھ میں آیا کہ اتنا مشکل سوال دے کر صغریٰ کو کیوں بھیجا گیا تھا۔

شام کو خالہ امی بذات خود تشریف لے آئیں، عامر کے ساتھ۔ بہنوں کے درمیان کانفرنس ہوئی۔ آخر میں خالہ امی کہتی ہوئی اٹھیں۔

"اچھا! ٹھیک ہے۔ میں عثمانیہ کو تلاش کرتی ہوں۔" رافعہ نے سر تھام لیا۔ بھلا اتنے پرانے واقف کار کی تلاش کیسے ممکن ہے؟

"اماں! آپ عائشہ کی فکر نہ کریں۔ اس کی تعلیم پوری ہو جائے۔ پھر دیکھا جائے گا۔"

"دم بھی سے فکر کریں گے۔ تب ہی تو کچھ ہو گا۔" اماں برا مان گئیں۔ پھر صغریٰ کی طلبی ہوئی۔

"اری۔ تو نے آپا سے کیا کہا تھا۔ جوان کی سمجھ میں نہ آیا۔"

صغریٰ آنچل مروڑنے لگی۔ کمر لچکا کر ہونٹ ٹیڑھا کر کے بولی۔ "اماں جی، سرم لگے ہے۔"

"ہائیں۔ میں نے کون سی شرم ناک بات پوچھ لی تھی۔"

"اماں جی۔ وہ جو آپ نے بولا تھا۔ یار خان مجھے یار خان سرم لگے ہے۔" اترا کر بولی۔

اماں نے جھک کر چپل اٹھا کر اس کی طرف پھینکی۔ "مردار، بے غیرت، بڑی شرم والی، جب عادل کے ساتھ ٹھی ٹھی ٹھاٹھا کرتی ہے۔ تب تیری شرم کہاں چلی جاتی ہے۔ غارت ہو۔"

"لو جی۔ عادل صاحب تو کھو ہنسا دے ہیں۔" صغریٰ مزید اترا کر بل کھا کر بولی۔ پھر ہنسی سے بے قابو ہو کر بھاگ گئی۔ "اماں! جب جوان چھوکریاں رکھی جاتی ہیں، تو ایسے تماشے ہوا کرتے ہیں، بڑی عمر کی عورت رکھی تھی۔ آپ نے کہا۔ یہ بڈھی ہے اس سے کام نہیں ہوتا۔ اور اماں! عائشہ کو بلا کر رکھتے ہوئے آپ نے سوچا کہ گھر میں جوان لڑکے آتے ہیں؟"

"بس۔ تم کو تو میرے ہر فعل پر اعتراض کا موقع چاہیے۔ چاہے میں نیک دلی سے کروں۔"

اماں کو واقعی غصہ آگیا تھا۔

"یہ جو آپ کے بھانجے صاحبان دندناتے ہوئے، سیدھے آپ کے کمرے میں آجاتے ہیں۔ عامر کو پہلے کبھی آتے دیکھا ہے؟ میں اعتراض نہیں کر رہی۔ احساس دلا رہی ہوں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ذمہ دار آپ ہی ٹھہرائی جائیں گی۔"

"اچھا! تو میں بھانجوں کو منع کر دیتی ہوں۔ نہیں آئیں گے مجھ سے ملنے۔ بس خوش؟" سخت ناراضی کے اظہار میں منہ موڑ کر بیٹھ گئیں۔ دراصل عائشہ نے خود رافعہ سے کہا تھا کہ عامر کے آنے سے وہ ڈسٹرب ہوتی ہے۔ کبھی لیٹی ہوتی ہے آرام کے لیے تو اٹھ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ عائزہ کے ساتھ برآمدے میں پڑھنا شروع کیا تو وہ وہاں بھی آجاتا ہے، عائزہ سے بات کرنے کے بہانے۔

عادل تو ہمیشہ ہی آتا تھا۔ مگر عامر بہت ہی کم آتا تھا۔ اب جو آمدورفت شروع ہوئی ہے۔ اس کی وجہ عائشہ ہو سکتی ہے۔ اماں کو کیوں احساس نہیں ہوتا۔ رافعہ کے احساس دلانے سے اب اماں، عامر کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ ایک سال گزر گیا۔

☆ ☆ ☆

ایک دوپہر ایک صاحبہ آگئیں۔ رافعہ انہیں نہیں پہچانی۔ اماں کا نام لے کر وہ صاحبہ اندر گھس آئیں سامنے ہی عائشہ نظر آگئی۔ وہ دوڑ کر عائشہ سے لپٹ گئیں۔

"میری بچی۔ میری منی۔ میری پیاری۔"

چٹاچٹ چومنے لگیں۔ عائشہ گھبرا گئی بزور خود کو ان کے شکنجے سے چھڑایا۔ اماں بھی آگئیں پوچھنے پر بتایا۔

"میں زری ہوں۔ عاشی کی زری خالہ۔ ہائے! میری شکل کیا اتنی بدل گئی کہ عاشی بھی نہیں پہچانتی۔"

"زری خالہ۔ آپ زری خالہ کیسے ہو سکتی ہیں۔ وہ ایسی تو نہیں تھیں۔" عائشہ پریشان ہو گئی۔

زری خالہ اس قدر گول مٹول بے ہنگم جسم کی مالک تو نہ تھیں۔ اور اگر کسی طرح فربہ ہو بھی گئیں۔ تو چہرہ اتنا سیاہ، دھبے دار کیسے ہو گیا۔ زری خالہ سے چار سال سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ مگر کوئی بھی اتنا کیسے بدل سکتا ہے۔

رفو چچی سے بات ہوئی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ کہنے لگیں۔

"زری پہلے واقعی دبلی پتلی تھی۔ مگر دبئی کے اصلی گھی مکھن عیش آرام بے فکری پیسے کی فراوانی نے اس کا یہ حال کر دیا۔ پھر دواؤں کے بے جا استعمال کے ری ایکشن کی وجہ سے اس کے چہرے پر بے شمار مسے نکل آئے۔ موٹے موٹے مسے۔ دبئی سے آئی تو میں نے اسے دیکھا۔ ہاہ بے چاری، مسوں سے پریشان تھی۔ پھر زری کی ایک دیورانی نے ایک ڈاکٹر کا بتایا۔ جو اسکن اسپیشلسٹ تھا۔ مشہور تھا۔ زری نے بتایا تو میں بھی اس کے ساتھ کلینک چلی گئی۔ ہم لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ زری ڈاکٹر کے ساتھ اندر چلی گئی۔ ارے رافعہ۔ میں کیا کیسے کہوں۔ اندر کمرے سے زری کی چیخوں کی آواز بھی آنے لگی۔ اندر میز پر لیٹی چیخیں مار رہی تھی۔

ڈاکٹر بے حد پریشان کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ "آٹھ انجکشن اس گال پر۔ آٹھ دوسرے پر لگا چکا ہوں۔ حالانکہ عام طور پر تو دو یا تین انجکشن کافی ہوتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں اثر نہیں ہو رہا۔ نرس! انجکشن کا دوسرا ڈبہ لاؤ۔

ہمیں دیکھ کر ہاتھ جوڑنے لگیں۔ ہماری منتیں کرنے لگیں۔ ڈاکٹر نے ہمیں کمرے سے باہر نکالا۔ عرشیہ زری کی دیورانی خود بہت پریشان تھی۔ چند ہفتے پہلے اسی ڈاکٹر نے اس کی خالہ کے مسے صاف کیے تھے۔"

غرض مزید گھنٹہ بعد ڈاکٹر کے ہمراہ باہر آئیں۔ میں تو پہچان نہ سکی۔ اف مسے صاف تھے۔ منہ سرخ سوجا ہوا فٹ بال بنا ہوا۔ روتی ہوئی۔ اور ڈاکٹر کو گالیاں دیتی آئی تھیں۔

عرشیہ بتا رہی تھی کہ بیٹا چند دن بعد دبئی سے آیا۔ وہ پہچانا ہی نہیں۔ ڈر رہی ہیں کہ میاں نے بھی نہ پہچانا تو کیا ہو گا؟"

رفو چچی ہنس ہنس کر سنا رہی تھیں۔ رافعہ کو افسوس ہو رہا تھا، بے چارے، لوگ بغیر سوچے ڈاکٹروں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ نہ جانے وہ کون سی دوا تھی جس کی وجہ سے زری پر انجکشن کا اثر نہ ہوا۔ بہتر ہوتا وہ کوئی دیسی ٹوٹکا آزما لیتیں۔ زری سے پوچھ لیا، کہنے لگیں۔

"موٹاپا کم کرنے کی بہت تیز دوا کھا رہی تھی۔ وہ تو کم ہوا نہیں رنگ جھلس گیا۔ مسے نکل آئے۔ مسے نکلوانے گئی۔ اس نے اور بھی سیاہی پھیر دی۔ اب کوئی پہچانتا ہی نہیں۔ رفو باجی نے بتایا تو ہو گا۔ وہ بھی تو تھیں

کلینک میں سب تماشا دیکھا انہوں نے۔"

رافعہ نے منہ پھیر کر ہنسی روکی۔ "نہیں بس یہ کہہ رہی تھیں کہ ہاں زری کو جس نے پہلے دیکھا ہے۔ وہ اب نہیں پہچان سکتا۔ چلیں' عاشی کو بلاتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

زری خالہ نے ایک رسید دی اور بتایا کہ ارشاد چچا نے ایک سال کا کرایہ عائشہ کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا ہے۔ یہ بینک کی رسید ہے۔ عائشہ کا گھر اب کسی ریٹائرڈ کرنل نے پورا لے لیا ہے' اوپر نیچے کا۔ اوپر والے چلے گئے ہیں۔

عائشہ کو تاسف ہوا' کتنی اچھی خاتون تھیں۔ رافعہ' خالہ اور بھانجی کو راز و نیاز میں مصروف دیکھ کر اندر چلی گئیں۔ اماں بھی جا کر لیٹ گئیں۔ ان کے جانے کے بعد زری خالہ نے رازداری سے کہنا شروع کیا۔

"آج کل کا زمانہ بہت خود غرضی کا ہے۔ کسی پر بھروسا نہ کرنا اور یہ جو تمہاری تائی نے تمہیں بلا کر رکھا ہے۔ اس میں بھی ان کی کوئی غرض ہو گی۔ نہیں تو بھلا کون کسی کی ذمے داری لیتا ہے۔ ویسے اب تک کتنے پیسے تم سے لے چکی ہیں یہ تائی؟"

عائشہ حیران ہو گئی۔ "مجھ سے؟ میرے پاس پیسے تھے ہی نہیں۔"

"کچھ تو وصول کیا ہو گا بڑی بی نے۔ اتنی نیک نظر تو نہیں آتیں۔ اب جو رسید بھیجی ہے۔ پہلے بھی تو آئی ہو گی۔ کتنے پیسے نکلوا لیے؟"

"میرا اکاؤنٹ تو وہیں ہے' ساہیوال میں کیسے نکالتی؟"

"ائے ہے! کیسی بھولی بچی ہے۔ اب تو کارڈ ملتے ہیں۔ اسی کارڈ سے کوئی بھی رقم نکال لے۔ تجھے خبر بھی نہ ہو گی۔ بینک خالی ہو جائے گا۔ پھر پچھتانا۔"

"نہیں! کوئی نہیں نکالتا رقم۔ عدنان بھائی فیس دے دیتے ہیں۔" عائشہ کو ان کی باتیں ذرا پسند نہ آئیں۔ مقصد بھی سمجھ میں نہ آیا۔

"اچھا خالہ! کل میرا ٹیسٹ ہے۔ میں پڑھنے جا رہی ہوں۔" وہ بہانہ بنا کر اٹھی۔

کچھ دیر بعد جب وہ پڑھ کر اٹھی' کمرے میں خالہ کو اماں کے پاس آنسو بہاتے دیکھا۔ اماں کچھ حیران سی تھیں۔ عائشہ کو اشارے سے بلایا۔

"سنو عائشہ! یہ زری کیا کہہ رہی ہے۔ تم یہاں خوش نہیں ہو؟"

عائشہ نے حیرت سے خالہ کو دیکھا۔ وہ ٹسر ٹسر آنسو بہا رہی تھیں۔

"بھابھی جان! میں تو اس بچی کی محبت میں دوڑی چلی آئی۔ بھئی! میرا بھی کچھ حق ہے۔ میں بھی کالج میں پڑھا سکتی ہوں۔"

"مگر خالہ۔۔۔ آپ تو دبئی میں رہتی ہیں۔"

"تو کیا دبئی میں کالج نہیں ہوں گے۔ حد ہو گئی' وہاں بہت ترقی ہے' سب پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ میرے پاس رہنا' خوب فیشن کرنا' سیر کرنا' کوئی کمی نہیں ہے اللہ کے فضل سے۔"

"نہیں خالہ! میں یہیں رہوں گی۔" وہ سمجھ گئی کہ خالہ کا مقصد تائی کو اس سے بدگمان کرنا ہے۔

خالہ نے پھر اکسایا۔ "بہت خوب صورت شہر ہے دبئی۔ دیکھنا جا کر' میں تو سوچ کر آئی تھی کہ اپنی بچی کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ بڑے دعوے سے آئی تھی۔ خالی ہاتھ گئی تو بیٹا کیا کہے گا۔ نہ جی نہ' میں تو لے کر جاؤں گی۔"

اماں بھی کہنے لگیں۔ "عائشہ! تم جانا چاہو' چلی جاؤ۔ سیر و تفریح کر کے آ جانا۔"

عائشہ نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں! میرا دل کہیں نہیں لگے گا۔ پڑھ نہیں پاؤں گی میں۔ سارا سال ضائع ہو جائے گا۔" عائشہ کے انکار پر زری نے بہت واویلا کیا۔

"میں نے تو کتنے خواب دیکھے تھے کہ عائشہ کو بہو بنا کر کلیجہ ٹھنڈا کروں گی۔ ہائے! میری پیاری بہن زندہ ہوتی تو عائشہ کو مانگ لیتی۔ مجال تھی کہ وہ انکار کرتی۔ ارے! میری پیاری بہن۔" رونے لگیں۔

"اچھا۔۔۔ ابھی تو تم جاؤ۔ عائشہ نہیں جا سکتی۔

تمہاری بہن زندہ نہیں' اس لیے اس بات کو بھول جاؤ آئندہ اس ارادے سے نہ آنا۔" تائی نے بہت سختی سے جواب دیا۔ بے چاری بے نیل و مرام واپس گئیں۔

☼ ☼ ☼

عائشہ تائی کی محبت کی دل سے قدر کرتی تھی۔ صاف دل' سادہ اور ہمدرد' ان کی زندگی کا مقصد ہی لوگوں کے کام آنا' ان کی مدد کرنا تھا۔ تایا ابا نے پورے خاندان کی ہمیشہ مدد کی۔ کئی گھروں کی کفالت کرتے تھے۔ عائشہ کے ابا نے بتایا تھا کہ ان ہی کی مدد اور تعاون سے وہ اعلا تعلیم حاصل کرسکے۔ کتنی بامقصد زندگی گزاری انہوں نے۔ تائی نے بھی ہر معاملے میں ان کا ساتھ دیا۔ "میں... میری زندگی کا کیا مقصد ہے بھلا۔ نہ جانے اللہ تعالیٰ نے میرے لیے کون سا عمل متعین کیا ہے۔ میرے پیدا کرنے کا کوئی مقصد تو ہوگا۔ شاید... امی' ابا کی نیکیوں کے صلے میں خوشی عطا کی تھی۔ مگر میں خود ایک ناکارہ وجود ہوں۔ کوئی خوشی میری زندگی میں بھی آئے گی؟ امید کم ہے۔ میرا کوئی راستہ نہ مستقبل۔

میری زندگی کتنی الجھی ہوئی ہے۔ تائی نہ ہوتیں تو کون تھا میرا۔ رفو چچی' ارشاد چچا نے بہت ساتھ دیا۔ وہ پھپھو کی بدزبانی اور سازشوں سے ڈر گئے۔ گو کہ وہ پھر بھی مجھے ساتھ رکھنے کو تیار تھے۔ مگر پھپھو کے تابڑ توڑ الزامات' روز آکر فساد برپا کرنا۔ تائی کے بلاوے پر میں نے بہتر سمجھا کہ رفو چچی کو پھپھو کے شر سے بچاؤں۔ اس رات... امی کے ساتھ میں بھی مر گئی ہوتی... تو... ان شریف لوگوں پر بوجھ نہ بنتی۔ پھپھو' تائی کی وجہ سے ابھی تو چپ ہوگئی ہیں۔ مگر جس طرح امی کو کچوکے لگاتی تھیں۔ اب مجھے ہدف بنانا چاہتی ہیں۔

اف... اس رات کی ہیبت' وہ خوف ناک رات' حالانکہ امی کی طبیعت بھی روز کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ مگر پھپھو... جب پوری طاقت سے حملہ آور ہوئیں۔ رفو چچی نہ ہوتیں تو... مگر وہ بھی کیا کرسکیں۔ پھپھو سے مقابلہ آسان نہ تھا۔ اب پھر وہی خوف... پھپھو' زری خالہ نہ جانے کس کس سے تائی لوگوں کی برائیاں کریں گی' مجھے شرمندگی ہوگی۔ خوف کا نیا سلسلہ۔

یہاں آکر جو اضطراب ختم ہوا تھا۔ پھر سے تازہ ہوگیا۔ وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہوگئی۔ لیکن کم از کم ان اچھے لوگوں کو تو رسوائی سے بچالے۔ کیسے؟ تائی بھی کب تک سہارا دیں گی۔ رافعہ آپا کہاں تک ساتھ دیں گی۔ کیا اب آخری حد... پھپھو ہیں؟" کپکپا گئی۔

ابا کی سگی بہن' روز آجاتیں۔ ابا نے مکان مہر کے طور پر امی کے نام کردیا۔ یہ بات پھپھو کو پسند نہیں آئی۔ انہیں بھائی سے شکوہ تھا کہ انہوں نے اپنی جائیداد (صرف ایک مکان ہی) میں بہن کو حصہ نہ دے کر ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ بھلا کوئی اپنی دولت یوں لٹاتا ہے بیوی پر۔ بیوی تو پیر کی جوتی کی طرح ہے۔ آج ایک' تو پرانی ہونے کے بعد دوسری لے آئے۔

ابا مسکرا کر چپ ہوجاتے۔ ابا کے بعد تو وہ اپنا حق چھین لینے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ امی ڈر گئیں۔ ارشاد چچا ابا کے کزن ہونے کے علاوہ دوست بھی تھے۔ رفو چچی بھی امی سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ہمیشہ ان کا خیال رکھا۔ زارا کو عائشہ کی فکر تھی۔ ارشاد چچا نے کوئی اچھا رشتہ تلاش کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

پھر پھپھو نے اپنے بیٹے کے لیے عندیہ دیا۔ عائشہ خوف زدہ ہوگئی۔ اسے پھپھو سے ڈر لگتا تھا۔ ان کے بیٹوں سے خوف آتا تھا۔ جب آتے زارا کو تکلیف ہی پہنچاتے۔ جان بوجھ کر گھر کی چیزیں توڑتے۔ کبھی لیمپ گرا دیا' کبھی کوئی گلاس' کبھی سالن کی ڈش گرا کر ہنستے۔ نہ صرف ڈش کا نقصان بلکہ سالن کا زیاں' فرش صاف کرنے میں عائشہ کو کتنی مشکل ہوتی۔

ہر قسم کے لطیفے سناتے۔ بڑا بیٹا تو ہاتھ پکڑنے سے بھی دریغ نہ کرتا' پھر ہنس کر کہتا چوڑیوں کا ناپ لینا ہے۔ پھپھو ہنس ہنس کر اور شہ دیتی تھیں۔

بڑے کی نظریں اس کے وجود کا ناپ لے رہی ہوتیں۔ اسے گھن آتی تھی۔ کبھی تو کمرہ بند کرکے بیٹھ جاتی۔ پڑھنے کا بہانہ کرکے۔ زارا بھی سخت فکرمند۔

پھر جب عائشہ کے نام گھر کی رجسٹری ہوگئی۔ پھپھو سن کر سیخ پا ہوگئیں۔ روز آکر شور کرتیں۔ ارشاد چچا پر بے ہودہ الزام لگاتیں۔ زارا کو بھی برا بھلا کہتیں۔ زارا بیمار ہوگئیں۔ بستر سے لگ گئیں۔

اب تو پھپھو کے بیٹے زیادہ فری ہونے لگے۔ کبھی آنچل پکڑ لیتے' کبھی چوٹی کھینچتے۔ رفو چچی زارا کی بیماری کے بہانے آکر رہنے لگیں۔ خدمت بھی کرتیں۔ ہمت بندھاتیں۔ تسلیاں دیتیں۔ ارشاد چچا' ابا کی دوستی کا بھرم رکھنے کی خاطر پھپھو کی یاوہ گوئی برداشت کرتے۔ رفو چچی انہیں عائشہ کی خاطر زندگی کی طرف راغب کرتیں۔ امیدیں دلاسے' زارا صحت کی سمت لوٹنے لگیں۔ رفو چچی نے ایک بہت اچھے رشتے کا بتایا۔ لڑکا سعودی عرب میں انجینئر تھا۔ وہ صاحبہ رفو چچی کی غالباً" بہن کی سسرال والی تھیں۔

پھرماں' بیٹی آگئیں۔ عائشہ انہیں پسند آگئی۔ بلکہ وہ صاحبہ اتنی عجلت پسند تھیں کہ فوراً" اقرار کے بعد انگوٹھی بھی پہنا گئیں۔ واپس جارہی تھیں اور بانو پھپھو آرہی تھیں۔ دروازے پر ملاقات ہوئی۔ اندر آکر وہ سوالات کرنے لگیں زارا نے کہا۔ "بھابھی کے ملنے والے ہیں۔ میری خیریت کے لیے آئے تھے۔" مگر بانو پھپھو نے اندازہ لگا ہی لیا۔ آستین چڑھا کر چڑھ دوڑیں۔

آخر زارا نے بتا دیا۔ لیکن اس دن نہیں' کئی دن بعد۔ روز ہی آکر سوالات کرتی تھیں۔ پھر ایک دن اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ آئیں۔ اس وقت زارا کے پاس اوپر والی ناعمہ بیٹھی تھیں۔ آتے ہی کہنے لگیں۔

"یہ میرے چار بیٹے ہیں۔ جس کی طرف انگلی اٹھاؤ گی' اسی سے عائشہ کا نکاح کروں گی۔ بس! عائشہ مجھے دے دو۔ وہ میری ہی ہے' انکار نہیں سنوں گی۔"

زارا پریشان ہوگئیں۔ آخر کہہ دیا۔ "آپا! آپ نے دیر کردی۔ عائشہ کا رشتہ طے کرچکی ہوں۔"

وہ بپھر گئیں۔ "کس سے کردیا رشتہ؟ وہ کون مائی کا لال ہے؟ بتاؤ تو" گھر میں چار' چار جوان موجود اور میرے مشورے کے بغیر میری بھتیجی کا رشتہ ہو۔ واہ بھئی! مجھے خبر تک نہیں۔"

ناعمہ' زارا کی زرد پڑی رنگت دیکھ کر بولیں۔

"آپا... باجی کی طبیعت خراب ہورہی ہے' پلیز یہ مسئلہ بعد میں طے کرلیں۔ ان کی حالت تو دیکھیں۔"

"ہاں! دیکھ رہی ہوں۔ لگتا ہے بیٹی نے ہی کسی کو پھنسالیا ہے۔ ہائے ہائے! یہ میری بھتیجی ہے اور اس کے یہ کرتوت میرے خدا..."

یہ کہنے کے بعد پینترا بدلا۔ "میں نہیں جانتی۔ تم انکار کردو۔ غیروں میں کیوں کریں' اپنوں کے موجود ہوتے ہوئے' اب کچھ نہیں سنوں گی بس۔"

"میں انکار نہیں کرسکتی۔ زبان دے چکی ہوں۔ انہوں نے انگوٹھی بھی پہنادی۔"

آپے سے باہر ہوکر چلائیں۔ "انکار تو تمہیں کرنا پڑے گا۔ دیکھتی ہوں کیسے شادی کرتی ہو۔"

رفو چچی کے آنے پر وہ چیختی چلاتی واپس گئیں۔ بیٹے بھی دھمکیاں دیتے رہے۔

زارا پر غشی طاری ہورہی تھی۔ ارشاد چچا آگئے۔ زارا کو اسپتال لے جایا گیا۔ کئی دن پریشانی میں گزرے۔ عائشہ بہت خوف زدہ تھی۔ ماں کی حالت پر اسے رونا آتا تھا۔ ناعمہ اور رفو چچی سمجھاتی رہتی تھیں۔ زارا کو بھی سب نے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

عائشہ نے سب کے سامنے پھپھو کے رشتے سے انکار کردیا۔ ان کے بیٹوں سے اسے کوئی انسیت نہیں تھی۔ بلکہ خوف آتا تھا۔ اسے پھپھو کی نہیں' ماں کی ضرورت تھی۔ جو دن بدن مرجھاتی جارہی تھی۔ کسی پھول کی مانند' جو دھوپ کی تمازت سے کملا جاتا ہے۔

زارا کو پھپھو کی ضد اور زبردستی نے لب گور پہنچایا تھا۔ عائشہ پھپھو کو معاف کرنے پر تیار نہ تھی' نہ کہ ان کی بہو۔

تائی امی اسے اداس دیکھ کر بے لوث چاہت کا اظہار کرتیں۔ رافعہ اور عائزہ بھی بہلاتیں۔ حالانکہ وہ ماں نہ تھیں اس کی۔ مگر انہوں نے اس کو ماں کی محبت کی طرح ہی اپنایا۔ آج کتنے دن بعد اسے ماں کی بے

بسی اور اپنی بے چارگی کا خیال آرہا تھا۔ وہ روتی رہی۔

اگر زارا کی بیماری کے دوران تائی وہاں ہوتیں۔ پھپھو کو تو قابو کر ہی لیتیں۔ پھر شاید۔۔۔ معاملات کچھ مختلف ہوتے۔ شاید زارا کو زندگی کے کچھ اچھے دن دیکھنے کو مل جاتے۔ مگر۔۔۔ پھپھو ان کی سازشیں، زبردستی، رات کو یاد آتے ہی وہ رونے لگی۔ نیند کا تو دور دور پتا نہ تھا۔ روتے میں آواز بلند ہو گئی۔ تائی تہجد کے لیے اٹھ گئی تھیں۔ فوراً" اس کے قریب آئیں۔

"ماں کی یاد آرہی ہے نا بیٹا؟ آنسوؤں کو روکو، تمہاری ماں کی روح کو اذیت پہنچے گی۔ اس کو یاد کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سیپارہ پڑھ کر روح کو ثواب پہنچانے کی دعا کرو۔ ماں باپ کسی کے بھی ہمیشہ نہیں رہتے۔ کسی کے پہلے رخصت ہو جاتے ہیں۔ کسی کے بعد میں۔ صبر کا بڑا اجر ہے۔"

دیر تک سمجھاتی رہیں، سہلاتی رہیں، یہاں تک کہ اس کے اعصاب پرسکون ہو گئے۔ کب نیند نے حملہ کیا۔ صبح آنکھ کھلی تو حسب معمول کالج چلی گئی۔ رات کی بے سکونی جیسے کہیں دور جا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

دن میں تائی کو بے چین دیکھا۔ ماتھا رگڑتی ہوئی ادھر سے ادھر پھر رہی تھیں۔ رہا نہ گیا، پوچھ لیا۔

"تائی امی! کیا بات ہے، آپ پریشان ہیں؟ رافعہ آپا کو بلاؤں؟"

"نہیں بچی! اصل میں صغریٰ آج جلدی چلی گئی اور مجھے اس سے کام تھا۔"

"آپ مجھے بتائیں، میں کر دوں گی۔"

"وہ۔۔۔ اوپر بھیجنا چاہ رہی تھی۔ آپا سے کچھ پوچھنا تھا۔"

"مجھے بتا دیں، میں پوچھ آتی ہوں۔" وہ ان کی عادت سے واقف ہو گئی تھی۔

گو کہ جس دن آئی تھی۔ اسی دن تائی کے ہمراہ گئی تھی۔ اس کے بعد نہیں گئی تھی۔ مگر تائی کی ہمدردی میں پوچھ لیا۔ تائی خوش ہو گئیں۔

"اچھا! تو جا کر پوچھنا کہ میں نے جو رحیم یار خان والی پڑوسن کا ان سے کہا تھا اس کا انہوں نے کچھ معلوم کیا؟ کچھ پتا چلا؟ بس یہی پوچھنا ہے۔"

خوشی سے سرشار تھیں۔ ان کو خوش کرنا کتنا آسان تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے زینہ چڑھنے لگی۔ کچھ جھجک سی ہوئی۔ "ان کے بیٹے بھی اگر ہوئے؟" واپسی کا سوچا، پھر تائی کی خوشی کا خیال آیا۔ چڑھ گئی۔ برآمدے میں تخت پر تائی کی بڑی آپا گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ اشارے سے سلام کا جواب دے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کونے میں ٹک گئی۔ ان کی بیٹی آئی ہوئی تھی۔ اشارے سے ہی اس نے عائشہ کا پوچھا۔

"رافعہ کی چچا زاد بہن ہے۔ آئی ہوئی ہے۔" مختصر جواب دیا۔ "ہاں، بولو۔" انہوں نے عائشہ سے سوال کیا۔ گویا سمجھ گئی تھیں۔

"جی! وہ تائی امی نے پوچھا ہے کہ رحیم یار خان والے پڑوسیوں کا پتا کرایا؟"

بڑی آپا کے جواب دینے سے پہلے۔ ان کی بیٹی منہ پر ہاتھ رکھ کر زور سے ہنسی۔ "لو بھلا! لڑکی خود اپنے رشتے کے بارے میں بات کرنے آگئی۔ بی بی خالہ جان کو پرانے پڑوسیوں کا پتا اس لیے چاہیے کہ ان کے بیٹے سے تمہاری شادی کا چکر چلائیں۔"

پھر ہنسیں، عائشہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اضطرابی کیفیت میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بڑی آپا نے اسے اشارے سے روکا۔

"بیٹھو بیٹا! یہ تو مذاق کر رہی ہے۔ شمسہ اس طرح نہیں منہ کھولتے۔ بچی بے چاری کیا جانے؟ تمہاری خالہ کی بے صبری توبہ ہے۔ پرسوں احد نے آکر پوچھا۔ "دادی! نانو پوچھ رہی ہیں نصفیہ کے بچہ ہونے کی کون سی تاریخ بتائی ہے ڈاکٹر نے لو بھلا! اور وہ بچہ پورا دادا ہے، کہنے لگا۔ "دادی! ڈاکٹر بچے کے پیدا ہونے کی تاریخ پہلے سے بتا دیتے ہیں؟ تو میرے بچوں کی تاریخ بھی پوچھ لیں کہ کب ہوں گے۔" سنا، یہ حال ہے آج کل کے بچوں کا۔"

وہ تو کچھ اور سوال بھی سنانے والی تھیں۔ عائشہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ جانے لگی تو شمسہ نے استہزائی لہجے میں پکارا۔

"ارے بھئی! جواب تو لیتی جاؤ، اپنے سوال کا۔" پھر قہقہہ لگایا۔

عائشہ جلدی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ وہ تائی سے خفا ہو گئی، شمسہ سے بھی۔

رافعہ نے اس سے پوچھا۔ اوپر کیوں گئی تھیں۔ وہ منہ پھلا کر کمرے میں گھس گئی۔ تائی نے بلند آواز میں پوچھا۔

"آپا نے کیا بتایا؟" پھر رافعہ کو راز میں شریک کر لیا۔ سرگوشی میں۔ وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔ شمسہ کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی، سمجھ گئیں۔

شام کو شمسہ، عامر کے ساتھ نیچے آئیں۔ عائشہ دال چاول صاف کر رہی تھی۔ احد کے لیے کھچڑی بنانی تھی۔ سلام کر کے وہ کچن میں آکر کھچڑی کے دال چاول دھونے لگی۔ پھر بگھار کی تیاری کر رہی تھی تو شمسہ پانی پینے کے بہانے کچن میں آگئیں۔ عائشہ کو کام کرتے ہوئے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر باہر آگئی۔

رات کو رافعہ نے اماں کو بتایا۔ "شمسہ کو عائشہ پسند آگئی۔ عامر کے لیے رشتہ مانگنا چاہ رہی ہیں۔ اماں! خالہ امی بات کریں تو آپ ٹال جائیں، کوئی بہانہ کر دیں۔"

"اوئی! میں کیا دیوانی ہوں جو گھر آیا رشتہ ٹال جاؤں، سنو ذرا۔"

"میں جو کہہ رہی ہوں آپ بہانہ بنا دیں۔"

"کیا شمسہ نے کہا ہے اس لیے؟ تم کو میرے بھانجے، بھانجی اتنے برے کیوں لگتے ہیں آخر؟ ایک معقول تجویز بجی نے تمہارے کان میں ڈال دی۔ تم ہتھے سے اکھڑ گئیں لو بھلا۔"

"میں بھی پاگل نہیں ہوں، جو خوامخواہ منع کروں گی۔ ہے ایک بات، اس لیے کہہ رہی ہوں۔"

اماں منہ بنا کر رہ گئیں۔ رات کو جب عائشہ سونے کے لیے لیٹی تھی، بڑی رازداری سے اماں نے اس سے کہا۔

"رافعہ ہے تو میری بیٹی، مگر میری کسی عادت کی چھینٹ بھی اس پر نہیں پڑی۔ بھلا دیکھو! اکلوتی نند سے بیر باندھا ہوا ہے۔ وہ بے چاری میکے آتی ہے۔ میرے پاس بھی آجاتی ہے، بس۔۔۔ رافعہ جل جاتی ہے۔ میرے بھانجے، بھانجی سے خوامخواہ کا بیر باندھا ہوا ہے۔"

"پھر بھی آپ نے ان کی شادی اپنے بھانجے سے کر دی؟ سب جانتے ہوئے۔" عائشہ کو ہنسی آرہی تھی۔

"اے لو، سنو ذرا، بچپن کی منگنی تھی۔ مردوں کے درمیان بات ہوئی تھی اور اسے عدنان کب برا لگتا ہے، اس کے بہن بھائی برے لگتے ہیں۔"

"عدنان بھائی ہیں بھی تو اتنے اچھے، محبت کرنے والے، سب کا خیال رکھنے والے۔"

"بس۔۔۔ یہ تو ہے اور جب یہ بھانجا اتنا اچھا ہے تو دوسروں سے کیوں نہ محبت کروں؟ مگر یہ رافعہ۔۔۔ اس کے پاس انصاف نام کی کوئی چیز نہیں۔ سسرال والوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنا چاہتی ہے، ضد باندھی ہوئی ہے۔"

"ارے نہیں، تائی امی!" رافعہ آپا بہت اچھی ہیں۔ وہ کیوں ضد باندھیں گی۔ عادل بھائی آتے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات کرتی ہیں۔"

"ارے بڑی گہری بندی ہے رافعہ۔ اس کی دوستی تو سمیہ سے ہے، سمیہ بھی میری بھانجی ہے۔ چھوٹی بہن کی بیٹی، سچی بات ہے مجھے سمیہ زیادہ پسند نہیں۔ ہنستی رہتی ہے، ہر وقت کھی کھی اور میں تو ٹوک دیتی ہوں۔ وہ تو برا نہیں مانتی۔ رافعہ کو میرا ٹوکنا برا لگتا ہے۔ سمیہ کا بھائی بہت پیارا بچہ ہے۔ بہت لائق ہے، انجینئر ہے۔ سعودی عرب میں ہوتا ہے۔ اے لو، بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا، اے میں نے کہا عائشہ بھلا مجھے دور جانے کی۔ رحیم یار خان اور اللہ بھلا کرے کس کس کا نام سوچ رہی ہوں، خدایا مجھے اپنے اس پیارے بھانجے کا خیال ہی نہیں آیا، لو بھلا۔" سر پر ہاتھ مار کر ملال کا

اظہار کیا۔

"آ... آپ کی چھوٹی بہن آپ سے ملنے نہیں آتیں۔" وہ ٹال گئی۔

"آتی ہے' بہت کم۔ بیٹا سعودی عرب' بیٹی امریکہ' تو وہ کبھی وہاں' کبھی یہاں۔

☼ ☼ ☼

عادل کی پوسٹنگ کھاریاں میں تھی۔ اکثر وہ گوجرانوالہ آیا کرتا تھا اور وہاں سے لاہور آنا ضروری' کبھی تو رات رہ کر صبح سویرے چلا جاتا۔ زیادہ تر آتا ہی رہتا۔ شور مچاتا' اچھلتا' کودتا' سیڑھیاں پھلانگتا' آکر بھائی' بھابھی کو سیلیوٹ کرتا۔ احد کو کمر پر لاد کر خالہ جانی کے کمرے میں جا دھمکتا۔ قہقہوں اور احد کی احتجاجی چیخوں کو سن کر رافعہ وہاں جاتیں تو خالہ سے لپٹا سرگوشیاں کررہا ہوتا۔ چھالیہ چباتا۔ احد سے کمر دبواتا۔ عاشی کونے میں بیٹھی پڑھ رہی ہوتی یا لکھ رہی ہوتی۔ کبھی وہ ہونٹ دبا کر مسکراتی نظر آتی۔ گویا عادل کے لطیفوں سے لطف لے رہی ہے۔

عائشہ کا ٹیسٹ تھا۔ وہ سڑک پر وین کا انتظار کررہی تھی۔ بالکل قریب فوجی جیپ آکر رکی۔ وہ جھجک کر ہٹی۔ عادل نے اندر سے گردن نکالی۔

"آپ کی وین نہیں آئی؟ میں گوجرانوالہ جارہا ہوں۔ آیئے! آپ کو کالج چھوڑ دوں۔"

اگر اتنا اہم ٹیسٹ نہ ہوتا تو وہ جرات نہ کرتی' مگر ایک موقع مل رہا تھا۔ ہچکچاتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"آپ کو... دیر نہ ہوجائے میری وجہ سے۔" کچھ شرمندگی سے اس نے کہا۔

"نہیں! آپ کو بھی تو جلدی پہنچنا ہے۔ یوں بھی ہماری یونٹ آگے بڑھ گئی ہے۔ میں اسے راستے میں پکڑلوں گا' میری خیر ہے' فکر نہ کریں۔"

صبح کا سہانا سماں' ٹھنڈی ہوائیں' جیپ کے اندر داخل ہوکر عجیب سا سرور پیدا کررہی تھیں۔ عائشہ کے چہرے پر سرخی سی تھی۔

"آپ... بہت خاموش رہتی ہیں۔ شاید میری یہ جرات آپ کو پسند نہیں آئی۔"

"ارے نہیں نہیں... میں بلکہ... دراصل آج کا ٹیسٹ بہت اہم ہے۔ میں تو شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ آج اگر لیٹ پہنچتی' خاصا نقصان ہوجاتا۔ آپ کی..." وہ تیزی سے بول رہی تھی۔

"میری کوئی مہربانی وغیرہ نہیں۔ میرا یہی راستہ ہے۔ آپ کو دیکھا تو خیال آیا۔ بھائی بھی گئے ہوئے ہیں۔ آپ کو برا نہ لگے تو... ایک بات پوچھوں' آپ کہیں انگیجڈ تو نہیں؟"

بہت شریفانہ سا لہجہ تھا۔ عائشہ گردن موڑ کر باہر دیکھنے لگی۔ تیزی سے پیچھے جاتی سڑک... لمحہ بھر میں دور ہوتی ہوئی ٹریفک... یہ بھی تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ میرے بڑوں سے بات کرو' بڑا کوئی تھا نہیں۔ وہ ایک لاوارث لڑکی ہے۔ اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اس پر ترس کھا کر انہوں نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔

گوکہ وہ اپنے اخراجات خود اٹھا سکتی تھی۔ مگر تائی امی نے اسے رقم نکالنے سے منع کردیا تھا۔ اسے کسی چیز کی تنگی بھی نہیں ہوئی۔ کب اس کے کپڑے سل سلا کر الماری میں آجاتے ہیں۔ کس طرح نئی چپل' سینڈل آجاتی ہیں۔ فیس کب جمع ہوجاتی ہے۔ کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب بھی عائزہ کے لیے کوئی نئی چیز لی جاتی۔ اس کے لیے بھی آجاتی۔ اس نے احتجاج بھی کیا۔

رافعہ نے اسے خاموش کردیا۔ یہ کہہ کر کہ "عدنان نے تم کو بیٹی بنایا ہے۔ وہ دو بیٹیوں کے درمیان اگر فرق کریں گے تو مجھے اعتراض ہوگا۔"

وہ حیران ہوجاتی۔ یہ کس دنیا کے لوگ ہیں۔ بے غرض اور بے نیاز' کیا یہ فرشتوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں؟

رافعہ کے موڈ کا اندازہ کرکے ایک روز اس نے پوچھ ہی لیا۔ "آپا! آپ کو اپنے دیوروں' ساس اور نند سے شکایت رہتی ہے۔ عدنان بھائی سے بھی کوئی شکوہ یا..."

رافعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "آہ... یہ لمبی کہانی ہے۔ سات سال ایک شخص کو تصور میں محسوس کیا ہو۔ اپنا سمجھا ہو' تو کیا شکوہ' کیسی شکایت' شاید اسی کو محبت کہتے ہوں اور محبت میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔"

"تو آپ اپنی خالہ سے یعنی ساس سے کیوں خفا رہتی ہیں؟ آپ کے دیور تو تائی سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ اپنی ساس کو خالہ ہی سمجھ کر..."

"اچھا جی... اب محبتوں میں بھی فرق تلاش کرنے لگیں۔ ماشاء اللہ۔ بھئی! بہت اچھی خالہ ہیں' مگر ساس بھی تو ہیں۔ ابھی تم کسی کی بہو نہیں ہو۔ اس لیے تجربہ نہیں ہے۔ عنقریب تم کو بھی عقل آجائے گی' پھر پوچھوں گی۔"

"آپا! آپ مجھ سے خوش تو ہیں نا؟ میری کسی بات پر خفا تو نہیں؟"

"نہیں... بالکل نہیں۔ مگر میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے۔ تمہارے ساتھ جچے گا نہیں۔" شریر ہورہی تھیں۔

وہ جھینپ گئی۔ "توبہ! میرا مطلب ہے میں آپ کی بہت قریبی عزیز تو ہوں نہیں۔ پھر آپ میرا اتنا خیال کیوں کرتی ہیں۔ میں تو بن بلائی مہمان کی طرح مسلط ہوگئی' پھر بھی..."

"میری گڑیا! قریبی یا دور کے رشتے سے کیا ہوتا ہے۔ تعلق تو ہے۔ انسان کا رشتہ سب سے اہم ہے اور پھر تم اماں کی بلائی ہوئی ہو اور اماں' ابا کی وصیت اور نصیحت پر آنکھ بند کرکے عمل کرتی ہیں' پھر تم عدنان کی ذمے داری ہو' میں تو دونوں طرف سے پابند ہوں۔"

عائشہ چپ چاپ رافعہ کو تکتی رہی۔ عائشہ کی پھپھو کا فون آگیا۔ تائی سے بات ہوئی۔

"بھابھی جان! میں آپ کے گھر آنا چاہتی ہوں۔ اجازت' کل آجاؤں؟"

"ارے کس سلسلے میں بھئی۔" اماں حیرت سے کہہ رہی تھیں۔

"آپ کے گھر میری بچی ہے' کیا میں اس سے ملنے نہیں آسکتی۔"

"اوئی! تمہاری بچی میرے گھر کیوں ہے بھئی؟ اور تمہاری تو کوئی بیٹی ہے ہی نہیں۔"

"مذاق نہ کریں بھابھی جان! سنا تو ہوگا آپ نے۔ پھپھی' بھتیجی ایک ذات' ماں' بیٹی دو ذات۔ تو بھتیجی میری بیٹی ہی ہوئی۔ عرصہ ہوگیا' اس سے ملے ہوئے۔ ایک دفعہ دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کرلوں۔"

"بانو! میرا گھر سب کے لیے کھلا ہے۔ جم جم آؤ' مگر پہلے تو تم نے اجازت نہیں لی تھی۔ ایک بات یاد رکھو! وہ میرے گھر میں ہے' تمہارے بھائی کے نہیں۔"

اماں نے خاصے روکھے لہجے میں بات کی تھی۔ دو دن پھپھو نے شاید سوچنے میں گزار دیے۔ تیسرے دن آوارد ہوئیں۔ عائشہ کالج سے آئی تو سامنے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ لپک کر اٹھیں۔ اسے گلے لگالیا۔ چٹاچٹ منہ چوما۔ پھر رونے لگیں۔ بین شروع ہوگئے۔

"ہائے! میری پھول سی بچی' اپنا گھر چھوڑ کر پردیس میں بیٹھی ہے۔ میں تو تلاش ہی کرتی رہی۔ دشمنوں نے اسے مجھ سے دور کرنے کے لیے چھپا دیا۔ ایسا غائب کیا کہ مہینوں تلاش کرتی رہی۔ سراغ ملا۔"

پلکیں جھپک جھپک کر آنسو بھی نکال لیے۔ اماں بغور ان کی اداکاری دیکھ رہی تھیں۔

"یہ... دشمنوں کسے کہا تم نے؟" وہ غصے میں ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

"وہی... بھابھی رفو' رفیعہ بیگم' بھابھی جان! ان کے چلتر کیا کیا بتاؤں۔ ایک نمبر کی چالاک عورت ہے۔ میں تڑپتی رہی۔ نہ جانے کہاں لے جاکر چھپایا۔ بھابھی جان! دو دن کو لے جاؤں اسے؟ میری مامتا کو قرار آجائے گا۔ چل بیٹی! بس دو جوڑے رکھ لے۔ خود پہنچا جاؤں گی پرسوں تک۔"

عائشہ کانپ گئی۔ اماں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔ انکار میں سرہلا دیا۔ تائی اپنی جگہ کھڑی ہوگئیں۔ بولیں تو آواز میں کھردراپن واضح تھا۔

"چلو بی بی بانو! مل لیں بھتیجی سے؟ اب اپنا رستہ

پکڑو۔ تمہاری ممتا کی تسکین کے لیے چار بیٹے بہت۔"

بانو لرز گئیں۔ خوشامد شروع۔ "میری بھابھی جان! دشمنوں نے کیا کیا لگا دی ہے۔ جو...."

"بس! قصہ ختم۔ تم نے کہا آنا چاہتی ہو۔ میں نے کہا، آجاؤ۔ ٹھیک؟ مل لیں، رولیں، اب جاؤ۔"

الفاظ میں سختی، چہرے پر سختی، انگلی دروازے کی جانب اٹھی ہوئی۔ بڑبڑاتی ہوئی بانو چلی گئیں۔ مگر عائشہ ڈر گئی۔

"میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی، کبھی نہیں۔ وہ پھر آجائیں گی۔" اماں نے ہاتھ ہلا کر گویا مکھی اڑائی۔

"ارے! بہت دیکھے ہیں ایسے مکار لوگ، فکر نہ کرو۔"

"تائی امی! انہیں مجھ سے نہیں، ابا کے گھر سے محبت ہے۔ ہر حال میں انہیں وہ مکان چاہیے۔"

اماں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں! لالچ اور عیاری بانو کی فطرت میں ہے۔ جانتی ہوں، تم فکر نہ کرو۔"

عائشہ جو یتیم تھی۔ بے سہارا تھی۔ اماں اس کے سر پر آسمان کی طرح تن گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پھر ایک دن اماں کی چھوٹی بہن آگئیں۔ وہ کمرے سے پانی پینے کے لیے باہر نکلی۔ صحن میں اماں کسی خاتون سے گلے مل رہی تھیں۔ پیچھے ایک لڑکا بھی کھڑا تھا۔ پرشوق انداز میں انہیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ عائشہ رک گئی۔ خالی بوتل ایک طرف رکھ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"کیسے آگئی اچانک؟ خیر نہ خبر۔" اماں ان سے الگ ہو کر شکوہ کر رہی تھیں۔

"آپا! آپ سے ملنے اور کیسے آتی؟" انہوں نے مسکرا کر کہا۔ پھر عائشہ پر نظر پڑی۔ حیرت اور مسرت نے چہرے کو گلنار بنا دیا۔ آگے آکر عائشہ کو لپٹا لیا۔

"نہ آتی تو یہ در نایاب کہاں سے پاتی؟ اسی کی تلاش میں تو آئی ہوں۔" خوشی سے معمور لہجہ۔ اماں حیرت زدہ کھڑی تھیں۔

"عائشہ! تم ثروت کو جانتی ہو؟ میری چھوٹی بہن ہے۔"

بجائے بہن سے پوچھنے کے عائشہ سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ پہلے ہی حواس باختہ تھی۔ انگلیاں چٹخانے لگی۔ گردن جھکا کر مجرموں کی طرح کھڑی تھی۔

"آپا! مجھ سے پوچھیں۔ یہی تو وہ لڑکی ہے۔ جسے دیکھنے میں ساہیوال گئی تھی۔ بھول گئیں آپ؟ بتایا تو تھا آپ کو۔ انگوٹھی پہنا کر آئی تھی۔ پھر میں آسٹریلیا چلی گئی۔ بیمار پڑ گئی۔ اب آئی تو اس بچی کا کچھ اتا پتا۔ میری نند کی وہ نند جنہوں نے رشتہ کرایا تھا۔ ان کا فون بند۔ ساہیوال جانے کے ارادے سے آئی تھی کہ آپ کو لے کر جاؤں گی۔ آپ کی تو وہاں نند، دیور وغیرہ ہیں۔"

"اچھا۔ لو.... تم نے پتا نشان بتایا ہی نہیں۔ مجھے کیا الہام ہوتا ہے کہ معلوم کر لیتی۔ خیر.... یہ میرے دیور کی بیٹی ہے۔ پچھلے سال اس کی ماں بھی چل بسی۔ میں نے اسے بلا لیا۔"

تائی تفصیل بیان کرنے لگیں۔ وہ عائشہ کو بانہوں میں بھر کر پیار کرنے اور افسوس کرنے لگیں۔

"ہائے! مجھے تو خبر ہی نہ ہوئی۔ میں تو آسٹریلیا کے چکر میں سب کچھ بھول گئی۔ اب آئی ہوں۔ یہ کیا خبر تھی کہ زارا آپ کی دیورانی ہیں۔ بہت اچھی معصوم خاتون تھیں۔ پاکیزگی کا نمونہ۔"

عائشہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ تائی اپنی بہن کو لے کر رافعہ کے کمرے میں چلی گئیں۔ لڑکا اسی طرح اس جگہ کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ وہاں سے ہل بھی نہ سکی۔ بھاگنا تو دور کی بات ہے۔

"اچھا! آپ یہاں ہیں۔ امی تو ساہیوال جانے کے ارادے سے آئی تھیں۔ ویسے آپ یہاں کیسے پائی جاتی ہیں؟"

"جی! یہ میری تائی امی کا گھر ہے۔ امی کے بعد تائی امی نے مجھے بلا لیا تھا۔" بمشکل بول سکی۔

"خوب! یہ تو میرے حق میں بہت اچھا ہو گیا۔ آپ

کی امی کا سن کر افسوس ہوا۔ تعجب ہے خبر ہی نہیں ہوئی۔"

عائشہ سر ہلا کر واپسی کے لیے مڑ گئی۔ پانی پینے کا ارادہ ملتوی کر کے کمرے میں گھس گئی۔ حیرت ہے 'رفو پھپھی نے ان لوگوں کو کیوں نہیں بتایا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ ــــ قدرت نے اب کیوں ان سے ملوادیا۔ کوئی اور قصہ نہ شروع ہو جائے۔ زندگی کتنی فضول ہے میری۔" دوسرے کمرے میں تائی امی بہن اور رافعہ سے کیا باتیں کر رہی ہیں۔ وہ جاننے کی بھی خواہش تھی۔ پھر اماں صغریٰ کو پکارنے لگیں۔

"یقیناً" اوپر بھیجا جائے گا۔ بڑی آپا کو بلانے۔ میری داستان غریب سب کے لبوں پر ہو گی۔ کیسے سامنا کروں گی؟"

پتا ہی نہیں چلا۔ کب غنودگی طاری ہو گئی۔ مستقبل کے اندھیروں سے خائف انجان جزیرے کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی۔ کب شام گہری ہو گئی اور رات آ گئی۔

"ہیلو۔ ہیلو کہاں ہیں آپ؟ کیا جاگ گئیں۔ سوری! کھانے پر بلایا ہے۔" احد تھا۔ وہ سٹپٹا کر اٹھی۔

"احد! مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔" سب کا سامنا۔

"آپ کو میری چھوٹی نانی سے ملنے کا بھی شوق نہیں ہے؟ وہ تو آپ کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔"

"ہیں؟ کیوں؟ ہیں بھلا۔ افوہ!" بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔

"افوہ کیوں کہا آپ نے۔ یہ تو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ آپ کی حیرانی دیکھ کر۔ چلیے! اب سہی افوہ۔ میری دادی بھی وہاں ہیں۔ وہ بھی آپ سے ایک بار پھر ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔ پھر کہیے افوہ۔"

عائشہ پھر گھبرا گئی۔ "دادی بھی موجود۔ افوہ۔"

"یہ آپ دادی کے ذکر پر ڈر کیوں رہی ہیں؟ میری دادی آپ کو کاٹتی ہیں؟ نوچتی ہیں؟"

"اف! لڑکا ہے کہ آفت۔" مسکرا رہا تھا۔

"تم چلو۔ میں آتی ہوں۔"

آج اندازہ ہوا کہ وہ خود ایک کھلی کتاب ہے۔ جس کے ہر صفحے پر اس کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ہر شخص پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ وہ اتنی عام زبان میں ہے کہ بچہ بھی بہ آسانی اسے پڑھ لیتا ہے۔ لیکن جو وہ کہنا چاہتی ہے لوگ وہ کیوں نہیں سمجھ لیتے۔

کمرہ طعام میں اسے دیکھ کر سناٹا طاری ہو گیا۔ اس نے سلام کیا۔ جواب رافعہ اور عدنان کی جانب سے آیا۔ پھر عدنان نے کہا۔

"خالہ! یہ میری بڑی بیٹی ہے۔"

"تمہاری بیٹی کی حیثیت سے تو پہلی بار مل رہی ہوں۔ مگر۔ میری یہ دوسری ملاقات ہے۔" ثروت نے اٹھ کر اسے پاس بلایا۔

"آؤ! تم میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔" کونا خالی کر دیا۔

وہ جھینپ گئی۔ اسے لگا' بڑی آپا اسے تیز نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔"

"جگہ نہیں ہے۔ تو میں ادھر چوکی پر بیٹھ جاتی ہوں۔" وہ شرمیلے لہجے میں بولی۔

بڑی آپا نے اسے مڑتے دیکھا۔ "اے بی بی! بزرگوں سے سنا ہے۔ جگہ دل میں ہونی چاہیے۔ اور تم۔ گھر کا پورا کمرہ سمیٹے بیٹھی ہو۔" لہجے میں حقارت اور طنز تھا۔

"عاشی! آؤ۔ تم یہاں میری کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ میں ذرا نیوز سن لوں۔ آج بڑی خاص خبریں آنے والی ہیں۔" عدنان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کرسی پر بٹھا دیا۔

"بڑے ہی بے عقل ہو عدی!" بڑی آپا پھر بولیں۔ "اپنی کرسی بھی کسی کو دی جاتی ہے؟"

عدنان نے جاتے جاتے مڑ کر ماں کو دیکھا۔ ٹھٹک گئے۔ بولے۔ "کرسی؟ کرسی کی بھلا کیا اہمیت ہے۔ اماں! میں نے تو عاشی کو بیٹی والا حق بھی دے دیا ہے۔"

یک لخت سناٹا چھا گیا۔ ناگوار سناٹا۔ عائشہ کا دل چاہا۔ اٹھ کر باہر بھاگ جائے۔ مگر۔ بڑی آپا کھڑی ہو گئیں۔

"بس بھیا! سب کو حق دار بنا لو۔ ایک ماں ہی تم کو کہیں نظر نہیں آتی۔" سرد آہ بھر کر وہ کمرے سے باہر جانے لگیں۔

رافعہ نے بے تابی سے پکارا۔ "خالہ امی! کھانا تو پورا کر لیں۔ رزق چھوڑ کر جانا تو۔۔۔"

"بس کھا لیا۔ جو رزق میرے نام کا تھا اس دستر خوان پر۔ تم لوگ کھاؤ۔" باہر نکل گئیں۔

"اے ہے۔ تم لوگ تو کھاؤ۔" اماں نے جیسے پروا ہی نہ کی۔ "بڑی آپا کو ایسے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ کبھی خوش' کبھی بے زار۔ کل تک ٹھیک ہو جائیں گی۔ صغریٰ گرم روٹی دو۔ رافعہ! کھانا کھاؤ۔ اور سعود کو یہ بریانی نکال کر دو۔ عائزہ کدھر ہے؟ توبہ ہے! سب کو نقارے بجا کر بلانا پڑتا ہے۔ عجب دستور ہے اس گھر کا۔ اور عجیب مزاج۔"

"نانی! میرا مزاج تو سب سے اچھا ہے نا؟" احد شوخی سے بولا۔ وہ ہنس دیں' ماحول بدلا کچھ۔

عائزہ شور مچاتی اندر آئی۔ "ہائیں! میرے بغیر کھانا شروع کر دیا سب نے۔ واہ!"

وہ دادی کی چھوڑی ہوئی کرسی پر جم گئی۔ ان ہی کی پلیٹ میں کھانے لگی۔

"عائشہ! یہ ہیں میری چھوٹی خالہ۔ جن کا ذکر کرتی تھی میں۔ اور یہ سعود ہے۔ سمیہ آج کل پشاور میں ہے۔ امریکا سے آئی ہے۔ سسرال کی شادی اٹینڈ کرنے۔"

رافعہ دراصل اسے بہلا رہی تھیں۔ باتوں میں لگا کر اس تاثر کو کم کرنا چاہا۔ عائشہ کی حالت دیکھ کر سمجھ گئی تھیں کہ شرمندہ اور رنجیدہ بھی ہے۔ بمشکل حلق سے کھانا اتار رہی تھی۔ وہ خود بھی خالہ امی کے طرز عمل سے پریشان اور حیران تھیں۔

"کیا بات ہے اماں! خالہ امی اس قدر خفا کیوں ہیں عائشہ سے؟"

عائشہ کے باہر نکلتے ہی انہوں نے اماں سے راز کی بات جاننا بلکہ اگلوانا چاہی۔ اماں کندھے اچکا کر پانی پیتی رہیں۔

"نہیں اپنا حق ہی سب سے افضل نظر آتا ہے اور عدنان تمہیں بھی کوئی حق دے۔ یہ کب گوارا ہے۔ عائشہ تو پھر ان کے لیے غیر ہے۔" رافعہ کے دوبارہ پوچھنے پر خیال ظاہر کیا۔

"مگر عائشہ کا اس میں کیا قصور ہے؟" ثروت بھی حیران تھیں۔

"عدنان ان کا بیٹا ہے۔ اس پر ماں کا حق ہونا چاہیے۔ کسی اور کا ہرگز نہیں۔"

"نہیں! کچھ اور بات بھی ہے۔" رافعہ سوچنے لگیں۔ کھانے کے بعد سعود چہل قدمی کے لیے باہر چلا گیا۔ اماں اور چھوٹی خالہ برآمدے میں تخت پر بیٹھی پرانے قصوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ وہ عائشہ کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ عائزہ کچھ سوال حل کرنے عائشہ کے پاس آئی تھی۔ انہوں نے اسے بہانے سے کمرے سے نکالا اور عائشہ سے وہی سوال کیا۔ عائشہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

"آپا! میں کیا بتا سکتی ہوں۔ آپ کو کیا لگتا ہے؟"

"عدنان کے چند الفاظ کے سوا۔ اور کیا بات ہے۔ اور کہہ دینے سے ہوتا کیا ہے؟ ہمارے پاس کوئی جائیداد یا جاگیر تو ہے نہیں۔ جس میں تمہارا حصہ ہو۔ پھر آخر' خالی محبت' شفقت کا عمل۔ اس میں بھی بخل سے کام لیا جائے۔ زبانی کہہ دینے سے کس کی حق تلفی ہوتی ہے بھلا۔ نہیں بھئی! مجھے تو کوئی اور بات لگتی ہے۔" وہ سوچتی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

عائشہ ڈر گئی۔ یہ مجھ پر شک کر رہی ہیں۔ "آپا! میں نے تو کبھی کوئی بات نہیں کی۔ جس سے بڑی آپا ناراض ہو جائیں۔"

رافعہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔ "بڑی آپا؟ ہائیں! تمہیں وہ بڑی آپا لگتی ہیں؟"

"وہ۔ بس تائی امی جو کہتی ہیں۔۔۔ تو بس۔" خجالت سے انگلیاں مروڑنے لگی۔

"پھر اماں کو تائی کیوں کہو؟ آپا کہو۔ چھوٹی خالہ آپا کہتی ہیں۔" اسے شرمسار دیکھ کر انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔ "مذاق کر رہی ہوں بھئی۔"

وہ صاف دل کی مالک تھیں۔ مگر الجھ گئی تھیں۔

"خالہ امی سے پوچھوں؟ بتائیں گی نہیں۔ خیر دوسری بات۔ عائشہ چھوٹی خالہ نے تمہیں انگوٹھی پہنائی تھی؟ کہاں ہے۔ کبھی پہنے دیکھا تو نہیں۔"

عائشہ مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر بولی۔ "رفو چچی کے پاس۔"

وہ چونک گئیں۔ "رفو چچی؟ تمہاری انگوٹھی ان کے پاس کیوں؟"

"امی کے انتقال کے وقت میں بے ہوش ہو گئی تھی تو ہسپتال لے گئی تھیں مجھے۔ رفو چچی نے اتار کر رکھ لی۔ پھر دینا بھول گئیں شاید۔"

کہاں تک راز چھپاتی۔ بوجھ سا تھا۔ کم تو نہیں ہوا۔ مگر جھوٹ بولنے سے بچ گئی۔ رافعہ کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھیں۔ مگر عائزہ شور کرتی اندر آئی۔

"کیا ہے ماما! مجھے اتنا ضروری سوال سمجھنا تھا۔ اب میری باری ہے۔ آپ مجھے پڑھنے تو دیں۔ پھر کہتی ہیں، ٹیسٹ میں نمبر کم کیوں ہیں؟"

رافعہ اسے گھورتی ہوئی چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

ثروت اور سعود کئی دن سے قصور گئے ہوئے تھے۔ غالباً" کسی کی شادی تھی۔

تائی کو ایک بار پھر صغریٰ کی ضرورت پیش آگئی۔

"بھاگ کے جا۔ بڑی آپا سے پوچھ۔ سیالکوٹ والے حسیب بھائی اب کس شہر میں ہیں۔ اور ان کے فوجی بیٹے کا نام بھی پوچھ کر آنا۔" صغریٰ دوڑ گئی۔

"اب حسیب ماموں کے بیٹے سے کیا کام پڑ گیا؟"

"استخارہ کروں گی۔"

"استخارہ؟ کس لیے۔"

"گھر میں لڑکی بیٹھی ہے۔ فکر نہ کروں؟ اگر استخارہ واجب آگیا تو ان سے کہوں گی۔ اس سے اچھی بہو بھلا انہیں کہاں ملے گی؟"

"اماں!" رافعہ حیرت سے آواز پر قابو نہ کر سکیں۔ زور سے بول پڑیں۔ "یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ سعود سے منگنی ہوئی ہے اس کی۔"

"مجھے یقین نہیں۔ نہ لڑکے کی کسی حرکت سے ظاہر ہوا۔ نہ عائشہ کچھ بتائے۔ کہیں تو کرنی ہے مجھے۔"

"چھوٹی خالہ آجائیں۔ ان سے پوچھ لیں۔ انگوٹھی تو خیر انہوں نے پہنائی تھی۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے نہیں کرنا۔ میری مرضی 'چاہے گھسیارے کو دے دوں۔"

"ماں واقعی خفا تھیں۔ نہ جانے کیوں؟ پھر صغریٰ نیچے آئی۔"

"کہتی ہیں حسیب بھائی پنڈی میں ہیں۔ ایک بیٹا! فوج میں تھا۔ کوئٹہ میں ہے۔ دوسرا چھوٹا بیٹا حبیب نام ہے۔"

"تیری سانس کیوں پھول رہی ہے؟" رافعہ کی تیز نظروں نے بھانپ لیا۔

"وہ جی۔ عادل صاحب۔ میرے پیچھے پڑ گئے کہ تیرا ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتاؤں۔ میں بھاگ لی۔ وہ بھی بھاگے تھے۔" اس نے مڑ کر دیکھا اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہنسی روکی۔

"اچھا۔ اچھا جا کام کر۔ یہ عادل بھی بس۔"

بڑبڑا کر رہ گئیں۔ آیا ہوا ہے۔ تو شام کو ضرور چکر لگائے گا۔ لڑکیوں کو دیکھ کر زیادہ ہی شوخ ہو جاتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے وہ عائشہ کو اپنے گھر لانے کے خلاف تھیں۔ وہ تو شکر ہے کہ عائشہ خود بے حد محتاط اور لیے دیے رہنے والی ہے۔ ورنہ۔۔۔

شام سے پہلے ہی عادل آگیا۔ اس کے ساتھ۔ دونوں بہنیں سر جوڑ کر سرگوشیوں میں مصروف ہو گئیں۔ عادل صحن میں احد کی بال سے کھیل رہا تھا۔ احد دوست کے گھر گیا ہوا تھا۔ عائشہ کمرے میں تھی۔

"عادل! اندر آجاؤ۔" انہوں نے پکارا۔ وہ بال کو کک لگاتا دوسری طرف چلا گیا۔ رافعہ اندر آئیں۔ خالہ امی کہہ رہی تھیں۔

"بھئی! آج کل تو سب ہی اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ میں کون سا انوکھا کام کر رہی ہوں۔ عادل خود چاہتا ہے کہ شادی سے کچھ فائدہ بھی ہونا چاہیے۔ میں تو ترقی کی قائل ہوں۔ اور تمہاری بیٹی میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے۔ اسی لیے ترجیح دی تھی کہ مکان ملے گا۔ بھئی! جائیداد والی ہو تو عزت و توقیر ہوتی ہے۔ مانی ہوئی بات ہے۔ بچپن کی منگنی کی حیثیت ہی کیا تھی۔ میں چاہتی تو کسی اعلا افسر 'جنرل' کرنل کی بیٹی بیاہ لاتی۔ مگر۔۔۔ عدنان نہ مانا۔ ہائے میرا ہیرا بیٹا۔"

"مگر بڑی آپا! فوجیوں کو تو گھر سرکاری طور پر مل جایا کرتے ہیں۔ جب تک نوکری ہوتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پھر۔ لے ہی لیتے ہیں۔" اماں دبی زبان سے معلومات کا اظہار کر رہی تھیں۔

"لو۔ کیسا مکان؟ کسی کسی کو ملتا ہے۔ خیر! اس میں کیا ہے۔ دو گھر ہوتے ہیں لوگوں کے۔ تم بات کو آگے بڑھاؤ۔ کیا کہتی ہو؟ سارے جہان کے لڑکوں کی چھان پھٹک کر رہی ہو۔ اب مفت میں بیٹھے بٹھائے۔۔۔"

"بڑی آپا! ثروت منگنی کر چکی ہے اس کی ماں کی زندگی میں۔ ایسا لپک کے ملی۔ جیسے برسوں کی کھوئی ہوئی بیٹی ملی ہو۔ اس سے کیا کہوں گی؟" اماں پریشان سی تھیں۔ "اچھا! پھر رفو سے بات کرتی ہوں۔" بڑی آپا کے تیور دیکھ کر بات بنائی۔ مگر بنی نہیں۔ وہ چیخ کر بولیں۔

"اوئی! رفو کون۔۔؟ خواہ مخواہ۔۔ نہ۔۔۔ میں نہ مانتی۔ کل آؤں گی۔ تب تک سوچ لو۔"

"ابھی پڑھائی پوری نہیں ہوئی۔" اماں بے بسی سے آنچل مروڑ رہی تھیں۔

"ہوتی رہے گی۔ میں کون سا ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کہہ رہی ہوں۔ مگر جواب کل ہی چاہیے۔" رافعہ انہیں اٹھتا دیکھ کر پیچھے ہو گئیں۔ جانتی تھیں 'ایسا ہو گا۔ عادل کی نظریں 'عامر کی توجہ' خالہ امی کی عائشہ سے چڑ' کوئی گل تو کھلنا تھا۔ ان کے جاتے ہی اماں کے پاس آئیں۔ وہ سر جھکائے انگلی سے کرسی پر کون سے نقش و نگار بنا رہی تھیں۔ جو نظر نہ آتے تھے۔

"اماں۔ اب کون سا شوشہ چھوڑ گئی ہیں خالہ امی! کبھی چین لینے دیں گی کہ نہیں۔ آپ نے بھی سر پر بٹھا رکھا ہے انہیں۔ وہ کیسی ہی غلط بات کریں۔ آپ سوچ میں پڑ جاتی ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ڈرنے کی۔"

"تو میں کب اہمیت دے رہی ہوں؟ بولتی ہیں تو بولتی رہیں۔"

"جی! تب ہی صاف جواب نہیں دیا۔ کہہ دیتیں، منگنی توڑنے کا اختیار نہیں ہے ہمیں۔"

"اچھا! سن لیا۔ سوچنے دو مجھے۔ کس مشکل میں ڈال دیا مجھے۔ ادھر ثروت ادھر وہ ضدی۔"

"پتا ہے مجھے۔ کل وہ آئیں گی۔ اور آپ آئیں بائیں شائیں کرتی رہیں گی۔ جب وہ کہہ رہی تھیں کہ تمہاری بیٹی کے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ تب تو آپ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہیں۔"

"تو کیا کہتی۔ جب ایک کام ہو چکا تو میں کیوں کچھ کہتی؟" اماں بھی کیا چیز ہیں، مطمئن۔

"اچھا! اور جب وہ کہہ رہی تھیں کہ کسی دولت مند کرنل 'جنرل کی بیٹی بیاہ لاتیں' تب تو آپ کچھ بول سکتی تھیں 'مگر نہیں میرے معاملے میں ہمیشہ ڈنڈی ماریں گی۔"

"جب وہ کہہ چکیں کہ عدنان نہیں مانا تو میں کیا کہتی؟ وہ جلے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔ میرا کیا بگڑا؟"

"میں کہے دیتی ہوں۔ میں عائشہ کی شادی ان کے لالچی 'بے غیرت' آوارہ بیٹوں سے نہیں ہونے دوں گی۔ بھیج دوں گی ارشاد چچا کے پاس۔ نبٹیے گا پھر آپ ان سے۔" رافعہ بہت خفا تھیں۔

"ساس تو ہمیشہ کچوکے لگاتی تھیں۔ مگر اماں کو دیکھو! کیسی چپ سادھ رکھی تھی' جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔" بڑبڑاتی باہر آئیں۔ عادل ابھی بال سے کھیل رہا تھا۔ یقیناً" وہ عائشہ کا منتظر تھا۔ جو کونے میں بنی لانڈری میں کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ اکثر مشین لگا کر کپڑے دھو لیتی تھی۔ رافعہ نے عادل کو پکار کر کہا۔

"عادل! اندر آجاؤ؟" صغریٰ چائے بنا رہی ہے۔

عادل سر سہلاتا اندر آیا۔ "خالہ جانی نظر نہیں

آرہیں؟"

"لاؤنج میں ہیں۔ فون کررہی ہیں۔ چلو! وہیں چائے پی لیں گے۔" عادل کو لاؤنج میں جاتا دیکھ کر وہ کچن میں آئیں۔ ٹرے میں برتن رکھے صغریٰ کو جلدی چائے بنانے اور بسکٹ، نمکو بھی ساتھ لانے کی تاکید کرکے واپس آئیں۔ لاؤنج میں کوئی نہ تھا۔ خالہ، بھانجے دونوں ہی غائب۔ بھنا کر صحن میں آئیں۔ جہاں اماں کا کمرہ تھا۔ صحن سے ہی کمرے سے عادل کی آواز آرہی تھی۔ خوشامدانہ انداز، خالہ کے صدقے جانے کی کوشش یا ارادے ظاہر کررہا تھا۔ وہ کمرے میں جا پہنچیں۔ عادل باہر آرہا تھا۔ جیب تھپتھپاتا ہوا۔ اماں الماری بند کررہی تھیں۔ رافعہ نے تنقیدی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کیا تلاش کررہی تھیں؟"

"کچھ نہیں! وہ بس، چکن کا میرا سوٹ کدھر ہے۔ یہ ہی دیکھ رہی تھی۔"

"پھر ملا کہ نہیں؟"

"ہوں۔ ہاں مل گیا۔"

"اور۔ عادل کو کیا دیا؟ میں نے دیکھ لیا تھا۔ اس کا پھولا ہوا بٹوہ۔ اماں! خدا کے لیے اپنی رقم غیر مستحق کو نہ دیا کریں۔ ضائع ہوتی ہے۔ آپ ذرا سی خوشامد سے کیوں ریشہ خطمی ہوجاتی ہیں۔" کتنی بے بسی اور تاسف تھا لہجے میں۔

"اے ہے۔ کیسا کاٹا ہے۔ موا مچھر تھا کہ بچھو۔ اُفوہ۔" اب اماں جھک کر اپنی پنڈلی کھجا رہی تھیں۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ "اللہ رے منحوس مچھر، خون چوس لیا نگوڑے نے۔"

مچھر کا واویلا ہی ختم نہیں ہورہا تھا۔ بات ٹالنے کے سو بہانے۔

"دیکھو تو کیسا دودڑا بن گیا۔"

"اور اپنا خون جوان جونکوں کو پلا رہی ہیں۔ اس کی تکلیف آپ کو نہیں ہوگی۔ مگر مجھے بہت ہے۔ اماں پلیز نہ بنائیں ان ہٹوں کٹوں کو فقیر۔ یہ بھکاری ہیں ٹال دیا کریں۔"

"میں کیوں بناتی بھکاری۔ وہ خود کماتے دھماتے۔ اے بھئی وہ کیا میرے محتاج ہیں۔"

"جانتی ہیں سب۔ کبھی ان کو بھی آزما دیکھیں۔ مانگ لیں کچھ۔ پتا چلے۔ کتنا دل ہے۔"

"اچھا اچھا! سن لیا۔ اب جاؤ۔ میں ذرا سوؤں گی۔"

"اور چائے جو بنی رکھی ہے۔ اس کا کیا ہوگا۔ اور یہ سونے کا کون سا وقت ہے؟"

"بال کی کھال نکالا کر۔ بس جاسوس کہیں کی۔ اے رافعہ! یہ عادت کہاں سے پڑی؟"

رافعہ ایک لمبی سانس بھر کر واپس آگئیں۔ عادل ضرورت پوری ہونے کے بعد اوپر جاچکا تھا۔ ایک کپ چائے اماں کو بھجوا کر عائزہ اور عائشہ کو دی جو کپڑے ڈوری پر ڈالنے کے بعد اب عائزہ کو پڑھا رہی تھی۔ اپنی پیالی لے کر اپنے کمرے میں آگئیں۔

اماں کی عجیب محبت تھی۔ بھانجوں اور بہن سے۔ بڑی آپا سے تھوڑا دبتی بھی تھیں۔ دراصل بڑی آپا اور اماں اوپر تلے کی ہونے کی وجہ سے دوست زیادہ تھیں۔ ثروت کئی سالوں کے بعد دنیا میں آئیں۔ سب سے زیادہ خوب صورت اور ذہین تھیں۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے ماں باپ کی لاڈلی۔ دونوں ثروت سے چڑنے لگیں۔ ثروت کی وجہ سے اکثر بڑی بہنوں کو ڈانٹ پڑجاتی۔ بڑی انٹر تک پڑھ کر گھر بیٹھ گئیں۔ اماں نے بھی ان کی تقلید کی۔

ثروت ایم اے کرکے اماں کی مزید لاڈلی ہوگئیں۔ تینوں کی شادیاں ہوگئیں۔ یہاں بھی بڑی کو شکوہ رہا کہ چھوٹی کی شادی بہت پڑھے لکھے بہت امیر آدمی سے ہوگئی۔ یوں تو منجھلی کی سسرال بھی خاصی متمول تھی، مگر رافعہ کے باپ کو دولت سنبھالنی نہ آئی۔ لٹاتا رہا۔

ثروت کے شوہر نے خوب ترقی کی۔ پیسہ کمایا۔ عزت بنائی بچوں کو بھی مشہور مہنگے اسکول کالجوں میں پڑھایا۔ بڑی کو تو ایک بھری پری سسرال ملی۔ گویا انہیں ٹرخایا گیا۔ نہ اعلا خاندان دیکھا نہ گھر کے طور طریقے۔

"اب ثروت کو دیکھو! عیش کررہی ہے۔ کبھی امریکا، کبھی سعودی عرب، پشاور، پنڈی، سوات، کون سی جگہ ہے جہاں وہ نہ گئی ہو۔ اب بیٹی امریکا میں گھومتی ہے۔"

ان خیالات کا اظہار وہ منجھلی یعنی رافعہ کی اماں سے کرتی ہی رہتی تھیں۔ وہ تو بچپن سے ہی بڑی بہن سے مرعوب تھیں۔ اوپر سے ستم ہوا کہ ابا نے ان کی اولاد نرینہ نہ ہونے کے باعث پورا گھر منجھلی کے سپرد کردیا۔ بڑی کو اس کا بھی قلق تھا۔ مگر ابا کی طرف سے اوپر کا گھر ملنے سے اتنا تو ہوا کہ ان کی سسرال سے جان چھوٹ گئی۔ اب بھی پہلے کی طرح منجھلی پر ان کا حکم چلتا تھا۔

ثروت بڑی بہنوں سے ہمیشہ کھلے دل سے ملتی تھیں۔ مگر بڑی آپا سے ڈرتی بھی تھیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کب کس بات پر خفا ہوجائیں۔ ہاں! منجھلی سادہ دل تھیں۔ ملتی بھی تپاک سے خاطر بھی اور سعود کی تو عاشق تھیں۔ ثروت سمجھتی تھیں۔ ان کا چونکہ کوئی لڑکا نہیں۔ اس لیے بھانجوں کو اپنا بیٹا ہی سمجھتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

کپڑے دھونے کے بعد اور عائزہ کو پڑھا کر تھکن سی ہوگئی تھی۔ رات بھی دیر تک پڑھتی رہی تھی۔ کرسی پر پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرکے کچھ دیر سکون سے بیٹھی رہی۔ نیند سی آنے لگی تھی کہ مردانہ کھنکار نے چونکا دیا۔ پٹ سے آنکھیں کھول کر سیدھی ہو بیٹھی۔

سامنے ہی عامر کھڑا تھا۔ اس نے کبھی عامر سے بات نہیں کی تھی۔ وہ اکثر آتا بھی تو وہ ادھر ادھر ہوجاتی۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ ان نیک شریف لوگوں کو اس کی طرف سے کوئی شکایت نہ ہو۔

"سنئے۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" اس نے عائشہ پر نظر جمائی ہوئی تھی۔

"کل امی، خالہ جان کے پاس آئیں گی۔ ان سے جواب لینے۔ آپ کو میرے حق میں فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہ میری تمنا ہے۔"

عائشہ حیرانی سے بولی۔ "جواب، فیصلہ، مگر کس بات کا؟"

"شادی کا۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ خالہ جان آپ کی شادی کے لیے فکرمند ہیں۔ عادل بھائی نے بھی آپ کا نام لیا ہے۔ سنئے عادل بھائی کو تو بہت لڑکیاں مل جائیں گی۔ ان کی تو درجنوں لڑکیوں سے دوستی ہے۔ کسی سے بھی شادی کرکے خوش رہ سکتے ہیں مگر میں نے صرف آپ کی خواہش کی ہے۔ آپ کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ آپ۔ عادل بھائی یا سعود کے بجائے میرے لیے اقرار کریں گی۔ میں۔ پہلے دن سے آپ کو پسند کرنے لگا ہوں۔ میرے سوا اور کسی کا نام نہیں لیں گی آپ۔ بس یہی کہنے آیا تھا۔"

آخری جملہ دھمکی آمیز تھا۔ عائشہ کو پورا جسم سن ہوتا محسوس ہورہا تھا۔ سامنے کوئی نہ تھا۔ صحن سنسان، تنہائی اور شام کا اندھیرا، جو اس کے نصیب پر پھیلتا جارہا تھا۔ وہ بے بسی سے ایک جانب نظر جمائے بیٹھی رہی۔ یہ کیا ہورہا ہے۔ منگنی، انگوٹھی، وہ تو سب بھول بھال چکی تھی اور عادل نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کہیں انگیجڈ تو نہیں۔

اس وقت کی خاموشی یہ دن دکھائے گی۔ اب انگوٹھی رفو پھپھی نے واپس نہیں کی۔ ورنہ اور ہوتی بھی تو۔ بے ہوشی اسپتال اور پھپھو کا خوف۔ پھر اسٹیشن، سفر اور تائی امی کی آغوش محبت اف امی کا آخری بار چہرہ بھی نہ دیکھ سکی۔ کیا کیا یاد رکھے اور کیا کیا بھول جائے۔

رافعہ آپا اور عدنان بھائی نہ ہوتے تو وہ محبتوں کے لیے ترس جاتی۔ رشتوں سے اعتبار اٹھ جاتا۔ زندگی سے مایوسی نے ساری امیدیں ختم کردی تھیں۔ پھر تائی امی کے مضبوط حصار میں آکر نئے سرے سے خوشیوں کی امید پیدا ہوئی تھی۔ اور اب پھر سے ایک امتحان، آزمائش۔ رفو پھپھی ہوتیں، وہ ان کے کندھوں کا سہارا لے کر ایک التجا کرتی۔ ارشاد چچا کو ابا کی دوستی کا واسطہ دے کر کہتی۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں، مگر وہ تھے کہاں، اور جو اطمینان نصیب ہوا تھا، وہ بھی حباب

بن کر اڑ چکا تھا۔ اس کو یہاں بھی خطرہ نظر آرہا تھا۔ اف

کیا کروں؟ رات ہو رہی تھی۔ اس کی بھوک بھی مر گئی۔ حالات کے دھارے پر سب کچھ چھوڑ دینا' بے بسی کی علامت ہے' وہ اتنی بے بس تو نہیں۔

☼ ☼ ☼

رافعہ کی توقع کے مطابق خالہ امی تشریف لے آئیں۔ مگر ان کی مڈبھیڑ ہوئی ثروت سے۔ منہ بن گیا۔ (بدشگونی؟) ادھر ادھر دیکھتی ہوئی ثروت کو نظرانداز کرنے کا مظاہرہ کرتی آواز لگانے لگیں۔

"منجھلی اے منجھلی بیگم! آگئی ہوں میں۔ سامنے آؤ' کیا پردہ کرو گی۔ ذرا اس لڑکی کو تو بلاؤ۔"

انہوں نے رافعہ سے کہا۔ رافعہ جاکر عائشہ کو بلا لائیں۔ بڑی آپا کے سامنے جانے سے ڈرنے کے باوجود وہ آگئی۔ ثروت نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ دوسری طرف رافعہ بیٹھ گئیں۔ اماں آگئیں۔ رافعہ نے محسوس کیا۔ اماں الجھن کا شکار ہیں۔ کچھ دیر پہلے سعود بھی ان کے کمرے سے نکلا تھا۔ رافعہ کو باہر برآمدے میں عادل بھی نظر آیا۔

"دیکھو بھئی! کل میں نے تم سے ایک سوال کیا تھا۔ آج بھی آئی تو اسی نیت سے ہوں کہ حتمی جواب لوں' مگر.... اب سوال تھوڑا بدل گیا ہے۔ یہ تمہارے دونوں بھانجے عادل' عامر.... دونوں عائشہ سے شادی کے خواہاں ہیں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے' بلکہ لڑکی سامنے بیٹھی ہے۔ خود اس سے پوچھ لو۔"

خالہ امی تو یوں بول رہی تھیں جیسے پوچھ رہی ہوں' دال گل گئی یا کچی ہے۔

"اور سعود؟" رافعہ کے منہ سے نکلا۔ "منگنی ہو چکی ہے اس سے۔ خالہ آپ چپ کیوں ہیں؟"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا' یہ کیا قصہ ہے؟" ثروت عائشہ کو دیکھنے لگیں۔

"خالہ! آپ نے انگوٹھی پہنائی تھی عائشہ کو.... ذرا چچی کے سامنے؟ بولیے نا۔"

"بھئی! کس نے دیکھا؟ کون گواہ ہے؟ اور ہے کہاں انگوٹھی؟ مرنے والی جاچکی ہے۔ اب کون گواہی دے گا۔" خالہ امی مطمئن اور بے نیاز تھیں۔

"عائشہ! میں نے تم کو جو انگوٹھی پہنائی تھی' وہ کہاں ہے' لے کر آؤ۔"

ثروت نے تحکمانہ انداز میں عائشہ سے کہا۔ عائشہ مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر رہ گئی۔

"وہ.... وہ تو رفو چچی کے پاس ہے۔" مری ہوئی آواز میں بولی۔

"لو.... اور سنو.... منجھلی! رفو سے منگنی کی ہے ثروت نے بیٹے کی کیا؟" ہنسی تھیں۔

"امی کے انتقال کے وقت...." عائشہ کی آواز رندھ گئی۔ کیا کیا یاد آگیا۔ وہ شام' وہ غم ناک شام' یادوں کا دریچہ سا کھل گیا۔ فلم کی طرح ریل چل پڑی تھی' وہ شام' اندوہناک اور دہشت زدہ۔

"میں کوئی نئی کہانی سننے کے لیے تیار نہیں۔" خالہ امی ضدی لہجے میں بولیں۔ "عادل' یا عامر' دونوں تمہارے جان نثار بھانجے ہیں' جس کو چاہو وہی تمہارا۔ میرا کیا ہے' ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔"

خالہ امی اتنی معصوم نہ تھیں جتنا ظاہر کر رہی تھیں۔

"اب دیر نہ کرو۔ لڑکی سے پوچھ لو' کس کو پسند کرتی ہے' پھر میں جاؤں۔ منگنی کی تیاری بھی کرنی ہے۔ میں ویسے بھی خالی تو نہیں ہوں' گھر میں دس کام ہوتے ہیں۔"

بڑا غرور تھا لہجے میں اور بے زاری بھی۔ اماں جو ابھی تک چپ تھیں۔ عائشہ کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں' بولیں۔

"دیکھو بیٹا! تم پر کوئی جبر نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں تو تمہاری شادی ہونی ہے۔ مجھے ہی کرنی ہے۔ اب یہ عادل' عامر اور سعود گھر بیٹھے رشتے مل رہے ہوں تو باہر کی خاک چھاننے سے فائدہ؟"

"یہ سعود کہاں سے آگیا؟" خالہ امی بگڑیں۔ "صاف بات کرو۔ اسے بتاؤ کہ مفت میں شادی ہو رہی ہے' لوگ تو بڑا خاندان دیکھتے ہیں۔ ماں' باپ' ماموں' چچا' مال دار ہوں۔ ارے! میں تو کچھ نہیں مانگتی۔ اپنے بچوں کی خوشی مانگتی ہوں' جو اس لڑکی کے ہاتھ میں ہے اور یوں دیکھو تو میرے بیٹوں میں کمی بھی نہیں۔ ایک سے ایک مال دار گھرانہ مل سکتا ہے۔ لوگ تو ایسے خوب صورت جوانوں سے رشتہ جوڑنا فخر سمجھتے ہیں۔ بس یہ ہے کہ ایک کا نام لینا ہے۔"

خالہ امی تقریر کر رہی تھیں جو فخر و غرور سے لبریز تھی اور عائشہ کو ایک ایک لفظ زہریلے تیروں کی طرح دل پر چبھتا محسوس ہو رہا تھا۔

"تمہارے پاس ہے ہی کیا' ایک پرانا دقیانوسی مکان۔ چاہوں تو لکھ پتی' کروڑ پتی کی بیٹی لے آؤں۔ مگر یہ نالائق اولاد' پہلے بڑے صاحب زادے نے ضد کرلی۔ اب دونوں ہی.... منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کیوں بیٹھی ہو۔ منہ سے پھوٹو تو سہی۔ رافعہ! دیکھنا خوشی سے بے ہوش تو نہیں ہو گئی؟"

رافعہ خود ان کے الفاظ سے صدمہ محسوس کر رہی تھیں۔ ثروت دم بخود تھیں۔

"آپا! پہلا حق میرا ہے کہ میں ڈھائی سال پہلے ہی انگوٹھی پہنا چکی ہوں۔ اس کی ماں کی رضامندی بھی تھی اور چچا' چچی بھی موجود تھے۔ اب آپ خوامخواہ اسے کیوں پریشان کر رہی ہیں۔ اس طرح بچیوں کا تماشا نہیں بنایا کرتے بڑی آپا۔"

ثروت کب تک چپ رہتیں۔ انہوں نے بازو بڑھا کر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ بڑی آپا ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

"تم تو چپ رہو۔ وہ اتنی بھی ننھی معصوم نہیں ہے۔ دو' دو لڑکوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے آخر...." اماں' خالہ امی کی بات پر یک لخت غضب ناک ہو گئیں۔

"بڑی آپا! خدا کے غضب سے ڈرو۔ ایک معصوم پر بہتان تراشی بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ تو کسی لڑکے کو نظر اٹھا کر دیکھتی تک نہ تھی۔"

"اچھا بابا! یہ دودھوں نہائی ہیں۔ ان سے کہو' کسی ایک لڑکے کا نام تو لے لیں۔"

"خالہ امی! بس کیجئے۔" رافعہ نے عائشہ کو سسکتے دیکھا۔

"کسی کے ضبط کا امتحان لینا اچھا نہیں ہے۔ چلو عائشہ! اٹھو یہاں سے۔" رافعہ کھڑی ہونے لگیں۔

"ابھی کیسے اٹھو۔" خالہ امی چنگھاڑیں۔ "میں جواب لے کر جاؤں گی۔ لڑکی! منہ سے پھوٹ' عامر کہ عادل؟"

عائشہ چیخ پڑی اور پھر عامر' عادل دونوں کمرے میں گھس آئے۔ وہ چیخ رہے تھے اور ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔

"میں نے پہلے کہا تھا۔ میں نے بہت دنوں سے کہہ رکھا تھا۔"

"میں کروں گا۔ میں شادی کروں گا۔ میں بڑا ہوں۔ عائشہ.... تم.... بولو۔"

"نہیں! میں کسی سے شادی نہیں کر سکتی۔" سناٹا سا چھا گیا تھا۔

"پھر ہم اپنی مرضی چلائیں گے۔ ایک سے تو کرنی ہی ہے۔ تم سے ہی کرنی ہے۔" خالہ امی کا فیصلہ۔

"نہیں' نہیں' کیونکہ میرا نکاح ہو چکا ہے۔" آواز تھی کہ جادو' سب کے چہرے اتر گئے۔

"نکاح.... کب.... کس سے؟" ثروت بوکھلا گئیں۔

"سن لیا منجھلی....؟ کیا کہتی تھی میں؟ اتنی نیک پارسا نہیں ہے یہ' سن لیا۔"

اماں کو جیسے اطمینان ہو گیا۔ "ارے! اس سے نکاح ہو گیا بچی۔" اب عائشہ زور سے رو پڑی۔ وہ سین' وہ ماں کا آخری وقت ذہن کے پردے پر منعکس ہونے لگا۔

کل سے امی کی طبیعت بہت بہتر تھی۔ رفو چچی کی خدمت اور تسلیاں ارشاد چچا کی یقین دہانی۔ امی نے ارشاد چچا سے کہا تھا۔

"بھائی! آپ سے اور بھابھی سے بہت امیدیں ہیں۔ بس میں ہوتا تو میں عائشہ کا نکاح کر کے رخصت کر دیتی۔ آپ ہی بزرگ ہیں۔ عائشہ کا فرض ادا

ہوجائے۔ میں زندہ رہی تب بھی یہ کام آپ کو ہی کرنا ہے۔ بڑی بھابھی کو بھی بتادیں۔ میں انہیں بھی عائشہ کا بزرگ سمجھ کر اپنا سب سے بڑا خیرخواہ جانتی ہوں۔ وہ عائشہ کے لیے جس طرح مناسب سمجھیں۔ اس کار خیر میں حصہ لیں۔ بانو آپا سے ڈرتی ہوں۔ کوئی نیا فساد نہ کھڑا کریں۔"

رفو چچی نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں ثروت کو خبر کردوں گی۔ سعود کو بلالیں۔ فوراً" نکاح کرکے اپنی امانت لے جائیں۔ بس اب تم مطمئن ہوجاؤ۔ خود کو سنبھالو۔ اللہ مددگار ہے۔"

تسلیوں' دلاسوں نے امی کو مطمئن کردیا تھا۔ ارشاد چچا اور رفو چچی رات کو رہ گئے۔ صبح سب کو ناشتا دے کر امی کو دلیہ کھلا کر وہ بستر وغیرہ درست کرنے لگی۔ اچانک آوازوں نے خاموشی کا پردہ چاک کر ڈالا۔ بانو پھپھو آگئی تھیں۔ ساتھ میں ان کے بیٹے بھی۔ ارشاد چچا کچھ دیر کے لیے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ وہ لوگ کچھ بول رہے تھے۔ پھپھو زور' زور سے نہ جانے کیا' کیا کہہ رہی تھیں۔ امی کے چہرے کو زرد ہوتے' آنکھوں میں ویرانی اترتے اس نے دیکھا۔ لپک کر ان کے قریب آئی۔ پلنگ پر بیٹھ کر ان کا ہاتھ پکڑلیا۔ پھر اسے پھپھو کی بات سمجھ میں آئی۔

"بس' میں نے کہہ دیا ہے' چاروں لڑکے کھڑے ہیں۔ جس کی طرف اشارہ کروگی وہی تمہارا۔ نمبر تو پہلا بڑے کا ہے' حق بھی اس کا ہے۔ تو چلو پھر اقبال! آج ابھی نکاح کردیتے ہیں۔"

امی بے بسی سے رفو چچی کو دیکھنے لگیں۔ آنسو بہنے لگے۔ رفو چچی نے دبنگ لہجے میں کہا۔

"بانو! پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟ حالت دیکھو زارا کی۔ یہ کوئی موقع ہے؟ بے وقت کا راگ۔ بیمار کا خیال بھی کرلیتے ہیں۔" "خیال ہی کررہے ہیں۔

جو آج نکاح ہوجائے تو بھابھی کو سکون مل جائے گا۔ جوان بچی کو کس پر چھوڑ کر جائیں گی۔ جان بھی مشکل سے نکلے گی۔ روح بھی بے چین رہے گی۔"

امی پر لرزہ طاری ہوگیا۔ پھپھو کو کچھ نظر نہ آیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"بلال! مولوی صاحب سے رجسٹر لے آؤ۔ عائشہ کے دستخط کرادوں نکاح نامہ پر' پھر بھائی ارشاد کے دستخط بھی کرالیں گے اور تم تین بھائی بھی ہو۔ عائشہ کے وکیل بن جانا۔"

رفو چچی چلائیں۔ "کیا ہورہا ہے یہ؟ زارا کی حالت دیکھو' کیا جان لوگے تم لوگ؟ بچی بھی سہم گئی ہے۔"

پھپھو نے رفو چچی کو دھکا دیا۔ بیٹے سے رجسٹر لیا۔ زبردستی قلم عائشہ کے ہاتھ میں پکڑایا۔

"نخرے نہ کر۔۔۔ کردے دستخط کرتی ہے؟ کہ دباؤں تیری ماں کی گردن؟" عائشہ کے ہاتھ سے قلم پھسلا جارہا تھا۔ پھپھو زبردستی انگلیوں میں گھسا رہی تھیں۔

"اقبال! یہ ایسے نہیں مانے گی۔ اس کی ماں کا ٹینٹوا دبا دے۔ پھر دیکھتی ہوں۔" عائشہ جو ان کے ہاتھ جھٹکتی جارہی تھی۔ ساکت ہوگئی۔ اس کی نظر امی کے چہرے پر پڑی۔ پھپھو کی زہر بھری نظریں۔ اقبال کے آگے آتے قدم۔ وہ چیخی۔

"امی!" زارا کی آنکھیں شاید پتھرا گئی تھیں۔ رفو چچی کلمہ پڑھتی آگے آئیں۔ عائشہ نے قلم پکڑلیا۔ رفو چچی امی کے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ تھپک رہی تھیں۔ چیخ رہی تھیں۔

"زارا۔۔۔ زارا۔۔۔ آنکھیں کھولو' زارا۔" پھر ان کے چہرے کی مایوسی۔

قلم عائشہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا۔ خود وہ بھی' ساتھ ہی رجسٹر بھی نیچے آگیا اور عائشہ اسی پر لڑھک گئی تھی۔ آج بھی ویسا ہی منظر تھا۔ وہاں چار امیدوار تھے۔ یہاں دو لڑکے گتھم گتھا ہورہے تھے۔

"اری بتا' کب ہوا یہ نکاح؟ کب کا قصہ ہے؟" بڑی آپا چلا رہی تھیں۔ "کس سے ہوا؟"

"امی کی فوتگی کے دن۔" لاچار ہوکر اس نے ضبط کی آخری حد پر پہنچ کر راز پر سے پردہ اٹھایا۔ "بانو پھپھو کے بیٹے سے۔ رفو چچی بھی تھیں وہاں۔" اب ضبط رخصت ہوگیا۔ وہ دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ یوں جیسے ماں کا جنازہ ابھی ابھی اس کے سامنے سے اٹھا ہو۔ اور

جنازہ اس نے دیکھا بھی نہیں۔ ثروت نے اسے بانہوں میں بھرلیا۔

"رافعہ! اسے پانی پلاؤ اور کمرے میں لے جاؤ' قصہ ختم کرو۔" رافعہ اور ثروت اسے لے کر کمرے میں جارہی تھیں اور بڑی آپا' عادل' عامر سر جھکائے سیڑھیوں کی طرف۔ رافعہ دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ ثروت خاموش تھیں۔ مگر اماں چکر کاٹ رہی تھیں۔ کبھی ادھر' کبھی ادھر۔

"رفو نے تو مجھے بتایا نہیں اور بانو نے بھی کچھ نہ کہا۔" وہ بغور عائشہ کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر کچھ پڑھ کر پھونکتیں۔ "بانو نے تو۔۔۔ کچھ کہا نہیں۔" یہ وہ سوچ کر رہ جاتیں۔ گھر میں سوگ کی سی فضا تھی۔ جیسے ابھی کسی کی موت ہوئی ہو۔ سناٹا' گمبھیر سناٹا۔ پھر رات کے اول پہر میں سناٹا ٹوٹ گیا۔ آوازیں۔۔۔ اور بے حد مانوس قدموں کی چاپ قریب آگئی۔

"اے بچی! اس قدر اندھیرا کیے کیوں پڑی ہو؟ ابھی سے آدھی رات منالی۔"

"رفو چچی!" وہ چیخ کر اٹھی اور ان کی آغوش میں سما گئی۔ کیسا سکون ملا اس لمس میں۔

"بھئی رافعہ! کھانے کی فکر نہ کرو۔ ایک پیالی چائے پلادو۔ تھکن تو اترے سفر کی۔ تمہارے چچا کو بھوک بھی لگی ہے اور چائے کی طلب بھی۔ کم بخت چائے تو ہماری رگوں میں خون کی جگہ گردش کرتی ہے۔ اس کے بغیر جینا محال ہے۔ میری بچی! اب میں آگئی ہوں۔ ثروت کی تلاش میں کہاں کہاں خاک چھانی۔ صبح پتا لگا کہ وہ یہاں ہیں۔ بھابھی جان کی بہن ہیں۔ لو! میں بے خبر تھی۔ سنو رافعہ! چائے گرم ہے؟ بھئی ٹھنڈی حلق سے نہیں اترے گی۔"

رفو چچی بے تکان بول رہی تھیں۔ رافعہ چائے لے آئی تھیں۔

"ہاں چچی! آپ کو چھوٹی خالہ کی کیوں تلاش تھی؟ ان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟" رافعہ پرشوق لہجے میں بولیں۔

"اے' نہیں ہے تو ہوجائے گا۔" "تم خالہ کو تو بلواؤ۔ اے بی بی! میرے تو مان وگمان میں نہ تھا کہ وہ تمہاری خالہ ہوں گی۔ میں تو ان کے میاں کے توسط سے جانتی ہوں۔ میری بہن کی اور ثروت کی ایک سسرال ہے۔ لو آگئیں۔" رفو چچی اٹھ کر ثروت سے لپٹ گئیں۔

"اے بہن! تمہاری تلاش میں کنوؤں بانس ڈلوائے۔ واہ! کیا شان ہے۔ کبھی پلٹ کر پوچھا نہیں کہ کدھر ہو' کیسی ہو اور میرا نہ سہی زارا کا حال پوچھ لیتیں۔ دیکھ کر گئی تھیں۔ بے چاری اگلے جہان سدھاری۔ تعزیت کے دو بول نہ بولے گئے۔ بہن آ نہیں سکتی تھیں' فون ہی کرلیتیں۔"

رفو چچی کے شکوے جائز ہے تھے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں عائشہ شرمندہ ہورہی تھی۔

"ہاں آپا! سوری' بے حد شرمندہ ہوں۔" ثروت رنجیدگی سے گویا ہوئیں۔ "میں آسٹریلیا چلی گئی تھی۔ ایسی جلدی اور ایمرجنسی میں کہ کسی کو اطلاع بھی نہ دے سکی۔ وہاں بھی بہت افراتفری میں وقت گزرا۔ دراصل سعود کو آسٹریلیا میں بہت ہی شان دار جاب مل گئی ہے۔ کوشش بھی تھی کہ سعودی عرب میں ہی رہیں۔ مگر دانہ پانی جہاں کا ہو۔ آسٹریلیا کی کمپنی نے سعود کی قابلیت کے مطابق جاب آفر کی۔ وہاں جاکر یہ بیمار ہوگئے۔ اس لیے مجھے جانا پڑا۔ پھر ان کا گھر وغیرہ سیٹ کرکے آئی۔ یہاں بھی کچھ مسائل مصروف رکھنے کے لیے تیار تھے۔ پہلی فرصت میں عائشہ کی تلاش کی۔ آپ کا فون نمبر نہ ملا۔ زارا بہن کی بھی خبر نہ ملی۔" تفصیلاً" بات کررہی تھیں۔

"لو۔۔۔ فون کہاں ملتا' کب کا کٹ گیا۔ بل جو ادا نہ ہوسکے۔" رفو چچی ہنس کر بولیں۔

"آپ کی بہن بھی غالباً" کہیں گئی ہوئی تھیں۔ کس سے پوچھتی۔ پھر ساہیوال جانے کے خیال سے منجھلی آپا کے پاس آئی کہ ان کو ساتھ لے جاؤں گی۔ یہ کیا خبر تھی کہ گوہر مقصود ان ہی کے پاس ملے گا۔ زارا کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔"

ثروت اور رفو چچی حالات بیان کررہی تھیں۔ پھر

رفو چچی نے پرس میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا۔

"دراصل بہن! آپ کی امانت میرے پاس تھی۔ سب کی موجودگی میں آپ کو لوٹا رہی ہوں۔" انہوں نے انگوٹھی ثروت کے ہاتھ میں دی۔ وہ انتہائی افسردگی سے بولیں۔

"آپا! اب اس کا کیا کروں؟ بڑے ہی شوق اور ارمانوں سے پہنائی تھی۔ کیا خبر تھی کہ نوبت ہی نہ آئے گی۔"

"ارے بابا! اب کس نے روکا ہے؟ بینڈ بجواؤ' نوبت رکھوالو' ہمیں کب اعتراض ہے؟ انگوٹھی امانت تھی۔ عائشہ بھی تمہاری امانت ہے۔ بہت صحیح مقام پر پہنچی ہے یہ۔ زارا کی بھی خواہش تھی کہ بھابھی جان کی ذمہ داری میں یہ کام تکمیل کو پہنچے۔ انگوٹھی پہنادو سب کے سامنے اور لے جاؤ اپنی امانت۔"

الفاظ تھے کہ بم کا دھماکہ۔ تحیّر نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ عائشہ کو بھی۔

"کیا؟ لے جاؤں؟ کیسے... عائشہ کا تو... نکاح..."

"کب منع کیا ہے بھئی؟ کرلو نکاح' آج ہی کرلو' ہمیں کیا اعتراض؟"

رفو چچی بم پھوڑنے میں لاثانی تھیں۔ یہ آج واضح ہوگیا۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کے سوا اور کیا کرتے۔ رافعہ نے ہی ہمّت بحال کی۔

"چچی... عائشہ کا نکاح... بانو پھپھو کے بیٹے سے نہیں ہوگیا؟"

رفو چچی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ہر حال میں خوشی کا اظہار ان کی فطرت تھی۔

"پورا زور لگایا تھا بانو نے۔ قلم تک عائشہ کے ہاتھ میں دے دیا کہ دستخط کردے نکاح نامے پر۔ ادھر زارا کا صدمے سے دل بند ہوگیا۔ بانو نے حملہ ہی ایسا کیا تھا کہ ادھر زارا ختم ہوئی' ادھر عائشہ بے ہوش ہو کر نیچے گری۔ رجسٹر اس کے نیچے دب گیا۔ کہتی تھیں "اس میں نکاح نامہ ہے۔ وہ رجسٹر نکالنے کو جھکیں۔ آخری کوشش کرنے اور میں نے بھی آخری کوشش کی۔ بانو کو دھکا دیا۔ وہ لڑھک کر پلنگ کے نیچے جا پڑیں۔ میں چیخی' "اقبال' بلال! شرم سے ڈوب مرو بے غیرتو! تمہاری ممانی مر رہی ہے اور تم ڈھیٹ بنے کھڑے ہو۔ ایمبولینس بلاؤ۔ وہ چاروں وہاں سے غائب ہوگئے۔

ارشاد آگئے۔ زارا اور بے ہوش عائشہ کو ناعمہ اور ان کے میاں کی مدد سے اسپتال لے کر گئے۔ زارا تو کب کی ختم ہوگئی تھی۔ بانو کے الفاظ ہی قاتل نکلے۔ ہاہ! پھوپھی بانو نے عائشہ کا پیچھا نہ چھوڑا تو میں نے بھابھی جان کے پاس بھجوادیا۔"

عجب سین تھا۔ سب عائشہ سے لپٹ کر رونے لگے' ہنسنے لگے۔

"پھر منجھلی آپا! انگوٹھی پہنادوں؟" ثروت بے قرار ہو کر بہن کو لپٹا رہی تھیں۔

"ہاں' ہاں' ٹھہرو! پہلے بڑی آپا کو بلواؤ۔ بزرگ ہیں ہماری۔ سعود کہاں ہے؟ اور انگوٹھی کے ساتھ ہی کل نکاح بھی ہوجائے۔" اماں خوشی سے جھوم گئیں۔

"ٹھیک ہے! سعود کو کاغذات بنوانے میں لے جانے میں آسانی ہوجائے گی۔"

عائشہ تائی امی کی مصروفیات دیکھنے لگی۔ حیرت' خوشی' ناامیدی' امید' کیا کچھ تھا اس کے چہرے پر۔ تائی کے سامنے عقیدت سے سر جھکا دیا۔ بعض بظاہر سادہ اور بے خبر لوگ کتنے گہرے معاملہ فہم ہوتے ہیں۔ عائشہ کو لالچیوں سے بچانے کا کارنامہ تائی کا تھا۔ محبت بھانجوں سے بھی' مگر عائشہ کے لیے کبھی ان کا نام نہ لیا تھا۔

عائشہ کو ایک گہرے گڑھے میں گرنے سے بچانے کے لیے آخری کوشش تائی امی نے ہی کی تھی۔

راحت جبیں

ساری بھول ہماری تھی

عریشہ عادلہ کی بیٹی ہے۔ عادلہ بیوہ ہیں اور اسکول میں ملازمت کرتی ہیں' مکان کے دوسرے حصے میں ان کے جیٹھ اور جٹھانی اپنے بچوں نعمان' ثوبان' فرید' فاطمہ اور مریم کے ساتھ رہتے ہیں' بانو اور ساجدہ شادی شدہ بیٹیاں ہیں' عریشہ ثوبان کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے۔ ثوبان کو علم ہے مگر ابھی اس کی طرف سے اعتراف نہیں ہے۔ عادلہ کو یہ چیز پسند نہیں کیونکہ ان کے جیٹھ کا گھرانہ جاہل ہے۔

نبیلہ' عادلہ اور حمیداں کی نند ہیں' ان کے دو بیٹے ہیں محسن اور جمال' جمال ملک سے باہر مگر اس کی بدمزاج بیوی طیبہ یہیں رہتی ہے۔

ابرار جمیلہ کا بیٹا ہے شہر میں پڑھتا ہے' باپ کی وفات کے بعد چچا کے ساتھ رہتا ہے۔ چاچی کبریٰ کا سلوک اس کے اور اس کی ماں کے ساتھ ناروا ہے۔ اپنے شوہر اصغر سے اکثر ڈانٹ پڑواتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کی بیٹی بشریٰ کی ابرار سے شادی ہو جائے مگر ابرار صاف انکار کر دیتا ہے۔ اصغر کو غصہ آتا ہے وہ ابرار پر ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ ابرار ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیتا ہے اور شہر آکر حمیداں کے گھر رہنے لگتا ہے۔ برکت حسین اس کی ماں کے چچازاد بھائی ہیں۔ حمیداں' ابرار سے سخت بیزار رہنے لگتی ہیں۔

نعمان اپنے اسٹور سے سودا لینے والے ماسٹر صاحب کی بیٹی عائشہ کو پسند کرتا ہے۔ وہ گورنمنٹ ٹیچر ہے۔ نعمان عائشہ کی ماں سے رشتے کی بات کرتا ہے اور ان سے فاطمہ کی شادی تک انتظار کرنے کو کہتا ہے کیونکہ حمیداں کا دونوں بیٹیوں سے پہلے بیٹوں کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ عائشہ اور اس کے گھر والے تھوڑی سی حیل حجت کے بعد مان جاتے

ناولٹ

ہیں۔

عادلہ نبیلہ کے کہنے پر بچت کرکے عریشہ کے لیے سونے کا سیٹ بنواتی ہیں۔ عادلہ کے منع کرنے کے باوجود عریشہ حمیداں کو وہ سیٹ دکھادیتی ہے۔ حمیداں کی عریشہ سے لگاوٹ میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

فاطمہ کی شادی پر حمیداں' عادلہ سے وہ سیٹ مانگتی ہیں۔ عادلہ پریشان ہوجاتی ہیں کیونکہ انہوں نے وہ سیٹ عریشہ کے لیے بہت مشقت سے بنایا ہوتا ہے۔ حمیداں بضد ہوتی ہیں کہ فاطمہ کو شادی پر سونے کا سیٹ دیا جائے جبکہ ان کی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ ثوبان کی فیس کے پیسے نکال لیتی ہیں۔ ثوبان بہت بگڑتا ہے۔ عریشہ' ثوبان کی پریشانی دیکھ کر چپکے سے وہ سیٹ نکال کر حمیداں کو دے دیتی ہے۔

شادی والے دن نبیلہ' فاطمہ کے گلے میں وہی سیٹ دیکھتی ہیں تو عادلہ سے کہتی ہیں۔ عادلہ' عریشہ سے پوچھتی ہیں تو وہ بجائے شرمندہ ہونے کے دھڑلے سے اعتراف کرتی ہے کہ اس سے ثوبان کی پریشانی نہیں دیکھی گئی۔ عادلہ' عریشہ کی حرکت سے اتنی دل برداشتہ ہوتی ہیں کہ ان کا دل بند ہوجاتا ہے۔ عریشہ پچھتاتی ہے۔ ثوبان لگاوٹ سے اسے بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔

ابرار کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ عریشہ ثوبان کو پسند کرتی ہے' ساتھ ہی وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ ثوبان اپنے فائدے کے لیے سب کچھ کرسکتا ہے۔ اس کی خود غرضی جان کر ابرار اس سے سخت کبیدہ خاطر ہوجاتا ہے۔

حمیداں کو نعمان کی خواہش کا علم ہوجاتا ہے اور جب عائشہ کی والدہ عادلہ کی تعزیت کرنے حمیداں کے پاس آتی ہیں تو وہ ان سے خوش اخلاقی سے نہیں ملتیں۔

''آج کل ماں باپ نے لڑکوں کو پھانسنے کے لیے اپنی لڑکیوں کو آگے کررکھا ہے اور لڑکیاں خود ہی معاملہ سیٹ کرلیتی ہیں۔'' جیسے سخت الفاظ کہہ کر ان کی بے عزتی کردیتی ہیں۔

عائشہ کی والدہ دلبرداشتہ ہوکر ان کے گھر سے چلی جاتی ہیں بلکہ وہ عائشہ کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چند دنوں کے لیے دوسرے شہر چلی جاتی ہیں۔ نعمان اس تمام عرصہ میں سخت پریشان رہتا ہے۔ ان کی واپسی پر ان کے گھر جاتا ہے تو وہ بتاتی ہیں کہ انہوں نے عائشہ کا کہیں اور نکاح کردیا ہے۔ وہ مغموم سا واپس آجاتا ہے۔

نبیلہ' عریشہ کا سیٹ لے لینے پر فاطمہ سے برگشتہ ہوتی ہیں تاہم فاطمہ کے وہ سیٹ لوٹادینے کا وعدہ کرنے پر وہ راضی ہوجاتی ہیں۔

ابرار' باسط کو ٹیوشن پڑھانے جاتا ہے۔ وہاں باسط کی بڑی بہن صنعیہ کے ساتھ ثوبان کی بے تکلفی دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتا ہے۔

ابرار' عریشہ کو ثوبان کے ساتھ چھت پر تنہا دیکھ کر اسے متنبہ کرتا ہے کہ دو نامحرم کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔

گاؤں میں کوئی جمیلاں کی بھینس کو زہر دے کر ماردیتا ہے۔ عریشہ اور مریم نے بی ایڈ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں مریم کا کوئی افیر شروع ہوجاتا ہے۔ جس سے عریشہ بے خبر ہوتی ہے۔

صنعیہ' ثوبان کو شادی کی آفر کرکے حیران کردیتی ہے۔

٦
چھٹی قسط

''ثوبان......'' عریشہ کے صرف لب ہلے تھے' الفاظ اندر ہی کہیں گنگ ہوگئے۔

ثوبان نے بوتل سلیب پر پٹخی اور خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔

''اتنی اپنائیت' اتنی محبت۔''

''ثوبان! خدا کے لیے بس کرو۔'' عریشہ حیرانی سے نکل کر دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی۔

''تم بس کرو عریشہ...! اور ہوسکے تو تھوڑی سی شرم بھی......'' وہ اک ملامتی نگاہ ڈال کر باہر نکل گیا۔ عریشہ ایک دم ہوش میں آکر پیچھے لپکی اور برآمدے میں اس کا بازو پکڑ کر روکا۔

''ابھی تم نے کیا بکواس کی؟''

''میرا بازو چھوڑو۔''

''کیوں چھوڑوں' تمہارا جو دل میں آئے' کہہ کر چلتے بنو اور میں تم سے پوچھوں بھی نہیں۔''

''تماشا مت بناؤ۔'' ثوبان نے دانت پیسے۔

''تماشا تو تم بنارہے ہو۔ تمہیں اتنی گھٹیا بات کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''میری بات گھٹیا ہے اور جو کچھ تم کررہی ہو۔''

''میں نے کیا کیا ہے ثوبان!'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''خود سے پوچھو......'' وہ بازو چھڑا کر چلا گیا۔

عریشہ خالی ہاتھ اسے دیکھتی رہ گئی اور واش روم سے نکلتا تولیے سے سر رگڑتا ابرار عریشہ کو۔

عریشہ کی نگاہ ابرار پر پڑی تو احساس توہین سے روم روم جل اٹھا۔ وہ تیزی سے مڑکر اندر کی طرف بھاگی۔

ابرار نے لب بھینچ کر اوپر جاتی سیڑھیوں کو دیکھا' پھر کمرے کے دروازے کو۔ محبت کرنے والے دکھ نہیں دیتے۔ مگر اس لڑکی کے نصیب میں محبت صرف دکھ بن کر آنے والی تھی۔ ابرار کا دل تاسف سے بھر گیا۔

☼ ☼ ☼

ثوبان کمرے میں بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ اسے اپنی جلد بازی پر غصہ آرہا تھا۔ خود سے الجھتے وہ کرسی پر گرسا گیا۔

''کیا ضرورت تھی اس طرح ری ایکٹ کرنے کی وہ بھی ایسی سچویشن میں جب مجھے عریشہ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے انگلیاں بالوں میں الجھائیں۔ ''مگر یہ نعمان بھائی کو کیا ہوا ہے۔ ان کے انداز کیوں بدلے بدلے سے لگ رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ عریشہ سے......'' وہ اپنی ہی جگہ ٹھٹک گیا۔ اندر کہیں جلن کا احساس بڑھنے لگا۔ وہ خود اپنی ہی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

''اگر ایسا ہے بھی تو مجھے کیا؟ میں تو ویسے بھی باہر جارہا ہوں... لیکن ایک بات یاد رکھ ثوبان بیٹا! اگر ایسا ہے تو تیرے ہاتھ پھوٹی کوڑی نہیں آئے گی۔ سب کچھ نعمان کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ اور رہے عریشہ کے ساتھ تیرا رویہ... یہ نہ ہو کہ وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے۔''

یہ خیال اتنا بے چین کردینے والا تھا کہ وہ اٹھ کر خوامخواہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔

☼ ☼ ☼

دو دن سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے وہ کمرے میں منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ نہ کالج گئی' نہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ لگایا۔ مریم خوشی خوشی کالج جاتی رہی۔ تائی اس کا خیال تو رکھتیں' مگر یوں جیسے مارے باندھے کررہی ہوں۔ ان کے اندر سے وہ محبت' وہ والہانہ پن دھیرے دھیرے غائب ہونے لگا تھا' جس کی عریشہ عادی تھی۔

ڈھیر سارا رونے کے بعد بھی دل کا بوجھ تھا کہ کم ہونے میں ہی نہ آتا۔ اسے ثوبان کا انتظار تھا کہ شاید وہ شرمندہ ہوکر اس کے پیچھے آئے' مگر وہ تو اپنے اندر کی ساری جلن عریشہ پر نکال کر غائب ہوگیا تھا۔ ثوبان کی بدگمانی نے اسے مار ڈالا تھا۔

''حد کرتی ہو اماں! وہ بیمار پڑی ہے۔ اسے ڈاکٹر کو دکھانے کے بجائے اپنے کاموں کا رونا رو رہی ہو۔''

باہر سے نعمان کی تیز جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔

عریشہ نے سر تک چادر تان لی۔ وہی تو تھا فساد کی جڑ۔

''ہاں سارے قصور تو ماں کے ہیں۔ جا' جاکے اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھ جا۔ سر دبا' دوائیاں کھلا' کتنی بار بھونک چکی ہوں کہ ڈاکٹر کے پاس چل۔ نہیں مانتی تو کیا گود میں اٹھا کرلے جاؤں۔''

''تم سے تو بات کرنا فضول ہے اماں......!''

عریشہ کو محسوس ہوا کہ وہ کمرے کی طرف آرہا ہے۔ اس نے چادر سر تک تان لی۔

نعمان اس کے پلنگ کے پاس آکھڑا ہوا' پھر اس نے

چادر کے اوپر سے ہی عریشہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ عریشہ نے تیزی سے چادر ہٹادی۔

"کیا ہوا' بخار ہے؟" وہ پھر سے اس کا ماتھا چھونا چاہتا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں؟" عریشہ نے اس کا ہاتھ جھٹکنا چاہا مگر وہ اس کی کلائی تھام کر نبض دیکھنے لگا۔

"اگر ایسے میں پھر سے ثوبان آجائے تو...." عریشہ نے وحشت زدہ ہو کر کلائی چھڑالی۔

"خدا کے لیے نعمان بھائی! آپ جائیں۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہوا تو تائی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" نعمان نے لب بھینچ کر اسے دیکھا' پھر ایک ہاتھ پلنگ پر رکھ کر جھکا۔ عریشہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ کیا کرنے والا ہے۔

"جس کے بل پر اتنا اکڑ رہی ہو' وہ تمہیں کچھ بھی نہیں دینے والا۔ سب کچھ بیچ کر کھا جائے گا اور خود باہر جا کر عیش کرے گا۔ اس بھول میں مت رہنا کہ وہ تم سے شادی کرے گا۔"

"اللہ کا واسطہ اب کھالینا....." تائی ہاتھ میں دلیے کا پیالہ لیے وارد ہوئیں۔ نعمان جان بوجھ کر ذرا دیر سے پیچھے ہٹا۔ تائی نے بے حد ناگواری سے یہ منظر دیکھا اور ترش کر بولیں۔

"اب کیا اسی کی پٹی سے لگے رہو گے۔"

"نہیں' میں دوا لے کر آتا ہے۔" وہ مسکرا کر چلا گیا۔ عریشہ کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ جو کچھ اس کے چہرے پر تھا۔ حمیدہ نے اس سے نظریں چرالیں۔

"کھالینا..... اب میں اکیلی جان کس کس کے نخرے دیکھوں۔" وہ انہیں پکارنا چاہتی تھی مگر پکار نہ سکی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" اس نے ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ سوچا۔

"ضرور یہ نعمان بھائی کی چال ہے۔ وہ جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کر رہے ہیں کہ ثوبان مجھ سے اور۔ اس سے بدظن ہو جاؤں۔ ان کی اپنی نیت خراب ہے مجھ پر اور میرے گھر پر..... مجھے اس طرح ہاتھ پاؤں چھوڑ کر نہیں بیٹھنا چاہیے۔" وہ بے قراری سے اٹھ بیٹھی۔ "مجھے ثوبان سے ملنا ہے۔ اس کی بدگمانی دور کرنی ہے۔"

"ہیلو....." مریم نے آتے ہی بیگ پلنگ پر پھینکا اور خود بھی ڈھیر ہو گئی۔ وہ بڑی مسرور اور مگن سی دکھائی دیتی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہے....." اس نے پیر نیچے اتارے اور جھک کر چپل دیکھنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو..... کچھ چاہیے تو مجھے بتاؤ۔" مریم نے کہا تو وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"آج تم بہت خوش لگ رہی ہو۔"

"نہیں تو..... میں تو روز ہی ایسی ہوتی ہوں۔" مریم ایک دم سنبھلی۔

"ہوں..... میں نہالوں۔" عریشہ چپل پہن کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں تمہاری طبیعت فریش ہو جائے گی۔"

☼ ☼ ☼

وہ بہت دنوں بعد رات کو ثوبان کے کمرے میں آئی۔ ثوبان کے اندر اطمینان کی لہر اٹھی' مگر اس نے کچھ بھی ظاہر کیے بغیر کتاب اٹھالی۔

"ثوبان! مجھے تم سے بات کرنی ہے؟" وہ انگلیاں چٹخاتے بہت مضطرب تھی۔

"سن رہا ہوں۔" وہ آہی گئی تھی تو کچھ نخرے دکھانے میں کیا ہرج تھا۔

"تم مجھ سے اتنے بدگمان کیوں ہو' آخر میں نے کیا کیا ہے؟" عریشہ روہانسی ہو گئی۔

"تم نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔" اب وہ عریشہ کے کندھے پر بندوق رکھ کر

چلا رہا تھا۔

"بس اتنا ہی اعتبار تھا؟" اس کے لہجے میں دکھ سمٹ آیا۔

"اعتبار کی دھجیاں خود تم نے بکھیری ہیں۔"

عریشہ بکھر گئی۔ اس کے قریب بیٹھ کر بازو تھامتے ہوئے وہ بلک اٹھی۔

"مت کرو ثوبان..... میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ جس پل میں جذبوں کو سمجھنے کے قابل ہوئی' دل پر تمہارا نام لکھا پایا..... آج تک تمہیں سوچا' تمہیں چاہا ..... ہر لمحہ تمہاری بن کے گزارا' میری سوچوں پر کسی اور کی پرچھائیں تک نہ پڑی اور نعمان بھائی..... پتا نہیں کیوں ان کی نظر بدلنے لگی ہے۔ مجھے نہیں پتا وہ کیا سوچتے اور کیا چاہتے ہیں لیکن میں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔ میرا یقین کرو میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔"

وہ ثوبان کے بازو پر سر رکھ کر رونے لگی۔ ثوبان اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ عریشہ کے لہجے میں اس کے جذبوں کی سچائیاں بول رہی تھی۔ ثوبان کا دل اس میں ڈوبنے لگا..... مگر پھر اس کی غرض آڑے آگئی۔

"یہی تو وقت ہے..... گرم لوہے پر بس ایک چوٹ اور سب کچھ تمہارے ہاتھ میں۔" اس کی آستین عریشہ کے آنسوؤں سے بھیگنے لگی تھی۔ جب ثوبان نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے عرشی! میں نے مان لیا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" عریشہ نے سر اٹھا کر ثوبان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت ڈوبتے مسافر جیسی تھی' جسے تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔ ثوبان نے نظریں چرالیں۔

"آئندہ ایسا مت کرنا ثوبان! ورنہ میں مر جاؤں گی ..... وہ نعمان بھائی تو....."

"تم جانتی ہو..... دل کے آئینے پر چھائی ذرا سی گرد ساری تصویر دھندلا دیتی ہے۔"

عریشہ کی سانسیں پھر سے اٹکنے لگیں۔ اس کی حالت اس فقیرنی جیسی تھی' جسے صدا لگانے کے بعد انتظار کا کہا گیا ہو اور اب وہ کاسہ پھیلائے دیکھ رہی تھی کہ دینے والے کی جیب سے اس کے لیے کیا نکلتا ہے۔

"تم کیا چاہتے ہو ثوبان....."

"اپنا مکان مجھے دے دو....."

عریشہ یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی ثوبان نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

"عرشی! سوچو' یہ صرف میرے نہیں' تمہارے بھی مستقبل کا سوال ہے..... ہم دونوں....." اس سے آگے وہ خوش رنگ خواب تھے' جو وہ پھولوں کی طرح ہمیشہ سے اس کی راہوں میں بچھاتا آیا تھا۔ عریشہ کو بس ایک لمحے کو احساس ہوا کہ نجانے یہ پھول ہیں یا خواب۔

"جس کے بل پر اتنا اکڑ رہی ہو۔ وہ تمہیں کچھ نہیں دینے والا سب کچھ بیچ کر کھا جائے گا اور خود باہر جا کر عیش کرے گا۔ اس بھول میں مت رہنا کہ وہ تم سے شادی کرے گا۔"

عریشہ نے آہستہ سے اپنے ہاتھ چھڑائے اور زخمی نگاہ سے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔

"تمہیں پھر میری محبت کا ثبوت چاہیے؟"

"یہ بات نہیں ہے عرشی! میں اپنے پرابلم تم سے شیئر نہیں کروں گا تو کس سے کروں گا۔"

عریشہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔

"محبت سوچنے میں اتنا وقت لیتی ہے؟" ثوبان نے اکسایا۔

"نہیں۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی۔ ایک بار اپنی محبت کا ثبوت دیا تو ماں جان سے چلی گئی۔ اب کون اپنی جان سے جائے گا۔" اس نے بے دردی سے آنسو رگڑے۔ کچھ تو تھا جو کلیجے میں انی کی طرح گڑ گیا تھا۔

"مجھے اپنی محبت ثابت کرنے کے لیے اور کیا کیا کرنا ہو گا۔ ایک ہی بار بتا دو۔"

"میں تمہیں فورس تو نہیں کر رہا۔" اندر شرمندگی کا احساس کروٹ لینے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ ایک بار اور سہی۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"عریشہ! یو آر گریٹ۔" ثوبان نے اٹھ کر بے اختیار اسے ساتھ لگانا چاہا۔۔۔ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹ گئی۔

"میں تمہیں اپنا مکان دے رہی ہوں۔ میری محبت ہر آزمائش سے گزری اور سرخرو ہوئی۔۔۔ زندگی میں کبھی تمہیں اس مقام سے گزرنا پڑا تو کیا کرو گے؟" عریشہ نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

ثوبان گڑبڑا سا گیا۔ "اگر عریشہ کو پتا چل جائے تو۔۔۔ تو کیا ہو گا۔ یہ دیوانی سی لڑکی تو پاگل ہو جائے گی یا جان سے گزر جائے گی۔"

عریشہ چلی گئی۔ ثوبان بے دم سا کرسی پر گر گیا۔ خوشی کے ساتھ اک احساس ندامت بھی اسے گھیر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اچھی طرح چھان بین تو کروالی ہے۔ خاص طور پر لڑکے کے اخلاق و کردار کے بارے میں۔۔۔" نبیلہ اور فاطمہ آئیں۔ آج انہیں لڑکے کو انگوٹھی پہنانے جانا تھا۔

"ہاں بھئی! لڑکوں نے اچھی طرح چھان پھٹک کروالی تھی، پھر بلوایا تھا۔" برکت حسین نئے نکور لٹھے کے سوٹ میں ملبوس بالکل تیار تھے۔ ثوبان اور محسن کا انتظار تھا، جو مٹھائی لینے گئے تھے۔

"اچھی بات ہے۔ مریم کی فکر تو کم ہوئی، اب عریشہ کے بارے میں سوچیں۔" انہوں نے موقع دیکھ کر بات چھیڑ دی۔ حمیدہ بس ایک لمحے کو گڑبڑائیں۔

"اس کے بارے میں کیا سوچنا۔ گھر کی بات ہے۔" فاطمہ نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔

"جب گھر کی بات ہے تو دیر کس بات کی، چند لوگوں کو بلا کر نکاح کر دیتے ہیں۔" برکت اور حمیدہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ نبیلہ کو حیرت سی ہوئی۔

"کوئی مسئلہ ہے؟" انہوں نے فاطمہ کو دیکھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں پھوپھو۔۔۔" فاطمہ نے ماں کو ٹہوکا دیا۔ جو اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

"تو ثوبان کے باہر جانے سے پہلے نکاح ضروری ہے؟"

"ثوبان۔۔۔" حمیدہ ایک حتمی نتیجے پر پہنچیں۔ "پر نعمان بڑا ہے۔"

"نعمان تو یہیں پر ہے، اس کے لیے اطمینان سے لڑکی ڈھونڈتی رہیں۔"

"نعمان کے لیے لڑکی کیوں ڈھونڈوں۔ میں نے تو ہمیشہ سے عریشہ کو بڑی بہو کے روپ میں دیکھا ہے۔" انہوں نے بڑی سفاکی اور اطمینان سے جھوٹ بولا۔ نبیلہ تو کچھ کہنا ہی بھول گئیں۔

"مگر جوڑ تو عریشہ اور ثوبان کا ہے۔" انہوں نے پریشانی سے بھائی کو دیکھا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگے۔

"چند سال کی چھوٹائی بڑائی کیا، پھر ثوبان تو ابھی شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔ کہتا ہے کہ کسی گوری میم سے شادی کروں گا۔" حمیدہ کو بس ایک منٹ لگا سب کچھ الٹ پلٹ کرنے میں۔

"تو عریشہ نے یہ کیوں کہا؟ اسے غلط فہمی ہوئی ہے یا یہ اس کے یک طرفہ جذبات ہیں؟" فاطمہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

"میں دیکھوں، عریشہ تیار ہو گئی۔"

عریشہ نے بالوں میں برش کرتے ہوئے آئینے میں مریم کو دیکھا، جو پلنگ پر نیم دراز رسالہ پڑھ رہی تھی۔ عریشہ قصداً خوشگوار موڈ میں اس کی طرف مڑی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

مریم نے رسالے سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

"ہمیشہ کی طرح خوب صورت۔۔۔"

"شکریہ۔۔۔" وہ دوسرے پلنگ پر بیٹھ کر سینڈل پہننے لگی۔ باہر شور ہو رہا تھا کیونکہ بانو آپا اپنے اہل و عیال کے ساتھ تشریف لے آئی تھیں۔

"مریم! تم خوش تو ہو نا۔۔۔؟" اس نے ہلکے سے خدشے کے ساتھ پوچھا۔

جب کوئی آپشن ہی نہیں تو میں خوش ہوں۔" مریم نے لاپروائی سے کہا۔ تب ہی فاطمہ آگئی۔

"عریشہ! تیار ہو؟"

"جی بالکل تیار۔" وہ دوپٹہ اوڑھ کر کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک لگ رہی ہوں؟"

فاطمہ نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔ وہ سب مل کر عریشہ کے ساتھ کیا کرنے والے تھے۔ فاطمہ اس کے جذبات سے اچھی طرح آگاہ تھی۔

"نہیں، اس کھیل میں مجھے ساتھ نہیں دینا۔ میں واپسی پر اماں سے بات کروں گی۔ عریشہ کے ساتھ اتنی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔"

اس نے مصمم ارادہ کیا۔ عریشہ اس کے انداز پر حیران تھی۔

"کیا ہوا آپی؟"

"کچھ نہیں، آؤ دیر ہو رہی ہے۔" فاطمہ نے ضبط کرتے ہوئے کہا تو دونوں باہر نکل گئیں۔ باہر برکت حسین ابرار سے کہہ رہے تھے۔

"ارے بھئی تم بھی گھر کا فرد ہی ہو۔ ساتھ چلے چلتے۔"

"سارے محلے کو لے چلیں۔" حمیدہ انہیں خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"نہیں ماموں۔۔۔! مجھے چھٹی نہیں ملے گی۔" اس نے ایک ہلکی سی نگاہ اندر سے آتی عریشہ پر ڈالی اور نظر ہٹالی۔

"میں چلتا ہوں۔ رات کو آؤں گا۔"

"زیادہ دیر نہ لگانا، ہم لوگ وقت پر آجائیں گے۔" برکت حسین نے تاکید کی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ لڑکا اپنی ذہانت اور سعادت مندی کی وجہ سے ان کے دل کے قریب ہونے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم نے سنسان گھر پر اک نگاہ دوڑائی۔

"شکر ہے، چند گھڑیاں تو سکون کی ملیں گی۔"

کچن میں جا کر اک بڑا مگ دودھ پتی کا بنایا۔ کمرے میں آکر اپنے کالج بیگ سے ایک موبائل فون نکالا جو سائلنٹ پر تھا اور پلنگ پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ دودھ پتی کی چسکیاں لیتے موبائل پر کسی کو مس کال دی۔ ایک منٹ کے بعد موبائل گنگنایا اور "فہد کالنگ" کے الفاظ جگمگانے لگے۔ مریم نے مسکرا کر کال ریسیو کی۔ وہ چھوٹتے ہی پوچھنے لگا۔

"خیریت۔۔۔؟"

"کیوں۔۔۔؟"

"بھئی یہ آدھی رات تو نہیں۔"

"فرصت تھی، تنہائی تھی، سو تم یاد آگئے۔"

"گھر والے کہاں گئے۔۔۔؟"

"میری منگنی کرنے۔۔۔" مریم کا منہ کڑوا ہو گیا۔

"اوہ۔۔۔" وہ چپ سا ہو گیا۔

"فہد! میں نے تمہارے کہنے پر منگنی کروا تو لی ہے۔ لیکن اب بھی تم نے کچھ نہ کیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔" اس نے سنجیدگی سے دھمکی دی۔

"یوں تو نہ کہو۔ کریں گے کچھ نہ کچھ۔ کیوں پریشان ہوتی ہو؟"

"تم لڑکے ہر بات کو اتنا لائٹلی کیوں لیتے ہو؟"

"تم لڑکیاں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ کیوں ہو جاتی ہو؟"

"کیونکہ ہم لڑکیاں تمہاری طرح ٹائم پاس نہیں کرتیں۔"

"میں ٹائم پاس کر رہا ہوں؟" فہد کو برا لگا۔

"فہد پلیز! یہ ہم دونوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔"

"مریم! میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھا ہوں۔ گھر والوں کو منا تو رہا ہوں۔"

"اگر وہ نہ مانے تو؟" مریم کے لہجے میں ہزاروں خدشے تھے۔

"تو ہم گھر سے بھاگ جائیں گے۔" فہد نے آرام سے کہا۔

"فہد۔۔۔" وہ بھونچکی رہ گئی۔

"اس کے بعد ہمارے پاس اور کوئی آپشن نہیں بچے گا۔ اسی لیے کہتا ہوں' تھوڑا انتظار کرلو۔ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں۔ ہم اپنی زندگی خود بنائیں گے۔" فہد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"فہد! یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔"

"یہی ہماری زندگی ہے۔ ہم بالغ اور باشعور ہیں۔ اپنے فیصلے خود کرسکتے ہیں۔ میں تو کسی کو اجازت نہیں دے سکتا کہ ہماری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بنیں۔" فہد کے ٹھوس لہجے نے مریم کے اندر توانائی سی بھر دی۔

"اب خاموش کیوں ہو؟"

"تمہاری باتوں پر غور کر رہی تھی۔"

"سنو! فرصت بھی ہے' تنہائی بھی.... میں آجاؤں؟" فہد نے شرارتی انداز میں کہا۔

"خوامخواہ۔" مریم بدک گئی۔

"ایسے موقعے بار بار نہیں آتے...." وہ مائل بہ شرارت تھا۔

"بڑے جی دار ہو گئے ہو۔ کالج میں تو میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔"

"محترمہ! آپ ہی نے قسم دی تھی۔"

مریم ہنس دی اور باتوں کا رخ اس سمت مڑ گیا' جہاں صرف خواب تھے۔ خواہشیں اور وہ ست رنگی دھنک' جو حقیقت چھپا کر انسان کو اندھا کردیتی ہے اور وہ جانتا ہی نہیں کہ یہ سفر رنگوں کا ہے مگر منزل صرف تاریکی....

☼ ☼ ☼

"اب کون سا شہزادہ ڈھونڈ لیا ہے۔ کیسی اکڑ سے مجھے انکار کیا تھا۔ اب بتائیں' میرے دیور میں کیا برائی تھی۔ بس ایک نوکری ہی سرکاری ہے.... پر کمائی.... ہونہہ شکل بھی پوری ساری.... گھر بھی ٹوٹا پھوٹا.... اب تم لوگ مانو یا نہ مانو' میرے دیور کا رشتہ ہر لحاظ سے اس رشتے سے بہتر تھا۔"

بانو نے گھر آتے ہی نکتہ چینیاں شروع کردیں۔

"اس میں ایک ہی کمی تھی بانو آپا!" مریم کمرے کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

"رنگ ہی مدھم تھا تو مردوں کے رنگ کون دیکھتا ہے۔ خود تم نے بھی تو کریمیں لگا لگا کر اپنا بوتھا سنوارا ہے۔ اس کو بھی لا دیتیں۔" بانو نے کہا۔

"نہیں آپا! اس میں ایک ہی کمی تھی کہ وہ تمہارا دیور تھا۔" مریم نے کہا اور غڑاپ سے کمرے کے اندر۔

"دیکھا.... اماں دیکھا! اس کی زبان گز بھر لمبی ہے۔ اس زبان کے ساتھ سسرال میں گزارہ کرے گی۔"

"بس بھی کرو...." حمیدہ نے اکتا کر ٹوکا۔ "آتے ہی شروع ہو گئیں.... عریشہ! مٹھائی کا ٹوکرا لے کر آنا۔ آس پڑوس میں بھجواؤں۔"

عریشہ چلی گئی تب انہوں نے فاطمہ کو دیکھا۔

"تم کیوں ادھر چلی آئیں.... ساس کے ساتھ کیوں نہیں گئیں۔"

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔ اس لیے رک گئی۔"

"کیسی ضروری بات...." بانو نے تجسس سے پوچھا تو فاطمہ ٹھٹک گئی.... ابھی بات کرنے کا مطلب تھا کہ ڈھنڈورا پٹ جائے۔ اور وہ نہیں چاہتی کہ عریشہ کے کانوں میں اس بات کی بھنک بھی پڑے۔

"کچھ خاص نہیں' بس وہ۔" فاطمہ کو کوئی اور بات نہ سوجھی۔ تب ہی عریشہ ٹوکرا لے کر آگئی تو سب کی توجہ خود بخود ادھر ہو گئی۔ رات کو بانو آپا یہیں رک گئیں اور فاطمہ کو لینے محسن آگیا.... فاطمہ نے سوچا' وہ پھر کسی دن آکر بات ضرور کرے گی۔

☼ ☼ ☼

عریشہ کمرے میں آئی تو مریم نہیں تھی۔ وہ بے خیالی میں اسی کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت الجھ گئی تھی.... کوئی چیز اندر ہی اندر بری طرح چبھ رہی تھی مگر وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ نعمان کی بات پر یقین کرنا چاہتی تھی نہ ثوبان کی نیت پر شک۔

"یا اللہ! میں کیا کروں' مجھے کوئی تو رستہ سجھا۔" اس نے جھک کر تکیے پر سر ڈال دیا۔

"سب کچھ سیدھا تھا۔ اب کیوں گنجلک ہو رہا ہے۔" اس نے کروٹ بدل کر گال کے نیچے ہتھیلی رکھی۔ اچانک تکیے کے نیچے تھرتھراہٹ ہوئی' وہ ایک دم اچھل پڑی۔ تکیہ ہٹایا تو موبائل دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

"یہ موبائل کہاں سے آیا؟"

اس نے اوندھا پڑا موبائل اٹھایا۔ اس سے قبل کہ وہ اسکرین پر آتا نام دیکھ پاتی' مریم نے موبائل جھپٹ لیا۔

"تم میرے بستر پر کیا کر رہی ہو۔" اس نے جلدی سے موبائل آف کردیا۔

"تمہارے پاس موبائل کہاں سے آیا؟"

"آ...." مریم نے سوچنے میں بس چند سیکنڈ لیے۔ "توصیف نے بھجوایا ہے؟"

"اچھا.... یہ کب کی بات ہے؟"

"پرسوں اس کی بہن آئی تھی میرا ناپ لینے' تب ہی چپکے سے دے گئی۔"

"پرسوں میں کہاں تھی؟" عریشہ نے غائب دماغی سے پوچھا۔

"کیا ہو گیا ہے۔ تم کالج گئی تھیں' میں نے چھٹی کی تھی۔"

"تائی کو پتا ہے....؟" عریشہ نے کچھ دیر ٹھہر کر پوچھا۔

"نہیں اور پلیز تم بھی مت کہنا۔ پرانے زمانے کی عورت ہیں۔ ان معاملات کو نہیں سمجھتیں۔" وہ آنکھ دبا کر بولی۔ عریشہ خود بہت الجھی تھی۔ سو زیادہ کرید میں نہیں پڑی۔ مریم آرام سے موبائل آن کرکے ایس ایم ایس کرنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

عریشہ واش بیسن پر جھکی جلتی آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔ جب ثوبان باہر سے آیا۔ عریشہ نے گردن گھما کر اسے دیکھا تو وہ وہیں چلا آیا۔

"تمہاری آنکھیں کیوں اتنی سرخ ہو رہی ہیں۔ طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" اس نے ایک دو چھپاکے مارے اور تولیہ کھینچ کر چہرہ رگڑنے لگی۔ اب کیا بتاتی کہ اک انجانی سی بے چینی ہے' جو رت جگا بن کر اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہے.... نجانے کون کون سے خدشے ہیں' جو دل دہلاتے رہتے ہیں.... خوف کی کوئی شکل نہیں ہے مگر ذہن و دل میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا ہے۔

"عریشہ! یار جلدی کرو نا.... ابھی مکان کو سیل کرنے میں بھی وقت لگے گا۔"

"میں آج جاؤں گی پھوپھو کی طرف۔" اس نے تولیہ تار پر ڈالا۔

"پھوپھو.... کی طرف۔"

"امی کے ضروری ڈاکومنٹس ان ہی کے پاس ہیں سو کاغذات بھی وہیں ہوں گے۔"

"اچھا...." ثوبان کچھ پریشان سا ہو گیا۔ جانتا تھا نبیلہ کی عادت کو' وہ سو بار جرح کریں گی۔ عریشہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں کاغذات لے کر ہی آؤں گی۔"

"نہیں' میں کیوں فکر کروں گا.... تم ہو نا میری ساری فکریں اپنے سر لینے کے لیے...." وہ اطمینان سے بولا۔

اور میری فکریں؟" وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھ نہ پائی.... ثوبان اوپر چلا گیا۔

"عریشہ آپی! ابرار بھائی کے سر میں بہت درد ہے۔ ایک کپ چائے بنا دیں۔" فرید بھاگتا ہوا آیا۔

"بنا دیتی ہوں۔"

"اماں کو پتا نہ چلے ورنہ ابھی دہائی دے دیں گی۔" فرید کی بات پر عریشہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

☼ ☼ ☼

"مکان کے کاغذات' وہ تم نے کیا کرنے ہیں؟"

نبیلہ نے بے حد چونک کر سامنے بیٹھی عریشہ کو دیکھا۔ وہ کالج سے سیدھا ان کے گھر آئی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ فاطمہ اور محسن گھر پر نہیں تھے۔

"ثوبان کو پیسوں کی ضرورت ہے تو..."

"ثوبان کو ضرورت ہے اور تم اپنا گھر اسے دے دو گی ... ان لوگوں کی ضرورتیں کہیں رکیں گی یا نہیں؟" نبیلہ کو تاؤ آگیا۔ "اور عریشہ! تم کتنی بے وقوف ہو۔ ثوبان کو ضرورت ہے، تم اپنا زیور دے دو گی۔ ثوبان کو ضرورت ہے تم اپنا گھر دے دو گی۔ ثوبان تمہیں کب تک سیڑھی بنائے گا... اور جب تم خالی ہو جاؤ گی، تب یہ ثوبان تمہارے ساتھ کیا کرے گا۔"

اندر آتا ابرار عریشہ کی آواز سن کر رک گیا۔

"پھوپھو! میں یہ سب نہیں جانتی... شروع سے آج تک میں نے اور ثوبان نے صرف ایک دوسرے کے خواب دیکھے ہیں۔ ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش کی ہے۔ اب اتنی معمولی سی بات کے لیے کیسے دستبردار ہو جاؤں؟"

"عریشہ! تم کچھ نہیں جانتی ہو، وہاں فیصلے کچھ اور ہو رہے ہیں۔" نبیلہ نے بے بسی سے اپنی بھتیجی کو دیکھا۔ وہ انہیں بے حد پیاری تھی۔ اپنی تمام تر بے وقوفیوں اور غلطیوں کے باوجود...

"مجھے کسی فیصلے سے کوئی سروکار نہیں۔ پھوپھو! وہ مجھ سے دور چلا جائے گا اگر میں مکان اسے دے دوں تو ..."

"وہ تب بھی تم سے دور چلا جائے گا عریشہ!" ابرار سے رہا نہ گیا۔

"تم؟"

"میں جب سے وہاں آیا ہوں، میں نے ایک بار بھی اس کی مستقبل کی پلاننگ میں تمہارا ذکر نہیں سنا۔"

"تم... تم ہوتے کون ہو ہمارے ذاتی معاملے میں بولنے والے۔" عریشہ غصے سے پھنکاری۔

"کوئی نظروں کے سامنے ڈوب رہا ہو تو مجھ میں اتنی انسانیت ہے کہ اسے بچانے کی سعی کروں۔" ابرار نے مدھم اور ٹھوس انداز میں کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں تمہیں کسی کو بچانے یا انسانیت کا علم بردار بننے کی۔ یہ میرا معاملہ ہے اور کسی ایرے غیرے کو کوئی حق نہیں کہ..." وہ غم و غصے سے سلگ اٹھی۔

"تم نے ٹھیک کہا۔ مجھے واقعی کوئی حق نہیں، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس شخص میں ذرا بھی وفا نہیں، اس کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر مت لگاؤ۔" وہ جانے کو پلٹا۔

"ابرار..." نبیلہ نے پکارا۔

"خالہ! میں باہر بیٹھا ہوں۔" ابرار آہستگی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

"پھوپھو! میں نے فیصلہ کر لیا ہے... میرے لیے دنیا کی کوئی بھی چیز ثوبان کی محبت سے زیادہ اہم نہیں۔" وہ نبیلہ کی طرف پلٹی۔ "آپ کاغذات مجھے دے دیں۔ ثوبان باہر چلا گیا تو سب کی زندگیاں سنور جائیں گی۔"

نبیلہ کا دل چاہا، کس کے ایک تھپڑ عریشہ کے منہ پر ماریں۔ اپنے اسی اندھے اور احمقانہ پاگل پن کے ہاتھوں وہ ایک بار اپنی ماں کو کھو چکی تھی اور اب پھر بغیر سوچے سمجھے، بغیر جانے بوجھے، وہی غلطی دوہرانا چاہتی تھی، لیکن اب وہ چپ چاپ تماشا تو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

"عریشہ! بیٹھ جاؤ اور غور سے میری بات سنو۔" وہ جیسے بادل نخواستہ بیٹھی تھی۔

"جانتی ہو، عادلہ کبھی بھی تمہاری شادی اس گھر میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

عریشہ نے سر اٹھا کر نبیلہ کو دیکھا۔

"کیونکہ وہاں رہنے والے سب لوگ خود غرض اور مطلب پرست ہیں۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے کسی بھی رشتے کو آرام سے استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ میرے بھائی کا گھر ہے، مگر جیسی فطرت حمیدہ کی ہے، ویسے ہی اس کے بچوں کی۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔" عریشہ الجھ کر بولی۔

"تمہاری آنکھیں کھولنا چاہتی ہوں بے وقوف لڑکی! میں نے حمیدہ اور برکت بھائی سے تمہارے

رشتے کی بات کی تھی۔ جانتی ہو انہوں نے کیا کہا؟“

ان کے ذرا سے وقفے پر عریشہ کی سانس اٹک گئی۔

”وہ تو شروع سے ہی عریشہ اور نعمان کے رشتے کا سوچے بیٹھی ہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔؟“ عریشہ کے لبوں سے بمشکل نکلا۔

”اور یہ بھی۔۔۔“ انہوں نے ایک ہی بار عریشہ کے قدموں سے زمین کھینچنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ”کہ ثوبان شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔“

عریشہ کا رنگ خطرناک حد تک پیلا پڑ گیا۔

”وہ مکان تمہارا ہے‘ مگر میں اس کے کاغذات ابھی تمہیں نہیں دوں گی۔ ثوبان سے کہو اگر وہ تم سے مخلص ہے تو پہلے نکاح کرے۔ یہ مکان اسی کو ملے گا‘ جس کی تم سے شادی ہو گی۔“ انہوں نے حتمی انداز میں کہہ دیا۔ کچھ کہنے کی کوشش میں عریشہ کے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

وہ بدقت کھڑی ہوئی۔

”وہ لوگ تمہاری محبت کو بار بار آزما رہے ہیں تو تم کیوں نہیں۔ یا پھر تم حقیقت کے سامنے آنے سے ڈرتی ہو؟“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے پھوپھو! ایسا کچھ نہیں ہے۔ ثوبان ایسا نہیں ہے۔“ وہ بیگ اٹھا کر بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔ کاریڈور میں کھڑے ابرار نے پلٹ کر اسے دیکھا مگر عریشہ بنا دیکھے اس کے قریب سے ہو کر چلی گئی۔

اس کے آنسو بہہ رہے تھے اور اسے صاف کرنے کا خیال تک نہیں تھا۔

ابرار نے تاسف سے اسے جاتے دیکھا۔

☆ ☆ ☆

”سنو! یہ سامان کس کا جا رہا ہے؟“ پک اپ پر جاتا سامان دیکھ کر نعمان نے لڑکے سے پوچھا۔

”ماسٹر صاحب ریٹائرڈ ہو گئے ہیں۔ اس لیے واپس اپنے آبائی شہر جا رہے ہیں۔“

”جا رہے ہیں؟“ اس نے زیر لب دوہرایا۔ نارسائی کا گہرا احساس وجود میں پنجے گاڑنے لگا۔ ”اب بھی آتے جاتے کبھی کبھار وہ دکھائی تو دے ہی جاتی تھی مگر اب۔۔۔“

وہ ست روی سے چلتا اسٹور کے اندر آگیا مگر سارا دن ایک پل بھی قرار نصیب نہ ہوا۔۔۔ تب ہی اسٹور بند کر کے گھر چلا آیا۔

”خیر تو ہے۔ تو اس وقت۔۔۔؟“ برکت حسین نے چونک کر پوچھا۔

”سر میں درد تھا۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”چائے بنوا کے پی لے۔۔۔ ساتھ میں گولی بھی لے لینا۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ ماں کو چائے کا کہنے آیا تھا۔۔۔ وہاں کچھ اور ہی بحث چل رہی تھی۔ وہ دروازے میں ٹھٹک گیا۔

”تیری پھوپھی کے پاس ہیں۔ بس پھر تو فاتحہ پڑھ لے۔ اب نہیں ملنے کے۔“

”اماں! عریشہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور لے کے آئے گی۔“ ثوبان نے کہا۔

”رہنے دے۔ تیری پھوپھی بڑی چالاک عورت ہے۔ کبھی نہیں دے گی۔ عرشی لاکھ سر پٹخ لے۔“ حمیدہ نے کہا۔

”اماں! مجھے نہیں پتا۔ اس مکان کا کچھ کرو۔ مجھے بس پیسے چاہئیں۔“

”تو میں کیا کروں‘ نکلوا لے اس سے۔“ وہ بے زاری سے بولیں۔

”عریشہ کے مکان کی بات ہو رہی ہے اماں۔۔۔!“ نعمان نے اندر قدم رکھا۔۔۔ ایک پل کو دونوں ٹھٹک گئے‘ پھر حمیدہ اکتائے ہوئے انداز میں بولیں۔

”ہاں‘ وہی۔۔۔ اسے ویزے کے لیے پیسے جو چاہئیں۔“

”سب کچھ اسی پر لٹاتی رہنا۔۔۔ باہر چلا گیا تو مڑ کر نہیں دیکھے گا۔“ اندر کی کھولن زبان پر آگئی۔

”میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ زمین سے اٹھا کر آسمان پر لے جائے گا۔“ حمیدہ نے فخر سے کہا تو نعمان کو کچھ اور تاؤ آگیا۔

”بس اسی خوش فہمی میں رہنا۔ بہرحال اس مکان کو بھول جاؤ۔ وہ عریشہ کا ہے۔“ نعمان کے اطمینان سے کہنے پر ثوبان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اور عریشہ۔۔۔ عریشہ کس کی ہے؟“

”اماں! تم نے بتایا نہیں کہ میری اور عریشہ کی شادی ہو رہی ہے۔“ نعمان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ حمیدہ نے گھبرا کر دونوں بیٹوں کو دیکھا‘ جو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔

”تم دونوں احمق ہو۔ ایک معمولی لڑکی کے لیے لڑ رہے ہو۔“

”عریشہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔“ ثوبان نے جتایا۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ نعمان نے لاپروائی سے کہا۔

”میں نے کہا۔۔۔ کیوں ایک دوسرے کا گریبان پکڑتے ہو۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔۔۔ بیٹھ کر طے کر لیتے ہیں۔“ حمیدہ نے ڈپٹ کر کہا۔

”تیرے لیے زیادہ ضروری کیا ہے۔ عریشہ یا روپے؟“

”ظاہر ہے اماں! مجھے رقم چاہیے۔“

باہر کھڑی عریشہ کے وجود کے پرخچے اڑ گئے۔ تیز رفتار ٹرین اسے روندتی چلی گئی اور کچھ بھی باقی نہ رہا۔

نہ دل‘ نہ جذبے۔

نہ وجود‘ نہ اس میں پنپتی خواہشیں۔

”تو بس ٹھیک ہے۔ چچا کا کاروبار نعمان کے پاس ہے۔۔۔ تجھے عریشہ سے شادی کرنی ہے۔ بدلے میں ثوبان کو اتنی رقم دے دے کر وہ باہر جا سکے۔۔۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

عریشہ نے پورے زور سے سینے میں اٹکی سانس کو باہر نکالا۔

یہ وہ لوگ تھے‘ جن کی خاطر اس نے اپنی سگی ماں کی پروا نہیں کی۔

وہ اسے کسی جائیداد کی طرح بانٹ رہے تھے۔

یہ تھی اس کی اوقات۔

یہ تھی اس کی حیثیت۔

وہ دروازے کے عین درمیان آکھڑی ہوئی۔ اس کی نظروں کے سامنے ثوبان تھا۔

ثوبان کی نظر عریشہ پر پڑی تو چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

اس کے اڑے رنگ نے باقی دو نفوس کو پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

اک تکلیف دہ خاموشی ان کے درمیان کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔

عریشہ لڑکھڑاتے قدموں سے ثوبان کے سامنے آئی۔

”کیوں کیا میرے ساتھ۔۔۔ کیا بگاڑا تھا میں نے؟ محبت کی تھی۔۔۔ تو اس محبت کی اتنی بڑی سزا دو گے۔۔۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں تھی‘ نہ آج نہ کل۔۔۔ ایک اے ٹی ایم کارڈ تھی‘ جسے جب دل چاہا کیش کروا لیا۔۔۔ میں نے تمہاری خاطر اپنی ماں کی نافرمانی کی۔۔۔ تمہاری خاطر اپنی ماں کو مار ڈالا اور تم نے۔۔۔“

ثوبان کا بازو عریشہ کے ہاتھ میں تھا اور وہ دیوانوں کی طرح جھنجھوڑتی چیخ رہی تھی۔

”تمہیں صرف پیسہ چاہیے‘ میں نہیں۔۔۔ اتنی تذلیل۔۔۔ اتنی۔۔۔“

”ارے عرشی! بات سن‘ ہم یہ بات نہیں کر رہے تھے ہم تو۔۔۔“ حمیدہ سنبھل کر آگے بڑھیں۔

”بس۔“ عریشہ کرنٹ کھا کر ان کی طرف مڑی۔

”آپ کی اصلیت میں نے دیکھ لی۔۔۔ میں نے جس عورت کو ماں سے بڑھ کر سمجھا۔ اس نے ناگن بن کر میری خوشیوں کو ڈس لیا۔ تم سب کے سب انتہا کے خود غرض اور ظالم لوگ ہو۔۔۔ نفرت ہو گئی ہے مجھے تم سب سے۔۔۔ مجھے اب یہاں ایک منٹ نہیں رہنا۔۔۔ مجھے تم لوگوں کی شکلیں بھی نہیں دیکھنی۔۔۔“

”عرشی‘ عرشی! میری بات تو سن۔۔۔“ حمیدہ نے پکارا مگر وہ دیوانوں کی طرح بھاگتی باہر نکل گئی۔

گلی سنسان تھی۔۔۔ وہ روتی بلکتی اک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئی۔

اس نے عاولہ کو جھٹلایا تھا۔

نبیلہ کو غلط کہا تھا۔

عریشہ کے نزدیک یہ لوگ سچے تھے۔ اس کے اپنے تھے۔ اس کے لاڈ اٹھاتے' ناز نخرے دیکھتے یہ لوگ اتنے خود غرض اور ظالم بھی ہو سکتے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر رونے لگی۔

تب ہی وہ آہستگی سے اس کے قریب آکر بیٹھا۔

"مانا دکھ بہت برا ہے..... مگر خود کو دنیا کے سامنے تماشا مت بناؤ۔"

"تماشا تو میں بن گئی۔ اپنی ہی بھول کے ہاتھوں خود ہی تماشا بن گئی۔"

"میں رونے سے نہیں روک رہا مگر یہ جگہ مناسب نہیں' اٹھو ہمت کرو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔" ابرار نے رسانیت سے کہا۔

"میرا کوئی نہیں ہے۔"

"زندگی اتنی جلدی ختم نہیں ہوتی عریشہ! اٹھ جاؤ۔" اس نے نرمی سے پکڑ کر کھڑا کیا۔

"میری تو ہو گئی۔" وہ بڑبڑائی۔

"دوپٹہ اوڑھ لو....."

دوپٹہ اوڑھتے ہوئے عریشہ نے سامنے کھڑے شخص کو پہچاننے کی سعی کی۔ وہ بالکل غائب دماغ تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"خالہ نبیلہ کے گھر۔"

☼ ☼ ☼

وہ اتنی چپ تھی کہ کبھی کبھی نبیلہ کو خوف آنے لگتا۔ وہ اسے بہلانے کی پوری کوشش کرتیں' مگر یہ بھی جانتی تھیں کہ عریشہ کو اپنی جنگ خود لڑنا ہو گی۔ فاطمہ الگ نظریں چرائے رہتی۔ حالانکہ کسی نے اسے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

نبیلہ نے کمرے میں جھانکا۔ وہ دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ نبیلہ نے تاسف سے سر جھٹکا۔

وہ آج وہی تکلیف اٹھا رہی تھی' جو عادلہ نے اس کے ہاتھوں اٹھائی۔

مان اور اعتبار ٹوٹنے کی تکلیف۔

کوئی آپ کو جان سے بھی پیارا ہو..... مگر دھوکا دے جائے۔ تو حالت ایسی ہوتی ہے۔

"عرشی!" نبیلہ آہستگی سے اس کے پاس بیٹھیں۔

"بیٹا! خود کو سنبھالو۔ کب تک اس طرح بیٹھی رہو گی۔ یہ سب اسی طرح ہونا تھا..... خدا کا شکر کرو کہ تمہاری زندگی برباد ہونے سے بچ گئی۔ ثوبان کی اصلیت اور نیت بروقت کھل کر سامنے آگئی۔ خدا کا شکر ادا کرو' تم کسی بڑے نقصان سے بچ گئی ہو۔"

"ابھی کوئی نقصان ہونا باقی تھا پھوپھو..... میں نے سب کچھ تو کھو دیا۔" وہ سر اٹھا کر ہارے ہوئے انداز میں بولی۔

"نہیں بچے۔" نبیلہ نے اس کی پیشانی چومی۔

"اس طرح مت سوچو۔ ابھی تو تمہاری پوری زندگی باقی ہے۔ تم عادلہ کی بیٹی ہو اور وہ بہت باہمت تھی۔"

ماں کے ذکر پر عریشہ کی آنکھیں پھر سے بھیگ گئیں۔

تب ہی فاطمہ چلی آئی اور جھجکتے ہوئے بولی۔

"پھوپھو! اماں اور ابا آئے ہیں۔"

"اچھا..... ان میں ہمت ہے میرا سامنا کرنے کی۔" عریشہ زہر خند لہجے میں بولی۔

"عرشی! وہ تم سے معافی مانگنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں' ابھی ان کا مطلب نہیں نکلا اس لیے۔"

فاطمہ شرمندہ ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی۔

"پھوپھو! میں ان میں سے کسی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی اور..... چند دنوں میں وہ میرا مکان خالی کروا دیں۔ اور رہی بات دکانوں کی تو نعمان کو ان کا قبضہ چھوڑنا پڑے گا' ورنہ میں کیس کر دوں گی۔" وہ بغیر سوچے سمجھے بولتی چلی گئی۔

"ریلیکس ہو جاؤ۔ میں ان سے بات کرتی ہوں۔"

پھوپھو اسے تسلی دے کر چلی گئیں۔ اس نے پھر سے گھٹنوں میں سر جھکا لیا۔

فاطمہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی' پھر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

سب کے سب کمرے میں سر پکڑے بیٹھے تھے۔

سوائے برکت حسین کے' جو غصے میں گھر سے نکل گئے تھے۔ بقول ان کے' سارا قصور حمیدہ کا تھا۔

"لو! ایک اور سیاپا....." حمیدہ نے تاسف سے ہاتھ ملے۔

"آپ اس سے بات تو کرتیں۔" ثوبان جھنجھلا کر بولا..... عریشہ بھی ہاتھ سے گئی اور پیسوں کی آس بھی۔ جھنجلاہٹ اور شرمندگی الگ۔

"کیا بات کرتی۔ وہ تو میرے سامنے ہی نہیں آئی۔ الٹا تیری پھوپھی رج کے میری بے عزتی کر کے گئی..... اور وہ تیرا باپ ہاتھ جوڑ جوڑ کے بہن سے معافی مانگ رہا تھا..... کر لو گل' ساری زندگی اسے کلیجے سے لگا کے رکھا۔ اپنی اولاد سے زیادہ اس کے نخرے دیکھے..... اور صلہ ملا یہ کہ ٹھینگا دکھا کے پھوپھی کے گھر جا بیٹھی۔ کہتی ہے کیس کروں گی؟ کس کی شہہ ہے' پھپھی کی نا؛ اوپر سے وہ فاطمہ الگ ہم سے منہ پھلائے بیٹھی ہے۔"

نعمان دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے گہری سوچ میں تھا۔

ثوبان نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور بدلحاظی سے بولا۔

"یہ سب اس کا قصور ہے۔ کیوں درمیان میں آیا۔ سارا کھیل بگاڑ دیا۔"

نعمان نے شرربار نگاہوں سے چھوٹے بھائی کو گھورا۔ اس کے منہ کا نوالہ کھانے والا آج اسی کے منہ کو آ رہا تھا۔

"مکان تو مکان' دکانیں بھی گئیں۔ اب کرے عیش۔"

"میری دکانوں کی فکر مت کر۔ اپنے ویزے کے پیسے جمع کر....." نعمان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"میرے پاس بہت آپشن ہیں۔ تم سوچو' کہاں کہاں مزدوری ملے گی۔" ثوبان نے مذاق اڑایا۔

"تجھے کیا خزانہ مل گیا ہے یا اپنی نوکری پر اکڑ رہا ہے؟"

"خزانہ ہی سمجھ لو۔ اس پورے قصے میں اگر کسی کو فائدہ ہوا ہے تو وہ میں ہوں۔" وہ سینے پر انگلی رکھ کر ہنسا۔ حمیدہ اور نعمان نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"میرا رستہ کلیئر ہو گیا۔ ایک فیصلہ کرنے میں دشواری تھی۔ وہ بھی دور ہوئی۔ اماں! میں سنبعہ سے شادی کر رہا ہوں۔"

"سنبعہ کون؟" حمیدہ نے چونک کر پوچھا۔

"سنبعہ وہ سیڑھی ہے..... جس پر چڑھ کر میں آسمان چھو سکتا ہوں۔" وہ ہنس دیا۔

نعمان ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا۔

خسارہ پھر اس کے حصے میں آگیا..... یہ احساس ناقابل برداشت تھا۔

☼ ☼ ☼

دروازے کا ایک پٹ تو کھلا تھا' دوسرا بڑے زور سے کھلا..... دھاڑ کی آواز پر چولہا لیپتی جمیلہ نے سر اٹھا کے دیکھا۔ بشریٰ تھی..... بشریٰ کا آنا اتنے اچنبھے کی بات نہ تھی۔ ایک ہی گاؤں میں ہونے کی وجہ سے وہ اکثر چلی آتی تھی' قیمتی کپڑوں پہ سارے زیور چڑھائے صحن میں اٹھلاتی پھرتی۔ ایسے میں کبریٰ کے انداز ہی کچھ اور ہوتے..... ماں بیٹی کی باتیں' حرکتیں' فخریہ لہجہ جمیلہ کو باور کرواتا کہ دیکھو اگر تم نے بشریٰ کو بہو نہیں بنایا تو خسارے میں جمیلہ رہی ہے..... بشریٰ نہیں لیکن آج بشریٰ کا حلیہ بتاتا تھا کہ ابتدائی دنوں کے چونچلے ختم ہوئے۔

"بشریٰ خیر تو ہے..... ساتھ میں کون ہے؟" جمیلہ نے متفکر انداز میں پوچھا۔

"کوئی نہیں۔" وہ رکھائی سے گویا ہوئی۔ تب ہی اندر سے کبریٰ نکلی اور بشریٰ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"تو.....؟"

"اماں....." بشریٰ غالباً ماں کے گلے لگ کر رونا چاہتی تھی مگر گلے لگنے سے پہلے ہی کبریٰ نے اسے بازو سے دبوچا اور چور نظروں سے جمیلہ کو دیکھتی اسے اندر دھکیل لے گئی۔

جمیلہ اک طویل سانس لے کر پھر چولہا لیپنے لگی۔

وہ بڑے صبر کے ساتھ اپنے اچھے دنوں کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔ ابرار کی سمسٹر میں کامیابی اس کا حوصلہ بڑھا دیتی۔ ابرار نے اسے سستا سا موبائل لا دیا تھا۔ اب بیٹے سے بات کرنے کے لیے اسے ماسٹر صاحب کے گھر نہ جانا پڑتا۔ بس عشاء کی نماز کے بعد موبائل ہاتھ میں لے کر ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتی۔۔۔ ادھر موبائل پر بیل ہوتی۔۔۔ ادھر اس کے سارے دن کی تھکن بیٹے کی آواز سننے کا سوچ کر ہی اڑنچھو ہو جاتی۔ ماسٹر صاحب نے اسے یہ بھی سکھا دیا تھا کہ اسے چارج کیسے کیا جاتا ہے۔

جمیلہ نے سر اٹھا کر کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔

"اب پڑھائے گی اسے الٹی سیدھی پٹیاں۔۔۔ اللہ ہی خیر کرے۔"

اندر کبریٰ اسے لتاڑ رہی تھی۔

"تو نے اپنا حال کیا کیا ہے۔ نہ ڈھنگ کے کپڑے، نہ زیور۔۔۔ تو کیا پاتھیاں (اپلے) تھاپتی اٹھ کر آ گئی ہے دشمنوں کے کلیجے پر ٹھنڈ ڈالنے کو۔"

"یہی سمجھ لے اماں! اپنا اصل دکھانے لگے ہیں۔ سارا دن ڈنگروں کی طرح کام کرو۔ راضی پھر بھی کوئی نہیں ہوتا۔ اور میری سس (ساس) کی زبان دیکھی ہے۔ سنپنی جیسی ہے، زہر سے بھری۔" وہ پھٹ پڑی۔

"تاں! اکبر کچھ نہیں بولتا؟"

"بولتا ہے اپنی ماں کی زبان۔" بشریٰ جل کر بولی۔ "نہ کچھ دیکھا نہ سوچا۔۔۔ بھیج دیا اس جہنم میں۔"

"اچھا دھیما بول۔ وہ سن لے گی تو کیا عزت رہ جائے گی۔" کبریٰ نے مدھم آواز میں دانت پیستے ہوئے کہا۔

"جو مرضی سنے، میری بلا سے۔ میں نے نہیں اب جانا۔" وہ پھسکڑا مار کے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"اچھا زیادہ بک بک نہ کر، تیرا باپ آتا ہے تو کرتی ہوں بات۔۔۔ اکبرے کو بلا کے سمجھائے۔۔۔"

"وہ نہیں کچھ سنے گا۔۔۔ ماں کا مرید ہے۔" بشریٰ نے تڑپ کر کہا، پھر تاسف سے ہاتھ مسلے۔

"کیا تھا جو میری شادی بلو سے ہی ہو جاتی۔ اتنے سیاپے تو نہ ہوتے۔"

"زبان اندر کر لے بے غیرتے۔۔۔ کوئی سن نہ لے۔"

"سنتا ہے تو سنے۔۔۔!"

کبریٰ بے بسی سے دانت پیستے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

پھوپھو کے بے حد سمجھانے پر وہ کالج جانے پر آمادہ ہوئی۔۔۔ دل تو جیسے مر ہی گیا ہے۔۔۔ صرف ان کی تسلی کے لیے چلی آئی۔۔۔ مریم اسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئی۔ عریشہ بادل ناخواستہ رکی۔ وہ اس پورے گھر میں سے کسی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

عریشہ! تم ٹھیک تو ہو۔"

"زندہ ہوں، اس لیے ٹھیک بھی ہوں۔ ورنہ تمہارے گھر والوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔" تلخی تو روم روم میں بسی تھی۔ پھر زبان پر کیسے نہ آتی۔ مریم نے نادم ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں عرشی۔۔۔ ہم نے۔"

"کیا وہ بھی شرمندہ ہے؟" اندر کہیں ہلکی سی امید تھی۔ شاید اسے دکھ دے کر، اسے دھوکا دے کر وہ بھی پشیمان ہو۔ مریم نے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"وہ پتھروں کا دیس ہے عرشی! وہاں آئینہ سے دل کرچی کرچی ہی ہوتے ہیں۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔۔۔ پتھروں سے سر میں نے پھوڑا تھا، کسی کا کیا دوش۔" عریشہ کے گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔ سر کلاس میں آ گئے تھے۔ سارا دن عریشہ نے کتابوں پر بکھرے حروف پر نظریں جمائے گزار دیا۔

نعمان کو غالباً مریم کی زبانی ہی پتا چلا تھا کہ عریشہ کالج جانے لگی ہے۔

چھٹی کے بعد وہ تیز تیز قدموں سے اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ جب بائیک اس کے پاس آ رکی۔ عریشہ نے بے خیالی میں دیکھا پھر یکدم ٹھٹک گئی۔

"آپ۔۔۔"

"بیٹھو، تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔" نعمان نے نرم لہجے میں کہا۔

"ضرورت نہیں، میں جا سکتی ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ضد کیوں کر رہی ہو۔ چلو نا میں اسی طرف جا رہا ہوں۔"

"آپ جس طرف مرضی جائیں، میرا رستہ کیوں روک رہے ہیں؟" وہ تڑخ کر بولی۔

"عریشہ! بدتمیزی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس پورے قصے میں میرا کیا قصور؟ دھوکا تمہیں ثوبان نے دیا، میں نے تو نہیں۔۔۔ میں تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے دل میں ثوبان ہے۔ میں تم سے شادی کو تیار تھا۔"

مارے غصے کے عریشہ کا پورا وجود کانپ گیا۔

"ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔"

"حد ہوتی ہے ہٹ دھرمی کی۔" نعمان کو غصہ آیا۔ عریشہ نے جواب نہیں دیا۔ بس تیز تیز قدموں سے اسٹاپ کی طرف بڑھ گئی۔ نعمان نے پیچھے آنے کی غلطی نہیں کی۔ بس لب بھینچے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

"بس بلو! کیا بتاؤں۔۔۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ اس وقت چھت پر کھلی فضا میں کھڑی چارپائی پر بیٹھی تھی کہ نیچے عموماً سگنل نہیں آتے تھے۔

"ہر چوتھے دن یا تو وہ خود آ جاتی ہے یا اکبر گھر سے نکال دیتا ہے۔ اصغر اور کبراں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔ کیسی ان کی لاڈلی تھی۔ اب دیکھے تو پہچانے نہ تو۔"

"اماں! بس کریں۔ اس کی اپنی زبان بھی خاصی لمبی ہے۔ دوبدو مقابلہ کرتی ہو گی۔۔۔ چاچی کے لاڈ نے ہی اسے بگاڑا ہے۔ کسی بڑے چھوٹے کی تمیز سکھائی ہوتی تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔" ابرار نے اکتاہٹ سے کہا۔

"تیری بات بھی ٹھیک ہے۔۔۔ پر وہ بڑے ڈھاڈے لوگ ہیں۔ بشریٰ کی دال نہیں گلتی اور یہ کبراں، یہ بھی میرے آگے ہی شیر ہے۔ چوہدرائن کے آگے اس کی بولتی بھی بند ہو جاتی ہے۔ اصغر گیا تھا بات کرنے، چوہدری یاسین نے صاف کہہ دیا۔ بیٹی بسانی ہے تاں آئندہ شکایتیں لے کر نہ آنا۔ کیا کرتا کندھے جھکا کے چلا آیا۔۔۔"

"اونچے لوگوں سے رشتہ کرنے کا یہی انجام ہوتا تھا۔۔۔ چلیں چھوڑیں یہ بتائیں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک رہتی ہے ناں۔" ابرار نے بات بدلی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں پتر! بس تیری راہ دیکھ رہی ہوں۔"

"ان شاءاللہ! جب کسی قابل ہو جاؤں گا تو آپ کو لینے آؤں گا۔۔۔ اس سے پہلے میں نے گاؤں میں قدم نہیں رکھنا۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے اماں!" اس نے مصمم ارادے سے کہا۔

"ماں کو کس بات کی سزا ہے۔۔۔ اپنی شکل تاں دکھا جا۔"

"میری اچھی ماں! بس تھوڑا سا صبر اور۔۔۔" ابرار نے بچوں کی طرح پچکارا۔

"بس ماں کو اسی طرح لارے لپے لگا تا رہ۔" جمیلہ ناراضی سے بولی تو ابرار نے اسے ادھر ادھر کی باتوں میں لگا لیا۔

☆ ☆ ☆

"فاطمہ آپی۔۔۔" عریشہ کچن میں آئی۔ فاطمہ ہنڈیا بھون رہی تھی۔ مڑ کر دیکھنے لگی۔ "نعمان سے کہہ دیں۔ میرے رستے میں نہ آیا کرے، ورنہ بہت برا ہو گا۔"

"نعمان۔۔۔" فاطمہ نے حیرت سے دہرایا۔

"ہر روز میرے کالج کے راستے میں آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں نے آج تک جتنی مہربانیاں ان لوگوں کے ساتھ کرنی تھیں، کر چکی۔ اب مزید کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"کیا ہوا عرشی ۔۔۔؟" محسن اس کی تیز آواز سن کر اندر آگیا۔

فاطمہ گھبرا گئی۔ اس کے گھر والوں کا کیا اس کے سامنے بھی آسکتا تھا۔

"کچھ نہیں محسن بھائی! پانی پینے آئی تھی ۔۔۔" عریشہ نے ٹالنا چاہا۔

محسن نے ایک نظر دونوں کو دیکھا۔

"بات کچھ اور ہو رہی تھی۔"

فاطمہ چاہتی تھی۔ بات محسن کے سامنے نہ ہو مگر عریشہ میں اتنا ضبط کہاں؟ محسن کے ذرا سے اصرار پر پھٹ پڑی۔

"ہر روز میرا راستہ روک لیتے ہیں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔ کیا مجھے نہیں معلوم کہ وہ یہ سب کیوں کر رہے ہیں۔ دکانوں کا لالچ ہے ۔۔۔ مگر میں اب ان کے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہیں چھوڑوں گی ۔۔۔ سب کچھ نکلوا کے رہوں گی ۔۔۔ اور فاطمہ آپی! انہیں اچھی طرح سمجھا دیں ۔۔۔ ورنہ اگر میں نے سمجھایا تو تماشا پورا زمانہ دیکھے گا۔"

فاطمہ کا رنگ فق ہو گیا۔

محسن نے اپنا ہاتھ عریشہ کے سر پر رکھ کر سنجیدگی سے فاطمہ کو دیکھا۔

"کھانا بنا لو تو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں ۔۔۔ آج ہی بات کرو۔ عریشہ ہمارے گھر میں رہتی ہے۔ ہماری ذمہ داری بھی ہے اور عزت بھی ۔۔۔ میں کوئی اونچ نیچ برداشت نہیں کروں گا۔"

"جی۔" فاطمہ نے دزدیدہ نگاہوں سے عریشہ کو دیکھا۔ کیا تھا جو وہ ذرا دیر کو خاموش رہتی۔ اسے عریشہ سے ہمدردی سے زیادہ غصہ آنے لگا۔ محسن عریشہ کو لے گیا۔ وہ اپنے اندر اٹھتے شرمندگی کے گہرے احساس کو دبانے کی کوشش میں جھنجلانے لگی۔

☆ ☆ ☆

"بس کر دیں خدا کے لیے ۔۔۔ اور مجھے سسرال میں کتنا ذلیل کروائیں گے ۔۔۔ آپ کو اپنا خیال تو ہے نہیں، کم از کم میرا خیال ہی کر لیں۔"

آج تک اس گھر میں کسی نے فاطمہ کی بلند آواز نہیں سنی تھی ۔۔۔ مگر آج وہ چیخ رہی تھی۔ کھانا کھاتے اہل خانہ نے نوالے واپس رکھ دیے۔

"کیا ہوا فاطمہ! یہ آتے ہی کیا واویلا مچا دیا ہے ۔۔۔ تیری ساس نے کوئی نئی پھلجھڑی چھوڑی ہے۔" حمیدہ نے پوچھا اور پوچھنے کا انداز ایسا تھا کہ اسے مزید غصہ آ گیا۔

"پھلجھڑیاں وہاں سے نہیں ۔۔۔ یہاں سے چھوٹتی ہیں ۔۔۔ اور ذلیل ہو رہی ہوں میں۔"

"بیٹھ جا بیٹھ جا' یہ سب تیری ماں کے قصور ہیں۔ اسی کے کرتوت ہیں۔ جو آج اولاد کے سامنے آ رہے ہیں۔" برکت حسین نے گھورا۔

"اب مجھے گھسیٹ لے ۔۔۔ اس ملک میں جہاں جہاں بم پھٹ رہے ہیں۔ حمیدہ ہی تو چلا رہی ہے۔ تو کیوں سر پر کھڑی ہے۔ بیٹھ کر تیر چلا لے' جو بھی چلانے ہیں۔" وہ بات کرتے کرتے فاطمہ کی طرف مڑیں' جو اب نعمان کو دیکھ رہی تھی۔

نعمان نے نوالہ ہاتھ سے رکھ دیا۔

"اور آپ ۔۔۔ کیا نظر آتا ہے اس عریشہ میں' جو سارے کے سارے اسی کے گرد چکرا رہے ہیں ۔۔۔ دنیا کی ساری لڑکیاں مر گئی ہیں۔ کیوں اس کے پیچھے جاتے ہیں؟" وہ پہلی بار بڑے بھائی کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے اس کے پیچھے جانے کی۔" وہ سب سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

"تو کیا عریشہ جھوٹ بول رہی ہے؟"

"تو اس کے پیچھے کیا لینے گیا تھا؟" برکت حسین نے غصے سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بے زاری سے کھڑا ہوا۔

اس نے گھر جا کے اچھا خاصہ واویلا کیا ہے۔ محسن نے سو باتیں مجھے سنا دیں۔ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اب وہ جس گھر میں رہتی ہے۔ وہ گھر میرا سسرال ہے۔" وہ بیٹھ کر رونے لگ گئی۔

"دیکھ لوں گا اس کو بھی۔" نعمان کو غصہ آگیا۔

"اسے کیا دیکھیں گے۔ اسے ذرا سی آنچ بھی آئی تو میں گھر سے باہر ہوں گی۔"

"ائے ہے۔۔۔ ایسے کیسے ہو گی؟" حمیدہ چمک کر بولیں۔

"بس کر دیں اماں!" فاطمہ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "آج تک اس گھر میں جو کچھ ہو گیا۔ وہی کافی ہے۔ اب اور کچھ نہیں ورنہ یہ فاطمہ اجڑ جائے گی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

حمیدہ اور برکت ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

نعمان غصے اور شرمندگی میں گھرا باہر نکل گیا۔

"اماں، ابا! بہت تماشے ہو چکے اب ان دونوں کو سمجھائیں۔ ساری بات ختم کریں۔ نہ عریشہ کے پیچھے جائیں۔ وہ اب ان کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی، اس گھر کا نام بھی نہیں سننا چاہتی۔"

فاطمہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اپنی اولاد کے منہ سے نوالے چھین کر اس کے منہ میں دیتی رہی ہوں۔ اب یہی صلہ دے گی۔" حمیدہ تلملائیں۔

"نیک نیتی اور خلوص سے کیا ہوتا تو وہ اپنی جان بھی دے دیتی مگر آپ نے تو لالچ میں آکر۔۔۔" فاطمہ کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی حمیدہ تڑپ کر اٹھیں۔

"ہاں، میں لالچی ہوں۔۔۔ تیرے بھائیوں کا فائدہ دیکھا تھا۔ اپنی قبر میں نہیں لے جانا تھا سارا کچھ۔ آگئی ہے مجھے باتیں سنانے۔"

"اماں! آپ کو اب بھی اپنی غلطی کا احساس نہیں؟" فاطمہ نے حیرت و بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔

"اولاد کا فائدہ دیکھنا غلطی ہے؟"

"اولاد کا فائدہ دیکھنا غلطی نہیں۔ دوسروں کا حق چھیننا غلطی بھی ہے اور گناہ بھی۔"

"ہاں پڑھی لکھی ساس کے ساتھ رہ کے تو تو ملانی ہی بنے گی۔۔۔ بخشو بی بی! مان لیا، سارے قصور ہمارے تھے۔" وہ دونوں ہاتھ زور سے جوڑ کر چپل گھسیٹتی اندر چلی گئیں۔

فاطمہ نے بے بسی سے باپ کو دیکھا۔

"اس کی عقل الٹی ہے۔۔۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" برکت حسین نے گویا بیٹی کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"سب آپ کا قصور ہے ابا!"

"لو میرا کیوں۔۔۔؟" وہ گڑبڑائے۔

"آپس کے جھگڑوں میں آپ لوگوں نے دیکھا ہی نہیں کہ اولاد کا کیا بن رہا ہے۔۔۔ ابا! نعمان کو سمجھائیں ورنہ کچھ برا ہو جائے گا۔"

"میں سمجھاؤں گا۔۔۔ تو فکر نہ کر۔" برکت حسین نے فاطمہ کا سر تھپتھپایا۔ حالانکہ ان کے اپنے لہجے میں بھی یقین نہ تھا۔

"یہ ثوبان اور مریم کہاں ہیں۔۔۔؟" فاطمہ کو اب جا کر ان کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔

"مریم تو ادھر کہیں ہو گی۔ رہ گیا ثوبان، تو اللہ جانے کن ہواؤں میں ہے۔۔۔ مجھے تو کبھی رک کر سلام کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ ایسی ناہنجار اولاد ہے کہ کیا بتاؤں۔"

"اولاد کی تربیت نہ ہو تو ایسی ہی ناہنجار اور ناخلف ہو جاتی ہے۔" فاطمہ زیر لب بڑبڑائی۔

☆ ☆ ☆

ابرار نے کمپیوٹر اسکرین سے نظریں ہٹا کر ثوبان کو دیکھا۔ وہ صاف ستھرے حلیے اور فریش موڈ میں گنگناتا خود پر پرفیوم چھڑک رہا تھا۔ ابرار نے دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہونا چاہا مگر دل میں اک کھٹک سی ہونے لگی۔ شاید وہ ثوبان کو اتنا مطمئن اور خوش دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے عریشہ کو جس دگرگوں حالت میں خالہ کے گھر پہنچایا تھا۔ اس کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔

"کیا بات ہے ثوبان بھائی! آج بہت خوش لگ رہے ہیں۔"

"ہم تو ہمیشہ ہی خوش رہتے ہیں بیٹا جی!"

"اچھا۔" ابرار ایک لحظہ چپ رہا۔ "محبت کھو کر بھی انسان اتنا ہی خوش اور مطمئن رہتا ہے جتنا کہ آپ؟"

"کیا مطلب؟" ثوبان نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں، میں شاید پرسنل ہو رہا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ جو تمہارے دل میں ہے پوچھ لو۔" وہ اس کے قریب آیا۔

"آپ کو عریشہ سے محبت تھی؟" ابرار نے پوچھ ہی ڈالا۔ یہی سوال تھا جو اس کے ذہن میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔

"ہاں۔" ثوبان نے بغیر تامل کے جواب دیا۔

ابرار نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"یہ کیسی محبت تھی؟"

"ارے۔۔۔ تم کیا وہ لیلیٰ مجنوں جیسی محبت ڈھونڈ رہے ہو۔۔۔ برادر!" وہ کرسی پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

"آج کل وہ محبت کہیں نہیں ملتی۔ وہ اچھی لگتی تھی۔ حالات سازگار ہوتے تو شاید شادی بھی کر لیتا مگر میرے نزدیک وہ اتنی اہم بھی نہیں کہ چلی گئی تو میں مجنوں بن جاؤں۔ یوں بھی ہم ایک پر اکتفا کرنے کے قائل نہیں، وہ بھی اس صورت میں جب اس سے بہتر اور شاندار پرپوزل سامنے ہو۔"

"آپ کا مطلب ہے سنیعہ۔۔۔؟"

"تم اسے جانتے ہو۔۔۔؟" ثوبان چونکا۔

"اتنا نہیں، جتنا آپ جانتے ہیں۔۔۔" ابرار کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"اب اور بھی جان جاؤں گا۔۔۔ اس وقت ملک سے باہر ہے۔۔۔ واپس آئے گی تو دیکھنا۔۔۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر یوں اوپر جاؤں گا۔" اس نے ہاتھ کو جہاز کی طرح اڑایا۔

"دھیان سے اکثر کریش بھی ہو جاتے ہیں۔" ابرار نے اس کے ہاتھ کے تعاقب میں دیکھا۔

"ڈونٹ وری۔۔۔ نہیں ہو گا۔" وہ کندھا تھپتھپا کر سیدھا ہوا۔

"اوکے! بیسٹ آف لک۔۔۔" اس نے بے حد اوپری دل سے کہا۔

ثوبان ہنس کر چلا گیا۔

ابرار نے دونوں ہاتھ سر کی پشت پر باندھ کر ٹیک لگالی۔

"تو بات یہ ہے ثوبان برکت حسین کہ تمہیں عریشہ سے محبت تھی ہی نہیں۔"

☆ ☆ ☆

کچھ ماہ دھیرے سے کھسک گئے۔ زخم مندمل نہیں ہوا تھا، بس اپنے اندر اٹھتی ٹیسوں کو دباتے ہوئے امتحانوں میں مصروف ہو گئی۔ اس کے بعد نعمان کبھی اس کے راستے میں نہیں آیا۔۔۔ محسن نے امتحانوں کے بعد کا عرصہ بھی اسے فارغ نہیں رہنے دیا۔۔۔ اس کے لیے سب سے اچھی چیز مصروفیت تھی۔ سو کمپیوٹر کورس پر لگا دیا۔ رزلٹ آیا تو اس کے لاکھ انکار کرنے پر یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے دیا۔ جبکہ مریم نے اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

سنیعہ کی امریکہ سے واپسی مہینوں پر چلی گئی مگر ثوبان مطمئن تھا۔۔۔ وہ پہلے سے بڑھ کر آفس ورک پر توجہ دیتا۔۔۔ آخر اس کے باپ کو بھی متاثر کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کہاں چلیں؟" مریم کے بائیک پر بیٹھتے ہی فہد نے پوچھا۔

"یہاں سے تو چلو۔ کسی ٹیچر نے دیکھ لیا تو مصیبت آجائے گی۔" مریم نے دوپٹے سے چہرہ چھپاتے ہوئے کہا تو فہد نے بائیک اسٹارٹ کر لی۔

"کسی پارک میں چلیں۔۔۔؟" اسکول دور رہ گیا تھا۔ اب وہ سکون سے بیٹھی تھی۔

"نہیں، لوگ گھورتے رہتے ہیں۔ کسی کی نظر پڑ گئی تو خوامخواہ مصیبت پڑ جائے گی۔"

"تم کچھ زیادہ ڈرپوک نہیں ہو گئیں؟"

"تمہاری بہادری بھی دیکھی ہے۔ کسی ریسٹورنٹ کے فیملی کیبن میں چلتے ہیں۔"

"لیکن میری جیب خالی ہے۔"

"ہمیشہ کی طرح۔۔۔"

"یار! کیا کروں۔ ابو ساری تنخواہ بٹور لیتے ہیں۔

پیٹرول تک کے پیسے ان سے مانگنے پڑتے ہیں۔"

"اور تم اتنے فرماں وار کہ سارے تھما دیتے ہو۔ مجھے دیکھو' آج تک گھر والوں کو میری اصل تنخواہ کا بھی علم نہیں۔"

"جینیئس ......"

"فیملی کو کیسے سپورٹ کرو گے؟"

"جب فیملی آئے گی' دیکھا جائے گا۔" فہد نے لاپروائی سے بائیک کی رفتار بڑھائی۔ فیملی کیبن میں چائے اور سینڈوچ آنے تک دونوں نے زیادہ بات نہیں کی مگر ویٹر کے جانے کے بعد وہ سنجیدگی سے بولی۔

"فہد! اب کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔"

"کر تو رہے ہیں۔" فہد نے سینڈوچ اٹھاتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"میری شادی کی تاریخ طے ہو رہی ہے۔" مریم نے سنجیدگی سے جتایا۔

"اوہ......" فہد نے سینڈوچ واپس رکھ دیا۔

"تم انکار کر دو۔"

"کس بنیاد پر......؟"

فہد خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"میری شکل نہ دیکھو۔ اپنے گھر والوں سے بات کرو' انہیں مناؤ۔ آخر اسٹینڈ لینے کے لیے میرے پاس کوئی ٹھوس وجہ تو ہو۔" مریم چڑ کر بولی۔

"ہزار بار کر چکا ہوں' مگر وہ مانیں تو......" فہد جھنجلایا۔

"او کے۔ پھر میرے یہاں ہونے کا جواز کیا ہے؟"

مریم دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر کھڑی ہوئی۔

"مریم! اتنی ایموشنل کیوں ہو رہی ہو...... بیٹھو! کچھ حل نکالتے ہیں۔" فہد نے ہاتھ پکڑ کر روکا تو وہ روٹھی روٹھی سی بیٹھ گئی۔

"میں امی سے ایک بار پھر بات کرتا ہوں' مجھے امید ہے وہ کوئی نہ کوئی رستہ نکال لیں گی۔"

"اور اگر نہ نکال سکیں تو......؟ اس کے لہجے میں ہزار خدشے دھڑک رہے تھے۔

"تو ہم کورٹ میرج کریں گے۔"

مریم ششدر سی رہ گئی۔ اس ریسٹورنٹ کے فیملی کیبن میں ہونے والی یہ گفتگو نئی نہ تھی۔ یہ کھیل صدیوں سے کھیلا جاتا رہا ہے...... کہتے ہیں مرد عورت کو ورغلاتا ہے' حقیقت یہی ہے کہ عورت لاشعوری طور پر پہلے سے ہی آمادہ ہوتی ہے۔ بس اپنی بندوق مرد کے کندھے پر رکھ کر چلاتی ہے اور خود بری الذمہ ہو جاتی ہے۔

فہد نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی۔ مریم ڈر گئی' لیکن اندر کہیں وہ بھی آمادہ ہو چکی تھی۔

"خیر! ہم ایک آخری کوشش تو کریں گے۔" وہ سینڈوچ اٹھا کر کھانے لگا۔ جبکہ مریم کی چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی۔ آخر فہد نے ٹوکا۔

"تم کچھ لے کیوں نہیں رہیں......"

"بھوک نہیں ہے۔"

"کیوں......"

"اب چلیں' کافی دیر ہو گئی ہے۔" مریم نے پیسے نکال کر میز پر رکھے۔ فہد نے ویٹر کو بلا کر بل دیا۔

"اب کب ملو گی؟"

"پتا نہیں۔" وہ الجھی ہوئی اور بے زار تھی اور اسی الجھن میں نقاب کرنا بھول گئی۔ فہد پردہ ہٹا کر باہر نکلا۔ مریم اس کے عقب میں تھی۔

وہ آگے نکل گیا اور مریم کے قدم وہیں جم گئے۔

عین سامنے والی میز پر نعمان اپنے دو دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔

قیامت یہ کہ وہ اسی سمت دیکھ رہا تھا۔

مریم کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

گھر کے صحن میں شور بپا تھا۔

نعمان کی ابلتی غیرت' اس کے ہاتھوں پٹتی محبت کی ماری مریم۔

اور چھڑانے والا کوئی نہیں۔ حمیدہ فق چہرے کے ساتھ اسے پٹتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

"ہماری عزت ہوٹلوں میں رولتی آئی ہے۔ وہاں بیٹھی اس کے ساتھ۔ گلچھرے اڑا رہی تھی۔ کوئی شرم اس میں نہیں بچی...... پتا نہیں کہاں کہاں گھومتی رہی ہے۔ شہر میں کس کس نے دیکھا ہو گا۔"

نعمان تھک کر ہانپنے لگا۔ مریم بے دم ہو کر گر گئی۔

"میں صاف صاف بتا رہا ہوں اماں!" اس نے انگلی اٹھا کر حمیدہ سے کہا۔ "یہ کسی دن بھاگ جائے گی' یہ نہیں رکنے والی۔"

حمیدہ نے دہل کر کلیجہ تھام لیا۔

"آج سے اس کا گھر سے نکلنا بند ہے۔ کمرے میں بند کر کے تالا ڈال دو اور بلاؤ اس کے سسرال والوں کو اور نکاح پڑھواؤ۔ ورنہ سر پکڑ کر روتی رہ جاؤ گی۔"

وہ نفرت سے اسے ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا۔

تب حمیدہ کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی...... انہوں نے قریب آ کر دو ہتڑ مریم کو مارے۔

"کمینی...... بدبخت! ایسی جوانی اچھل رہی تھی تو بتا دیتی میں دو بول پڑھوا کے دفع کر دیتی۔ میرے سفید بالوں میں یہ کھے ضرور ڈلوانی تھی۔"

"اب کر دو نا رخصت۔" مریم نے پھٹے ہوئے ہونٹ کو رگڑا۔

"بلاتی ہوں تیرے سسرال والوں کو...... اب تجھے گھر میں رکھ کر میں نے اچار ڈالنا ہے۔"

"نہ اماں! اتنی مار میں نے جس کے نام پر کھائی ہے رخصت بھی اسی کے ساتھ ہوں گی۔ میں شادی صرف فہد سے کروں گی۔"

مریم کے لہجے میں چھلکتی بغاوت نے حمیدہ کو سن کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"پھوپھو!" عریشہ نے کمرے میں جھانکا۔ وہ ابھی تک قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ آیت ختم کر کے نبیلہ نے قرآن پاک بند کیا۔

"تیار ہو گئیں؟"

"جی' میں یونیورسٹی سے واپسی پر گھر جاؤں گی۔"

"گھر؟" نبیلہ نے تعجب سے دیکھا۔ "وہاں تو

کرائے دار ہیں۔"

"فاطمہ آپی! بتا رہی تھیں' وہ جا چکے ہیں۔ گھر خالی پڑا ہے۔"

"وہاں کیا کرنے جاؤ گی عریشہ!"

"یونہی ایک نظر دیکھ کر آجاؤں گی..... آج امی کی برسی بھی تو ہے۔" اس کے گلے میں پھندا پڑ گیا۔ چائے لے کر آتی فاطمہ رک گئی۔ عریشہ نے ایک طرف ہو کر جگہ دی۔

"کہاں جانا ہے؟" فاطمہ نے پیالی نبیلہ کے پاس رکھی۔

"گھر جا رہی ہوں آپی!"

"اچھا جلدی آنا' مجھے فکر رہے گی۔" نبیلہ نے کہا تو وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

فاطمہ نے کچھ سوچ کر گھر کا نمبر ملایا۔

"ہے..... لو۔" حمیدہ کی مخصوص آواز آئی۔

"اماں! میں ہوں فاطمہ۔"

"ہاں..... بول اب تجھے کیا تکلیف ہے۔"

فاطمہ سٹپٹا گئی۔ اسے کیا پتا تھا کہ اماں اس وقت کس موڈ میں بیٹھی ہیں۔

"کیا ہوا.....؟"

"کچھ نہیں ہوا۔ تو اپنا سیاپا بول....." وہ جھنجلائیں۔

"کیا سیاپا' میں نے صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ آج عریشہ اپنا گھر دیکھنے آ رہی ہے۔"

"کیوں گھر کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ یا ہم بیچ کر کھا رہے ہیں؟"

"اماں! خدا کے لیے اپنے بیٹوں کو سمجھا دیجیے گا کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔ بس اتنا ہی کہنے کے لیے فون کیا تھا۔" فاطمہ نے اتنا ہی کہہ کر ریسیور پٹخ دیا۔

"کبھی جو اماں نے اچھے طریقے سے بات کی ہو..... جب بھی کریں گی لٹھ ہی ماریں گی۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر آہٹ ہوئی یا کسی نے ہلکی سی دستک دی تھی۔ اونگھتے ہوئے برکت حسین نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحے کو تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔

"عریشہ....."

وہ بغیر بولے دو قدم آگے آئی۔

"گھر کی چابی آپ کے پاس ہے؟"

"ہاں میرے پاس ہی ہے..... پر تو کھڑی کیوں ہے یہاں بیٹھ اپنے تایا ابا کے پاس..... حمیدہ او حمیدہ! بات سن..... دیکھ کون۔"

"میں یہاں کسی سے ملنے نہیں آئی ہوں۔ چابی دے دیں۔" اس نے بدلحاظی سے کہہ کر ہتھیلی پھیلائی۔

وہ یہاں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکنا چاہتی تھی۔ اس جگہ سے جتنی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں..... اس سے کہیں زیادہ تلخ تھیں۔

اس کا انداز اتنا قطعی تھا کہ برکت حسین نے چابی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی..... وہ چابی جھپٹ کر انہیں کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر پلٹ گئی۔

پورے گھر میں دھول اڑ رہی تھی۔ نجانے کب سے کرائے دار گئے تھے اور تب ہی سے یہاں صفائی نہیں ہوئی تھی۔ اسے وہ صحن یاد آیا' جو اس کی ماں کے ہاتھوں چمکا کرتا تھا..... اس کے قدم دھول پر نشاں چھوڑتے کچن تک آئے۔

"تم نے کھانا کھا لیا.....؟" عادلہ کی تشویش بھری آواز ابھری۔

"کہاں سے کھاتی.....؟"

ہائے! وہ نخرے جو صرف ماؤں کو دکھائے جاتے ہیں۔

"میں کھانا بنا کر تو گئی تھی۔"

"وہ بینگن..... ہونہہ۔"

"بری بات۔ کھانے کی ناقدری نہیں کرتے۔"

رسانیت و محبت بھرا لہجہ..... نجانے تب وہ محبت محسوس کیوں نہ ہوئی تھی۔ عریشہ کی آنکھیں بھر آئیں..... اس نے کچن کے دروازے سے ہاتھ ہٹا لیا۔

خالی ڈھنڈار بیڈ روم میں خاموشی دیواروں سے لپٹی تھی۔

"یہ زندگی بڑی عجیب ہے عرشی! پتا ہی نہیں چلتا۔ انسان کچے برتن کی طرح ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ خدانخواستہ زندگی میں تم پر کوئی مشکل وقت آئے تو تم کسی اور کی طرف نہ دیکھو۔ خدا کے بعد اپنا سہارا آپ بنو۔"

"امی! کوئی چھوٹی نصیحت کر لیا کریں۔ یہ تو سر کے اوپر سے گزر گئی۔"

"کبھی یاد آئیں گی ماں کی باتیں۔" عریشہ بے اختیار رو پڑی۔

"امی! بہت یاد آتی ہیں آپ کی باتیں۔"

ان خالی کمروں میں کچھ نہیں تھا..... بس گم گشتہ آوازیں گونجتی تھیں۔ وہ جس طرف بھی دیکھتی کوئی نہ کوئی لمحہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سسکنے لگتا۔ وہ روتی ہوئی صحن میں آ نکلی۔

"کاش' کاش! انہیں کوئی ایک بار واپس لے آئے..... میں ان کے پیر پکڑ کر معافی مانگ لوں۔" وہ کھلے آسمان تلے بیٹھ کر رو سکتی تھی۔ سو دل کھول کر روئی۔

نجانے کتنا وقت گزرا تھا' جب ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر حمیدہ نے اندر جھانکا۔ عریشہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ صاف کرتے انہیں دیکھا۔

"تمہاری پھپھی بھی آئی ہے؟"

عریشہ کا سر بے اختیار نفی میں ہلا۔

"چلو! اچھی بات ہے..... آجاؤ۔" انہوں نے آخری الفاظ دروازے کی طرف منہ کر کے کہے۔ عریشہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے انہیں دیکھا۔ تب ہی دروازہ کھول کر نعمان اندر آ گیا..... اس کے ہاتھ میں اک سادہ کاغذ تھا۔

عریشہ کی چھٹی حس نے الارم دیا۔ وہ تیزی سے کئی قدم پیچھے ہٹی۔

"کیا بات ہے.....؟"

"کوئی بات نہیں میری بچی..... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" حمیدہ کا لہجہ منافقت بھرا تھا۔

"مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ چلی جائیں یہاں سے۔"

"عرشی! بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔" حمیدہ نے پچکارا۔

"میں تایا ابا کو آواز دوں گی۔"

نعمان اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ عریشہ کو اس کی سنجیدگی سے خوف آنے لگا۔

"گھر پر کوئی نہیں ہے۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" وہ اندر سے ڈر گئی تھی۔

"اس کاغذ پر دستخط کر دو۔"

عریشہ نے حیرت سے اس کاغذ کو دیکھا۔

"نکاح نامہ ہے....."

(آخری قسط اگلے ماہ ان شاء اللہ)

ثمینہ عظمت علی

بریکنگ نیوز

کچن میں برتن دھوتی عظمٰی لاؤنج سے آتی ملی جلی آوازوں پر کچھ چونک سی گئی۔ وہ جلدی جلدی آخری دو پلیٹیں کھنگالنے لگی تاکہ جاکر صورت حال کا جائزہ لے سکے۔ اسی اثناء میں عمار مشہور نیوز چینل کا میوزک بجاتے ہوئے کچن میں داخل ہوا۔

"ڈھین ڈھین..... ڈھین..... بریکنگ نیوز۔"

"صائمہ بجو اسپائیڈر مین بن گئی ہیں۔ اوہ سوری! اسپائیڈر وومن بلکہ اسپائیڈر گرل....."

عظمٰی ہونق بنی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بولے جارہے ہو، کبھی آرام سے بات نہ کرنا۔"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ خود آکر دیکھ لیں۔ اور یاد رکھیں کہ یہ خبر "سب سے پہلے" میں نے آپ کو دی۔" وہ اسی تیزی سے میوزک بجاتا خبر کو مزید نشر کرنے کے لیے دوسری طرف نکل گیا۔

عمار کے ان اینکرانہ شوشوں سے واقف ہونے کے باوجود عظمٰی اپنے تجسس پر قابو نہ پاسکی اور جلدی سے لاؤنج میں آئی تو اس کی پہلی نظر ہی صائمہ پر پڑی اور اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ سرخ اور نیلے پرنٹ کا پونچو پہنے وہ واقعی اسپائیڈر مین لگ رہی تھی۔ اس کا منہ کسی مہمان کی طرح لٹکا ہوا تھا کیونکہ امی، دادی اور پھوپھو کا "لیکن "کراس دی فائر" اور "کھری بات" ایک ساتھ جاری تھا۔

"ارے میں پوچھتی ہوں، یہ کیا پہنا ہوا ہے، بس ایک چادر لے کر درمیان سے گردن باہر نکال دی ہے۔" دادی نے تعجب سے کہا۔

کچن سے آتی عظمٰی اور سیڑھیوں سے اترتی طوبٰی کو دیکھ کر صائمہ کو ایسا اطمینان ہوا جیسے کسی ٹاک شو کے مہمان کو اس وقت ہوتا ہے، جب میزبان بریک لے لے۔ اسی لیے وہ اٹھلا کر بولی۔

"کیا ہے دادی..... اتنا فیشن ہے اس کا..... ٹیلر نے صرف سولہ سو میں سی کر دیا ہے۔"

"سولہ سو؟" تینوں کی آنکھیں یوں کھل گئیں جیسے ذوالفقار مرزا نے کوئی نیا انکشاف کر دیا ہو۔

"غضب خدا کا اس چوکور ٹکڑے میں ایک سوراخ کرنے کے سولہ سو....."

"اور یہ.....؟" پھپھو نے شبیر کی طرح اس کے شاپر سے وہ بل برآمد کیا، جو کوئی اور دیکھے نہ دیکھے، انہوں نے دیکھ لیا تھا۔

"آٹھ ہزار۔" انہوں نے اپنی عینک جھکا کر سب کو "جوابدہ" نظروں سے دیکھا۔

"آٹھ ہزار، صرف اس تنبو اور تین سوٹوں کا بل.....؟" دادی نے تلملانے میں جیسمن منظور کو بھی مات دے دی۔

"معلوم ہے تمہارے ابا کی آمدنی کتنی ہے؟ اس کی استطاعت اتنی ہے کہ تم اتنے مہنگے ٹیلر سے کپڑے سلواؤ اور....."

دادی کی بات سے متفق ہونے کے باوجود امی اس جملے سے سخت بے مزا ہوئیں۔

"رہنے دیں اماں! آپ کیا یہ ہمیشہ افضال احمد اور اسلم پرویز والا جملہ بولتی ہیں، جو وہ ہمیشہ ندیم سے شبنم کا رشتہ مانگنے پر بولتے تھے۔"

"اور خود ان کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی ڈریسنگ گاؤن اور پائپ میں چھ سو فلموں میں کام کیا۔" امی اور پھپھو کا اتحاد مثالی تھا۔

"یہ افضال احمد اور اسلم پرویز کون ہیں؟" طوبٰی نے حیرت اور اشتیاق سے پوچھا۔

"شاباش ہے....." دادی تو ویسے ہی جلال میں تھیں۔ "اگر میں نے اس وقت افضال کپور اور اسلم بچپن کہا ہوتا تو تمہیں ان کے کرتوت کے نام بھی معلوم ہوتے۔"

"اماں! اب آپ 1857ء کے اداکاروں کے نام لیں گی تو ہمیں کیا علم ہوگا۔" صائمہ موضوع بدلنے پر بڑی خوش تھی۔

"لو! غدر میں کیا فلمیں بن رہی تھیں؟"

"غدر؟" "لیکن غدر میں تو سنی دیول تھا اور ایشا پاٹل....." عظمٰی نے کہا۔

"اماں! میں تو پاکستانی اداکاروں کو بہت اچھی طرح

جانتی ہوں۔" صائمہ نے فخریہ کہا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح یہ 11th Hour ختم ہو اور وہ اپنا سامان سمیٹ کر کمرے میں جائے۔

"اچھا!" پھپھو نے اسے طنزیہ گھورا۔ "ذرا پانچ اداکاروں کے نام تو بتانا۔"

"ہی ہی ہی!" طوبیٰ کھلکھلائی۔ "امی! یہ تو ون کلاس والا سوال لگ رہا ہے' پانچ پھولوں کے نام بتایئے' پانچ رنگوں کے نام بتایئے....."

"تم تو پیدائشی ون کلاس کی ٹیچر تھیں اور رہو گی۔" عظمیٰ نے اعلان کیا۔ "ہاں ہاں صائمہ! ذرا نام بتاؤ پانچ اداکاروں کے۔"

"اوہ یار! اتنی اچھی لڑکی رات کو ڈرامے میں تھی' بالکل دیپکا پڈوکون جیسی' بس قد ذرا چھوٹا تھا' کیا نام تھا۔" وہ ذہن پر مصنوعی زور دینے لگی۔

"اور وہ ایک لڑکا تھا رات ایک ڈرامے میں اف! بالکل شاہد کپور جیسا تھا۔"

"اور امی! وہ ایک پیاری سی لڑکی نہیں' جو آج کل بہت مشہور ہو رہی ہے' کون سی بلوچ؟ ارے وہی جو بالکل انوشکا جیسی ہے۔"

"اور ایک اینکر جو شاہ رخ خان جیسا ہے۔"

"سمجھتا ہے۔" عظمیٰ نے لقمہ دیا۔

"اور وہ مہر بخاری وہ تو بالکل کرشمہ کپور جیسی ہے۔" صائمہ نے بالآخر ایک نام لے ہی لیا۔

"مہر بخاری اداکارہ ہے؟" طوبیٰ نے اسے گھورا۔

"نہیں ہے کیا؟" وہ گھبرا گئی "لگتی تو ہے۔"

"کیا ہوا بھئی..... کیا "گریٹ ڈیبیٹ" ہے یا "کیپٹل ٹاک" کی ریکارڈنگ آج یہاں ہو رہی ہے۔" ابا نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"جی..... یہ آپ کی صاحبزادی آپ کا کیپٹل "ملکی خزانے" کی طرح لٹا رہی ہے؟ میرے بھائی کو "بھائی" سمجھا ہوا ہے۔" پھپھو نے کہا۔

"تو ہمشیرہ! بھائی کو بھائی ہی سمجھنا چاہیے' پچا نہیں اور کیوں میری بیٹی کے پیچھے پڑے ہو۔" وہ کہتے کہتے ٹھٹک گئے "لیکن صائمہ بیٹا..... تم کیا اسپیس میں جانے والی ہو؟ تم نے بتایا نہیں کہ کسی خلائی تجربے کے لیے تمہارا نام بھی تجویز ہوا ہے۔"

"ابا.....!" صائمہ روہانسی ہو گئی۔ وہ تو بڑے شوق سے پونچو پہن کر آئی تھی کہ سب کو سرپرائز دے گی اور یہ توقع بھی نہیں تھی کہ ابا آجائیں گے۔

"بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے' آج سے صائمہ سلائی سیکھے گی۔ غضب خدا کا' کچھ تو سیکھے' کچھ سیئے' کچھ ادھیڑے۔" امی نے اعلان کیا۔

"کیوں بھئی! کیا میری بیٹی اتنی بے کار مباش ہے؟" ابا نے کہا۔

"جی نہیں! وزارت عظمیٰ اس نے سنبھالی ہوئی ہے۔"

"تو بے کار مباش ہی ہوئی نا....."

"کیا میری کوئی وزارت بھی ہے۔ ہے تو وہ میرے پاس ہونی چاہیے' صائمہ کے پاس کیوں ہے؟" عظمیٰ نے سوال کیا۔

"عظمیٰ بیٹا!" ابا نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ "عزیزی" والے سوال کرنے سے بہتر نہیں ہے کہ..... چائے پلا دو؟"

"جی..... ابا!"

"اور صائمہ! تم اپنا سامان اٹھاؤ اور کمرے کی طرف اڑ جاؤ۔"

"جی..... جی!" وہ اور طوبیٰ جلدی سے وہاں سے چلی گئیں۔

"اور آپ تینوں معزز خواتین! بچیاں ہمارے غریب عوام کی طرح ہوتی ہیں' ان پر اتنے ستم نہ ڈھایا کریں۔"

✲ ✲ ✲

"یہ سب تم دونوں کی وجہ سے ہوا ہے۔" صائمہ نے دونوں کو لتاڑا۔

"ارے' بدتمیز!" طوبیٰ نے اسے گھورا۔ "ہم نے تو تمہارا ساتھ دیا تھا۔"

"حالانکہ....." عظمیٰ ہنسنے لگی۔ "تمہارا ڈریس دیکھ کر پتا ہے مجھے کیا یاد آ رہا تھا؟"

"کیا؟"

"بچپن میں یاد ہے' ایک کاغذ کے بیچ میں سوراخ کر کے انگلی میں پہن لیتے تھے اور انگلی پر پین سے ایک چہرہ بنا دیتے تھے۔"

"اسی لیے..... اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم میرا ساتھ دیتیں تو ایسا نہ ہوتا۔" "تمہارے اصغری پن کی وجہ سے میرا اکبری پن نمایاں ہوتا ہے۔ اگر میں اکلوتی ہوتی اور طوبیٰ یہاں نہ رہتی ہوتی۔"

طوبیٰ کا رنگ ایک لمحے کو پھیکا پڑ گیا۔ صائمہ کچھ گڑبڑا سی گئی۔ "میرا مطلب کہ....."

"لیکن میں تو چاہتی ہوں کہ تم میری بہن ضرور ہوتیں۔" عظمیٰ نے شرارت سے کہا۔ "کیونکہ مجھ میں کوئی خاص خوبی نہیں' نہ میں کسی کام کی ماہر ہوں۔ بس جو تھوڑا بہت آتا ہے' وہ تمہارے باؤلے پن کی وجہ سے نظر میں آجاتا ہے۔"

"کتنی خود غرض ہو تم....." اس نے شکایت کی۔

"اور تم.....؟"

"میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ....."

"اچھا اب زیادہ نہ ہانکو۔ یہ بتاؤ کہ یہ ٹیلر کے پاس کہاں سے پہنچ گئیں؟"

"میں اسما کے ساتھ گئی تھی۔ وہ وہیں سے سلواتی ہے۔ اتنا زبردست ٹیلر ہے۔"

"ہاں' وہ تو پل سے ہی پتا چل رہا ہے۔"

"اتنے بڑے بڑے آرڈر ہیں اس کے پاس..... بڑی بڑی اداکارائیں اور ماڈلز بنواتی ہیں ڈریسز....."

طوبیٰ اور عظمیٰ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"بڑی بڑی اداکاراؤں" اور "ماڈلز" کے ڈریسز بنانا تو بہت آسان ہوتا ہے۔"

"ہیلو گرلز.....!" جواد نے اندر جھانکا۔ پیچھے پیچھے عمار۔

"یہ آپ کیا دونوں ہر وقت "بولتا پاکستان" بنے رہتے ہیں۔" صائمہ نے کہا۔

"بھئی تم "گولڈن گرلز" کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی اتحاد تو کرنا پڑے گا۔ اکیلے کی تو تم نے چھٹی کر دینی ہے۔"

"لیکن....."

"لیکن؟ شنا بچہ والا؟"

"نہیں یہ میرا اپنا لیکن ہے۔ یقین کریں۔"

"کیا بات ہے آج تم میرا کی منگنی' نرگس کے ڈرامے ایشوریا کی بیٹی اور ریما کی منہ دکھائی سے بھی زیادہ ہاٹ ٹاپک بنی ہوئی ہو۔" جواد نے پوچھا۔

"سارے مل کر میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔ چار سوٹ ہی سلوائے ہیں۔ اسلام آباد میں محل نہیں لے لیا۔" صائمہ روہانسی ہو گئی۔

"یہ دیکھیں۔" طوبیٰ نے اس کے دوسرے سوٹ اٹھائے۔ "لان کی شرٹ پر جارجٹ کی آستین' دوسری پر نیٹ کی اور یہ تیسرا سوٹ تو لگتا ہے کہ ٹیلر کے پاس جتنے ٹکڑے تھے' جوڑ کر بنا دیا ہے۔ بالکل "فقیر کی لان" لگ رہا ہے۔"

"یہ سوٹ ہیں یا سالن۔" عظمیٰ نے اضافہ کیا۔ "آج گوشت میں آلو ڈال لیے' کل ٹنڈے' پرسوں بینگن....."

"تم جاہلوں کو کیا پتا....." صائمہ بالکل آپے سے باہر ہو گئی۔ "محلے کی درزنوں سے کپڑے سلوائے ہیں تم لوگوں نے' ذرا فیشن کا نہیں معلوم..... آج کل کیا اسٹائلز چل رہے ہیں۔ ذرا ٹیلرز کے پاس جا کر دیکھو' کسی بوتیک' کسی بڑے مال میں دیکھو۔"

✲ ✲ ✲

دادی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی پر کوئی ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔ امی اور پھپھو اندر داخل ہوئیں۔ دونوں مارکیٹ سے واپس آئی تھیں۔ شاپرز صوفوں پر پھینک کر وہیں ڈھیر ہو گئیں۔ دادی کے انہماک میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"عظمیٰ! طوبیٰ! صائمہ.....!" پھپھو نے آوازیں لگائیں۔

"بھئی کہاں ہیں یہ لڑکیاں اور اماں! آپ اتنے ذوق و شوق سے کیا دیکھ رہی ہیں۔۔۔ طوبیٰ!" انہوں نے پھر آواز لگائی۔

"اپنے ڈراموں کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہی ہوں' زبان' لباس' موضوع۔۔۔ کچھ بھی تو ہمارا نہیں ۔"

"اماں! وقت کے ساتھ موضوعات' زبان لباس سب بدل جاتے ہیں اور پھر شوبز تو شوبز ہے' برقع پہن کر تو ڈرامے نہیں کر سکتیں۔" امی نے لبرل بنتے ہوئے کہا۔

"میں کب کہتی ہوں برقع پہن لیں' ڈھنگ سے شلوار قمیص ہی پہن لیں تو غنیمت ہے۔"

"ارے بھئی کہاں ہیں یہ سب؟" پھپھو نے بیزاری سے کہا۔

"ان کی کوئی دوست آئی ہوئی ہے۔ طوبیٰ کے کمرے میں ہیں ساری۔" اسی وقت سیڑھیوں پر سے لڑکیاں اترتی ہوئی نظر آئیں۔ ان کی دوست فریا ساتھ تھی۔

"اوہو! اتنی ساری شاپنگ کر کے آئی ہیں؟" کافی سارے شاپر زدیکھ کر لڑکیوں کا جوش فطری تھا۔

امی نے ایک پیکٹ صائمہ کی طرف بڑھایا۔ "یہ لو بطور خاص تمہارے لیے لائی ہوں۔"

"تھینک یو امی!" وہ حیران ہوئی اور خوشی تو بے تحاشا تھی۔ "سوٹ ہے کیا؟"

"نہیں۔"

پھر اس نے پیکٹ ٹٹولا۔ "پرزا؟"

"نہیں۔"

"مامی! کیا لائی ہیں صائمہ کے لیے؟ اس کا برتھ ڈے بھی نہیں ہے۔"

"میں بہت دنوں سے سوچ رہی تھی۔ آج اردو بازار جانا ہوا تو لے آئی۔" امی نے بتایا۔

"اردو بازار؟" عظمیٰ خوشی سے چلائی۔ "امی! میں نے سنا ہے کہ کراچی میں "آخری زمانہ" آگیا ہے؟"

"کیوں؟ کراچی میں "آخری زمانہ" پہلے آنا ہے؟"

"نہیں نہیں پہلے تو لاہور میں آیا تھا۔ اب سنا ہے کہ کراچی میں آگیا ہے۔" طوبیٰ نے کہا۔

"یہ لڑکیاں تو بولا گئی ہیں۔" دادی نے آہ بھری "ہر طرف "آخری زمانہ" آگیا ہے۔"

"نہیں دادی! ہر جگہ نہیں آیا' ابھی' صرف اردو بازار میں آیا ہے۔"

"ہاں اردو۔" پر تو ضرور آگیا ہے۔ بازار کا نہیں معلوم۔"

"امی! مجھے آخری زمانہ پڑھنا ہے۔" طوبیٰ نے کہا۔

"آخری زمانہ" پڑھا نہیں جاتا' گزارا جاتا ہے۔ اللہ اللہ کر کے۔"

"میں تو آمنہ مفتی کے ناول "آخری زمانہ" کی بات کر رہی ہوں۔ اللہ اللہ کر کے تو کراچی میں آیا ہے۔"

"مجھے بھی انتظار ہے۔" صائمہ نے جلدی سے کہا۔

"پہلے یہ کام کر لو۔" امی نے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔ صائمہ نے جلدی سے پیکٹ کھولا۔ عظمیٰ' طوبیٰ اور فریا بھی قریب آگئیں چاروں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ٹیلرنگ گائیڈ!"

"امی!" صائمہ روہانسی ہو گیا۔ "اتنے دن میں تو اینکرز بھی پرانے موضوعات بھول جاتے ہیں۔"

"میں نہیں بھولی تھی۔۔۔۔ بس جانا نہیں ہو رہا تھا۔ میری غلطی ہے' میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اب میں اور ریحانہ (پھپھو) تو اسکول میں ہوتے ہیں۔ طوبیٰ ہمارے ساتھ' عظمیٰ یونیورسٹی جاتی ہے اور آج کل تو لڑکیاں کتابوں اور ویب سائٹس سے ہی ہر چیز سکھ لیتی ہیں اور یہ گائیڈ بہت اچھی ہے۔۔۔۔ ہماری سلائی مشین تو خراب ہے۔ تم پھپھو کے اسٹور سے ان کی مشین نکلوالو۔"

"امی! وہ آخری زمانہ۔۔۔۔"

"وہ بھی پڑھ لینا بعد میں۔۔۔۔"

"امی! اب دیکھیں سلائی اتنی ضروری ہوتی تو آمنہ مفتی ناول لکھنے کے بجائے کپڑے نہ سیتیں۔"

"اسے سب کچھ آتا ہے' میں نے پڑھا ہے۔"

"ایک تو امی مجال ہے جو خواتین ڈائجسٹ کا ایک لمحہ بھی چھوڑ دیں۔" وہ بڑبڑائی۔

"اور یہ۔۔۔۔" انہوں نے ایک اور شاپر دیتے ہوئے کہا۔ "یہ سیکھنے کے لیے کچھ سستے کپڑے لائی ہوں۔"

صائمہ منہ لٹکا کر چلی گئی۔ امی نے مسکراتے ہوئے یک لفافے سے "آخری زمانہ" نکالا' چشمہ لگایا اور پڑھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

لوہے' اسٹیل' لکڑی اور نہ جانے کس کس ناپید میٹریل کا بنا ایک بے ہنگم وجود ان کے سامنے تھا۔

"یہ کیا عجوبہ ہے؟" صائمہ نے کہا۔

"تین سو قبل مسیح میں اسے سلائی مشین کہتے تھے۔ آج کل نہ جانے کیا کہتے ہیں۔" عظمیٰ ہنسی۔

"آج کل اسے اینٹک (نوادرات) کہتے ہیں۔"

"یہ آثار قیامت میں سے ایک ہے۔ میں نے اسے شاہد مسعود کے اینڈ آف ٹائمز میں دیکھا تھا۔" طوبیٰ بولی۔

"ویسے یہ امی کے جہیز کی ہے۔" وہ پھر بولی۔

"اسی لیے تو جہیز کو لعنت کہا گیا ہے۔" صائمہ نے وثوق سے کہا۔

"نہیں یار! پھپھو کی شادی اتنا قدیم واقعہ نہیں ہے۔ یہ دادی کے جہیز کی ہو گی اور دادی نے وہی مشین پھپھو کو دے دی ہو گی۔" عظمیٰ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"بلکہ یہ تو دادی کے زمانے سے بھی پہلے کی لگتی ہے۔"

"یہ ضرور بابے بڈھے کی مشین ہے۔"

"کون سا بابا بڈھا؟"

"جس کی مشین تھی۔"

"ایں؟"

"ارے! وہ جو لاہور چلا گیا تھا اور چور اس کی مشین اٹھا کر لے گئے تھے۔"

ایک دو تین
بابے بڈے کی مشین
بابا بڈھا گیا لاہور
مشین اٹھا گئے چور۔۔۔۔

"لو! اس بابے بڈھے کو لاہور جانے کی کیا پڑی۔۔۔۔ مرنے کے وقت اسے "جمنا" یاد آیا۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے نانا چور تھے؟" طوبیٰ نے اسے گھورا۔

"نہیں بھئی۔" وہ گڑبڑا گئی۔ "چور نے مشین بیچ دی ہو گی۔"

"مت بھولو کہ امی نے مشین کی تاریخ پر مفصل نوٹ لکھنے کو نہیں کہا۔ نکلوا سے۔"

"SALIKA" طوبیٰ نے منمناسا پڑھا۔

"افسوس! اس مشین پر لفظ سلیقہ لکھنے والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا' جب یہ ایک بد سلیقہ کے ہاتھ چڑھے گی۔"

"اور روایت ہے کہ وہی "آخری زمانہ" ہو گا۔"

☼ ☼ ☼

"مجھے بریکنگ نیوز ملی ہے کہ اعلا حکام نے تمہارے خلاف آپریشن شروع کر دیا ہے۔" جواد نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اس کے پیچھے عمار تھا۔

"جی "اپنا چینل" تو آپ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔" وہ جل کر بولی۔

"اور یہ خبر جواد بھائی کو سب سے پہلے میں نے دی۔" عمار نے فخر سے کہا۔

"لگتا ہے تمہارے خلاف کوئی خط لکھا گیا ہے۔" جواد نے شرارت سے کہا۔

"جی نہیں' اس کی حرکات کی وجہ سے از خود نوٹس لیا گیا ہے۔" طوبیٰ نے اطلاع فراہم کی۔

جواد نے مشین کا پہیہ گھمایا تو اس سے ایک عجیب و غریب آواز برآمد ہوئی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ مشین کسی مسجد یا مل کو عطیہ کر دیتے ہیں۔" جواد نے تجویز پیش کی۔

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ گھگھو گھگھو ہوندا اے بھاویں مسجد دا ہووے یا مل دا۔"

"ہاں سحری اور افطاری میں کام دے گا۔" جواد نے ایک بار پھر زور سے پہیہ گھمایا۔

"تم لوگوں نے کبھی دیکھا ہے امی' نانی اور مامی جو بیٹھ کے پرانی پاکستانی فلمیں دیکھتی ہیں' ماں جیسے ہی سلائی مشین کا پہیہ گھماتی ہے اس کے گھومتے گھومتے ہیرو بڑا ہو جاتا ہے۔ پہیے کا کلوز اپ فیڈ آؤٹ ہوتا ہے اور ہیرو کی ٹانگیں سامنے آجاتی ہیں اور وہ ہمیشہ سڑک پر دوڑ رہا ہوتا ہے۔ اگر منفی ہو تو وہ چور بن چکا ہوتا ہے اور پولیس سے بھاگ رہا ہوتا ہے اور سعادت مند ہیرو ہو تو بے چارہ نوکری کے لیے جوتیاں چٹخا رہا ہوتا ہے۔

شاید ابا کے انتقال کے بعد امی نے یہ مشین اسی طرح چلائی ہو اور میں بڑا ہو گیا اور......"

"اچھا! اب زیادہ مظلوم بننے کی کوشش نہ کریں۔ ہم اتنے غریب نہیں ہیں اور نہ اتنے قدیم ...... کیونکہ اس مشین کو کوئی انسانی ہاتھ لگے کم از کم سو سال گزر چکے ہیں اور آپ اس کے چلنے سے بڑے بھی ہوئے ہوں تو سڑکوں پر دوڑ نہیں رہے تھے' عظمیٰ کو انگوٹھی پہنا رہے تھے۔"

"چپ بھی کر جاؤ۔" عظمیٰ جھینپ گئی۔

"یہ کتاب تمہیں ضرور سلائی کا ماہر بنا دے گی۔"

"جس طرح عتیق انگلش بک سے طوبیٰ نے تیس دن میں انگریزی سیکھ لی تھی۔"

"اور میں لاہور سے رفیق روزگار منگوا کر کروڑ پتی بن گیا تھا۔"

"اور میں نے بنگال کے جادو سیکھ لیے تھے۔"

"ضرور ضرور...... ایک دن تمہارے سلائی کے نسخے اور ٹوٹکے آئیں گے۔" "اور ایس ایم ایس بھی۔"

"تم ضرور ایک مشہور فیشن ڈیزائنر بن جاؤ گی۔" سب کے بولنے کے ساتھ ساتھ جواد نے اسے تسلی دی۔

"مشہور فیشن ڈیزائنر۔" سب یک زبان ہو کر بولے۔

"صائمہ چوہدری۔"

☆ ☆ ☆

"اب کتاب پڑھ پڑھ کر بھلا کس طرح سلائی آسکتی ہے۔" صائمہ اب تک جھنجھلائی ہوئی تھی۔

"آ بھی سکتی ہے۔" عظمیٰ نے جو کتاب کھولے بیٹھی تھی' مزے سے کہا۔

"تو تم ہی کر لو سلائیاں اس میں سے پڑھ پڑھ کر۔" صائمہ نے جل کر کہا۔

"لیکن یہ احکامات تو تمہارے لیے صادر ہوئے ہیں بھئی......"

"ہاں' امی تو جیسے حکومت بنی بیٹھی ہیں' ایک طرف ہی برائی نظر آتی ہے باقی سب فرشتے ہیں۔"

"ٹیلرنگ کی تاریخ۔" عظمیٰ نے باآواز بلند پڑھا۔

"ارے! ٹیلرنگ کی بھی تاریخ ہوتی ہے۔" طوبیٰ جو چائے لے کر اندر آ رہی تھی' حیرت سے بولی۔

"قدیم زمانے کے انسان بڑے سائز کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپتے تھے۔" عظمیٰ نے پڑھا۔

"اور جدید دور کی اداکارائیں یہ کام چھوٹے پتوں سے ہی لے لیتی ہیں۔" طوبیٰ نے اسے چائے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب انسان نے کھیتی باڑی کرنے کے مختلف طریقے سیکھ لیے تو اس نے طرح طرح کی فصلیں اگانا شروع کر دیں۔"

"ارے یہ سلائی کی کتاب ہے یا معاشرتی علوم کی ...... لگتا ہے ابھی ربیع اور خریف کی فصلوں کا ذکر ہو گا۔"

"ہاں' تمہیں تو صرف اسپرنگ اور فال کلیکشن سے دلچسپی ہے۔ تاریخ بھی سن لو صائمہ بیگم!"

"قدیم دور کے انسان نے ان پارچہ جات کو جوڑنے کے لیے کانٹوں کا استعمال کیا۔"

"اور آج کے انسان کی راہوں میں بوئے گئے"

صائمہ نے دہائی دی۔

"زمانہ ترقی کرتا رہا۔ ایک دور ایسا آیا' جس نے انسان کو وقت کی افادیت کا احساس دلایا۔ ہاتھوں سے کام کرنے میں وقت کا بہت زیاں ہوتا تھا۔ انسان نے سوچا......"

"کیوں نہ کپڑے درزیوں سے سلوائے جائیں۔ بس کرو اب۔" صائمہ نے اس کے ہاتھ سے کتاب جھپٹی۔

"اے کاش وہ کون تھا جس نے خواب میں سوئی میں سوراخ دیکھا تھا۔ بھئی کیا نام تھا اس کا کاش ہمارے علاقے میں رہتا ہوتا' لوڈشیڈنگ کی وجہ سے نہ اسے نیند آتی اور نہ ایسے خواب دیکھتا۔ ویسے طوبیٰ ...... یو پی ایس تو سلائی مشین کے بعد ایجاد ہوا تھا نا۔" اس نے معصومیت سے پوچھا۔ تو اسے ہنسی آگئی۔

"یو پی ایس تو شاید سکھر یا گجرات میں ایجاد ہوا ہے۔ کل میں یو کے اپنی دوست سے بات کر رہی تھی تو بجلی' لوڈشیڈنگ اور یو پی ایس کے ذکر پر اس نے کہا' یہ کیا ہوتا ہے؟؟"

"آج تو میں قطعی سلائی شروع نہیں کر سکتی۔" صائمہ نے اعلان کیا۔

"وہ کیوں؟"

"دیکھو! اس کتاب میں ہی لکھا ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے آپ ذہنی طور پر بالکل فریش ہوں۔ زبردستی کام نہ کریں۔"

"پھر تو ہو چکی سلائی......"

☆ ☆ ☆

"ایک گز میں تین فٹ ایک فٹ میں بارہ انچ' ایک انچ میں آٹھ پوائنٹ اور آدھا انچ میں چار پوائنٹ...... اف خدایا۔"

اس نے کتاب پٹخی "لگتا ہے کوئی پہاڑہ یاد کر رہی ہوں۔ نہ وہ منحوس چوغہ سلواتی' نہ یہ دن دیکھنا پڑتا اللہ پوچھے اسما کی بچی کو' خوامخواہ اس ٹیلر کی راہ دکھائی۔ کہتی تھی عام درزی نہیں ہے' ڈیزائنر ہے' فارن سے کورسز کیے ہوئے ہیں۔ بھاڑ میں جائے' اچھے بھلے اپنے ایریا کے درزی یا محلے کی آپا سے کپڑے سلے سلائے مل جاتے تھے۔" وہ مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھی۔

"اب عظمیٰ اور طوبیٰ تو آرام سے گھر سے روانہ ہو جاتی ہیں' میں بھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیتی یا اسکول ہی چلی جاتی......

نہیں بھئی! اتنی بھاری پڑھائی بھی تو نہیں ہوتی مجھ سے اور نہ ہی ننھے ننھے بچوں کی ریں ریں سنی جاتی ہے۔"

وہ کتاب کھولے مسلسل خود کو کوسے جا رہی تھی۔ یوں ہی کتاب کی ورق گردانی کرتے کرتے' وہ وہیں اونگھنے لگی۔

"یہ آپ کیا پوری قوم کی طرح خواب غفلت میں مبتلا رہتی ہیں۔" عمار نے اچانک آکر کہا۔

وہ ہڑبڑا گئی۔ "عمار کے بچے! تم نے کیا "ٹائم چیک" کی ڈیوٹی لی ہوئی ہے اور جلدی کیوں آگئے ہو آج......"

"چھٹی ہو گئی ہے' خرابی حالات کی وجہ سے۔"

"اف! یہ حالات کب اچھے ہوتے ہیں۔ عظمیٰ کو فون کروں اور ہاں خدا کے لیے اب ٹی وی نہ لگا لینا۔ سو سے ضرب دے کر سنائیں گے۔ لگتا ہے پورے ملک میں بم پھٹ رہے ہیں۔ دادی خوامخواہ پریشان ہوں گی۔ رشتے دار فون کر کر کے پریشان ہوتے ہیں اور یہاں ہمیں خود ہی کو معلوم نہیں ہوتا کہ ہوا کیا ہے۔"

"اچھا صائمہ بجو! یہ تو بتائیں آپ کا پراجیکٹ کہاں تک پہنچا؟" اس نے پوچھا۔

"کون سا پراجیکٹ؟؟" صائمہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ جبری سلائی والا۔"

"وہ؟" وہ منہ بنا کر بولی۔ "یہاں کروڑوں کے پراجیکٹ یوں ہی پڑے رہتے ہیں۔ یہ تو ایک عدد کتاب' چار فٹ یا تھ کے جوڑوں اور ایک دو سو سال قدیم سلائی مشین...... اس کا کیا ہونا ہے۔"

"ہاہاہا۔" عمار نے ہنس کر کتاب کھولی۔

"اسپول پن' تھریڈ لیور' پریس بار' بوبن وائنڈر بیلنس وہیل۔۔۔ ہائیں! یہ تو کوئی سائنس کی کتاب لگتی ہے۔"

"اب تم ہی بتاؤ۔" اس نے روہانسی ہو کر کہا۔ "میں سلائی سیکھوں یا یہ سائنس؟"

"ویسے سلائی بھی سائنس ہی ہے۔" عمار نے تسلی دی۔

"Neck کا ناپ' دل چاہتا ہے' گردن ہی دبا دوں۔" وہ جل کر بولی۔

"کس کی' میری؟" وہ ڈر کر بولا۔

"نہیں اپنی۔"

"یہ دیکھو! گلے کاٹنے کا طریقہ۔ توبہ! لگتا ہے دہشت گردوں کے ٹوٹکے ہیں۔" وہ بوکھلا کر بولی۔

"وہ بھی بہت جلد مارکیٹ میں دستیاب ہوں گے۔"

"اور یہ ایک کندے والی شلوار۔۔۔"

"کنڈے والی بجلی تو سنی ہے' یہ کیا بلا ہے۔ ویسے ایک ترکیب بتاتا ہوں آپ کو۔" عمار نے کہا۔

"وہ کیا؟" اس نے شوق سے پوچھا۔

"سیدھے سیدھے بوریاں سینا سیکھ لیں۔ بہت کاروبار چلے گا۔"

"بکو مت۔"

"اصل میں بجو! آپ بیچ بیچ میں سے پڑھ رہی ہیں اس لیے الجھ رہی ہیں۔ پہلے صفحے سے آرام آرام سے شروع کریں تو سمجھ میں آ جائے گا۔"

"ہاں!" اس نے سر ہلایا "یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"اور ایک اور ترکیب بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آپ کا جو سلا سلایا سوٹ ہو' اس پر کپڑا رکھ کر سوٹ کاٹ لیں۔"

"واہ! زبردست۔" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"تم تو بڑے عقل مند ہو۔" اس نے سراہا۔

"بس دیکھ لیں۔" وہ اکڑا۔

"صحیح کہتے ہیں' سب میں بڑی بے وقوف ہوں۔ مجھ سے زیادہ عقل تو اس عمار میں ہے۔" وہ الماری سے ایک سلا ہوا سوٹ نکالنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عظمیٰ کو یونیورسٹی سے واپس آنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ بھوک سے اس کا برا حال تھا۔ اوپر جانے کے بجائے وہ صحن میں لگے واش بیسن سے ہی منہ دھو کر کچن میں آ گئی۔ امی چائے بنا رہی تھیں۔ "السلام و علیکم امی!"

"وعلیکم السلام بیٹا!"

"آج کچھ دیر ہو گئی۔" وہ شرمندگی سے بولی۔ شام کی چائے امی' پھپھو اور دادی قدرے جلدی پیتی تھیں اور عظمیٰ ہی بنا کر دیتی تھی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! تم نے فون تو کر دیا تھا۔"

"آپ صائمہ سے کہہ دیتیں۔" وہ کھانا نکالتے ہوئے بولی۔

"اس کا تو لگتا ہے سلائی میں دل لگ گیا ہے۔ آج تو کھانا بھی نہیں کھایا۔" امی نے مسکرا کر کہا۔

"ایں!" بے یقینی کی سی حالت میں وہ نوالہ ہاتھ میں پکڑے امی کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ معجزہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کچھ اور نہ کر رہی ہو۔"

"نہیں!" امی نے کہا۔ "عمار نے بتایا ہے' پھر طوبیٰ بھی دیکھ کر آئی تھی۔"

"واقعی!" اس کو اب بھی یقین نہ آیا۔ "لیکن امی! کھانا نہ کھانا تو اچھی بات نہیں' اتنی شام ہو گئی ہے۔"

"ہاں میں نے سوچا تھا' پھر رہنے دیا۔ اتنی مشکل سے تو اس کا دل لگا ہے' کھا لے گی کھانا بھی۔۔۔ اور تم اس کو جانتی نہیں؟ کمرے میں ہی کھانے کی دس چیزیں ہوتی ہیں اس کے پاس۔" امی چائے لے جاتے ہوئے بولیں۔

"پھر بھی۔۔۔ میں دیکھتی ہوں۔" وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کمرے میں داخل ہوئی تو عجیب منظر تھا۔ ہر طرف کپڑوں کے ٹکڑے' سلائی کا سامان اور بیچ میں بال

اے' صائمہ ہاتھ میں پکڑی قمیض کو دیکھ رہی تھی۔ عظمیٰ دیکھتے ہی اس نے چھلانگ ماری اور چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔

"یہ دیکھو۔۔۔" اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

"دیکھو! یہ قمیض میں نے سی ہے۔ اف اللہ! اس قدر ہاتھ دکھ رہے ہیں۔ یہ مشین چلانا تو سل بٹے سے بھی مشکل ہے۔"

"قمیض!" عظمیٰ ہکا بکا رہ گئی۔ "یعنی کہ سچ مچ کی قمیض۔" وہ کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ "تم نے سی لی۔۔۔ سچ مچ تم نے۔" وہ آنکھیں پھاڑے کبھی قمیض اور کبھی صائمہ کو دیکھتی۔

"کیا ہے بھئی خیریت تو ہے؟" طوبیٰ نے اندر جھانکا

"یہ اتنی چیخیں کون مار رہا تھا؟"

"طوبیٰ! یہ دیکھو میں نے شرٹ سی لی پوری کی پوری۔" صائمہ نے خوش ہو کر بتایا۔

"تم نے؟" طوبیٰ نے اسے سخت مشکوک نظروں سے گھورا۔

"سچ بتاؤ یہاں بونے تو نہیں آ گئے تھے؟"

"ہاں! سلوک تو تم لوگوں نے واقعی سوتیلی ماں اور بہنوں والا کیا ہے لیکن نہیں بھئی' کوئی بونا دونا نہیں تھا۔ ہاں اپنے بونے عمار کا مشورہ تھا ایک عدد۔"

"لیکن۔۔۔!" عظمیٰ جو شرٹ کا بغور جائزہ لیے جا رہی تھی۔ کچھ ٹھٹک سی گئی۔

"توبہ عظمیٰ! اب اسے تجزیہ کار والی نظروں سے تو نہ دیکھو۔ اتنی صفائی تو نہیں ہو گی۔" صائمہ نے بیزار ہو کر کہا۔ "کچھ کمی بیشی تو ہو گی ہی۔"

"کچھ؟" عظمیٰ نے کہا۔ "صائمہ! تمہیں نہیں لگتا کہ یہ شرٹ کچھ زیادہ ہی تنگ ہے۔"

"ہاں ہے تو۔۔۔ میں نے اپنی شرٹ کی ناپ پر کاٹی تھی۔"

"یہ تمہارا ناپ ہے؟"

"ہاں' کیوں؟"

"ذرا پہن کر آؤ۔"

"کیا مطلب؟"

"تم ذرا پہن کر تو آؤ۔"

صائمہ شرٹ لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد منہ لٹکا کر واپس آ گئی۔ شرٹ اس کے ہاتھوں میں تھی۔

"یہ تو واقعی نہیں پہنی جا رہی۔" وہ مایوسی سے بولی۔

عظمیٰ اور طوبیٰ نے تابڑ توڑ سوال کرنا شروع کر دیے۔

"توبہ ہے' لگتا ہے کوئی حادثہ ہو گیا ہے اور تم لوگ ٹی وی اینکرز ہو۔"

"تو صائمہ بی بی! بتائیے نا' آپ نے یہ شرٹ کیسے کاٹی۔۔۔؟" طوبیٰ نے پوچھا۔

"اتنی بار تو بتایا ہے اپنی شرٹ کے اوپر رکھ کر پوری پوری اس جتنی کاٹی تھی۔"

"آہ!" عظمیٰ اور طوبیٰ بالآخر ایک نتیجے تک پہنچ گئیں۔

"گدھی! تم نے پوری پوری ناپ پر کاٹ دی۔ سلائی کا مارجن چھوڑا ہی نہیں اور جب سلائی کی تو ظاہر ہے وہ اتنی تنگ ہو گئی۔"

"یہ تو عمار نے نہیں بتایا تھا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اب یہ بھی عمار بتاتا؟" طوبیٰ نے دانت پیسے۔

"تو تم بتا دیتیں۔۔۔ دوبار دیکھنے آئی تھیں تم مجھے۔" وہ بگڑی۔

"اس وقت تم سن رہی تھیں کسی کی بات۔۔۔ خود کو پتا نہیں کیا سمجھ رہی تھیں۔"

"ہائے اللہ! میری اتنی محنت۔" وہ باقاعدہ رونے لگی۔

"چلو چھوڑو۔ اٹھو چلو' کھانا کھائیں۔" عظمیٰ نے اسے پچکارا۔

"مجھے نہیں کھانا۔" وہ شرٹ کو ایک طرف اچھال کر بیڈ پر اوندھی لیٹ گئی۔

"اوفوہ! ابھی کمرا بھی سمیٹنا ہے' دیکھو تو تم نے کیا

حال کردیا ہے۔ اٹھ جاؤ شاباش!"
لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے بھی تو اس بات کو سر پر سوار کرلیا ہے۔ اب امی نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ ہر وقت ہی..... اور دیکھو کمرے کی حالت کیا کی ہے تم نے۔"
اتوار کا دن تھا اور عظمیٰ اس کے سر پر کھڑی چلا رہی تھی۔
"تو اور کہاں جاؤں' امی نے کیا الگ سے سلائی سینٹر بنا کر دیا ہوا ہے مجھے۔" وہ بگڑ کر بولی۔ "یہی کمرا ہے' یہیں سارے تجربات کرنے ہیں۔"
"اوہ گاڈ.....!" بستر کی چادر جھاڑتے ہوئے عظمیٰ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔
"کیا ہوا؟" صائمہ حیران و پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔
"یہ ہوا۔" اس نے چادر کا بیچ کا کٹا ہوا حصہ کھول کر صائمہ کو پہناتے ہوئے بھنا کر کہا۔ "یہ لو اپنا پونچو..... الو کی دم! تم نے بیڈ پر بیٹھ کر کٹنگ کی ہے جس کے نتیجے میں بیڈ شیٹ کٹ گئی ہے۔"
"اوہ!" وہ جو پہلے سے ہی گھبرائی ہوئی تھی' مزید گڑبڑا گئی۔ "یار! کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"
"چلو چھوڑو۔ اب یہ کھڑاگ سمیٹو۔ دو تین دن تک..... ریلیکس ہو جاؤ' پھر کچھ سوچتے ہیں۔ آج ہم تینوں شاپنگ کرنے چلتے ہیں۔"
"ہاں ٹھیک ہے!" وہ خوش ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"امی! یہ آپ نے صائمہ کو کس چکر میں ڈال دیا ہے۔" عظمیٰ اپنی امی سے کہہ رہی تھی۔
"میں بھی اس سے یہی کہہ رہی تھی۔" پھپھو نے تائید کی۔ "بے چاری بچی گویا قید ہو کر رہ گئی ہے۔"
"اور اگر آپ سلائی سیکھنا اتنا ہی ضروری خیال کرتی ہیں تو اسے کسی اچھے سینٹر میں داخلہ دلوادیں۔ یہاں اسے کوئی گائیڈ کرنے والا نہیں ہوتا' صرف

کتاب پڑھ کر وہ کیا سیکھے گی۔" عظمیٰ نے مزید کہا۔
"وہ خود لاپرواہ ہے ورنہ تم تو مجھے دیکھ دیکھ کر سیکھ گئیں اور پڑھی لکھی لڑکیاں کتابوں سے سیکھ نہیں سکتیں؟" امی نے کہا۔
"امی! جیسا آپ نے خود کہا وہ ذرا لاپرواسی ہے' میں چھوٹی بھی ہے' اس کو اتنا انٹرسٹ بھی نہیں۔ یوں زبردستی کرنے سے کچھ نہیں آتا۔"
"عظمیٰ آپی!" عماد آوازیں دیتا اندر داخل ہوا۔
"بریکنگ نیوز یہ ہے کہ صائمہ بجو کمرے میں سر پکڑے بیٹھی ہیں اور ریسکیو (فوری امداد) کے لیے آپ کو بلا رہی ہیں۔"
"اللہ خیر!" پھپھو نے کہا۔
"ارے پھپھو! ایسے ہی..... پھر کوئی سلائی کا مسئلہ ہو گا۔ اس کی تو عادت ہے۔" اس نے عمار کو گھورا۔
جاتے جاتے وہ طوبیٰ کو بھی لیتی گئی۔
"پھر اب کیا کر دیا بھئی؟" انہوں نے صائمہ سے پوچھا۔
"یہ تم دونوں کیا بس نمائندوں کی طرح میری ٹوہ میں رہتی ہو۔" وہ جلی بیٹھی تھی۔
"لو خود ہی تو بلایا تھا' عمار نے بتایا ہے۔"
"اس کو تو بس ہر بات پر از خود نوٹس لینے کی عادت ہے۔" وہ اور بگڑی۔
"لو بھئی' نیکی برباد گناہ لازم..... میں تو سپریم کورٹ میں تمہاری سزا میں کمی بلکہ خاتمے کا بل پیش کیے بیٹھی تھی اور وہ بے چارا تمہیں پریشان دیکھ کر مجھے بلانے چلا آیا۔ تم نے دونوں کی نیکی برباد کی۔"
"اچھا! یہ دیکھو۔" اس نے گویا ہار مان کر ایک ٹراؤزر انہیں دکھایا۔
"آج ٹراؤزر سینے کی کیا سوجھی.....؟"
"اس کی ریسیپی بہت آسان لگی تھی۔" اس نے معصومیت سے کہا تھا تو عظمیٰ اور طوبیٰ بے ساختہ ہنس پڑیں۔
"پھر کیا ہوا؟ نمک کم پڑ گیا یا مرچیں زیادہ....."
"ایک پائنچہ چھوٹا..... ایک بڑا۔"

"یہ کیسے ہو گیا؟"
"پتا نہیں۔" "اب کیا کروں؟
"آسان طریقہ ہے۔ کسی ماڈل سے درخواست کرو کسی فیشن شو میں اسے پہن لے۔ بس پھر اسی کا فیشن آجائے گا۔ ایک سائیڈ سے چھوٹا ایک سے بڑا" طوبیٰ نے تجویز دی۔
"بکو مت!"
"جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ دیکھ لینا ایک دن یہ فیشن ضرور آئے گا۔"
"تب تک کیا کروں؟"
"ہوں.....!" عظمیٰ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔
"ایسا کرو' جو لمبا ہے اسے کاٹ کر چھوٹے کے برابر کردو۔"
"پھر تو بہت چھوٹا ہو جائے گا۔"
"سنو نا! اتنی لمبی لمبی لٹکتی ہوئی لیسوں کا فیشن ہے۔ دونوں طرف لیس لگا دو۔"
"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔"
ڈھین ڈھین..... ڈھین۔ "بریکنگ نیوز....."
عمار نے میوزک بجایا۔
"اب کیا ہے؟" عظمیٰ نے مڑ کر اسے دیکھا۔
"عنقریب جواد بھائی اور عظمیٰ آپی کی شادی کی تاریخ فکس ہونے والی ہے۔"
"کیا؟" تینوں چیخ پڑیں۔
"اور یاد رہے کہ یہ خبر آپ کو "سب سے پہلے" ہم نے دی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"امی! آپ عظمیٰ کی شادی کے کپڑے تو ٹیلر سے سلوائیں گی یا وہ بھی مجھے بنانا پڑیں گے۔" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی تو امی کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔
"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے آج تک سارے گھرانے کے کپڑے تم ہی سی رہی ہو۔" امی نے ہنس کر کہا۔
"جب کہ سیا تو ایک رومال بھی نہیں بلکہ اس

مشین کے پیچھے جو تھوڑا بہت گھر کا کام کرتی تھی اس سے بھی گئی۔" دادی نے کہا۔

"دادی! کوشش کر تو رہی ہوں۔" وہ جھنجھلا کر بولی۔

"لیکن اب تو عظمیٰ کی شادی ہے' ابھی تو مجھے کپڑے بنوادیں۔"

"اور وہ جو اتنے سارے کپڑے بنوائے تھے۔" دادی نے یاد دلایا۔

"وہ!" وہ چیخ پڑی۔ "وہ کوئی شادی میں پہننے کے کپڑے تھے۔ میری اکلوتی بہن کی شادی اور میں نئے کپڑے نہ بنواؤں۔۔۔ ابا!" اس نے فریاد کی۔

"اچھا چیخو مت۔۔۔ ابا تمہارے نہیں ہیں گھر پر اور بنوالینا کپڑے بھی۔" امی نے جھڑکا۔

اور پھر وہ اسی وقت چھلانگیں مارتے ہوئے اوپر پھپھو کے پاس پہنچی' جہاں پھوپھو' طوبیٰ اور جواد بیٹھے تھے۔

"آہم آہم۔۔۔ بھئی دولہا والے ہمارے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہے' کوئی پلاننگ؟" اس نے شرارت سے کہا۔

"ہاں! ہم سوچ رہے ہیں دلہن کی بہن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" جواد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھئی! طوبیٰ ہوگی دولہن کی بہن' یہ ہی ہر وقت عظمیٰ کے ساتھ چپکی رہتی ہے۔ میں تو دولہا کی بہن ہوں۔" وہ پھپھو کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں' اس میں کیا شک ہے۔" پھپھو نے محبت سے کہا۔

"پھپھو! جواد بھائی کی شادی میں مجھے کتنے سوٹ ملیں گے؟" اس نے چالاکی سے کہا۔

"تو یوں کہو نا!" طوبیٰ نے اسے گھورا۔

"ملیں گے' ملیں گے' جتنے کہو گی۔" پھپھو نے کہا۔

"امی! آپ 'ملیں گے۔ ملیں گے' تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے میری ملیں چل رہی ہیں۔" جواد نے بے چارگی سے کہا۔

"میری باری آنے پر سب کو بچت سوجھنے لگتی ہے۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں! میں تو مذاق کر رہا تھا بلکہ ابھی ہم یہ ہی باتیں کر رہے تھے۔ امی کہہ رہی تھیں کہ صائمہ اور طوبیٰ کو ایک ساتھ شاپنگ کروانا۔"

"یاہو!" وہ خوشی سے بولی۔

"طوبیٰ! تم کیسے بنواؤ گی۔" ریڈی میڈ یا سلواؤ گی؟ میں تو اسی ٹیلر سے بنواؤں گی۔"

"اف! ٹیلر کا بھوت اترا نہیں۔"

"ارے پھپھو! اتنا زبردست کام کرتا ہے۔ آپ عظمیٰ کے ڈریسز بھی وہیں سے بنوایئے گا۔"

"ہاں بھئی جہاں سے چاہو بنوالو بلکہ عظمیٰ کو بھی ساتھ لے جانا۔ میں نے بھائی جان سے پوچھ لیا ہے۔"

"ارے واہ۔۔۔ چلو طوبیٰ! نیٹ پر نئے ڈیزائن دیکھتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"فیضان احمد۔" اس نوجوان نے جواد سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

"صائمہ! یہ تو بڑا ہینڈسم ہے' میں تو کوئی ٹوپی والا بڈھا ٹیلر سمجھی تھی۔" طوبیٰ نے سرگوشی کی۔

"جی یہ تو ویڈنگ سیزن لیکن آپ کے لیے وقت نکال لیں گے۔ میرے ورکرز ہیں' میں صرف انسٹرکشن دیتا ہوں۔ ہاں۔۔۔ کوئی خاص آرڈر ہو تو خود بناتا ہوں۔"

اس نے ایک سرسری سی نظر صائمہ پر ڈالی اور پھر جواد سے باتیں کرنے لگا۔

"پھر کب تک ملے گا یہ سب؟" طوبیٰ نے بے چینی سے پوچھا۔

"آپ کو کب تک چاہئیں؟ آپ ایڈریس لکھوا دیں۔ میں خود ڈیلیوری کردوں گا۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"لگتا ہے کپڑوں کے ساتھ خود بھی پہنچے گا۔" واپسی پر طوبیٰ نے وثوق سے صائمہ کے کان میں کہا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے۔ اب سب خوب نبٹائے کرنے کے بعد اپنی تھکن اتار رہے تھے۔ صائمہ خوب دیر سے سو کر اٹھتی۔ جواد اور عظمیٰ دعوتوں میں مصروف تھے۔ کہیں پوری فیملی مدعو ہوتی' کہیں وہ دونوں۔

"صائمہ!" امی نے اسے آواز دی۔ وہ جو مزے سے چائے پیتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ آواز کم کرکے امی کی طرف دیکھنے لگی۔

"جی امی!"

"یہ لو۔۔۔" انہوں نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے امی؟"

"ایک بہت اچھا انسٹی ٹیوٹ ہے' میرا خیال ہے کہ تم وہاں جاکر اچھی طرح سیکھ سکو گی۔ فیشن اینڈ ڈیزائننگ کا ڈپلومہ ہے۔"

"یعنی آسان اردو میں وہی سلائی مشین۔۔۔" صائمہ خوف زدہ ہوگئی۔

"امی!" اس نے احتجاج کیا۔

"میں دیکھتی ہوں تمہیں شوق بھی بہت ہے۔ اسی لیے اتنے بڑے ادارے میں داخلہ دلوا رہی ہوں۔ حالانکہ مجھے گھر میں بھی تمہاری ضرورت ہے' عظمیٰ کی شادی ہوگئی ہے۔"

"یہیں تو ہے عظمیٰ۔" اس نے کہا۔

"پھر بھی فرق پڑجاتا ہے۔ اچھا چھوڑو اس بات کو۔ دیکھو فارم بھر لینا بلکہ آگے کے سارے کام خود ہی کر لینا۔ ویسے اچھی بات یہ ہے کہ گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

وہ چائے وہیں چھوڑ کر دھپ دھپ کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

کچھ دن تو وہ منہ لپیٹ کر پڑی رہی لیکن آخر کب تک جاتی تھی۔ امی کا حکم حرف آخر تھا۔ اوپر سے اسے عظمیٰ پر غصہ تھا جو روز تیار ہو کر جواد کے ساتھ کہیں چلی جاتی تھی اور بقول صائمہ کے' اس کے پاس اس کے لیے اب وقت نہیں تھا۔ طوبیٰ الگ اپنی بھابھی کی نازبرداریوں میں مصروف رہتی۔

"ہونہہ۔۔۔ پہنچی کہیں کی۔۔۔ جیسے پہلے عظمیٰ کو کبھی دیکھا نہیں۔" وہ غصے سے بڑبڑائی۔

"اور یہ فارم۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ ذرا ریکوائرمنٹ تو دیکھو گویا پی ایچ ڈی میں داخلہ لے رہے ہوں اور یہ سامان کی لمبی لسٹ۔۔۔ پورا ٹول باکس تیار کرنا ہے۔۔۔ ٹریسنگ وہیل' قینچیاں' چاک' پن' انچ ٹیپ' اف۔۔۔"

"ڈھین ڈھین۔۔۔" عمار نے کمرے میں جھانکا۔ "بریکنگ نیوز۔"

"عمار کے بچے! جاؤ یہاں سے ورنہ تمہارا سر پھٹنے کی بریکنگ نیوز نیچے جائے گی۔"

"نیچے تو اعلا حکام کا نہایت خفیہ اجلاس ہورہا ہے' جس میں عظمیٰ آپی کی شادی کے بعد آپ کے لیے آنے والے دھڑا دھڑ رشتوں پر غور ہو رہا ہے اور ایک

کمیٹی تشکیل دی جا رہی ہے' جو آپ کی رضامندی حاصل کرے گی اور رشتوں پر تحقیق کرے گی۔"

"ایں۔۔۔؟" وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"جی! اور یاد رکھیے گا کہ یہ خبر۔۔۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے جاؤ۔"

"اس کو تو عادت ہے یوں ہی شوشے چھوڑنے کی ۔۔۔ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں' یہ کوئی نہیں سمجھتا۔"

"فائل پتا نہیں کہاں رکھی ہے' اب بھلا میٹرک اور انٹر کے سرٹیفکیٹ لینے کی کیا تک ہے۔۔۔ مشین ہی تو چلانی ہے اور یہ سامان۔۔۔"

وہ پھر الجھ کر سامان کا ڈبا ڈھونڈنے لگی' جو شادی کی وجہ سے ادھر ادھر ہو گیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو!" عظمیٰ اور طوبیٰ ہنستے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"فرصت مل گئی لاڈلی نند اور چہیتی بھابی کو ایک دوسرے کے لاڈ اٹھانے سے۔۔۔ دیکھتی ہوں' یہ ڈرامہ کتنے دن چلتا ہے۔" وہ غرائی۔

"ہماری چھوڑو' تم خود اب اپنے رول کی تیاری کرو۔ لوگ تمہیں سسرال نامی سیریل میں کاسٹ کرنے کو بے چین ہیں۔" طوبیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے ٹیلر صاحب نے تمہارے کپڑے بہت محنت سے بنائے تھے' رشتے پہ رشتے آ رہے ہیں۔"

"اچھا! کپڑے تو تمہارے بھی انہوں نے بنائے تھے۔"

"نہیں یار۔۔۔!" اس نے منہ بسورا۔ "میرے تو ایسے ویسے درکر سے بنوا لیے ہوں گے۔ تمہارے خاص طور پر بنائے تھے۔" اس نے آنکھیں نچائیں۔

"اچھا بکو مت۔۔۔ امی نے مجھے نئی مصیبت میں ڈالا ہوا ہے۔ نہ صرف سارے اکیڈمک پیپرز تیار کرنے ہیں بلکہ یہ آلات جنگ کا بکسا بھی تیار کرنا ہے۔" "یہ ایل فٹ' ٹی فٹ' فلاں فٹ۔ مائی فٹ!"

"اچھا چھوڑو ان کو۔ میری بات سنو۔" عظمیٰ نے سنجیدگی سے کہا۔

"طوبیٰ! مذاق نہیں کر رہی۔۔۔ یہ صحیح ہے' تمہارے اتنے اچھے رشتے آئے ہیں کہ امی' ابا تمہاری شادی کرنے پر سیریس ہو گئے ہیں۔"

"کیا؟"

"ہاں۔۔۔ اور تفصیل سنو۔۔۔ ایک تو وہ امی کی دوست ہیں۔" "آنٹی فاطمہ ان کا بیٹا ہے فواد' بزنس مین ہے۔ دوسرا پھپھو کی کولیگ کا دیور ہے' دبئی میں جاب کرتا ہے۔ تیسرا جواد کا دوست ہے' ان کے ساتھ ہی جاب کرتا ہے شادی میں آئے تھے وہ لوگ۔۔۔ اور چوتھا۔" وہ رک گئی۔

"ہاں بولو۔۔۔" صائمہ سارا قصہ ہی عدم دلچسپی سے سن رہی تھی۔ اس کا سارا دھیان اپنے داخلے والی مصیبت کی طرف تھا۔

"فیضان احمد۔۔۔!" وہ آہستہ سے بولی۔

"کون فیضان۔۔۔؟" اس نے الماری سے ڈبا برآمد کرتے ہوئے کہا۔

"ٹیلر ماسٹر۔"

"ہائیں!" ڈبا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور سارا سامان اس کے قدموں میں بکھر گیا۔

"خیر' اس میں برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ ٹیلر ہوتا کوئی۔۔۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

صائمہ وہیں ساکت کھڑی تھی' پھر اچانک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اپنے قدموں میں دھرے آلات سلائی کو اک شان بے نیازی سے ٹھوکر ماری بیڈ سے چادر اٹھا کر نہایت عقیدت کے ساتھ دائیں طرف رکھی بے ڈھب مشین کے اوپر ڈال دی گویا مزار پر چادر ڈال رہی ہو۔ میز پر رکھا داخلہ فارم اٹھایا' کچھ دیر اس کو غور سے دیکھا اور پھر آرام سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے' پھر عظمیٰ کی طرف مڑی اور اطمینان سے بولی۔

"امی سے کہو! ٹیلر ماسٹر کو ہاں کر دیں!"

☆

فرحت اشتیاق

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

شہریار خان معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھنے والے بے مثال ذہانت اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ایک مغرور شخص ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ خوب صورت اور ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں مگر گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ سکندر اور زین ان کے دو بیٹے ہیں۔ سکندر اپنے باپ کا عکس ہے اس لیے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ زین ذہانت میں سکندر سے کم ہے۔ باپ کے امتیازی سلوک کی وجہ سے سکندر سے خائف رہتا ہے۔

محمود خالد نے عیسائی عورت وٹوریا سے شادی کی مگر دونوں میں نبھ نہ سکی اور لیزا اور سیم کی پیدائش کے بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ سیم اپنے باپ کی طرح ذہین اور خوب صورت تھی۔ علیحدگی کی صورت میں اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا پڑا ۔لیزا ذہانت و خوب صورتی میں درمیانے درجے کی تھی۔ وہ محمود خالد کے پاس رہی۔ وٹوریا نے ارب پتی بزنس مین سے دوسری شادی کی اور میلان چلی گئی۔ نشے کی حالت میں وٹوریا کا دوسرا شوہر سیم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لیزا کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ محمود خالد کو چھوڑ کر اپنی نینی کے ساتھ روم شفٹ ہو جاتی ہے۔ محمود خالد عائشہ سے دوسری شادی کر کے پاکستان شفٹ ہو جاتے ہیں۔ محمود خالد اپنا کاروبار بچانے کے لیے سیم کی شادی اس سے پندرہ سال بڑے ہاشم اسد سے کروا دیتے ہیں۔ لیزا کو اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے پاکستانی مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیزا ایک مصورہ ہے۔ روم میں ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔

مکمل ناول

زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین' سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار' سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم' زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں امو جان رو' رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں' وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے' ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔

سکندر دوہا چلا جاتا ہے لیزا کو ہر ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم' محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بد تمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔ سکندر کو دوہا میں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ لیزا نہیں ہوتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

سکندر دوہا آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلورنس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایگزیبیشن کا پہلا دن گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مردانہ وقار مغضوب ہو چکا ہے۔ وہ ندامت محسوس کرتا ہے اور ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی منگیتر ام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے' اسے رجھانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی گھٹیا الزام لگا کر اسے اپنے گھر والوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

۹
نویں قسط

وہ اس کی آواز سن کر سویا تھا' وہ اس کی آواز سن کر ہی اٹھا۔

بہت گہری' بہت پر سکون نیند سو رہا تھا' وہ جب اس کے موبائل پر لیزا کی کال آئی تھی۔ وہ ٹھیک اس کے بتائے ہوئے ٹائم پر اسے جگا رہی تھی۔ ایک دو گھنٹوں کے بعد وہ جاگا تھا۔

"اٹھ جائیے سینور سکندر!" اس کے نیند میں ڈوبے ہیلو کے جواب میں وہ مسکرا کر بولی۔

وہ اس کی آواز سنتے ہی بالکل خوش باش اور چست ہو گیا۔ یوں جیسے نیند سے جاگنے کے ساتھ ہی اسے دن بھر کے لیے بھرپور توانائی مل گئی ہو۔

"میں جاگ گیا ہوں سینوریتا!"

"تمہیں نیند آئی؟" وہ جانتا تھا لیزا اس کے نیند نہ آنے کے مرض کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس سے یہ بات پوچھ رہی ہے۔ اسے لیزا کا اپنی فکر کرنا اور محبت سے بھرا انداز ہمیشہ سے بھی بڑھ کر اچھا لگا۔

"ہاں مجھے نیند آئی۔ بہت پر سکون اور بہت گہری نیند۔"

"ضرور تم نے مجھے سوچا ہو گا' اسی لیے پر سکون نیند سوئے ہو۔" وہ اس کے لہجے میں شامل شرارت پر مسکراتا ہوا بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"ہاں میں تمہیں سوچتے ہوئے سویا تھا اور اب میں تمہیں سوچتے ہوئے ہی اپنے دن کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ اب تم کوئی اچھی بات کہو مجھ سے۔"

"اچھی بات؟" لیزا حیرانی سے بولی گویا اس کی بات سمجھ نہ پائی ہو۔

"ہاں اچھی بات کوئی ایسی بات جسے سوچ کر میں سارا دن خوش ہوتا رہوں۔"

اس نے لیزا کا رات والا جملہ اسی کے انداز میں دہرایا تھا۔ لائن کے دوسری جانب سے اسے لیزا کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں سکندر!"

"کتنی؟ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو لیزا!"

وہ اسے بہت چاہتی ہے وہ جانتا تھا' پھر بھی اس وقت وہ یہ سننا چاہتا تھا کہ وہ بھی چاہا جاتا ہے۔ بے حد اور بے حساب۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتے اتنی..... میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

"تم میرے لیے پینٹنگ چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔"

"روما جانا چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔" وہ بغیر ایک پل کی ہچکچاہٹ کے فوراً بولی۔

"اگر تم میری خاطر یہ دو چیزیں چھوڑ سکتی ہو تو اس کا مطلب ہے تم مجھ سے واقعی بہت محبت کرتی ہو۔" وہ مسکرا کر شریر سے انداز میں بولا۔

"تمہیں میری محبت کا یقین ہونا چاہیے سکندر شہریار!"

"مجھے تمہاری محبت کا یقین ہے لیزا! میری بہت تنہا اور بہت بکھری ہوئی زندگی میں واحد خوشی' واحد روشنی تم ہو۔ میری زندگی میں زندگی ہی تم ہو۔"

بولتے ہوئے اس کا لہجہ بے حد بھیگ گیا تھا۔ اس کے لہجے میں جذبات کی شدت تھی۔ جواب میں چند سیکنڈز کے لیے لیزا بالکل خاموش رہی۔

"بس اب تم گزری ہوئی باتوں کو مت سوچا کرو۔ اچھی اچھی باتیں سوچا کرو' میرے اور اپنے بارے میں جو زندگی ہم ایک ساتھ گزاریں گے اس کے بارے میں۔"

لیزا کی نرم لہجے میں سمجھائی ان باتوں کو سنتا ہوا وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔ اسے آفس کے لیے دیر ہو رہی تھی اس لیے اسے خدا حافظ کہہ کر اس نے فون بند کیا۔ جلدی جلدی نہا کر آفس کے لیے تیار ہونے کے بعد وہ کچن میں آیا تاکہ ناشتا کر سکے۔ وہ کھڑکی سے باہر نظر آتے صبح کے منظر ہی کی طرح خود کو بہت فریش اور تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔

کیا وہ یہاں آئے گی؟ کیا وہ اس کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرے گی؟ وہ کچن اور کچن سے باہر نظر آتے اپنے فلیٹ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ دل کی دھڑکنوں میں بسی اس لڑکی کے ساتھ تمام وعدے کر لینے کے باوجود اس سے تمام عہد محبت و وفا سن لینے کے باوجود بھی وہ اس کے ساتھ کے خواب دیکھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

اس کے اندر ایک خوف تھا۔ جو لیزا اس سے کہہ

رہی ہے اور جو وہ اس کے کہنے پر مان بھی گیا ہے' وہ ہو نہیں پائے گا۔ وہ اور لیزا ایک نہیں ہو پائیں گے۔ لیزا اس کی زندگی میں نہیں آئے گی۔ کہیں نہ کہیں سے اس کی زندگی کی نحوست اسے پھر اپنے گھیرے میں لے لے گی۔ وہ اس لڑکی کو کھو دے گا۔ جب تک اس کی محبت قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا' جب تک اسے اپنی محبت دینے سے انکار کر رہا تھا تب تک ضدی دل کو اس نے سنبھالا ہوا تھا مگر اب اسے اپنی زندگی میں لیزا محمود چاہیے تھی۔

اگر زندگی نے اس بار اس کے ساتھ کچھ برا کیا' اگر لیزا اسے نہ ملی تو اب کی بار وہ ایسا ٹوٹ کر بکھرے گا کہ پھر لیزا بھی اسے سمیٹ نہیں پائے گی۔ کیا زندگی تمام عمر سکندر شہریار پر صرف سنگ ہی برسائے گی؟ کبھی کوئی پھول' کوئی خوشی' کوئی ہنسی اس کے حصے میں نہیں آئے گی؟ وہ لیزا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ لڑتے ہوئے زندگی کو بتا رہا تھا کہ اس بار اس سے اس کے خواب اور محبت چھیننے کی کوشش نہ کرے۔ زندگی لیزا محمود کو اس سے چھیننے کی کوشش نہ کرے۔

☼ ☼ ☼

آج ہفتے کا دن تھا' اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ مگر کچھ ضروری کام کی وجہ سے اسے آفس آنا پڑا تھا۔ وہ ایک کانٹریکٹ کے متعلق اپنا قانونی نقطہ نظر ڈرافٹ کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں لیپ ٹاپ پر مرکوز تھیں' اس کی انگلیاں تیز رفتاری سے حروف ٹائپ کر رہی تھیں۔ مگر اس کا دل مسلسل اسے وہموں اور اندیشوں میں مبتلا کر کے مضمحل کر رہا تھا۔ اس کی منفی سوچیں اس پر حاوی ہو رہی تھیں۔ اس وقت اس کا موبائل بجا تھا۔

"لیزا!" وہ اس کی آواز سن کر آج تک کبھی اتنا خوش نہیں ہوا تھا جتنا منفی سوچوں کے ان لمحوں میں۔

"کیا کر رہے تھے؟" وہ اس کی آواز سنتے ہی بولی۔

"تمہیں یاد کر رہا تھا۔"

"جھوٹ۔ مجھے یاد کر رہے ہوتے تو مجھے فون کرتے۔"

اس نے فوراً" اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ جواب میں اسے یہ نہیں بتا پایا کہ وہ کس طرح کی منفی سوچوں میں گھرا اسے سوچ رہا تھا۔

"خیر چھوڑو اس بات کو۔ مجھے تم سے یہ پوچھنا تھا' تم نے ہماری شادی کے بارے میں کیا سوچا؟"

"کیا سوچا' مطلب؟" وہ غائب دماغی سے بولا۔

"تم شادی پر کس کلر کا سوٹ پہنو گے اس بارے میں۔" وہ اس کی غیر حاضر دماغی پر چڑ کر بولی۔ وہ جواب میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

"میرا خیال ہے بلیک کلر کا۔ بلیک کلر مجھ پر جچتا ہے۔ اور تم؟"

یک دم ہی اس کا موڈ تبدیل ہو کر خوشگوار ہو گیا۔ امیدیں خواب اور آرزوئیں سب پھر دل میں جاگ اٹھیں۔ اسے لیزا کے ساتھ غیر سنجیدہ انداز میں گفتگو کرنے میں لطف آ رہا تھا۔

"جو تم مجھے خرید کر دو گے' میں وہی پہنوں گی۔ تمہیں میں پاکستانی دلہن کے روپ میں اچھی لگوں گی یا ویسٹرن دلہن کے روپ میں؟"

"تم ہر روپ میں اچھی لگو گی۔ تم پر ہر رنگ' ہر لباس بجتا ہے۔"

"ڈپلومیٹ جواب نہیں' اپنی پسند بتاؤ۔" وہ رعب ڈالنے والے انداز میں بولی۔

"پاکستانی دلہن۔ سرخ لباس میں۔"

وہ بے اختیار اپنی پسند بتا گیا۔ بغیر کسی شعوری کوشش کے یک دم ہی اس کے ذہن میں سرخ رنگ کا خوب صورت جوڑا پہنے' دلہن بنی لیزا کا تصور ابھر آیا تھا۔ یہ خوابوں میں رہنا اس نے کب سے شروع کر دیا؟ وہ خود اپنے تصور پر حیران ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر تم مجھے ریڈ کلر کا پاکستانی برائیڈل ڈریس دلانا۔"

"میں تمہیں ریڈ کلر کا برائیڈل ڈریس ضرور دلاؤں گا۔ ویسے تم اصل میں پوچھ کیا رہی تھیں؟" وہ مسکرا کر کہتے ہوئے لیزا کی اصل بات کی طرف آیا۔

"میں بس یہی پوچھ رہی تھی' تم نے کچھ پلان کیا ہماری شادی کے بارے میں؟ یعنی ہم شادی کب کر رہے ہیں اور کہاں؟"

"تم نے اپنی بہن اور نینی سے بات کر لی؟"

"ہاں اور وہ دونوں میری شادی سے بہت خوش ہیں۔ نینی تو بہت ہی ایکسائیٹڈ ہیں۔ ان دونوں نے مجھ سے کہا ہے میں انہیں جب اور جہاں آنے کو کہوں گی وہ دونوں میری شادی میں شرکت کے لیے وہاں آ جائیں گی۔ پاپا کو ابھی میں نے نہیں بتایا۔ میں سوچ رہی تھی' پہلے ہم ڈیٹ اور جگہ طے کر لیں پھر ہی انہیں بتاؤں گی۔"

ان دونوں ہی کی زندگیاں ابنارمل تھیں۔ جس طرح وہ تمام خونی رشتوں کے ہوتے ہوئے تنہا تھا۔ اسی طرح لیزا بھی باپ کے ہوتے ہوئے اپنی شادی میں اس کی شرکت یا عدم شرکت سے بے نیاز تھی۔ وہ لیزا کی اس کے پاپا سے ناراضی سے باخبر تھا' اس لیے جواباً" سنجیدگی سے بولا۔

"لیزا! اس وقت میں آفس میں ہوں۔ ہم اس ٹاپک پر رات میں تفصیل سے بات کر لیں؟ تب ہی ہم دونوں مل کر ساری چیزیں طے کر لیں گے۔"

"او کے سینور سکندر۔" اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔

وہ فون بند کرنے کے بعد دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ پھر اپنا کام کرنے لگا تھا مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب اس کے لبوں پر ایک مدھم سی زندگی کی امنگ سے بھری مسکراہٹ تھی اور اس کے دل میں خوشیاں' خواب اور آرزوئیں پھر سے شور مچاتے اسے زندگی کے خوب صورت ہونے کا یقین دلا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

انہیں آفس سے آئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ شاور لے کر آنے کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی پر ریموٹ سے چینل تبدیل کر کر کے مختلف پروگرام دیکھ رہے تھے۔

عائشہ کچن میں ان کے لیے چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس تیار کر رہی تھیں۔ وہ آفس میں زیادہ ہیوی لنچ نہیں کرتے تھے۔ بہت سے بہت ہوا تو تھوڑی سی سلاد یا دہی لے لی ورنہ وہ بھی نہیں۔ سو عائشہ ان کی دفتر سے واپسی پر چائے کے ساتھ ہلکے پھلکے اسنیکس کا اہتمام رکھا کرتی تھیں۔

انہیں باہر کسی کے بولنے اور باتیں کرنے کی آواز آئی۔ مریم آئی تھی۔ بہت دور سے جب ابھی آواز واضح بھی نہیں ہوئی تھی' وہ اس کی آواز پہچان گئے تھے۔

"السلام علیکم پاپا۔" وہ اندر داخل ہوئی۔

"وعلیکم السلام۔" ٹی وی کی آواز ہلکی کرتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھا اور وہ پیار اور شفقت سے مسکرائے۔ مریم ان کے پاس آئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ان کے گال پر پیار کیا۔ باپ کی فطری محبت سے ان کا دل یک دم ہی بھر آیا تھا۔ انہوں نے بے اختیار اس کا ماتھا چوما تھا۔

"ٹھیک ہو بیٹا؟"

"بالکل ٹھیک ہوں پاپا۔" وہ ان کے نزدیک بیٹھ گئی۔

"آفس سے گھر واپس جا رہی تھی' میں نے سوچا کافی دن ہو گئے آپ سے ملے ہوئے' اس لیے آ گئی۔ آپ تو میرے گھر آتے ہی نہیں ہیں۔" مریم نے مسکرا کر کہتے ہوئے ان سے شکوہ کیا۔ وہ کوشش کے باوجود اس کے گھر جا نہیں پاتے تھے۔ کبھی مجبوراً" جانا پڑ جاتا تو دونوں ان کا دل پریشان رہتا تھا۔ انہیں مریم کے گھر میں کسی کی سسکیاں اور آہیں سنائی دیتی تھیں۔

"والدین کو بیٹیوں کے گھر زیادہ نہیں جانا

چاہیے۔" وہ کوشش کرکے مسکرائے۔
"پاپا! یہ آپ کس زمانے کی دقیانوسی باتیں کرتے ہیں۔"
مریم نے منہ بنایا پھر یک دم ہی جیسے کچھ خیال آنے پر ان سے بولی۔
"آپ کے پاس لیزا کا فون آیا؟"
"نہیں..... کیوں؟ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟" یک دم ہی ان کا دل گھبرایا تھا۔ "خدا خیر کرے۔ ان کی کلثوم بالکل خیریت سے ہو۔"
"وہ بالکل ٹھیک ہے پاپا۔"
انہیں محسوس ہوا، مریم ان کے چہرے کو بہت بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل سنجیدہ ہو گئی تھی۔
"وہ شادی کر رہی ہے خدا جانے کس کے ساتھ۔ میں سمجھی اس نے آپ کو بتا دیا ہو گا۔" مریم نے سنجیدگی سے کہا۔
ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ "شادی؟"
"جی! آپ سے اجازت نہیں لی تھی، کم از کم آپ کو انفارم تو کر دیتی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا بھی تھا کہ وہ آپ کو بتائے، آپ سے پرمیشن لے، بلکہ پہلے آپ سے اس لڑکے کو ملوائے جس سے شادی کرنے جا رہی ہے۔ مگر میرے سمجھانے کا بھی اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔"
مریم کے لہجے میں تاسف اور رنج تھا جیسے لیزا کی خود سری اور من مانی سے دکھی ہو رہی تھی۔
ان کے چہرے پر یک دم ہی سختی سی آگئی۔ "تم جانتی ہو اس لڑکے کو؟" وہ سخت نگاہوں سے مریم کو دیکھ رہے تھے۔
"نہیں۔ خدا جانے کون ہے، کیسا ہے۔ کیا کرتا ہے، کس ملک کا رہنے والا ہے۔ پتا نہیں مسلمان ہے بھی کہ نہیں۔ میں بالکل بھی نہیں جانتی کہ وہ کس سے شادی کرنے جا رہی ہے۔ میں اسے اتنا سمجھا رہی تھی کہ کم از کم پاپا کو تو....."
"میں کلثوم سے بات کرکے پتا کر لوں گا کہ کون لڑکا ہے۔ تم زیادہ فکر مت کرو۔"
مریم کا تاسف اور پریشانی بھرا جملہ انہوں نے بے حد سختی سے کاٹا۔ ان کے سخت لہجے میں یہ تنبیہہ شامل تھی کہ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتے۔ وہ جانتے تھے، ان کے سخت انداز اور بات کے دم ہی کاٹ دینے پر مریم کا موڈ آف ہو گیا ہے مگر انہوں نے اس کے برا ماننے کی پروا نہیں کی۔ تب ہی عائشہ ہاتھ میں ٹرے لیے وہاں آئی تھیں۔
"ارے مریم آئی ہوئی ہے۔" وہ مریم کو دیکھ کر خوشگوار انداز میں مسکرائیں۔
"السلام علیکم ممی۔" مریم عائشہ کو دیکھتے ہی صوفے سے اٹھی اور ان سے گلے ملی۔ عائشہ نے اس سے ماں کی طرح ہی پیار کیا تھا۔ مریم انہیں ممی کہا کرتی تھی اور عائشہ جو ماں بن نہ سکی تھیں، انہیں اس کا ممی کہنا بے حد اچھا لگتا تھا۔
"کیسی ہو؟ بہت دنوں بعد آئیں؟" عائشہ کے آتے ہی ماحول میں پیدا ہوا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ اب لاؤنج کا ماحول بے حد خوشگوار تھا۔
عائشہ مریم کو اسی طرح اہمیت دے رہی تھیں جیسے میکے آئی شادی شدہ بیٹی کو دی جاتی ہے۔ ان دونوں کی گفتگو کے دوران وہ زیادہ وقت خاموش رہے تھے۔ جہاں کہیں عائشہ یا مریم انہیں بولنے پر اکسائیں۔ وہ تب ہی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ مختصر سا جملہ بول دیتے۔ وہ اس وقت بہت ڈسٹرب تھے۔ کلثوم کے شادی کر لینے کے فیصلے پر نہیں۔ وہ کسی اور بات سے پریشان تھے۔

☼ ☼ ☼

مریم گھر واپس آچکی تھی۔ اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ آتے ہی وہ بے وجہ ملازمین پر چیخی چلائی تھی۔ ہاشم آج صبح ہی دفتری کام سے جاپان گیا تھا۔ دو، تین روز بعد اس کی واپسی متوقع تھی۔ شکر تھا وہ گھر پر نہیں تھا ورنہ اپنا غصہ اور جھنجلاہٹ نکالنے کو وہ اس سے بھی لڑ پڑتی۔
پاپا اس سے اتنی دور کیوں ہو گئے تھے۔ اس کے پاپا آخر اس سے اتنی دور کیوں ہو گئے تھے؟ وہ تو ان کی سب سے لاڈلی تھی، اس میں تو ان کی جان تھی، وہ تو ان کی ام مریم تھی۔ پھر آج وہ اتنی دور کیوں محسوس ہوئے تھے؟ چودہ سال کی عمر میں جب اس سے اس کے پاپا چھنے تھے تب وہ دھاڑیں مار مار کر اکیلے میں روئی تھی۔ ہاں وہ اکیلے میں روئی تھی۔
وہ بہت بہادر لڑکی تھی، وہ ام مریم تھی، وہ کبھی کسی کے سامنے نہیں روئی تھی۔ کوئی دوسرا شخص اس کی ایسی کمزوری بھی نہ تھا کہ وہ اس کے لیے کبھی روتی مگر اپنے باپ سے جدا ہونے پر وہ چلا چلا کر روئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے پاپا کی جان تھی، کیونکہ وہ اپنے پاپا کی سب سے بڑی کمزوری تھی کیونکہ وہ پاپا کی زندگی تھی۔ پاپا نے زندگی میں صرف اور صرف اس سے پیار کیا تھا۔ وہ اپنے پاپا پر جان دیتی تھی۔ مگر چودہ سال کی عمر میں جب پاپا اس سے چھنے تب وہ دوری ایسی دوری ثابت ہوئی کہ آنے والے برسوں میں لاکھ کوششیں کر لینے کے باوجود وہ پھر ان کے اس طرح قریب نہ ہو پائی جیسے بچپن سے لے کر چودہ سال کی عمر تک رہی تھی۔
زمینی فاصلے نے اسے پاپا کے دل سے بھی دور کر دیا تھا۔ وہ اس سے بہت دور ہو گئے تھے۔ پتا نہیں آج وہ اس سے پیار کرتے بھی تھے کہ نہیں؟ وہ آج کتنی مختصر اور کتنی کم بات کیا کرتے تھے اس سے۔ عائشہ کے گفتگو میں شریک ہونے پر چاہے وہ ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو جایا کرتی تھی، مگر اپنے پاپا کی مسلسل خاموشی اسے بہت بری طرح چبھتی تھی، اس کے دل کو دکھاتی تھی۔ پھر اسے اپنا گھر، اپنا شوہر اور اپنی عیش و آرام اور خوشیوں سے بھری زندگی سب کچھ زہر لگتا تھا۔ ہر چیز کو آگ لگا دینے کو دل چاہتا تھا۔
ہاشم سے اسے محبت نہیں تھی، مگر وہ اس کے ساتھ خوش تھی۔ وہ اسے جان دینے کی حد تک چاہتا تھا۔ ہاشم کی حد سے بڑھی محبت اسے فخر اور غرور میں مبتلا کیا کرتی تھی۔ اگرچہ کسی چیز کی کمی نہ تھی ہاشم میں، مگر ہاشم اسد وہ نہ تھا جس پر ام مریم مر مٹ جاتی۔ وہ ہاشم سے محبت نہیں کرتی تھی، مگر اس سے شادی اسے تاحیات نبھانی تھی، اپنے پاپا کا دل خوش کرنے کے لیے۔ اس نے محبت زندگی میں صرف ایک بار کی تھی، صرف ایک بار۔ سکندر شہریار سے۔ نجانے ایسا کیا تھا اس شخص میں، جو وہ بارہ سالوں بعد بھی اس کے حصار سے نکل نہیں سکی تھی۔
وہ نہ اس شخصیت کی محبت اپنے دل سے نکال پائی تھی اور نہ اس کے خود کو ٹھکرانے کی اذیت اور ذلت کبھی بھول پائی تھی۔ اس نے زندگی میں صرف دو ہی لوگوں سے سچی محبت کی تھی، جن پر اس کا خود کو مٹا دینے کو جی چاہا تھا۔ ایک سکندر شہریار اور دوسرے محمود خالد اس کے پاپا، سکندر سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لینے کے باوجود نہ اس کی محبت دل سے ختم ہوئی تھی نہ ہی وہ اسے کبھی بھول پائی تھی۔
تیرہ سال قبل محمود خالد نے اسے اس کی خواہش پر امریکا پڑھنے کے لیے بھجوایا تھا۔ وہ میلان میں دوران تعلیم جس طرح ہر سال باپ کے پاس لندن جایا کرتی تھی، اسی طرح محض ان کا دل خوش کرنے کے لیے ہر سال پاکستان اپنی دادی کے پاس بھی جایا کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کے پاپا کا دل اس سے خوش رہے۔ وہ شکل صورت اور ذہانت میں تھی بھی ان پر اور ان کا دل خوش کرنے کے لیے پڑھتی بھی بہت لگن کے ساتھ رہی تھی۔
اس نے امریکا پڑھنے کے لیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو محمود خالد نے اسے پڑھنے کے لیے امریکا بھجوا دیا تھا۔ باپ کا دل خوش کرنے کے لیے اس نے اپلائی ہی کیلی فورنیا یونیورسٹی میں کیا تھا۔ تاکہ وہاں لاس اینجلس میں وہ اپنے چچا کے پاس رہ سکے۔
اس کے پاپا کو یہ یقین ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق مشرقی اور پاکستانی رسم و رواج کو پسند کرتی ہے۔ اس نے ماں کے رکھے نام سمانتا کو نہیں، باپ کے رکھے نام ام مریم کو چنا تھا۔ جب پاپا سے اس قدر پیار تھا تو ان کے رکھے نام سے کیوں نہ ہوتا؟
بہت سے لوگ اس کے ساتھ اور اس کی محبت کے متمنی و خواہاں رہا کرتے تھے۔ اس نے ہمیشہ مردوں کو

بھنورے کی طرح اپنے گرد منڈلاتے دیکھا تھا۔ وہ سب اس کے لیے وقتی تفریح یا پھر اپنی انا کی تسکین کا سامان رہے تھے۔ سچی محبت تو پتا نہیں اسے کبھی کسی سے ہوئی بھی تھی یا نہیں۔ مگر اتنا طے تھا کہ وہ شادی کسی پاکستانی لڑکے سے کرے گی۔

اس کے پاپا اپنے ملک سے بے تحاشا محبت کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹیاں پاکستانی لڑکوں سے شادی کریں تو وہ اپنے پاپا کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتی تھی۔ یونیورسٹی میں دوران تعلیم اسے زین شہریار ملا تو لگا اس کی تلاش ختم ہو گئی۔ وہ بے وقوفی کی حد تک اس پر فدا ہو چکا تھا۔ اس کے ہلکے سے اشارے کی دیر تھی' وہ کھنچا کھنچا اس کے پیچھے چلا آیا۔

زین کی محبت قبول کرنے کا فیصلہ اس کے دل کا نہیں' دماغ کا فیصلہ تھا۔ وہ ایک بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا' بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا' دولت' جائیداد' روپیہ' اثر و رسوخ کسی چیز کی اس کی فیملی کے پاس کمی نہ تھی۔

جو کچھ اس نے اپنے باپ کے پاس پایا تھا' وہ سب کچھ زین کے ساتھ بھی اسے اسی طرح ملنا تھا۔ پھر زین کی شکل صورت' پرسنالٹی بھی اچھی تھی' وہ اعلا تعلیم حاصل کر رہا تھا' اس کا مستقبل بہت شان دار تھا اور وہ احمق لڑکا اس سے بے تحاشا محبت بھی کرتا تھا۔

زین بری چوائس نہ تھا۔ جب اس نے زین کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا تب اس وقت کے لحاظ سے وہ اس کا بہترین فیصلہ تھا۔ مگر کاش وہ زین سے ملنے سے پہلے سکندر سے مل لی ہوتی۔ کہاں احساس کمتری کا مارا زین شہریار اور کہاں دنیا فتح کر لینے کی طاقت رکھتا سکندر شہریار۔ زین تو اس کے پاسنگ بھی نہ تھا۔

سکندر کو ایک نظر دیکھتے ہی اسے اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا تھا۔ پچھتاوا ہوا تھا۔ باپ کے دل کو خوش کر لینے کے لیے جو اس نے زین کو بہتر آپشن سمجھتے ہوئے ایک سمجھوتا کیا تھا۔

سکندر کو دیکھتے ہی اپنے اس غلط فیصلے پر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ تو وہی تھا جو اس کے لیے بنایا گیا تھا' جو ہو بہو اس کے جیسا تھا۔ جو اس کی طرح آسمان چھو سکتا تھا' جو اسی کی طرح اپنی قابلیت اور ذہانت کے بل پر کچھ بھی حاصل کر سکتا تھا۔ کتنا پر اعتماد تھا وہ۔ زین کی طرح کا کوئی احساس کمتری اس کے اندر نہ تھا۔ ام مریم اور سکندر شہریار' وہ دونوں غیر معمولی صلاحیتیں اور ذہانت رکھتے لوگ ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے تھے۔

زین کیا سوچے گا اور اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ اس کی اسے مطلق پروا نہ تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے محبت ہوئی تھی اور وہ زین شہریار جیسے عام سے لڑکے کے جذبات و احساسات کو مجروح کرنے کے ڈر سے اس محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتی تھی۔

کبھی ایسا ہوا ہی نہ تھا کہ اس نے کسی پر نگاہ ڈالی ہو اور وہ کھنچا کھنچا اس کے پاس چلا نہ آیا ہو۔ مگر مغرور و خود پسند سکندر شہریار نے اسے ٹھکرا دیا۔ اس نے اس کی تذلیل کی اور ام مریم ان لوگوں میں سے نہ تھی جو اپنی تذلیل چپ چاپ برداشت کر لیتے ہوں۔ محبت اپنی جگہ' مگر اپنے ٹھکرائے جانے اور ذلیل و بے عزت کیے جانے کا بدلہ تو اسے سکندر شہریار سے لینا ہی تھا۔

اس وقت اس پر انتقام اس طرح حاوی ہوا تھا کہ اسے لگا تھا سکندر کی محبت اس کے گال پر پڑنے والے اس کے تھپڑ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ہے۔ وہ ذلیل ہوا تھا' وہ رسوا ہوا تھا' وہ بے عزت ہوا تھا' وہ اپنے گھر سے دھکے مار مار کر نکال دیا گیا تھا' اس کے دل کو تسکین پہنچی تھی۔ اسے ٹھکرانے کی کم سے کم سزا بھی سکندر شہریار کو یہی ملنی چاہیے تھی۔ جب وہ ذلیل و بے عزت کر کے اپنے گھر سے نکال دیا گیا تھا تب اس نے بھی فوراً ہی اس گھر سے رخصت ہونے کی تیاری کی تھی۔

جب تک سکندر سے نہ ملی تھی۔ زین کا ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار تھی۔ مگر اب زین جیسے عام سے لڑکے کا ساتھ قبول کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسے سکندر شہریار چاہیے تھا یا پھر اس جیسا کوئی دوسرا۔ منگنی کی انگوٹھی زین کو لوٹاتے ہوئے اس احمق اور بے وقوف لڑکے کے ساتھ تھوڑا سا محبت کا ڈراما کرنا ضروری تھا۔

اس نے آنسو بہاتے ہوئے وہ ڈراما اتنے بھرپور انداز میں کیا تھا کہ زین کو یہ یقین آجائے کہ وہ مجبور' دل گرفتہ ہو کر اسے چھوڑ کے جارہی ہے۔

وہ اس کے گھر سے باہر نکل کر اپنی جذباتی اداکاری اور زین کی محبت اور دکھ بھری باتوں پر ہنسی تھی۔ وہ احمق تو واقعی اس سے جدا ہوتے وقت رو دینے کو تھا۔ وہ بخوبی اس سے پیچھا چھڑا آئی تھی۔

وہ لاس اینجلس واپس جاتی تو زین نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا تھا اسی لیے وہ لاس اینجلس سے اپنا سارا سامان سمیٹ کر اپنے پاپا کے پاس لندن آگئی۔ محمود خالد تو اس کی منگنی میں شریک ہوئے تھے' زین کے ساتھ اس کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہوا تھا مگر لیزا اور عائشہ بھی اس کی منگنی سے واقف تھیں۔

وہ وہاں زین کے بھائی کا ذکر لائی تھی۔ وہ کس طرح کا بدکردار لڑکا تھا اور کس طرح اس نے اس کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی اور زین نے بجائے اپنے بھائی کو قصوروار ٹھہرانے کے اسے ہی الزام دیا تھا۔ زین اور اس کی فیملی اس قابل نہ تھی کہ وہ وہاں رشتہ قائم رکھ پاتی۔ وہ اسی وقت زین کے منہ پر منگنی کی انگوٹھی پھینک آئی تھی۔ وہ اس لیے لاس اینجلس اسی وقت چھوڑ آئی تھی' وہ اسی لیے اب وہاں اپنی پڑھائی جاری نہیں رکھنا چاہتی تھی کہ وہاں کیمپس میں اس کا زین سے آمنا سامنا ہوا کرے گا اور وہ اس جیسے بیچ لڑکے کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔

وہ جانتی تھی اس کے پاپا' لیزا اور عائشہ سب کو اس کی باتوں کا یقین آچکا ہے اور رہ گئے زین کے گھر والے تو سکندر کی اس گھٹیا حرکت کے بعد ان میں سے کسی کی بھی کبھی ہمت نہیں ہوگی کہ اس کے پاپا کو فون کرکے یہ پوچھ سکیں کہ ام مریم' زین سے منگنی کیوں توڑ آئی ہے۔

اس نے واپس اٹلی جانے اور اپنی ادھوری تعلیم وہیں مکمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ماں کو چھوڑے تو اسے عرصہ ہوگیا تھا۔ اسے نہ اپنی ماں سے محبت تھی نہ ہمدردی نہ انسیت۔ اسے ان سے نفرت تھی۔ وہ محبت تو صرف اپنے پاپا سے کرتی تھی۔ مگر اب وہ لندن ان کے پاس بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ برسوں سے آزاد زندگی' اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ باپ کے ساتھ رہنا اور خود کو پابندیوں میں جکڑ لینا اس کے لیے دشوار تھا۔

اس نے باپ پر اپنا جو بہت مشرقی ہونے کا تاثر قائم کر رکھا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان سے دور رہے۔

وہ چاہتی تھی۔ اس کے پاپا ہمیشہ یہی سمجھتے رہیں کہ ان کی بیٹی مشرقی روایات کی پاس دار اور بہت نیک اور پارسا ہے۔ وہ اپنی اٹالین ماں پر نہیں' بلکہ اپنے مسلمان اور پاکستانی باپ پر گئی ہے۔ اٹلی واپس آکر اس نے وہیں تعلیم مکمل کی اور پھر وہیں ملازمت بھی کرلی تھی۔

جب تک محمود خالد لندن میں رہے تھے' وہ ان سے ملنے سال میں دو بار لندن جاتی تھی جب وہ پاکستان شفٹ ہوگئے تب وہ ان سے ملنے وہاں گئی۔ وہاں اسے ہاشم ملا تھا اور ہاشم اسد پہلی ملاقات ہی میں اس پر دل ہار بیٹھا تھا۔

اس کے دل ہار بیٹھنے میں نیا کچھ بھی نہ تھا۔ کب مردوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا' کب اس کی ایک نگاہ التفات کے لیے ذہین سے ذہین مردوں نے احمقانہ حرکتیں نہ کی تھیں جو وہ ہاشم کے خود پر فدا ہو جانے پر چونک جاتی۔ ساری زندگی اسے چاہا ہی گیا تھا' اسے سراہا ہی گیا تھا۔ سوائے اس ایک شخص سکندر شہریار کے' پارسا سے پارسا مرد بھی اسے ایک نگاہ دیکھ کر اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیا کرتا تھا۔

ہاشم سے مل کر اسے سکندر بہت یاد آیا۔ وہ اتنے برسوں بعد بھی کبھی اسے بھول نہیں پائی تھی۔ اور نہ اس کے ٹھکرانے کی اذیت کبھی کم ہو پائی تھی۔ اس نے زندگی میں دو مردوں سے محبت کی تھی' والہانہ اور شدید محبت' جان سے بڑھ کر محبت۔ ایک اس کے پاپا اور دوسرا سکندر شہریار اور یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ وہ دونوں ہی اس سے چھن گئے تھے۔ اس کے پاپا اس سے چودہ سال کی عمر میں چھن گئے تھے پھر وہ ساری عمر

ان کے پیچھے ہی بھاگتی رہی تھی اور سکندر شہریار اسے ٹھکرا کر اس کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ سکندر شہریار تو اسے عمر بھر اب کبھی ملنا نہیں تھا مگر اسے اب اپنے پاپا واپس چاہیے تھے۔

اپنے پاپا کا دل خوش کرنے کے لیے اسے کسی پاکستانی مرد سے شادی کرنی تھی اور پاپا کے قریب رہنے کے لیے پاکستان ہی میں شادی کرنی تھی تو ہاشم اسد ہی کیوں نہیں؟ وہ بہت امیر تھا۔ دولت' جائیداد کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ نہ جانے کتنے ملکوں میں تو اس کے بینک اکاؤنٹ اور پراپرٹی تھی۔ اس کا کاروبار شان دار تھا اور پرسنالٹی بہت باوقار۔ وہ ایک خوب صورت اور وجیہہ مرد تھا۔

وہ زین کی طرح کا احساس کمتری کا مارا شخص بھی نہ تھا۔ وہ پراعتماد تھا' وہ بے حد ہینڈسم تھا' وہ بہت ذہین تھا' دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ بہت شاطر' تیز اور چالاک تھا مگر اس کی محبت میں ڈوب کر وہ اپنی ساری چالاکی اور تیزی بھول کر اس کا غلام سا بن جاتا تھا۔

اس کا واحد نیگیٹو پوائنٹ اس کا شادی شدہ ہونا تھا تو اس نے شادی سے پہلے یہ شرط رکھ دی تھی کہ ہاشم اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ ہاشم نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اپنے بچوں کی خاطر اس نے اسے کہیں اور دوسرا گھر لے کر دے دیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کا خرچا بھیجا کرتا تھا۔ اس عورت اور اس کے بچوں کو عیش و آرام والی زندگی گزارنے کے لیے ہر ماہ پیسے مل تو رہے تھے۔ کافی تھا یہ اس عورت اور اس کے بچوں کے لیے۔

محمود خالد کی کاروباری حوالے سے ہاشم سے دوستی اور واقفیت پہلے سے تھی' مگر ظاہر ہے وہ اس کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے تھے۔

اس نے ہاشم کے ساتھ اپنا افیئر محمود خالد اور عائشہ سے اس وقت تک چھپائے رکھا تھا جب تک ہاشم نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نہ نکال دیا۔ ہاشم کے اس کی بیوی کو طلاق دے دینے کے بعد بھی انہوں نے ایک ڈیڑھ ماہ انتظار کیا تھا۔ ہاشم تو اس کی ہر بات مانتا تھا تو وہ اس انتظار کے لیے راضی ہوگیا تھا۔ ہاشم اس کے کہنے پر محمود خالد سے یہ جھوٹ بولنے کے لیے بھی تیار ہوگیا تھا کہ اس کی بیوی بہت لڑاکا اور بدزبان عورت تھی۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ذہنی ہم آہنگی نہ تھی۔ وہ پھر بھی یہ رشتہ نبھا رہا تھا۔ مگر اس کی بیوی اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ طلاق اس نے خود مانگی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے مطالبے پر اسے طلاق دینے پر مجبور ہوا ہے۔

اکیلے میں مریم نے عائشہ کو یہ تک کہہ دیا تھا کہ ہاشم کی بیوی کا کردار ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ہاشم ہی کے کسی دوست کے ساتھ افیئر چلا رہی تھی۔ اسے یقین تھا' عائشہ یہ بات محمود خالد تک ضرور پہنچائیں گی۔ اس کے پاپا کے اوپر کبھی اس کا کوئی برا امپریشن نہیں پڑنا چاہیے۔ انہیں ہمیشہ ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے تھا کہ ان کی مریم واقعی مریم ہے اور ہاشم کے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی وجہ اس کی بدکرداری اور بدفطرتی ہے۔ ہاشم نے محمود خالد سے اس کا رشتہ مانگا تو اس کی رضامندی پا کر انہوں نے اس رشتے کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔ جب انہوں نے اس سے ہاشم کے رشتے کے متعلق پوچھا تب وہ بہت سچے دل سے ان سے بولی تھی۔

"پاپا! میں شادی کرنا چاہتی ہوں' اس لیے کہ میں آپ کے قریب رہنا چاہتی ہوں۔ ہاشم سے شادی کر لوں گی تو آپ کے پاس کراچی ہی میں رہوں گی۔ ساری زندگی آپ سے دور رہی ہوں پاپا! اب آپ کے نزدیک رہنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ صرف لیزا کا حق تھا کہ وہ آپ کے ساتھ رہے اور مجھ سے چودہ سال کی عمر میں آپ چھن جائیں؟"

☼ ☼ ☼

یہ ورکنگ ڈے تو تھا نہیں سو وہ آفس سے اپنے کام نمٹا کر جلدی اٹھ گیا۔ اسے فلیٹ جانے سے قبل ایک ضروری کام کرنا تھا جو کل وہ کر نہیں پایا تھا۔ اسے لیزا کے لیے انگوٹھی خریدنی تھی۔ اب جب بھی اس سے ملنا تھا اس نے سب سے پہلے اس کی انگلی میں اپنے نام

کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ وہ ڈھائی گھنٹے لگا کر اور کئی دکانوں میں دیکھنے کے بعد وہ ایک خوب صورت انگوٹھی لیزا کے لیے پسند کرپایا تھا۔ اسے وہ انگوٹھی خریدتے ہوئے بے تحاشا خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسا احساس جو اب تک کی زندگی میں کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا موڈ ہنوز خراب تھا۔ وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور چہرے پر گہری سوچ۔ چائے پیتے ہوئے اس نے لیزا کا نمبر ملایا۔ وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر پرسکون سے انداز میں بیٹھی تھی۔ اپنے شاندار کمرے میں جہاں ہر چیز ڈیزائنر تھی، قیمتی ترین تھی اور اس کے ذوق اور مرضی کے مطابق تھی۔ وہاں اس کئی لاکھ روپے کے ڈیزائنر بیڈ پر بیٹھی وہ کوئی ملکہ ہی لگ رہی تھی جو شاہانہ انداز میں اپنی خواب گاہ میں آرام کر رہی ہو۔ لیزا نے اس کا نام دیکھتے ہی پہلی بیل پر کال ریسیو کرلی تھی۔

"کیسی ہو لز؟" اس نے مسکرا کر پیار سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں، ابھی ایگزیبیشن ہی میں ہوں۔ آج تو کل سے بھی زیادہ لوگ آئے ہیں۔" اس نے لیزا کی خوشی سے کھلکھلاتی آواز سنی۔

"واؤ وٹس گریٹ! مزا آرہا ہے؟"

"ہاں، مزا بھی آرہا ہے اور تھوڑا تھک بھی گئی ہوں۔"

"چلو، اب تم لندن جاکر اکٹھا آرام کرنا۔ یہ بتاؤ، پاپا سے تمہاری بات ہوئی؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی میں نے پاپا کو فون نہیں کیا۔ کیوں؟" اس نے لیزا کا حیرانی بھرا انداز محسوس کیا۔

"آج میں نے بتادی ہے پاپا کو تمہاری شادی کی بات۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"پھر؟ کیا بولے وہ؟"

"خوش ہوئے بہت۔ آخر کو پاپا جو چاہتے تھے، انہوں نے ہم دونوں سے وہی کروالیا۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز آیا تھا۔ "انہوں نے مجھے پریشرائز کرکے ہاشم سے شادی پر مجبور کیا تھا اور تم تو خود ہی اپنی خوشی اور مرضی سے انہیں ان کی مرضی کا کام کرکے دے رہی ہو۔ ایسی Satisfaction تھی پاپا کے چہرے پر کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ ساری زندگی انہوں نے اور ممی نے اپنی مرضی کی زندگی گزاری، ہمیں نظرانداز کیے رکھا اور جب ہماری زندگیوں کے اس سب سے بڑے فیصلے کا وقت آیا تو میں نے اور تم نے پاپا کو وہی کر کے دیا جو وہ ہم سے چاہتے تھے۔"

اس کے لہجے میں ایک چھپی ہوئی ناراضی اور برہمی تھی اور اس کے لہجے کی یہ برہمی لیزا نے محسوس کرلی تھی۔

"سیم پلیز، اس طرح تو مت بولو۔ مجھے پتا ہے۔ تم میرے شادی کے فیصلے سے خوش نہیں ہو مگر۔۔۔" وہ اسے منانے والے لہجے میں بول رہی تھی، اس نے لیزا کی بات کاٹ دی۔

"میں تمہارے شادی کرنے پر نہیں، جس سے تم شادی کرنے جارہی ہو، اس پر فکر مند ہوں۔ تمہاری شادی کی مجھ سے زیادہ اور کس کو خوشی ہوسکتی ہے لز! مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔ جو میرے ساتھ ہوا، جو میرے ساتھ ہو رہا ہے، وہ تمہارے ساتھ نہیں ہونا چاہیے لز۔ اپنی زندگی کی بربادی میں سہہ گئی مگر تمہیں۔ کوئی دکھ پہنچا تو میں۔۔۔ نہیں پاؤں گی۔" اس کا لہجہ بے حد جذباتی اور محبت بھرا تھا۔

"تم میرے لیے بالکل بھی پریشان مت ہو سیم۔ سکندر بہت اچھا ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ تم اس سے ملوگی تو کہوگی میں نے تم سے اس کی کم تعریفیں کی تھیں۔" لزا نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو لز۔ اللہ کرے وہ تم سے بہت محبت کرے اور تم ہمیشہ خوش رہو۔" لیزا سے یہ دعائیہ جملے بولتے اور اسے اپنا بہت خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے اس نے فون بند کیا۔

ابھی اس نے فون بند کیا ہی تھا کہ اس کے موبائل پر ہاشم کی کال آگئی۔ اس کے چہرے پر بے زاری آئی تھی۔ وہ یہ چند دن ہاشم کے بغیر کراچی میں سکون سے گزارنا چاہتی تھی آج کل ویسے ہی اس کا موڈ خراب چل رہا تھا۔ ایسے میں ہاشم کے چاؤ چونچلے اسے زہر لگ رہے تھے۔ "ہیلو۔"

"کیا حال ہے میری جان کا؟" ہاشم کا لہجہ سراپا محبت تھا، جان نچھاور کرتا، اس پر فدا ہوتا۔

"ٹھیک نہیں ہوں۔" وہ بے زاری اور غصے سے بولی۔

"کیا ہوا؟ میری حسین بیوی کا موڈ کس نے خراب کردیا؟"

"یہ تمہارے گھر کے نوکر۔ مجال ہے کوئی کام ڈھنگ سے کریں۔"

وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔ وہ اس گھر کی ملکہ تھی اور ہاشم اس کا تابعدار اور غلام۔ وہ اس کی غلامی کرتا، اس پر دل و جان سے نثار ہوتا تو اس کی انا کو بڑی تسکین پہنچتی تھی۔ اس کا مغرور انداز یہ ظاہر کرتا تھا کہ جو محبتیں اور چاہتیں ہاشم اسے دے رہا ہے وہ اس کا حق ہے۔

یہ ام مریم کا حق تھا کہ اسے چاہا جائے، اسے ساری زندگی چاہا جاتا رہے۔ ہاشم کی آواز سنتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس وقت اسے اپنی انا کی یہ تسکین ہی درکار تھی۔ اس کا شوہر اس کا غلام ہے، اس پر جان نچھاور کرتا ہے، وہ اس کی خاطر کچھ بھی کرسکتا ہے اسے یہ یقین دہانی پھر درکار تھی۔

ہاشم اب اسے منانے اور اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے اس کی خاطر کیا کیا کچھ کرے گا وہ جانتی تھی۔ وہ بظاہر منہ بنائے ہاشم کے محبت میں ڈوبے جملے سن رہی تھی۔ وہ اس کے کسی وعدے، کسی عہد، کسی بات سے خوش نہیں ہو رہی تھی اور وہ اسے خوش کرنے کے لیے پتا نہیں مزید کیا کیا وعدے کر رہا تھا اور اندر اس کی زخمی انا کو ہاشم کی غلامی اور تابعداری سے بہت تسکین مل رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شام ڈھل رہی تھی جب وہ لیزا کے لیے انگوٹھی خریدنے کے بعد اپنے فلیٹ واپس آیا۔ وہ راستے بھر یہی سوچتا ہوا آیا تھا کہ اسے آمنہ کو کال کرنی چاہیے۔ اسے اپنی زندگی کے اس انتہائی اہم فیصلے سے اپنی ماں کو آگاہ کرنا چاہیے۔ وہ کہہ نہیں پائی تھیں، مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی امو جان اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھرا اور خوشگوار دیکھنا چاہتی ہیں، وہ جانتا تھا وہ دل سے چاہتی ہیں کہ اب وہ شادی کرلے۔ اسے ماں سے بات کرنے سے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ اس کے شادی کے فیصلے سے بہت خوش ہوں گی۔ وہ گھر کے لینڈ لائن نمبر پر کال نہیں کرتا تھا۔ وہ آمنہ کے موبائل پر انہیں کال کرتا تھا۔

"سکندر! کیسے ہو بیٹا؟" وہ ہمیشہ کی طرح فون پر اس کی آواز سنتے ہی خوشی سے سرشار ہوئی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں امو جان۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے بیٹا! پتا ہے، آج میں تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔"

اور وہ جانتا تھا کہ ماں صرف آج نہیں بلکہ ہر پل اور ہر گھڑی اس کو یاد کیا کرتی ہیں۔ وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ایک پل ان کے درمیان خاموشی رہی تھی۔

"امو جان! میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں شادی کر رہا ہوں۔" اس کی سنجیدگی سے بتائی اس بات کے جواب میں آمنہ کی خوشی بڑی والہانہ اور بے ساختہ تھی۔

"واقعی؟ تم سچ کہہ رہے ہو سکندر؟" انہیں جیسے مارے خوشی کے یقین نہیں آرہا تھا۔

"جی امو جان۔" وہ ان کی خوشی کو محسوس کر رہا تھا۔

"میں بہت خوش ہوں سکندر! تم میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ مجھے بتاؤ ناں بیٹا! کیسی ہے میری ہونے والی بہو؟"

اسے ماں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مارے خوشی کے رو پڑی ہیں۔ شاید انہیں لگتا تھا، وہ ساری زندگی یونہی تنہا گزار دے گا۔

"امو جان! اس کا نام لیزا ہے۔ مجھے روما میں ملی تھی۔ اس کے پاپا پاکستانی اور ممی اٹالین ہیں۔ وہ ایک مشہور آرٹسٹ ہے۔ پینٹنگز بناتی ہے۔ لندن کے ایک کالج میں آرٹ پڑھاتی بھی ہے۔"

وہ انہیں لیزا کے بارے میں بتا رہا تھا۔ لیزا کا نام لیتے ہوئے' اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنے اندر خوشی اور امنگ پیدا ہوتی محسوس کر رہا تھا۔

"دیکھنے میں کیسی ہے؟ میرے بہت ہینڈسم بیٹے کے ساتھ جچے گی ناں؟" وہ جیسے روتے روتے ہنسی تھیں۔ ہنستے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ بھی جواباً ہنسا۔

"وہ بہت خوب صورت ہے امو جان! میں آپ کے موبائل پر اس کی تصویر Send کروں گا' آپ دیکھ لیجیے گا۔"

"بس تصویر send کرو گے؟ مجھے اس سے ملواؤ گے نہیں؟"

انہوں نے رنج اور کرب میں گھر کر سوال کیا تھا۔ اس سوال میں ان کے آنسو اور سسکیاں شامل تھیں۔

"امو جان!" وہ کیا کہے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"سکندر! میں اپنی ہونے والی بہو کو دیکھنا چاہتی ہوں میں تمہاری دلہن کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے ایک بار تو آکر مل جاؤ بیٹا۔ میری بہو کو تو مجھ سے ملا دو۔ میں تمہیں اس کے ساتھ خوش اور مسکراتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ کمپیوٹر یا موبائل پر نہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے' اپنے بے حد نزدیک۔" وہ روتے ہوئے جیسے اس سے التجا کر رہی تھیں۔

"امو جان! آپ پلیز' اس طرح مت روئیں۔ آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ وہ ماں کے دل کو کیسے تسلی دے۔ ایسا کیا کرے کہ ماں مسکرا دے' خوش ہو جائے۔

"تم گھر پر نہیں آنا چاہتے ناں' مت آؤ۔ مگر تم کراچی تو آؤ۔ تم کراچی آکر جہاں کہو گے' میں خود تم سے اور اپنی بہو سے وہاں آکر مل لوں گی۔ میں تم دونوں کو گلے لگا کر پیار کرنا چاہتی ہوں' دعائیں دینا چاہتی ہوں۔ تمہیں تمہاری ہونے والی دلہن کے ساتھ جی بھر کر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"امو جان آپ.....!" وہ ماں کے آنسوؤں سے ایسا بے بس سا ہو رہا تھا کہ صاف انکار کرنے کی جرأت خود میں نہیں پا رہا تھا۔

"کیا تمہیں بھی مجھ پر رحم نہیں آتا بیٹا؟ میں نے بارہ سالوں سے تمہیں اپنے سینے سے نہیں لگایا۔ میں تمہیں جی بھر کر دیکھنے اور پیار کرنے کو ترس رہی ہوں میری جان' ایک بار تو آکر ماں سے مل لو بیٹا۔ کیا میرے مرنے پر ہی آؤ گے' میری زندگی میں نہیں؟" وہ بلک بلک کر یوں رو پڑی تھیں جیسے تمام حوصلے اور ہمت ہار بیٹھی ہوں۔

"خدا نخواستہ امو جان! پلیز ایسی باتیں مت کریں۔ ٹھیک ہے جیسی آپ کی خوشی میں ویسا ہی کروں گا۔ میں پاکستان آ رہا ہوں آپ کی بہو کو آپ سے ملوانے۔"

اس کا دل ماں کی آہوں اور آنسوؤں سے ایسا بے چین ہوا کہ وہ ان سے آنے کا وعدہ کیے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"واقعی؟ تم سچ کہہ رہے ہو سکندر؟ مجھے بہلا تو نہیں رہے؟" وہ خوشی اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں بولیں۔

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں امو جان۔" مسکرا کر انہیں یقین دلاتے دلاتے وہ یک دم ہی رکا تھا۔ وہ یک دم ہی سنجیدہ ہوا تھا' بے حد سنجیدہ۔

"مگر میری آپ سے ایک ریکویسٹ ہے امو جان! میں آپ سے ملنے کراچی آؤں گا تو آپ مجھے گھر آنے کے لیے مجبور نہیں کریں گی۔ آپ کو انکار کرتے ہوئے مجھے بہت تکلیف ہو گی امو جان! مگر میں وہاں نہیں آ سکتا۔"

وہ ماں کے جذبات کے آگے ہار مان گیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

"مجھے پتا ہے بیٹا! میں یہ بات جانتی ہوں۔ میں تمہیں ایسی کسی بات کے لیے کبھی مجبور نہیں کروں گی۔ جس سے تمہیں تکلیف پہنچے۔"

وہ جانتا تھا' ماں اس پل اس سے ملنے کے لیے خوش ہوتے ہوتے کچھ یاد آ جانے پر پھر اداس ہو گئی تھیں۔ جیسے چند لمحوں کے لیے بھولی یہ بات کہ خوشیاں ان کے اور ان کے اس بہادر بیٹے کے لیے نہیں ہیں' انہیں یک دم ہی پھر یاد آ گئی تھی۔ ماں سے بہت جلد ملنے کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کیا۔ وہ بہت دیر تک ایک ہی جگہ' ایک ہی زاویے سے بیٹھا ماں کو سوچتا رہا تھا۔ ان کے آنسو اپنے دل پر گرتے محسوس کرتا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ اپنے جذبات پر قابو پا سکا تب اسے یہ یاد آیا کہ اس نے ماں سے پاکستان ان کے پاس آنے کا وعدہ کیا ہے اور اس وعدے کے ساتھ ہی اسے لیزا کا خیال آیا۔ وہ اس سے پوچھے بنا امو جان سے وعدہ کر بیٹھا تھا۔ فلورنس سے لیزا کو لندن جانا ہے۔ اس کی چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں' اسے اپنا کالج دوبارہ جوائن کرنا ہے۔ پتا نہیں پاکستان جانا اس کے لیے ممکن ہو بھی سکے گا کہ نہیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ لیزا کے اپنے پاپا کے ساتھ خوشگوار تعلقات نہیں ہیں۔ وہ پچھلے پانچ سالوں سے ان کے بلانے پر بھی پاکستان نہیں گئی ہے۔ تو کیا اب اس کے کہنے پر وہ وہاں جانے کے لیے راضی ہو جائے گی؟ اگر لیزا نے اس کے ساتھ پاکستان چلنے سے انکار کر دیا پھر؟

وہ عجیب سی الجھن اور پریشانی میں مبتلا تھا۔ اسی لیے بجائے فوراً ہی اسے فون کرنے کے وہ کچن میں آ گیا۔ وقتی طور پر اس پریشانی سے خود کو بچانے کے لیے وہ اپنے لیے کھانا بنانے لگا تھا۔

اسے ماں سے وعدہ کرنے سے پہلے لیزا سے تو پوچھ لینا چاہیے تھا۔ اب اگر اس نے انکار کر دیا تو وہ امو جان کو کیا جواب دے گا؟ وہ بے دلی سے فریزر میں سے فروزن چکن کبابوں کا پیکٹ نکال رہا تھا۔ اسی وقت اس کے موبائل پر لیزا کی کال آئی تھی۔ اس نے میز پر سے فوراً موبائل اٹھایا۔

"کیا کر رہے ہو؟" اس نے لیزا کی کھنکتی ہوئی آواز سنی۔

"کھانا بنا رہا ہوں اپنے لیے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیا بنا رہے ہو؟"

"فی الحال گروسری شاپ سے خرید کر لایا کبابوں کا پیکٹ کھول رہا ہوں۔ بریڈ یا رول کے ساتھ انہیں کھا لوں گا۔ ویسے میں ککنگ کر لیتا ہوں۔" وہ پیکٹ کھولتے ہوئے بولا۔

"چلو یہ اچھا ہے تم ککنگ کر لیتے ہو' بعد میں ہمیں سہولت رہے گی۔" وہ اپنے اسی ہنستے مسکراتے موڈ میں تھی۔

"ہاں' بڑی آسانی رہے گی۔ تم پینٹنگز بناتی رہا کرنا اور میں آفس سے آکر تمہارے اور اپنے لیے ڈنر تیار کر لیا کروں گا۔"

لیزا کے لہجے کا ساتھ دیتے ہوئے اس نے گویا اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا! زیادہ دل مت جلاؤ اپنا۔ میں بہت اچھی مشرقی بیوی بنوں گی تمہاری۔ نینی بڑا اچھا نقشہ کھینچتی ہیں پاکستانی بیویوں کا۔ میں تمہاری فرماں بردار ٹائپ پاکستانی بیوی بنوں گی۔ خوب خدمت کروں گی تمہاری۔"

وہ ساری الجھن بھلا کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ لیزا کا انداز تھا ہی اتنا دلچسپ سا۔

"تم یقیناً بہت اچھی بیوی ثابت ہو گی' مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں۔ دعا کرو' میں تمہارے لیے ویسا ثابت ہو سکوں جیسا تم نے مجھے سمجھا ہے۔ کاش میں تمہیں کبھی مایوس نہ کروں۔"

ہنستے ہنستے وہ یک دم ہی سنجیدہ ہوا۔ اس کے لہجے میں اداسی تھی جیسے اس کے دل میں یہ خدشہ ہو کہ وہ بحیثیت شوہر لیزا کی امیدوں پر پورا نہیں اتر پائے گا۔

"خدا کے لیے سکندر! اب پھر ہی فضول باتیں مت شروع کر دینا کہ میں اپنے اس جذباتی فیصلے پر پچھتاؤں گی اور یہ کہ مجھے تم سے شادی کے فیصلے پر ایک بار پھر غور و فکر کر لینا چاہیے۔"

لیزا نے جیسے بری طرح چڑ کر باقاعدہ اس کی منت کی۔
وہ جواباً" خاموش رہا۔ وہ پیکٹ کھول کر یونہی میز کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ کچھ بھر کی خاموشی کے بعد لیزا اس سے پوچھنے لگی۔
"تم نے کیا سوچا؟ ہم شادی کب اور کہاں کر رہے ہیں؟"
"لیزا! میری امو جان ....." وہ ایک پل کے لیے ہچکچا کر چپ ہوا۔
لیزا کی محبت کا یقین ہونے کے باوجود وہ اپنے اندر گھری مایوسیوں کے سبب فورا" بول نہیں پایا تھا۔ نجانے کیسا یہ احساس اس کے اندر سرایت کر چکا تھا کہ وہ ان چاہا اور Un wanted ہے۔ اس کے لیے کوئی بھی کبھی کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اس لائق ہی نہیں ہے۔
"وہ بہت بیمار رہتی ہیں۔ وہ کینسر پیشنٹ رہ چکی ہیں۔ گو ان کی بیماری کا ابتدائی اسٹیج پر ہی علاج کیا جا چکا ہے، مگر وہ ابھی بھی میڈیسنز پر رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے۔ میں تمہیں ان سے ملوانے پاکستان لے کر آؤں۔ وہ اتنی بیمار رہتی ہیں لیزا! میں انہیں انکار نہیں کر پایا۔"
"سکندر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ تم کس انداز میں مجھ سے بات کر رہے ہو؟" اس نے لیزا کی ناراضی بھری آواز سنی۔
"تمہاری اپنے پاپا کے ساتھ ناراضی ہے ناں لیزا! تم ان کی وجہ سے پاکستان نہیں جانا چاہتیں۔ میں اس وجہ سے....."
اس کا وضاحتی جملہ لیزا نے فورا" قدرے خفگی سے کاٹ دیا۔ "حد کرتے ہو تم سکندر! تمہاری امو جان اتنی بیمار ہیں، تمہیں ان سے ملنے ضرور جانا چاہیے۔ میری پاپا سے ناراضی ہے، مگر اتنی بھی نہیں کہ میں تمہاری امو جان کے بلانے پر پاکستان نہ جا سکوں۔ ہم پاکستان جا رہے ہیں سکندر!"
وہ لڑکی سر تا پا اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اس کی محبت کے احساس میں گھرا خوشی سے سرشار سا کھڑا تھا۔
"تھینکس لیزا! تم نے میری پریشانی دور کر دی۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے فون پر امو جان سے یہ وعدہ کر بیٹھا تھا کہ ان کی ہونے والی بہو کو ان سے ملوانے پاکستان لاؤں گا۔ فون رکھنے کے بعد مجھے تمہارا خیال آیا کہ پتا نہیں، تم پاکستان جانا چاہو گی بھی یا نہیں۔"
"آج برداشت کر لیے ہیں میں نے تمہارے یہ فارمل جملے۔ آئندہ نہیں کروں گی۔ میں تمہاری کوئی کولیگ ہوں جسے تم اس قدر پر تکلف تھینکس بولو گے؟ تم مجھے آج فون کر کے کہتے لیزا! کسی بھی طرح کل کی فلائیٹ سے دوبئی آجاؤ، پرسوں ہم نے کراچی جانا ہے۔ میں تم سے بغیر کچھ پوچھے چل پڑتی۔ تمہارے سپرد میں نے اپنی پوری زندگی کر دی ہے سکندر!"
وہ کچھ خفگی اور کچھ اپنائیت سے بولی۔ وہ بے ساختہ مسکرایا۔ وہ اس سے بہت پیار کرتی ہے، وہ جانتا تھا۔ وہ اس سے والہانہ محبت کرتی ہے اس کے دل کو معلوم تھا۔
"دعا کرو لیزا! میں تمہاری اس محبت کی قدر کر پاؤں۔ پتا نہیں کیوں ایک ڈر سا ہے میرے اندر۔ کچھ برا ہو جانے کا۔ جب تک تمہیں سمجھ رہا تھا اس رشتے کے لیے منع کر رہا تھا تب تک خود کو بھی سمجھا لیا تھا کہ تم میرے لیے نہیں ہو۔ مگر اب تمہارے لیے میرا دل ضدی بچے کا سا ہو رہا ہے۔ اب مجھے میری زندگی میں لیزا محمود چاہیے۔ چاہے میں شادی کے بعد اسے مایوس کروں گا، خفا کروں گا یا وہ مجھ سے شادی کر کے پچھتائے گی، مگر اب وہ مجھے میری زندگی میں ہر حال میں چاہیے۔"
وہ خود کو، اپنے دل، اپنی سوچوں، اپنے اندیشوں کو اس پر اس طرح عیاں کر رہا تھا جیسے خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔
"تم مجھے نہ خفا کرو گے نہ مایوس۔ تم مجھے بہت پیار کرو گے، میں جانتی ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ، تمہارا ڈنر تیار ہو گیا؟"
لیزا کے پوچھنے پر اسے کھانے کا دھیان آیا۔

"نہیں! ابھی نہیں ہوا۔" وہ مائیکرو ویو کی طرف آیا۔
"بس پھر اب تم جلدی سے کھانا تیار کرو، سکون سے کھانا کھاؤ۔ مزے دار سی کافی پیو اور ریلیکس کرو۔ ہم کل صبح بات کر کے پاکستان جانے کا پروگرام فائنل کر لیں گے۔"
"کل صبح نہیں، آج رات۔ تم مجھ سے رات میں سونے سے پہلے بات کرنا پلیز۔"
"ٹھیک ہے مگر ایک شرط پر۔"
"بولو۔"
"تم مجھے Bella (بیلا) کہو۔ تم یہ کہتے ہو تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"
لیزا کی مسکراتی آواز سن کر وہ بھی مسکرا دیا تھا۔
"Bella! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔"
"دل خوش کر دیا آپ نے سینئر سکندر! میں نے جو مانگا، آپ نے مجھے اس سے بھی بڑھ کر خوب صورت بات بول دی۔"

☆ ☆ ☆

وہ اپنے ہوٹل روم میں تھی اور اپنے پاپا کو فون ملا رہی تھی۔ سکندر سے بات کرنے کے بعد اب جب کہ یہ طے ہو چکا تھا کہ وہ دونوں پاکستان جا رہے ہیں تو اسے سب کچھ اپنے پاپا کو بھی بتانا تھا۔ اس نے واپس لندن جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ کل اس کی ایگزیبیشن کا آخری دن تھا اور اس نے کل رات ہی واپس روم چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
وہاں سے دوبئی اور پھر کراچی جانے کی تمام تیاری ہو جانے کے بعد اس کو پہلی فلائیٹ سے سکندر کے پاس دوبئی چلے جانا تھا۔ لندن تو ویسے بھی اس کو اب سب کچھ وائنڈ اپ کرنے ہی جانا تھا۔ ظاہر ہے اپنی جاب اس کو صحیح طریقے سے نوٹس پیریڈ پورا کرنے کے بعد چھوڑنی تھی اور لندن میں اپنے فلیٹ اور دیگر تمام معاملات کو نمٹانا تھا۔ اپنے دوستوں اور کولیگز سے اچھی طرح مل کر انہیں الوداع کہنا تھا اور اس سب میں اسے کچھ وقت تو لگنا تھا۔
ابھی وہ سکندر کے ساتھ پاکستان ہو آئے، پھر لندن چلی جائے گی۔ فی الحال اس نے لندن اپنے کالج کے ڈین کو فون کر کے اپنی چھٹیاں بڑھوالی تھیں۔ ساتھ ہی اس نے ان کے کان میں یہ بات بھی ڈال دی تھی کہ وہ شادی کر رہی ہے اور جب واپس کالج جوائن کرے گی تو استعفے کے ساتھ اپنا نوٹس پیریڈ پورا کرنے کے لیے کرے گی۔
اس کے ذہن میں مسلسل سکندر کی باتیں گونج رہی تھیں، اس کا دکھ بھرا لہجہ گونج رہا تھا۔ آخر کتنا مایوس کیا تھا اسے لوگوں اور رشتوں نے، جو وہ رشتوں سے اس قدر ڈرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہتا تھا مگر وہ اس طرح سے ڈرا ہوا تھا جیسے اسے خوف ہو کہ جس طرح باقی تمام لوگوں اور رشتوں نے اسے دکھ دیے تھے، دھوکا دیا تھا ایسے ہی وہ بھی کرے گی۔
محمود خالد کی کال مل گئی تھی۔ اس نے سکندر سے دھیان ہٹا کر اپنے پاپا پر دھیان مرکوز کیا۔ وہ اس کی کال ریسیو کر چکے تھے۔
"میں ابھی تم ہی کو یاد کر رہا تھا بیٹا۔ سوچ رہا تھا تمہیں فون کروں۔ آج مریم آئی تھی۔ بتایا اس نے مجھے تمہارے شادی کے Decision (فیصلہ) کے بارے میں۔"
ان کے لہجے میں اس بات کی ذرا سی بھی ناراضی یا خفگی شامل نہیں تھی کہ اس نے اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ ان کے مشورے کے بغیر کیسے کر لیا۔ ان کے لہجے میں ایک فکر شامل تھی، مگر ناراضی ہرگز نہیں تھی۔
"میں نے آپ کو یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے پاپا!"
جو بھی تھا، وہ اس کے باپ تھے۔ اسے دل میں تھوڑی شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ جو انہوں نے کیا۔ وہ ان کا فعل تھا۔ جو وہ کر رہی ہے، وہ اس کا ظرف ہے۔
"وہ کون ہے کلثوم؟ مجھے کچھ بتاؤ اس کے بارے میں؟"
کیا وہ اس سے یہ سننا چاہ رہے تھے کہ وہ پاکستانی آدمی

سے شادی کر رہی ہے یا نہیں یا حقیقت میں اس کی فکر اور محبت میں یہ سوال کیا تھا؟

"وہ لائر ہے پاپا! وہاں میں رہتا ہے۔ ایک ملٹی نیشنل میں لیگل ایڈوائزر ہے۔" سکندر کے مسلمان اور پاکستانی ہونے کا بتائے بغیر اس نے انہیں بتایا۔

"عادت کا کیسا ہے؟ میری حساس اور نازک بیٹی کا خیال تو رکھے گا ناں؟" انہوں نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس کے ساتھ پاکستان آ رہی ہوں پاپا۔ آپ اس سے خود مل لیجیے گا۔" وہ سنجیدگی سے اور بہت رسمی سے انداز میں بولی مگر جواب میں ان کی خوشی والہانہ' بے ساختہ اور بہت سچی تھی۔

"تم پاکستان آ رہی ہو کلثوم؟" وہ اسے کلثوم کہتے تھے' یہ ان کی ضد تھی۔ جو نام انہوں نے اس کا رکھا چاہے وہ اسے قبول نہیں کرتی' مگر وہ اسے اس سے پکاریں گے۔ سیم کے ساتھ انہوں نے ہر معاملے میں زبردستی کی تھی۔ اس کے پسندیدہ نام سمانتا کے بجائے ہر جگہ اس کا نام ام مریم لکھوایا تھا مگر اس پر وہ اپنی مرضی مسلط نہیں کر پائے تھے۔ تو زبانی اسے کلثوم پکار کر لیزا نام سے نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔

سکندر کا تعلق پاکستان سے تھا تو کیا ہوا' وہ یہ شادی کر تو اپنی مرضی سے رہی ہے۔

اس نے سیم کی طرح پاپا کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اس کی زندگی کے تمام فیصلے خود کرتے پھریں۔ وہ تلخی سے سوچ رہی تھی۔

"جی میں پاکستان آ رہی ہوں پاپا..... سکندر کے پیرنٹس کراچی میں رہتے ہیں اور وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں' اس لیے میں سکندر کے ساتھ شاید اگلے ہفتے تک کراچی آ جاؤں۔"

اس کے اندر تلخی ابھری تو اس نے فوراً" ہی باپ کو یہ جواب دیا' گویا درپردہ انہیں یہ بتانا چاہا کہ وہ سکندر کو ان سے ملوانے پاکستان نہیں لا رہی بلکہ سکندر کی فیملی سے ملنے اس کی خاطر پاکستان آ رہی ہے۔ مگر محمود خالد اپنے جیسے ابن نے کبھی بھی خفا نہ ہونے کی قسم کھا رکھی

تھی۔ وہ بجائے اس کی بات محسوس کرنے کے' برا ماننے کے' بہت شوق اور خوشی سے پوچھنے لگے۔

"سکندر نام ہے اس کا؟"

"جی!" وہ ان کے لہجے میں شامل محبت پہ پل بھر کے لیے شرمندہ ہو کر بالکل چپ ہو گئی تھی۔ انہوں نے سکندر کا نام بے حد محبت سے لیا تھا۔ جیسے جو ان کی بیٹی کو اچھا لگا تھا انہیں وہ بغیر ملے ہی اچھا لگ گیا تھا۔

"اب یہ ایک ہفتہ کیسے گزرے گا بیٹا! میں تو آج سے ہی دن کیا گھنٹے گننے شروع کر دوں گا تم سے اور سکندر سے ملنے کے لیے۔"

ان کا لہجہ باپ کی شفقت اور محبت سے لبریز تھا۔ وہ جواب میں خاموش رہی تھی۔ کیا وہ سکندر کے پاکستانی اور مسلمان ہونے پر خوش ہو رہے تھے یا اس لیے خوش تھے کہ وہ خوش تھی؟

"تم سے ایک بات کہوں کلثوم؟" وہ کچھ کہتے کہتے ہچکچا کر چپ ہوئے۔

"جی پاپا؟"

"مجھے پتا ہے بیٹا! تم میں اور مریم میں بہت پیار ہے۔ تم کراچی آ کر غالباً" اس کے پاس رکنا چاہو گی۔ میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا مگر میرا مشورہ ہے' تم یہاں آ کر میرے پاس رکو۔ باپ کا گھر ہوتے ہوئے تم بہن بہنوئی کے پاس ٹھہرو گی تو تمہارے ہونے والے سسرالی کیا سوچیں گے؟"

ان کا لہجہ التجائیہ سا تھا۔ جیسے وہ شدت سے چاہتے تھے کہ وہ سیم کے پاس نہیں' ان کے پاس ٹھہرے' مگر اس کی ضد سے ڈر کر نرمی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر رہے ہیں۔

وہ باپ کے التجائیہ لہجے پر شرمسار سی ہوئی تھی۔ ابھی تک اس نے یہ سوچا نہیں تھا کہ وہ کراچی جا کر کہاں ٹھہرے گی یا شاید اندر ہی اندر یہ طے تھا کہ اسے سیم کے پاس ٹھہرنا ہے' اس لیے کچھ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن اگر اس کے پاپا کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان کے پاس ٹھہرے تو ٹھیک ہے۔ سکندر بھی تو اپنے گھر والوں سے ناراضی کے باوجود اپنی

ملنے جا رہا ہے تو کیا وہ چند دنوں کے لیے باپ کا دل خوش کرنے کو ان کے پاس نہیں رک سکتی۔ آگے کون سا اسے ان کے پاس کراچی میں رہنا ہے۔ چند دن گزار کر تو وہ اور سکندر واپس آ جائیں گے۔

"ٹھیک ہے پاپا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"جیتی رہو جان پاپا! دل خوش کر دیا تم نے اپنے آنے کا بتا کر۔ بس اب جلدی سے آ جاؤ۔ میں تمہاری اور سکندر کی راہ دیکھ رہا ہوں۔" ان کا لہجہ محبت اور چاہت سے بھرپور تو تھا ہی' مگر نجانے کیوں اسے رندھا ہوا سا بھی لگا۔

کیا اس کے پاپا رو رہے تھے؟ نہیں' مرد تو نہیں رویا کرتے اور اس کے پاپا تو ایک انتہائی سخت' سرد مزاج اور غیر جذباتی سے آدمی ہیں' وہ بھلا کیوں روئیں گے؟

انہیں خدا حافظ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ بیڈ پر بالکل چپ چاپ اور گم صم سی لیٹی تھی۔ اس کے کانوں میں باپ کا رندھا لہجہ ابھی بھی گونج رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نورہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو وہاں صوفے پر آمنہ بیٹھی نظر آئیں۔ کسی گہری سوچ میں گم۔ گہری سوچ میں گم اور اداس تو وہ ہر وقت رہا کرتی تھیں اس وقت مختلف بات یہ تھی کہ وہ اداس نہیں تھیں۔ وہ کچھ سوچ رہی تھیں اور ان کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

نورہ ان کی مسکراہٹ کو بغور دیکھتی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

انہوں نے نورہ کا آنا اور اپنے پاس بیٹھ جانا محسوس ہی نہ کیا تھا۔ وہ اس وقت یہاں تھیں کب؟ وہ اس وقت اپنے سکندر کے پاس تھیں۔ وہ اسے اور اپنی ہونے والی بہو کو سوچ رہی تھیں۔ اپنے سکندر کی دلہن کو سوچ رہی تھیں۔ جو ان کے بیٹے کو پیاری تھی انہیں تو وہ بغیر ملے' بغیر دیکھے ہی بہت پیاری ہو گئی تھی۔

"کیا بات ہے امو جان؟" نورہ نے مسکرا کر پیار [illegible]

سے پوچھا۔

"ہاں۔" انہوں نے خیالوں سے چونک کر نورہ کو دیکھا۔ "کیا ہوا بیٹا؟"

"میں یہ پوچھ رہی تھی امو جان کہ آپ کچھ کھوئی کھوئی لگ رہی ہیں اور کسی بات پر بہت خوش بھی ہیں۔" نورہ نے مسکرا کر ان سے پوچھا۔

"بات خوشی ہی کی پتا چلی ہے ناں۔ کل میری سکندر سے بات ہوئی تھی۔ وہ شادی کر رہا ہے۔"

وہ جیسے اس اتنی بڑی خوشی کو شیئر کیے بغیر رہ نہیں سکی تھیں۔ اسی وقت لاؤنج کے دروازے پر شہریار خان آئے تھے۔ وہ باہر لان میں علی کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اب کھیل ختم کر کے انہوں نے اندر کا رخ کیا تھا۔ نورہ اور آمنہ نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ ان دونوں کی ان کی طرف پشت تھی۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" نورہ نے آمنہ کی بات پر بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں بہت خوشی کی بات ہے۔ زندگی میں خوشیوں پر اب میرے سکندر سے زیادہ اور کسی کا حق نہیں۔ میں نے سکندر سے کہا ہے' وہ میری ہونے والی بہو کو لے کر کراچی مجھ سے ملوانے لائے۔ جسے میرے بیٹے نے زندگی کی ساتھی کے طور پر چنا ہے' میں اسے جی بھر کر دیکھوں گی' پیار کروں گی اور اس سے یہ بھی کہوں گی کہ میرے بیٹے نے زندگی میں بڑی سختیاں کاٹی ہیں' بڑی آزمائشیں برداشت کی ہیں۔ اب تم اسے اتنا پیار دو کہ وہ....."

بولتے ہوئے آمنہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں' وہ بھرائے لہجے میں بول رہی تھیں' آنسو ان کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ ابھی ان کا جملہ پورا ہو بھی نہیں پایا تھا کہ شہریار خان کے پیچھے بھاگتا دوڑتا علی بھی اندر داخل ہوا۔ الٹی کر کے کیپ لگائے' ہاتھ میں چھوٹا سا بیٹ اور بال پکڑے۔

"ماما! میں نے دادا جان کو ہرا دیا۔" علی بھاگتا ہوا ان لوگوں کے پاس آ رہا تھا۔ نورہ اور آمنہ نے فوراً" ہی گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ان دونوں ہی

کی نگاہیں علی پر نہیں' شہریار خان پر جا کر ٹھہری تھیں۔

آمنہ کے لب یک دم ہی یوں پیوست ہوئے تھے جیسے وہ کوئی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہوں۔ سکندر کی بات کرنا تو کیا' وہ شہریار خان اور زین کے سامنے کبھی بھولے سے اس کا نام تک نہیں لیا کرتی تھیں۔ کجا کہ آج وہ سکندر کی بات کرتے' اسے یاد کرکے آنسو بہاتے دیکھ لی گئی تھیں۔ وہ فورا" ہی گھبرا کر اپنے آنسو صاف کرنے لگی تھیں۔

"دادی جان رو رہی ہیں؟" علی ان کے پاس حیران پریشان سا آیا۔

"نہیں میری جان۔" انہوں نے علی کو گود میں بٹھا کر پیار کیا۔ نویرہ نے قدرے گھبرائی ہوئی ایک نظر آمنہ کو اور پھر سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑے شہریار خان کو دیکھا۔

"آیئے ناں پاپا! علی نے کتنا تھکایا آپ کو؟"

اس نے فورا" ہی صورت حال کو سنبھال کر اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔ شہریار صوفے پر ان لوگوں کے نزدیک آ گئے تھے۔

"تھکن وکن نہیں ہوئی۔ ہم دادا پوتے نے خوب انجوائے کیا ہے۔ آج تو دادا نے علی کو ہرایا بھی ہے۔"

صوفے پر بیٹھتے ہوئے شہریار خان گویا علی کو چھیڑ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر لمحہ بھر پہلے کی کسی بات کا کوئی تاثر موجود نہیں تھا۔ وہ پرسکون اور کمپوزڈ تھے' جیسے ہمیشہ ہوا کرتے تھے۔ علی فورا" ناراضی سے انہیں دیکھتا بولا۔

"جی نہیں! دادا جان ہارے ہیں' میں جیتا ہوں۔"

آمنہ' علی اور شہریار خان کی نوک جھونک پر پھیکے سے انداز میں مسکرائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"لیزا پاکستان آ رہی ہے۔ یہ تو بہت خوشی کی بات بتائی آپ نے۔"

کھانے کی میز پر وہ اور عائشہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے عائشہ کو لیزا کے شادی کے فیصلے اور پاکستان آنے کا بتایا تھا۔

"ہاں الحمد اللہ۔ میرا دل بڑا مطمئن ہے۔ ابھی ملا نہیں ہوں اس لڑکے سے مگر چونکہ یہ کلثوم کا اپنا اکیلی کا فیصلہ ہے' اس لیے مجھے یقین ہے اس نے کسی غلط شخص کا انتخاب نہیں کیا ہوگا۔ اگر کسی کے influence (اثر) میں آ کر اس نے یہ فیصلہ کیا ہوتا تو میں یقینا" پریشان ہوتا۔ میں کلثوم کے لیے بہت فکر مند بھی اسی لیے رہتا تھا کہ مجھ سے ناراضی اور میری ضد میں آ کر جس طرح وہ پچھلے پانچ سالوں سے لندن میں اکیلی رہ کر خود کو نقصان پہنچا رہی تھی' کہیں میری ضد میں وہ کسی غلط جگہ شادی کرنے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔"

وہ خاصے مطمئن اور خوش نظر آ رہے تھے۔ مگر ان کے چہرے پر ابھی بھی کسی بات کی ٹینشن تھی۔ عائشہ ان سے محبت کرتی تھیں' وہ ایک اچھی شریک حیات اور ان کے دکھ درد کی ساتھی تھیں' مگر بہت سی باتیں ایسی تھیں' جو وہ عائشہ سے بھی شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عائشہ سے کچھ کہنا چاہتے تھے' مگر کہنے کے لیے مناسب لفظوں کا انتخاب کر رہے تھے۔

انہوں نے سر جھکا کر اپنی پلیٹ میں چاول ڈالے اور چند نوالے چاولوں کے کھائے بھی تھے۔ یہ چند لمحے سوچنے کے لیے لینے کے بعد انہوں نے عائشہ کو دیکھا۔

"تمہاری مریم سے بات ہو تو اسے کلثوم کے پاکستان آنے کا مت بتانا۔" ان کا انداز سنجیدہ تھا۔

"کیوں؟" عائشہ نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

"اچھا ہے ناں' کلثوم اچانک آ کر اسے سرپرائز دے گی۔" انہوں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

عائشہ جوابا" مسکرائی تھیں۔ "ٹھیک ہے میں نہیں بتاؤں گی۔ مگر ان دونوں بہنوں میں پیار اور دوستی اس قدر ہے' دیکھ لیجیے گا لیزا خود اسے بتا دے گی۔"

"ہاں! کلثوم' مریم سے بہت محبت کرتی ہے۔" انہوں نے ایک تھکی ہوئی سی سانس لے کر گلاس میں پینے کے لیے پانی ڈالا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا سولو شو کامیابی سے ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ فلورنس سے واپسی کی تیاری کر رہی تھی۔ اپنا سامان پیک کرتے ہوئے اس نے سیم کا نمبر ملایا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ لندن نہیں جا رہی' واپس روم جا رہی ہے۔ کیونکہ اگلے ہفتے کسی روز وہ پاکستان آ رہی ہے۔ سیم نے اس کی کال ریسیو کی تو ہائے ہیلو کے بعد اس نے اسے اگلی بات یہی بتائی تھی۔

"کیا ضرورت پڑی ہے تمہیں پاکستان آنے کی لز؟ شادی کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو روم یا دوہا کہیں بھی شادی رکھ لو۔ تم جہاں کہو گی ہمیں تمہاری شادی اٹینڈ کرنے وہاں آ جاؤں گی۔" وہ فورا" ہی سنجیدگی اور محبت سے بولی۔

"میرا آنا ضروری ہے سیم۔"

"میرا مشورہ ہے' تم یہاں نہ آؤ۔ تمہیں پاپا کی نیچر کا پتا ہے ناں؟ محض اس ضد میں کہ تم ان کی نہیں' اپنی مرضی سے شادی کر رہی ہو' وہ تمہاری شادی رکوانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو' وہ اپنی منوانے کے عادی ہیں اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ چاہے ان کے ایسا کرنے سے ان کی بیٹیوں کی زندگی برباد ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔"

سیم بہت جذباتی انداز میں بول رہی تھی' اس کے لہجے میں اس کی محبت اور فکر شامل تھی۔ وہ سیم کی خود سے محبت پر مسکرائی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا سیم! میری پاپا سے بات ہوئی ہے' وہ میری شادی کی بات سن کر بہت خوش ہوئے ہیں اور اگر وہ خوش نہ بھی ہوتے تو مجھے تو تب بھی پاکستان آنا ہی تھا۔ سکندر کی فیملی پاکستان میں ہے۔ وہ مجھے اپنی ماں سے ملوانا چاہتا ہے۔ ان سے ملنے تو مجھے کراچی آنا ہی ہے۔"

اس کی رسانیت سے کی بات کے جواب میں سیم یک دم ہی غصے اور ناراضی سے بولی۔

"جب تم طے کر چکی ہو تو ٹھیک ہے جو تمہارے دل میں آتا ہے کرو۔ وہ چند دنوں سے ملنے والا شخص مجھ سے زیادہ اہم ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے۔ بعد میں پاپا کچھ الٹا سیدھا کریں' تمہاری شادی یہاں نہ ہونے دیں تو روتی ہوئی میرے پاس مت آنا۔" سیم نے بات پوری کرتے ہی اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔

سیم بہت تلخ اور غصیلے لہجے میں بولی تھی' اس کی آواز اونچی تھی۔ سیم کے غصے اور اس کی تلخی کا اس نے برا نہیں مانا تھا۔ وہ جانتی تھی' سیم اس سے بے تحاشا محبت کرتی تھی اور اس کی اس بے تحاشا محبت ہی میں اس کی فکر میں مبتلا ہو کر وہ اس پر چلائی تھی' ناراض ہوئی تھی۔ کوئی بات نہیں وہ کراچی جا کر سیم کو منا لے گی۔ منا کیا لے گی' اس کی شکل دیکھتے ہی سیم اپنی ساری ناراضی خود ہی بھول جائے گی۔

☼ ☼ ☼

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ لیزا کو لینے ایرپورٹ آیا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس دوہا آئی تھی' یہاں سے ان دونوں نے مل کر کراچی جانا تھا۔ وہ اسے سامنے سے اپنی طرف آتا دیکھ رہا تھا۔ وہ پورے ایک ہفتے بعد پھر اس کے سامنے تھی۔

"Signorina Buon giorne۔"

وہ اسے دیکھ کر شریر سے انداز میں بولا۔ وہ بلیک لوز سا بلاوز آف وائٹ لینن پینٹ کے ساتھ پہنے تھی۔ حسین تو وہ تھی' اب اپنی بھی لگا کرتی تھی۔

"Buon giorno۔"

شکر تم اٹالین بھولے نہیں۔"

"جتنی آئی تھی' وہ یاد رکھی ہوئی ہے' باقی تم مجھے سکھا دینا۔"

وہ ٹرالی اس کے ہاتھ سے لے کر خود چلاتا ہوا اپنی گاڑی تک آ گیا تھا۔ اس نے لیزا کا چھوٹے سائز کا سوٹ کیس گاڑی کی ڈگی میں رکھا۔ وہ تو پاکستان کا صرف دو یا تین دن کا پروگرام بنا رہا تھا مگر لیزا نے اس

سے کہا تھا کہ جب وہ اپنی بیمار ماں کا دل خوش کرنے کے لیے پاکستان جا ہی رہا ہے تو اسے وہاں چند دن تو ٹھہرنا چاہیے' تاکہ وہ اچھی طرح اس سے مل سکیں۔ لیزا بھی کراچی میں اپنی بہن سے ملنے کے لیے بہت ایکسائیٹڈ تھی۔

وہ پہلی بار پاکستان جا رہی تھی۔ وہ پانچ سالوں بعد اپنے پاپا سے ملنے والی تھی اور کافی مہینوں بعد اپنی بہن سے ملنے والی تھی' سو وہ بھی وہاں ایک ہفتہ قیام کرنا چاہتی تھی۔ یوں لیزا کے کہنے پر انہوں نے ایک ہفتے کراچی میں رکنے کا پروگرام بنایا تھا۔ انہوں نے کراچی ساتھ جانا تھا اور وہاں سے دوہا ساتھ واپس آنا تھا۔

ان کے قیام کی مدت اگر لیزا نے طے کی تھی تو آج کس فلائیٹ سے لیزا دوہا آئے گی اور کس فلائیٹ سے وہ دونوں کراچی جائیں گے' یہ اس نے طے کیا تھا۔ وہ آج لیزا کے ساتھ بہت سارا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ مگر اس کا دل چاہا تھا' آج جتنا ہو سکتا ہے وہ لیزا کے ساتھ وقت گزار لے۔

اس نے لیزا سے کہا تھا' آج صبح سویرے جو سب سے پہلی فلائیٹ اسے دوہا پہنچائے وہ اس سے آجائے۔ یوں اس وقت جبکہ صبح پانچ بجے تھے' لیزا اس کے سامنے تھی۔ آج رات گئے کراچی جانے والی جس آخری فلائیٹ میں انہیں سیٹیں مل سکی تھیں' وہ اس سے کراچی جا رہے تھے۔ یوں آج صبح پانچ بجے سے رات گئے تک ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہترین وقت گزارنے کے لیے ان کے پاس کئی گھنٹے موجود تھے۔

کراچی پہنچ کر پتا نہیں وہ ایک دوسرے سے کتنا مل پائیں گے' کتنا وقت ساتھ گزار پائیں گے۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہ خوب صورت سی ڈبیا نکالی جس میں لیزا کے لیے خریدی انگوٹھی موجود تھی۔

"اوہ' تم نے رنگ خرید لی سکندر۔" اس نے ڈبیا کھول کر اس کے سامنے کی تو وہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں! کیسی ہے؟"

"بہت خوب صورت۔ پہنا تو دو۔"

اس نے جھٹ اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی کہ وہ رنگ خریدنے والی بات بھولا نہیں تھا۔ اس نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی انگلی میں انگوٹھی ڈال دی تھی۔

لیزا مسکراتے ہوئے انگوٹھی سے سجے اپنے ہاتھ کو ہر ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہے ناں میرے ہاتھ میں؟"

"ہاں بہت۔" اس نے پیار سے لیزا کو دیکھا۔

"چلیں؟" اس کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے وہ خود بھی مسکرا رہا تھا۔

لیزا نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "چلو۔"

وہ اسے لے کر اپنے فلیٹ آگیا تھا۔ راستے بھر وہ اسے اپنی ایگزیبیشن کی باتیں بتاتی رہی تھی یا پھر اپنی بہن کا ذکر کرتی رہی تھی جس سے ملنے کے لیے وہ بہت ایکسائیٹڈ تھی۔ نینی نے اسے دعا پیار کہلوایا تھا جو اسے لیزا نے راستے میں پہنچا دیا تھا انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ ان دونوں کی شادی میں ضرور شریک ہوں گی۔

وہ چابی لگا کر اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول رہا تھا۔ لیزا اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے یک دم ہی اسے احساس ہوا کہ اس کا فلیٹ لیزا کے شایان شان نہیں۔ اس کا دل ایک دم ہی بجھ سا گیا۔ اسے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟ وہ دروازہ کھول چکا تھا۔

"آؤ۔" لیزا نے اس کے ساتھ اندر قدم رکھا۔

"تمہارے روم والے فلیٹ کے مقابلے میں میرا فلیٹ چھوٹا ہے۔ مجھے پتا ہے' تم اسے دیکھ کر مایوس ہو رہی ہو گی۔ میں شادی سے پہلے کہیں اور اس سے بڑا فلیٹ لے لوں گا۔" اس کے لہجے میں افسردگی در آئی تھی۔ وہ دونوں اندر داخل ہو چکے تھے۔ اس کے فلیٹ میں ایک ڈرائنگ روم تھا جو وہ عموماً "لیونگ روم" کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا اس کے ساتھ ہی کچن اور ایک بیڈ روم تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں سکندر؟ تمہارا فلیٹ بہت اچھا ہے۔ میرے لیے ہر وہ جگہ خوب صورت ہے جہاں تم میرے ساتھ ہو۔"

وہ جیسے قدرے برا مان کر بولی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"لیلا! میں اپنی الجھی بکھری زندگی کی وجہ سے پریشان سا ہو جاتا ہوں کہ کہیں تمہیں مایوس نہ کر دوں۔ یقین کرو' میری جاب اور سیلری بہت اچھی ہے۔ میں اچھی سے اچھی جگہ بھی افورڈ کر سکتا ہوں۔ بس میں نے کبھی اپنے فلیٹ کو گھر سمجھا ہی نہیں' کبھی گھر سمجھ کر اسے سجانے سنوارنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی' مگر اب دل چاہنے لگا ہے زندگی کو ترتیب دینے کا' ایک بہت بڑا بہت خوب صورت سا گھر ہو جہاں ہم دونوں رہیں۔ میں تمہارے لیے دنیا کی ہر نعمت اکٹھی کر لینا چاہتا ہوں۔"

وہ رک رک کر یوں بول رہا تھا جیسے اسے خوف ہو' اندیشہ ہو کہ جو وہ سوچ رہا ہے' وہ کبھی ہو نہیں سکے گا۔ لیزا اور وہ کبھی ساتھ زندگی گزار نہیں پائیں گے۔ لیزا اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

"تم خواب دیکھنے سے ڈرنا چھوڑ دو سکندر۔ تمہارے سارے ڈر غلط ثابت ہوں گے۔ اس بار تمہاری زندگی میں کچھ برا نہیں ہو گا۔"

وہ اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔ جو وہ اس سے کہہ نہیں پایا تھا' وہ اسے بھی سمجھ چکی تھی۔ وہ اسے زندگی میں سب کچھ اچھا ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔

"مجھے تھوڑا وقت دینا لیزا! میں برسوں سے اندھیروں میں رہنے کا عادی ہو چلا ہوں۔ زندگی کے ہنگاموں اور رونقوں سے میں نے خود کو سالوں سے دور کر رکھا ہے۔ تم خوش رہنے اور ہنسنے ہنسانے والی لڑکی ہو۔ میں تمہاری پسند کے مطابق خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کروں گا' بس تم مجھ سے مایوس مت ہو جانا۔ مجھے تھوڑی رعایت' تھوڑی گنجائش دیتی رہنا۔" وہ اپنے ہاتھ پر رکھے لیزا کے ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ میں مضبوطی سے دبا کر بولا۔

"تم جو ہو جیسے ہو' مجھے بہت پسند ہو اور اس بات کا یقین کر لو سکندر! میں نہ تم سے کبھی مایوس ہوں گی' نہ تمہارا ساتھ چھوڑوں گی' نہ تم سے محبت کبھی میرے دل میں کم ہو گی۔"

وہ مضبوط لہجے میں اسے اپنی محبت اور وفاؤں کا یقین دلا رہی تھی۔ وہ کچھ پل یونہی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیا تم مجھے اپنے گھر لا کر یونہی سزا میں کھڑا کیے رکھو گے؟ ایک تو پہلے اپنی ایگزیبیشن' اس کے بعد فلورنس سے روم بھاگ دوڑ اور اس کے بعد جلدی جلدی پیکنگ وغیرہ کرنے میں میں اتنا تھک گئی ہوں۔ اوپر سے تم نے صبح سویرے دوہا پہنچنے کی ہدایت کر کے میری کل رات کی نیند اور آرام خراب کروایا۔"

وہ اپنے مخصوص زندہ دلی سے بھرپور انداز میں بولتی اسے اس کی کوتاہی کا احساس دلا رہی تھی۔

"اوہ آئم سو سوری۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ تم واقعی تھک گئی ہو گی۔ آؤ۔"

وہ فوراً" شرمندہ سا ہوتا اس کا سوٹ کیس پکڑے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ لیزا اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئی تھی۔

"تم شاور لے لو' فریش ہو جاؤ۔ پھر تھوڑی دیر سو جاؤ۔" اس نے اس کا سوٹ کیس ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ لیزا نے سر نفی میں ہلایا۔

"سووؤں نہیں رہی میں۔ تمہارے ساتھ ناشتا کرنے کے لالچ میں' میں نے فلائیٹ پر کچھ بھی نہیں لیا۔ مجھے ناشتا کرواؤ اچھا سا۔ اس کے بعد مجھے دوہا گھماؤ۔"

بولتے بولتے وہ پل بھر کے لیے رکی پھر اسے کچھ مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"تم نے آفس تو نہیں جانا ناں؟"

"نہیں بھئی۔ تمہیں پورا دن اپنے ساتھ گزارنے کے لیے یہاں بلاؤں گا اور خود آفس جا کر بیٹھ جاؤں گا؟ اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میں آج سے ہی چھٹی پر ہوں۔ میں نے فی الحال ایک ہفتے کی چھٹی لی ہے۔ آگے شادی کے لیے ہم جو بھی پلان کرتے ہیں' پھر اس

حساب سے مزید چھٹیاں لے لوں گا۔"
وہ اس کے رعب دار سے انداز پر ہنس کر بولا۔
"تمہارا کوئی بھروسا نہیں ہے ناں۔ اس لیے پوچھ رہی تھی۔"
وہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ وہ لیزا کے لیے ذرا اہتمام سے ناشتے کی تیاری کرنا چاہ رہا تھا۔

✵ ✵ ✵

نہانے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ خود ہی اس کے فلیٹ میں گھومتی کچن میں آ گئی تھی۔ جہاں میز پر ناشتے کے کچھ لوازمات سجائے جا چکے تھے اور کچھ وہ ابھی تیار کر رہا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں مائیکرو ویو' ٹوسٹر اور برتنوں کی طرف متوجہ تھا۔ وہ ہنستی ہوئی اندر آ گئی۔
"اتنا اہتمام بھی مت کرو میرے لیے۔" اس نے ٹوسٹر سے ٹوسٹ نکال کر پاس رکھی پلیٹ میں رکھے اور وہ پلیٹ "فوراً" ہی میز پر پہنچائی تھی۔ سکندر بڑی مہارت سے آملیٹ بنا رہا تھا۔ پہلے اس نے پین میں پھینٹے ہوئے انڈے ڈالے۔ دو' ایک سیکنڈ بعد اس پر مشروم اور پنیر ڈالا تھا اور پھر بڑے ماہرانہ انداز میں اسے جلدی جلدی رول کر رہا تھا۔
"تم ساسیجز کھاتی ہو؟"
"میں سب کچھ کھاتی ہوں۔" وہ میز پر رکھی پھلوں کی خوب صورت سی ٹوکری کو دیکھ کر مسکرائی۔ اس میں صرف ایک ہی پھل تھا۔ ناشپاتیاں۔ ٹوکری پوری لبالب بھری ہوئی تھی ناشپاتیوں سے۔ اس نے پلیٹ میں آملیٹ نکالتے سکندر کو مسکرا کر دیکھا۔ اسے یہ پھل کچھ خاص پسند نہیں تھا۔ وہ یہ ناشپاتیاں کس کے لیے خرید کر لایا تھا' وہ جانتی تھی۔
"تم ناشپاتیاں میرے لیے لائے تھے؟" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ آملیٹ کی پلیٹ میز پر رکھتا سکندر بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔
"ہاں ..... صرف ناشپاتیاں نہیں' بلکہ یہ فروٹ باسکٹ بھی میں نے کل شام ہی خریدی ہے۔ اب بے ڈھنگے پن سے پھل یونہی شاپر میں پڑے چھوڑ دیتا تو تم میرے پھوہڑ پن پر افسوس کرتیں۔"
وہ ہنس کر بولا جیسے اپنی کل فروٹ باسکٹ خریدنے والی حرکت کو ابھی تک انجوائے کر رہا ہو۔ وہ سکندر کے میزبانوں کی طرح پر اخلاق دعوت دینے سے قبل ہی ناشتا شروع کر چکی تھی۔
"کیا تم میری پسند ناپسند ہمیشہ اسی طرح یاد رکھو گے۔" آملیٹ اور ساسیجز کھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔
"پتا نہیں۔" وہ یک دم ہی سنجیدہ ہوا پھر وہ اداسی سے بولا۔
"میں تمہاری امیدوں پر پورا اترنا چاہتا ہوں لیزا۔ میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر پتا نہیں میں تمہیں خوش رکھ بھی پاؤں گا یا نہیں؟ میں تمہارا ساتھ چاہتا ہوں لیزا! اب تمہارے بغیر زندگی کا تصور محال ہے۔ ہم شادی کرنے جا رہے ہیں۔ تم اس وقت میری پہنائی ہوئی رنگ پہنے میرے سامنے بیٹھی ہو مگر میں اس وقت پھر یہی بات کہوں گا کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں ..... تم مجھ سے بہت بہتر شخص ڈ کرتی تھیں۔"
اس کے چہرے پر اداسی تھی' جیسے اپنے آپ سے مایوس تھی۔ لیزا نے یک دم ہی اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔
"میں اس دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہوں کیونکہ سکندر شہریار مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اس جیسے اچھے شخص کو ڈھونڈ نہیں کرتی مگر وہ پھر بھی مجھے مل رہا ہے تو یہ میری خوش قسمتی ہی ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہیں گے کیونکہ ہمارا رشتہ محبت اور سچائی پر قائم ہوا ہے۔"
اس نے دیکھا' سکندر کے چہرے کی مایوسی "فوراً" ہی مسکراہٹ میں تبدیل ہوئی تھی۔ اور پھر "فوراً" ہی سنجیدگی اور سچائی میں۔
"پلیز' مجھے کبھی چھوڑنا نہیں۔ مجھے سب نے چھوڑ

ما۔ مجھے رشتوں نے اور زندگی نے صرف نفرتیں ہیں۔ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا' اگر تم مجھ سے دور ہیں تو میں زندہ کس طرح رہ پاؤں گا؟"
اور وہ جانتی تھی کہ سکندر شہریار آسانی سے لوگوں مل جانے والا شخص نہیں تھا۔ اپنے اندر جھانکنے کی سی کو اجازت نہیں دیا کرتا تھا۔ اگر وہ اسے اپنے جھانکنے دے رہا تھا' اپنے دکھ اور اپنی کمزوریاں اس شیئر کر رہا تھا تو وہ اسے اپنی زندگی میں سب سے رتبے پر لے جا کر بٹھا رہا تھا۔ وہ اسے اپنے دل اور روح تک رسائی دے رہا تھا۔
"جنہوں نے تمہیں نفرتیں دیں' جنہوں نے ہیں چھوڑ دیا' وہ بدنصیب لوگ تھے سکندر! یہ ماری نہیں' ان کی بدنصیبی ہے کہ وہ تمہیں چاہ نہ کے۔ تم سے تو صرف محبت کی جا سکتی ہے سکندر۔"
سکندر کا دکھ' اس کا کرب محسوس کرتے ہوئے اس ں آنکھوں میں نمی آ گئی تھی' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ہ ٹکٹکی باندھے بالکل خاموش اسے دیکھے جا رہا تھا۔
"تم مجھ سے پوچھو گی نہیں لیزا کہ میرے گھر والوں نے مجھے کیوں چھوڑ دیا تھا؟ انہوں نے مجھے نفرت سے دل دھتکار دیا تھا؟"
وہ چند لمحوں کے بعد آہستگی سے بولا۔ اس کے مرے پر تلخی ابھر آئی تھی۔
"نہیں میں تم سے یہ سب نہیں پوچھنا چاہتی ں لیے کہ میں وہ سب جاننا ضروری نہیں سمجھتی۔"
ں کے نرم لہجے میں کہی بات جیسے سکندر کو یک دم ہی مزید تلخ کر گئی تھی۔ وہ قدرے بلند آواز میں بولا تھا بہت منتشر ہو کر۔
"پوچھنا چاہیے تمہیں مجھ سے۔ پوچھنا چاہیے ہیں مجھ سے کہ آخر میرے اپنے سگے باپ نے مجھے اپنے گھر سے دھکے مار کر کیوں نکال دیا تھا' میرا سگا بھائی ھ سے اس حد تک نفرت کیوں کرتا تھا کہ اگر میرے مرنے کی اطلاع آتی تو اس پر سب سے زیادہ خوش ونے والا وہ ہوتا؟"
"سکندر پلیز' تم خود کو کیوں اذیت دے رہے ہو؟"
وہ گھبرا کر بولی۔
سکندر کی تلخی اور اس کا خود پر غصہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھی۔ سکندر نے خالی خالی نگاہوں سے اسے بغور دیکھا۔
"میں بیس سال کا تھا لیزا' میں اس وقت صرف بیس سال کا تھا۔ کیا کوئی باپ اپنے بیس سال کے کم عمر بیٹے کے ساتھ ایسا ظلم کر سکتا ہے؟ کیا کوئی بھائی اپنے بھائی کو تباہ و برباد ہوتا ہوا دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے؟ یہ تھے میرے خونی رشتے۔ یہ تھے میرے خونی رشتے۔"
بولتے بولتے سکندر کی آواز بالکل مدھم ہو گئی تھی وہ سر جھکا کر میز کو دیکھنے لگا تھا۔ وہ بہت دکھ' بہت کرب سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے زخم زخم وجود پر کس طرح مرہم رکھے کہ وہ ماضی کی ہر تلخ یاد کو بھول جائے؟
"یہ جو آج میں تمہیں ایک باعزت انسان نظر آتا ہوں ملٹی نیشنل میں معزز سی جاب کرتا۔ میں یہاں تک کس طرح پہنچا ہوں' اگر تمہیں بتاؤں تو شاید تم میری سخت جانی پر حیران رہ جاؤ گی۔ گرے سے گرا اور گھٹیا سے گھٹیا وہ کون سا ایسا کام ہے جو اپنے Survival (بقا) کے لیے میں نے نہیں کیا تھا۔ میں نے نائٹ کلبز اور بارز میں لوگوں کو شراب پیش کی ہے' میں نے لوگوں کے جانوروں' ان کے کتوں کی دیکھ بھال کی ہے' میں نے کنسٹرکشن سائٹ پر محنت مزدوری کی ہے۔ میں سڑکوں' فٹ پاتھوں اور پارک کی بینچوں تک پر سویا ہوں۔ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے میں کئی کئی دن بھوکا رہا ہوں' کوئی بھی مجھے ایک وقت کا کھانا کھانے کے لیے پیسے دے گا' اس کے لیے میں نیچ سے نیچ کام کرنے تک کے لیے تیار ہوا ہوں۔ اس ملٹی نیشنل کمپنی میں لیگل ایڈوائزر کی پوسٹ تک پہنچتے پہنچتے میں نے زندگی میں کتنی ذلتیں برداشت کی ہیں' تمہیں بتا نہیں سکتا۔"
وہ اسی طرح میز کو گھورتا آہستہ آواز میں کرب سے کہہ رہا تھا۔
"اسی لیے تو میں تمہیں ایک بہادر انسان کہتی ہوں

سکندر! تم بہت بہادر ہو، زندگی کی ٹھوکروں سے تم نے ہار نہیں مانی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو خود کو تباہ و برباد کر چکا ہوتا۔ مگر تم نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے بتا دیا کہ تم ہار ماننے والے نہیں ہو۔ تم بدترین حالات کا سامنا کر لو گے مگر خود کو برباد نہیں ہونے دو گے۔ تم نے ناممکن ترین اور مشکل ترین حالات میں اپنی ایجوکیشن مکمل کی لائر بنے، تم بہت بہادر ہو سکندر۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ مجھے تم سے محبت ہونے پر فخر ہے۔ تم میری زندگی میں شامل ہونے جا رہے ہو مجھے تمہارے اس ساتھ پر فخر ہے۔"

سکندر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں نرمی اور چاہت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ سکندر بغیر کچھ بولے پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا تھا۔

"خود کو اتنا دکھ مت دیا کرو سکندر۔" وہ رسانیت سے بولی۔ "چائے پیو اور تھوڑا سا ناشتا بھی کرو۔ بہت کر لیں، ہم نے یہ دل دکھانے والی باتیں۔" وہ اس کے لیے کپ میں چائے ڈالنے لگی تھی۔

✲ ✲ ✲

وہ لیزا کو ساتھ لے کر وہاں کے ایک بڑے سے شاپنگ مال آیا تھا۔ اس نے لیزا کے اصرار پر تھوڑا بہت ناشتا کر لیا تھا۔ ماضی کو دہرا کر اسے یاد کر کے اس پر عجیب سی اداسی اور قنوطیت طاری تھی۔ ناشتے کی میز لیزا نے سمیٹی تھی، اس نے جھوٹے برتن ڈش واشر میں ڈالے تھے۔ وہ خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا تھا۔ لیزا اس کے بعد ایک بار پھر اس کے پاس میز پر آکر بیٹھی تھی۔

"جو باتیں سوچنے اور دہرانے سے تمہیں اتنی تکلیف ہوتی ہے سکندر! تم انہیں مجھ سے بھی مت کہا کرو۔ کبھی جب ہماری شادی کو بہت عرصہ گزر چکا ہو گا۔ میرا ساتھ تمہارے اندر کی تلخیاں کچھ کم کر چکا ہو گا، تم خواب دیکھنے سے ڈرنا چھوڑ چکے ہو گے، تمہارے اندر سے یہ اندیشہ بھی ختم ہو گیا ہو گا کہ باقی سب لوگوں کی طرح میں بھی تمہیں چھوڑ جاؤں گی، تم اس روز مجھے خود پر گزری ایک ایک بات بتانا۔"

اور وہ اس لڑکی کے خود پر یقین اور محبت کو دیکھتا گیا تھا۔ اس کے موڈ پر چھائی پژمردگی اور اداسی دور کرنے کے لیے لیزا نے فوراً ہی یہ شور مچایا تھا کہ وہ اسے گھمانے لے کر چلے اور یہ کہ اسے یہاں پر شاپنگ بھی کرائے۔ یہاں زیادہ تر شاپنگ مالز صبح دس بجے یا اس کے کچھ بعد کھلا کرتے تھے۔ اس بیچ جو تھوڑا وقت تھا۔ وہ اس میں لیزا کو وہاں کی مختلف خوب صورت سڑکیں اور روڈز پر گھماتا رہا تھا۔ کئی جگہ وہ ٹریفک جام میں بھی پھنسے تھے۔ گویا صبح صبح یہ ان کی لانگ ڈرائیو تھی۔

وہ ابھی بھی اداس تھا، وہ دل سے خوش ہونے سے ڈر رہا تھا مگر وہ لیزا سے اپنی یہ کیفیت چھپا رہا تھا۔ وہ بظاہر ڈرائیو کرتے اس کی باتوں پر یوں مسکرا رہا تھا جیسے بہت خوش ہو، جیسے کوئی خوف، کوئی اندیشہ اس کے دل کو پریشان نہ کر رہا ہو۔

اب وہ دونوں اس جدید اور بے حد خوب صورت پُرآسائش شاپنگ مال میں تھے جہاں اچھی سے اچھی اور مہنگی سے مہنگی ہر شے موجود تھی۔ لیزا کو ایک شاپ پر اپنے لیے ایک ہینڈ بیگ پسند آ گیا۔ وہ اسے خریدنے لگی۔

"پتا ہے مجھے، تمہارے پاس بہت پیسے ہیں۔ مہربانی کر کے یہ والٹ اندر رکھ لو۔"

اسے پیمنٹ کرنے کے لیے والٹ نکالتا دیکھ کر وہ قدرے رعب سے بولا۔ اس نے خود اس کی پیمنٹ کی تھی۔

"میری شاپنگ کی پیمنٹ تم کرو گے؟" وہ دونوں بیگ خرید کر شاپ سے باہر نکلے تو لیزا نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"یہ تو بہت فائدے کی بات ہے۔ اب تو میں دل بھر کر اور خوب مہنگی شاپنگ کروں گی۔" وہ کسی نوعمر لڑکی کی طرح خوشی اور ایکسائٹمنٹ کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

وہ اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ لیزا کے لیے وہ بیگ خریدنا اسے اچھا لگا تھا، اس کا موڈ خوشگوار ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"یہاں چلیں؟" ایسکلیٹر پر چڑھ کر وہ دونوں اگلی منزل پر آئے تو وہاں ایک گفٹ شاپ دیکھ کر لیزا اس سے بولی۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ وہ دونوں اس شاپ میں آ گئے تھے۔ وہ ایک طرف مختلف ڈیکوریشن پیسز دیکھ رہا تھا اور لیزا دوسری طرف کچھ اور دیکھ رہی تھی۔

"سکندر! یہ دیکھو، یہ میں تمہارے لیے لے رہی ہوں۔" وہ بہت ایکسائیٹڈ سی اس کے پاس آئی۔ اس نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں قیمتی لکڑی سے بنی ایک خوب صورت اور بڑی سی چابی تھی جسے الماری یا میز پر سجایا جا سکتا تھا۔ اس پر سنہری حروف میں کندہ الفاظ پڑھ کر وہ ہنسے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

Only you hold the key
to my heart

"یہ؟ تم یہ میرے لیے خریدو گی؟" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"ہاں یہ میں تمہارے لیے لے رہی ہوں۔"

"Key to my heart اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟" وہ اس کے قہقہہ لگا کر ہنسنے پر قدرے برا مان کر بولی۔

"پتا ہے ٹین ایجڈ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو اس طرح کے بچکانہ تحفے دیتے ہیں۔" وہ ہنوز ہنس رہا تھا۔

"اب اگر ٹین ایج میں مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی تھی تو کیا میرے دل میں کوئی ارمان ہی نہیں ہوں گے؟ کیا اٹھائیس سال کی عمر میں، میں اپنے ٹین ایج والے شوق پورے نہیں کر سکتی؟" وہ بہت سنجیدہ تھی اس چابی کو خریدنے کے لیے۔

"کرو، ضرور کرو۔ میں نے کب روکا ہے۔"

مگر میں یہ تمہارے لیے لے رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں، تم اسے اپنے کمرے میں اپنی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سجاؤ۔ جس طرح تم نے وہاں سمورائی کا مجسمہ اور میرا بنایا کارڈ سجا کر رکھا ہوا ہے۔ کیونکہ

You are the only one
the key who hold
to my heart

(تم وہ واحد آدمی ہو جس کے پاس میرے دل کی چابی ہے۔) وہ بے حد سنجیدگی سے بولی تھی۔

"لے لو بیلا! میں اسے بہت سنبھال کر اور سجا کر رکھوں گا۔"

اسے ابھی بھی ہنسی آ رہی تھی۔ اس طرح کا نوعمر لڑکے لڑکیوں والا تحفہ خریدے جانے پر مگر اس نے لیزا کو سنجیدہ دیکھ کر اسے خریدنے کو کہا تھا۔ وہاں بہت سے تحفے ایسے بھی تھے جنہیں خریدنے سے پہلے لوگ Personalised کروا رہے تھے اپنے نام یا تصاویر ان میں چسپاں یا کندہ کروا کر۔

"ہم ان مگ کو پرسنلائزڈ کروائیں؟"

ابھی وہ لیزا کی چابی والی حرکت ہی پر محظوظ ہو رہا تھا کہ وہ سامنے رکھے مختلف رنگوں اور ڈیزائنز کے مگوں کو دیکھ کر بولی۔

"کیا لکھوانا چاہتی ہو تم مگ پر؟" وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ وہ صبح ناشتے کے دوران ماضی کو یاد کرتے ہوئے کتنے ڈپریشن میں چلا گیا تھا۔ کتنا مایوس اور کتنا اداس ہو گیا تھا۔ اب اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ لیزا کے ساتھ ان بچکانہ سی چیزوں کو لیتا خوش ہو رہا تھا، اسے اچھا لگ رہا تھا جیسے لیزا سولہ سال کی دوشیزہ تھی اور وہ سترہ سال کا نوعمر لڑکا۔

"مسٹر اینڈ مسز سکندر۔" لیزا نے مگ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے فوراً ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ اسے اس پر کیا لکھوانا ہے۔ اس نے دو مگ اٹھا لیے تھے۔ اب وہ کاؤنٹر پر کھڑی سیلز مین سے انہیں مسٹر اینڈ مسز سکندر کندہ کاری کر کے لکھنے کو بول رہی تھی۔ جتنی دیر سیلز مین نے مگوں پر کندہ کاری کی وہ ادھر ادھر گھومتے رہے۔ سیلز مین مگوں پر نام کندہ کر چکا تھا۔

"کیسا لگ رہا ہے؟"
لیزا انگ یا تھ میں لے کر اس سے پوچھنے لگی۔
"مجھے یقین نہیں آ رہا میں آرٹ کی اتنی قدر اور شخصیت سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔ لگ تو ایسا رہا ہے میری شادی کسی سولہ سترہ سال کی بچی سے ہونے والی ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ ڈیکوریشن پیس کے لیے لیزا نے لے کیا تھا اور مگوں کا اس نے۔ شاپنگ بیگ ہاتھ میں لیے وہ دونوں شاپ سے باہر نکلے تب وہ لیزا سے بولا۔
"کبھی کبھی انسان کو بچہ بننا چاہیے۔ بچوں جیسی حرکتیں بھی کرنی چاہئیں۔ اب جو تم ہر وقت ساٹھ ستر سال کے بزرگ بنے رہتے ہو میں تو اس پر کچھ نہیں کہتی۔ تو تم کیا میری خاطر تھوڑی دیر کے لیے میرے بچپنے کو انجوائے نہیں کر سکتے؟"
وہ لیزا کو ساتھ لیے شاپنگ مال کے فوڈ کورٹ میں آ گیا۔ وہاں فوڈ کورٹ کے ساتھ بچوں کے لیے Playing ایریا بھی تھا اور ان ڈور آئس اسکیٹنگ کی سہولت بھی۔
"مجھے تمہارا بچپنا بہت اچھا لگ رہا ہے لیزا۔! ان فیکٹ مجھے بہت مزا آ رہا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔
لیزا بھی جواباً مسکرائی تھی۔
"کیا کھاؤ گی؟"
"کچھ بھی کھلا دو۔"
"برگر کھاؤ گی یا پھر ٹیمپورا یا پھر سوشی؟" وہ دونوں فوڈ کورٹ میں مختلف مشہور ہوٹلز اور فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹس کے کاؤنٹرز کے سامنے سے گزر رہے تھے۔
"میرا خیال ہے سوشی اور ٹیمپورا ٹھیک ہے۔"
تھوڑی دیر بعد وہ دونوں وہاں ایک میز پر اپنا اپنا کھانا لے کر بیٹھ گئے تھے۔
"تمہارے پاس کوئی پاکستانی ڈریس نہیں ہوگا ناں؟" ٹیمپورا کھاتے ہوئے اس نے لیزا سے پوچھا۔
"نہیں، کیوں؟" پوچھتے پوچھتے جیسے اسے از خود ہی سمجھ میں آ گیا تھا کہ سکندر اسے اپنی ماں سے ملوانے پاکستانی لباس میں لے جانا چاہتا ہے۔
"ہم ابھی خرید لیں گے کھانے کے بعد۔ ہوں گی ناں پاکستانی اور انڈین بوتیکس؟" اس نے سکندر سے پوچھا۔ اس نے جواباً اثبات میں سر ہلایا۔
"تمہاری امو جان کیسی ہیں، میرا مطلب ہے دیکھنے اور عادت میں۔" وہ اسے اپنی ماں سے ملوانے پاکستان لے جا رہا تھا تو اس کا دل چاہا، وہ سکندر سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھے۔
"بہت حسین، بہت خوب صورت۔ تم انہیں دیکھو گی تو وہ تمہیں بھی بہت اچھی لگیں گی۔ آہستہ آواز میں اتنی نرمی سے بولتی ہیں وہ۔ میں نے انہیں کبھی چیختے چلاتے اور غصے میں نہیں دیکھا۔ پتا ہے وہ ڈاکٹر ہیں۔ مگر اپنے گھر اور بچوں کے لیے انہوں نے اپنی ڈگری کی قربانی دے دی، کبھی میڈیکل پریکٹس نہیں کی۔"
ماں کے بارے میں بولتے ہوئے اس کے چہرے پر از خود ہی نرمی اور محبت بکھر گئی تھی۔ وہ بہت جذباتی سا ہو کر بول رہا تھا۔
"تم انہیں امو جان کہتے ہو ناں؟"
"ہاں۔" بولتے ہوئے وہ مسکرایا۔ "بچپن میں میں نے ہی انہیں اس نام سے بلانا شروع کیا تھا۔ امو جان بچپن میں ہمیں بہت کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ کبھی کتابوں میں سے پڑھ کر، کبھی خود ان کی بچپن میں سنی کہانیاں ایک بار انہوں نے ایک کہانی سنائی تھی جس میں بچہ اپنی ماں کو امو جان کہتا تھا اور اس میں ماں کا کردار مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ تب شاید میں چار یا پانچ سال کا تھا۔ تب خود بخود ہی میں نے انہیں ممی کہنا چھوڑ کر امو جان بلانا شروع کر دیا تھا اور میری دیکھا دیکھی ——"
بے دھیانی میں بولتا بولتا وہ یک لخت ہی خاموش ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی آ گئی تھی۔
"بہت خوب صورت نام ہے امو جان۔" لیزا نے فوراً ہی مسکرا کر کہتے ہوئے یوں ظاہر کیا جیسے اس کا بولتے بولتے چپ ہو جانا اور وہ بے سوچے سمجھے کیا بولنے جا رہا تھا، سمجھا ہی نہ ہو۔ وہ جھکے سے انداز میں

ایا۔ یہ ہلکی سی مسکراہٹ بھی وہ بہت کوشش کر کے اپنے چہرے پر لا پایا تھا۔
"اور کچھ بتاؤ ناں اپنی امو جان کے بارے میں، میں انہیں اچھی لگوں گی ناں؟"
"تم انہیں بہت اچھی لگو گی۔ وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔ تم تو ہو ہی بہت خوب صورت، لیکن اگر میں نے کوئی عام سی لڑکی بھی اپنے لیے پسند کی ہوتی۔ وہ سے بھی پسند کرتیں، کیونکہ وہ ان کے بیٹے کی پسند ہوتی۔" لیزا اس کی بات پر مسکرائی تھی۔
"تمہاری باتوں سے مجھے لگ رہا ہے تمہاری امو جان بہت اچھی ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے میں ان سے جلدی سے ملوں۔"
"میرا بھی دل چاہ رہا ہے۔ پتا ہے میں اس سے پہلے ان سے چار سال قبل ملا تھا۔ تب وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھیں۔ ان کی سرجری ہوئی تھی۔ اس پوری رات میں ان کے ساتھ رہا تھا۔ اس روز میں پورے آٹھ سالوں بعد ان سے ملا تھا۔ ان آٹھ سالوں میں میرا ان سے کسی بھی طرح کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے یاد کر کر کے اتنی بیمار پڑ گئی تھیں۔ ان کی صحت ابھی بھی زیادہ ٹھیک نہیں رہتی۔"
اس کے لہجے میں ماں کی محبت اور ان کی صحت کی فکر شامل تھی۔
"کیا خدانخواستہ کینسر؟" لیزا نے تشویش سے پوچھا۔
"نہیں! اس کا الحمدللہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہر دو تین مہینے بعد اس حوالے سے ان کے ٹیسٹ وغیرہ اور ڈاکٹر کے پاس تفصیلی چیک اپ ہو جاتا ہے۔ اس طرف سے اطمینان ہے۔ مگر ان کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے۔ کبھی بلڈ پریشر، کبھی شوگر، کبھی کولیسٹرول بھی کچھ اور کچھ نہ کچھ صحت کا مسئلہ انہیں مسلسل رہتا ہے۔ اپنی صحت کے متعلق وہ مجھے زیادہ بتاتی نہیں ہیں، مگر مجھے پتا ہے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ میں نے انہیں چار سالوں سے دیکھا نہیں ہے لیزا۔" لیزا نے میز پر رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔
"فکر مت کرو۔ وہ بالکل ٹھیک ہوں گی اور تمہارے آنے کا جان کر بہت خوش ہوں گی۔ تم ان سے ملو گے تو ان کی طبیعت اپنے آپ بہتر ہو جائے گی۔" لیزا مسکرا کر اسے یقین دلا رہی تھی۔ اس نے جواباً مسکرا کر سر ہاں میں ہلایا تھا۔
فوڈ کورٹ سے اٹھ کر وہ دونوں اسی مال میں موجود ایک بوتیک میں آ گئے تھے۔ وہاں انڈین اور پاکستانی ملبوسات موجود تھے۔ پسند لیزا نے کیا تھا۔ دلوایا اس نے تھا۔ کڑھائی کی ہوئی پنک کلر کی خوب گھیر والی فراک، چوڑی دار پاجامے اور دوپٹے کے ساتھ۔ اس نے اس کے علاوہ بھی لیزا کو کافی کچھ دلوایا تھا۔
"تمہارے بہت پیسے خرچ ہو گئے ناں؟" دل بھر کر شاپنگ کرنے کے بعد جب وہ دونوں مال سے باہر نکل رہے تھے تب وہ معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر بولی۔ وہ اس کی اس مصنوعی معصومیت پر مسکرایا۔
"پتا ہے لیزا! تمہارے لیے کچھ خرید کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار خود سے وابستہ کسی رشتے کے لیے کچھ خرید رہا ہوں۔ مجھے اپنے اندر بڑی نئی سی خوشی اور زندگی کی امنگ محسوس ہو رہی ہے۔"
اس سے دل کی باتیں کہنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اب جو وہ سوچتا تھا، جو محسوس کرتا تھا بے جھجک اس سے شیئر کر لیا کرتا تھا۔ اس نے اسی بوتیک سے اپنی امو جان کے لیے بھی ایک قیمتی جوڑا خریدا تھا۔ پسند لیزا کی تھی۔
اب لیزا کو دوہا کا سی سائڈ دیکھنا تھا۔ ڈھیر ساری شاپنگ کر کے وہ دونوں فارغ ہوئے تو سہ پہر کا اختتام اور شام کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔
وہ اسے لے کر Corniche پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ وہاں حسب معمول جاگنگ ٹریک پر لوگ جاگنگ کر رہے تھے۔ سمندر کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرنے کے لیے بنائی گئی خوب صورت روش پر لوگوں کی ایک

بڑی تعداد چہل قدمی کرتی نظر آرہی تھی۔ پام کے درختوں کی چھاؤں میں بینچوں پر بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ کثیر المنزلہ اور جدت کی حامل عمارتوں کا منظر بھی بہت خوب صورت نظر آرہا تھا۔ وہ دونوں وہاں چہل قدمی کرنے لگے۔

"ہم نے ایک بات ابھی تک طے نہیں کی۔" آہستہ قدموں سے چلتے اس نے لیزا سے کہا۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا؟"

"تمہاری جاب۔ تمہاری جاب کا کیا ہوگا؟ میں نے تم سے پوچھے بغیر از خود یہ فرض کرلیا کہ تم لندن چھوڑ کر روما آجاؤ گی۔"

"ہاں تو ٹھیک سوچا تم نے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تو کیا تم اپنی جاب چھوڑ دو گی؟ تمہاری جاب بہت اچھی ہے لیزا۔"

"مگر جس سے میں شادی کررہی ہوں' وہ بھی تو بہت اچھا ہے۔" وہ اسی کی ٹون میں فوراً بولی تھی۔

"جاب کا کوئی مسئلہ نہیں ہے سینور سکندر! میں ایک کامیاب آرٹسٹ ہوں۔ شادی کے بعد گھر سے اور تم سے بچ جانے والے ٹائم میں پینٹنگز بنایا کروں گی' اپنی ایگزیبشنز کی تیاریاں کیا کروں گی اور اگر مجھے لگا کہ مجھے گھر پر بوریت ہورہی ہے' ٹائم نہیں گزرتا تو میں یہاں روما میں کسی آرٹ اسکول یا کالج میں جاب کرلوں گی۔"

"مگر تمہیں اپنی لندن میں جاب بہت پسند ہے۔ تم صرف اپنی اس بہترین جاب کی وجہ سے لندن چھوڑ کر روما میں سیٹل نہیں ہوتیں' صرف سال کے دو مہینے روما میں گزارتی ہو۔ اگر روما سے اتنی محبت کے باوجود تم لندن میں اپنی جاب چھوڑ کر روما میں سیٹل نہیں ہوئیں تو کیا یہ تمہارے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی کہ تم میری خاطر اپنی بہت اچھی جاب چھوڑ دو؟"

وہ بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔

"میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں سینور سکندر! کہ تمہاری خاطر کچھ بھی کرسکتی ہوں' تمہاری خاطر کچھ بھی اپنا سکتی ہوں' تمہاری خاطر کچھ بھی چھوڑ سکتی ہوں۔"

وہ بہت شدت اور سچائی سے بولی۔ اس کا لفظ لفظ اس کے دل میں چھپی اس کی محبت کا شدتوں سے اظہار کررہا تھا۔ ایک پل اس کی طرف دیکھتے رہنے اور اس کی والہانہ محبت کو محسوس کرنے کے بعد یک دم ہی اس کا دل شرارت پر آمادہ ہوا۔ جیسے یک دم ہی بہت خوش ہو کر دل شریر ہوا تھا۔

"تم میرے لیے کیا کیا چھوڑ سکتی ہو؟"

"کچھ بھی۔"

"تم میرے لیے پینٹنگ چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔"

"روما جانا چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔" وہ پچھلی بار ہی کی طرح شرارتی انداز میں سوالات دہرا رہا تھا اور وہ رٹے رٹائے انداز میں بغیر سوچے فوراً "ہاں" کہہ رہی تھی۔

"اگر تم میری خاطر یہ دو چیزیں چھوڑ سکتی ہو تو اس کا مطلب ہے تم سچے دل سے مجھ سے محبت کرتی ہو۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولا۔ لیزا بھی جواباً ہنسی تھی۔

☆ ☆ ☆

آمنہ زیورات کے ڈبے اور ایک خوب صورت صندوقچی نما جیولری باکس' جس میں ان کے پرانے زیورات رکھے تھے' نکال کر بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ ڈبوں میں قدرے نئے ڈیزائن کے ان کے زیورات جبکہ صندوقچی میں ان کے خاندانی زیورات تھے۔ کل برسوں بعد ان کا سکندر ان سے ملنے آرہا تھا' ان کی ہونے والی بہو کو ان سے ملوانے کے لیے۔ وہ کل اپنے بیٹے اور اپنی ہونے والی بہو سے ملیں گی۔ وہ اپنی بہو کو اپنے زیورات میں سے کوئی زیور دینا چاہتی تھیں۔ وہ بہت خوش تھیں۔ بیٹے سے ملنے کی خوشی نے ان کے اندر زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ وہ لبوں پر خوشی سے بھری مسکراہٹ لیے مختلف زیورات دیکھ رہی تھیں۔

انہوں نے وہ جڑاؤ کنگن اٹھائے جو انہیں منہ [illegible] میں شہریار خان نے دیے تھے اور اس سے پہلے [illegible]ر خان کے والد نے ان کی والدہ کو۔ یہ ان کے [illegible]ائی اور بہت قیمتی کنگن تھے۔ یہ انہوں نے نویرہ کو [illegible] دیے تھے۔ یہ انہوں نے اپنے سکندر کی دلہن [illegible] لیے سنبھال کر رکھے تھے۔ وہ اپنی ہونے والی بہو کو [illegible]یہ بہت خاص اور اہم چیز دینا چاہتی تھیں۔ اپنے [illegible] بیٹے کو وہ وہ بہت کچھ نہیں دے سکی تھیں جو انہیں [illegible] چاہیے تھا۔ کنگن کے ساتھ ساتھ انہیں اپنا ایک [illegible] ہار اور کئی لڑیوں والی وزنی مالا بھی سکندر کی بیوی کو [illegible] کے لیے اچھی لگ رہی تھی۔

وہ زیورات دیکھنے میں مگن تھیں' تب ہی کمرے کا [illegible]انہ کھلا۔ شہریار خان اندر آئے تھے۔ وہ اسٹڈی میں [illegible]ے۔ وہ آج دفتر سے گھر جلدی آگئے تھے۔ آنے کے [illegible]عد سے وہ اسٹڈی میں تھے۔ انہوں نے کافی بھی وہیں [illegible] والی تھی۔ وہ اسٹڈی میں مطالعے میں مصروف ہیں [illegible]یہی سوچ کر آمنہ یوں زیورات بکھیر کر بیٹھ گئی تھیں۔ شہریار خان کو اندر آتے دیکھ کر ان کا چہرہ فوراً [illegible]سنجیدہ ہو گیا۔ انہوں قدرے محتاط سے لہجے میں [illegible]پوچھا۔

"کچھ چاہیے تھا آپ کو؟"

"نہیں۔" وہ سنجیدگی سے جواب دے کر بیڈ پر اپنی [illegible]نے کی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔

وہ سنجیدگی سے سر جھکا کر زیورات واپس صندوقچی میں رکھنے لگیں۔ اپنے جذبات' اپنی سوچیں شوہر سے [illegible]شیئر کرنے والا ان کا تعلق ہی نہیں تھا۔ شوہر سے دکھ [illegible]سکھ کہنے والا ان کا رشتہ ہی نہیں تھا۔ ساری زندگی [illegible]شوہر نے فیصلے سنائے تھے' انہوں نے سر جھکا کر تعمیل کی تھی۔ سوال کرنے یا وجہ پوچھنے کی کبھی جرأت ہی [illegible]میں کی تھی۔

شہریار خان جانتے تھے کہ وہ کیا کررہی ہیں' وہ جانتے تھے کہ کل سکندر آنے والا ہے' مگر وہ شوہر کے مزاج کو سمجھتی تھیں' جانتی تھیں وہ اس بارے میں ایک لفظ بھی کہے بغیر یا تو ٹی وی دیکھنے لگیں گے یا پھر آرام کرنے لیٹ جائیں گے۔ سینے میں جیسے ایک دل نہیں' پتھر تھا شہریار خان کے۔

شہریار خان بغور انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ بیڈ پر ٹیک لگا کر اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے تھے۔

"یہ زیور سکندر کی بیوی کے لیے نکال رہی ہو؟"

شہریار خان سنجیدگی سے ان سے مخاطب ہوئے تھے۔ سکندر کا نام اور یہ جملہ ان کے لبوں سے سن کر آمنہ نے بے طرح چونک کر شدید حیرت کے عالم میں انہیں دیکھا۔ وہ زیور واپس رکھنا بھول گئی تھیں۔ مارے حیرت کے وہ جواب میں فوراً کچھ بول بھی نہیں پائیں۔ ایک دو سیکنڈ بعد انہوں نے سر اثبات میں ہلایا۔

"جی۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم جیولر کو بلا کر کچھ نئے زیورات خرید تیں اسے دینے کے لیے؟"

"یہ سکندر کی دادی' پڑدادی' نانی اور میرے زیورات ہیں۔ مجھے لگا اس چیز سے وہ زیادہ خوش ہو گا۔"

وہ ابھی تک حیرت کے عالم میں تھیں۔ شہریار خان انتہائی سنجیدگی سے اپنے مخصوص نپے تلے اور غیر جذباتی انداز میں گفتگو کررہے تھے مگر آمنہ تو ان کے لبوں سے سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی کا ذکر سن کر ہی شاک میں تھیں۔ شہریار خان نے ان کی توجیہہ پر سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے' یہ زیور بھی دے دینا۔ مگر کل میں جیولر کو بھی فون کردوں گا۔ کچھ نئے زیور بھی خرید دو اس کی بیوی کے لیے۔"

شہریار خان پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھے۔ انہوں نے نہ تو ٹی وی کھولا تھا اور نہ ہی آرام کرنے لیٹے تھے۔ انہیں اندازہ ہوا' وہ ان سے مزید کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں۔

"آمنہ! میں تم سے کل کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی؟" انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے شوہر کو

دیکھا۔

"تم نے سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی کو ملنے کے لیے کراچی بلایا ہے' تم ان دونوں سے ملنا چاہتی ہو۔"

"ٹھیک ہے' یہ بہت اچھی بات ہے' مگر میری رائے میں یہ قطعاً" مناسب نہیں ہو گا کہ تم ان دونوں سے ملنے ان کے ہوٹل جاؤ یا کہیں اور باہر ملو۔ وہ نئی لڑکی جو فارنر بھی ہے' کیا سوچے گی ہمارے خاندان کے بارے میں؟ تم ان دونوں کو گھر پر بلاؤ۔ دوپہر کا یا رات کا کھانا کھائیں وہ دونوں ہمارے گھر پر۔"

تو بیٹے کی محبت نے دل میں جوش نہیں مارا تھا' خاندانی آن بان نے دل کو بے چین کیا تھا۔ پل بھر کے لیے جو دل خوش فہم ہوا تھا کہ شاید برسوں بعد لوٹنے والے بیٹے کے لیے باپ کا دل گداز ہو گیا ہے' فوراً" ہی وہ خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔ انہوں نے افسوس بھری نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔ اگر اللہ کسی کے دل سے نرمی اور محبت نکال دے تو انسان ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسے شہریار خان۔ دل چاہا تھا انہیں جھنجھوڑیں' پوچھیں کہ کیا دل نام کی کوئی چیز ان کے سینے میں موجود بھی ہے؟ بیٹے کی زندگی برباد کر دی اور آخر میں فکر رہی تو اپنی جھوٹی آن' بان اور شان کی!"

"وہ گھر نہیں آئے گا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آنے پر اس شرط پر راضی ہوا ہے کہ میں اسے گھر نہیں بلاؤں گی۔"

وہ نظریں جھکا کر بظاہر زیورات کو ڈبوں میں رکھتے محتاط لہجے میں بولی تھیں۔ ایک دو سیکنڈ شہریار خان کا جواب سنائی نہ دیا تو انہوں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔

"ٹھیک ہے تو یوں کر لیتے ہیں' ان دونوں کو کل ہمارے فارم ہاؤس پر بلا لو۔ میں' تم' نویرہ اور علی وہاں جائیں گے۔ زین نہ جانا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔ میں غلام احمد سے کہہ دیتا ہوں' وہ کسی اچھے ہوٹل کو کھانے کا آرڈر کر دے گا۔ تم کھانے میں جو بھی ڈشز رکھوانا چاہتی ہو یا باربی کیو وغیرہ کروانا چاہتی ہو وہ سب غلام احمد کو بتا دینا۔ اس لڑکی پر ہمارے خاندان کا اچھا تاثر پڑنا چاہیے۔ اسے پتا چلنا چاہیے کہ وہ کس بڑے خاندان کی بہو بننے جا رہی ہے۔"

شہریار خان کا مغرور' دو ٹوک انداز آمنہ کے دل میں کئی چبھتے ہوئے سوال اٹھا رہا تھا۔ وہ پوچھنے کی جرأت نہ رکھتی تھیں ورنہ ضرور پوچھتیں' طنزیہ لہجے میں۔ "اپنے بیٹے کو گھر سے بے دخل کر کے' اسے سڑک پر لے جا کر کھڑا کر کے آج انہیں اچانک وہ اپنے خاندان کا حصہ لگنے لگا ہے؟ صرف اس اٹالین لڑکی اور اس کی فیملی کے سامنے اپنی آن' بان اور خاندانی شوکت جتانے کو۔ وہ لڑکی سکندر کی ماں سے کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں مل کر کہیں ان کے خاندان کو کوئی معمولی خاندان نہ سمجھ بیٹھے۔

بیٹے کی زندگی تباہ و برباد کر کے بھی کچھ اہم رہا تو خاندان؟ اس کی ایک غلطی کی اسے اتنی کڑی سزا دے ڈالی؟ اس کی زندگی اندھیروں میں دھکیل دی۔ اسے برباد کر دیا۔ ان سے" آمنہ شہریار خان سے ان کا بیٹا چھین لیا۔ ماں کی گود اجاڑ دی۔ اور آج بھی چہرے پر کوئی پچھتاوا' کوئی دکھ نہیں؟ فکر ہے تو اپنے خاندانی جاہ و جلال کی؟"

"ٹھیک ہے میں اس سے کہہ دوں گی۔"

کہیں ان کے چہرے پر بکھرے سوال اور شکایتیں وہ پڑھ نہ لیں' اس خوف سے وہ سر جھکا کر آہستہ سے بولی تھیں۔

☆ ☆ ☆

شام ڈھل چکی تھی جب وہ دونوں سارا دن گھوم پھر کر اس کے فلیٹ لوٹے تھے۔

"میں نے ابھی تک اپنی پیکنگ نہیں کی ہے۔ تم چاہو تو تھوڑی دیر ریسٹ کر لو۔ میں پیکنگ کر لوں؟"

واپس آنے کے بعد وہ اس سے بولا تھا۔

"ٹھیک ہے' تم پیکنگ کرو۔ میں ہم دونوں کے لیے مزے دار سی کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

باہر گھومنے پھرنے میں وہ دونوں وقتاً" فوقتاً" اتنا کچھ

کھا چکے تھے کہ اب ان دونوں میں سے کسی کا بھی ڈنر کا ارادہ نہیں تھا۔ واپس آتے ہی لیزا نے شاپنگ بیگ میں سے دونوں مگ اور چابی نکالی تھی۔ اس نے خود ہی وہ چابی اس کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سجا دی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ہنسا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کافی لے کر کمرے میں آئی تو کافی ان ہی مگوں میں تھی جن پر مسٹر اینڈ مسز سکندر لکھا ہوا تھا۔ اس نے بیڈ پر سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ وہ اس میں اپنے کپڑے رکھ رہا تھا۔ اس نے کراچی میں ہوٹل میں روم کی بکنگ بھی یہیں سے کروالی تھی۔ لیزا کا اسے پتا تھا کہ وہ اپنے پاپا کے گھر پر ٹھہرے گی۔

"سیم آئے گی مجھے ایئرپورٹ لینے۔ یہاں آتے ہوئے میں نے اسے فون کر کے اپنی فلائیٹ اور کراچی پہنچنے کا وقت بتا دیا تھا۔" وہ بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کافی پینے کے لیے اس نے بھی تھوڑی دیر کے لیے پیکنگ کا کام روک دیا تھا۔ وہ لیزا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو اپنی بہن کے ذکر پر جگمگا اٹھا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے موبائل پر کال آ رہی تھی۔ یہ اس کی امو جان کی کال تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کی۔ اسے ماں سے ملنے کی بہت خوشی تھی مگر ساتھ ساتھ دکھ اور ذلت بھرے کچھ احساسات بھی تھے۔ وہ ماں کے گلے لگنا چاہتا تھا۔ ایک ماں ہی تھی جس نے اس سے محبت کرنا کبھی نہیں چھوڑی تھی۔ ان کا دل اپنے گناہ گار بیٹے کے لیے وسیع تھا۔ وہ بیٹے کا گناہ کب کا معاف کر چکی تھیں۔ یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ پوری دنیا میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا جو یہ کہہ دیتا کہ سکندر نے وہ گناہ نہیں کیا تھا۔ اسے بھروسا اور اعتماد ماں کے پاس بھی نہ مل سکا تھا مگر یہ کیا کم تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھیں' اسے دل و جان سے چاہتی تھیں' اس کے انتظار میں دن گن گن کر گزار رہی تھیں' وہ اس کی واپسی کی راہ تک رہی تھیں۔

"کل کس وقت پہنچ رہے ہو بیٹا؟"

"صبح سویرے ان شاء اللہ۔"

"کس فلائیٹ سے آ رہے ہو؟"

ان کے لہجے میں اس سے ملنے کی تڑپ تھی' بے قراری تھی۔ وہ ان کی بے قراری کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے انہیں اپنی فلائیٹ اور کراچی پہنچنے کا وقت بتا دیا تھا۔

"یہ چند گھنٹے کیسے گزریں گے سکندر؟ مجھے تو ایک ایک پل صدیوں کے برابر لگ رہا ہے۔ تم تھوڑے دن کراچی میں رکو گے تو ناں؟ ایسا تو نہیں ہو گا کہ کل آئے اور پرسوں واپسی؟"

وہ بہت بے چین ہو کر بولی تھیں۔ جیسے برسوں سے بچھڑے بیٹے کو دیکھنے' اسے چھونے اسے پیار کرنے کو ان کی مامتا بری طرح تڑپ رہی ہو۔

"جی امو جان! میں تھوڑے دن رکوں گا کراچی میں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

اس نے تشکر بھری نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھی لیزا کو دیکھا تھا لیزا کے کہنے پر اس نے ایک ہفتے کا پروگرام بنایا تھا۔ ورنہ شاید اس وقت انہیں یہ بتا کر کہ وہ محض دو یا تین دنوں کے لیے آ رہا ہے۔ وہ ماں کے دکھے ہوئے دل کو مزید دکھانے کا باعث بنتا۔ لیزا مسکراتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھ سے بہت ساری دیر کے لیے ملو گے ناں؟ مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں بیٹا! تمہیں جی بھر کر دیکھنا ہے۔"

ان کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ بولتے بولتے ایک دم یوں چپ ہوئی تھیں جیسے خود کو رونے سے روک رہی ہوں۔

"میں آپ سے بہت ساری دیر کے لیے ملوں گا امو جان۔ جب تک کراچی میں ہوں گا ہم روز ملیں گے اور بہت ساری باتیں کریں گے۔"

وہ ماں کا کرب محسوس کرتے ہوئے رسانیت سے بولا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

سمیرا حمید

لگی تھی جیت سی ہار ایسی

مکمل ناول

یہ نیویارک شہر کی دس منزلہ عمارت کا ایک کشادہ فلیٹ ہے۔ جس کے لیونگ روم کی کھڑکی کے پاس رکھے کاؤچ پر وہ اکیلی بیٹھی رات کے اندھیرے میں ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ آج رات سے پہلے تک اس کھڑکی سے دیکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ آج بھی وہ کھڑکی سے پار ہی دیکھ رہی تھی، لیکن اچھا یا برا احساس لیے بغیر۔

وہ اداس تھی۔ اس نے اپنا لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ اس کے بال بے ترتیبی لیے ہوئے تھے۔ جنہیں کچھ گھنٹے قبل ہی ——— بنایا تھا۔ گھر میں گھر اسناٹا تھا۔ اس لیے بھی کیونکہ گھر کے دو لوگوں میں سے ایک اپنے بیڈ روم میں سو چکا تھا اور ایک کاؤچ پر اداس بیٹھا تھا۔

چند گھنٹے قبل وہ خوش اور پر جوش تھی۔

اس نے وکٹوریہ بیکھم فیشن لائن کا وہ ٹاپ پہنا تھا جو اس کی وارڈروب میں سب سے زیادہ مہنگا تھا اور شان دار بھی۔ ٹاپ شولڈر لیس تھا۔ شولڈرز کو کور کرنے کے لیے اس نے ٹاپ کی ہم رنگ سفید آدھی آستینوں والی جیکٹ پہنی۔ جس نے بہت خوب صورتی سے اس کے اوپری حصے کو ڈھانک لیا تھا۔ وائٹ ٹاپ کے اوپری حصے پر گولڈن نگینوں کا ستاروں جیسا چھڑکاؤ تھا اور یہی اس ٹاپ کی سب سے بڑی

دلکشی تھی۔ یہ ایک بہترین مغربی لباس تھا۔ جو گھٹنوں تک تھا۔ اس کے ساتھ اس نے سفید ہی ٹائٹس پہنا۔ ہائی ہیل اور گلے میں قیمتی نیکلس۔

یہ ڈریس اسے اس کے بھائی نے خاص شادی کا گفٹ برطانیہ سے لے کر بھیجا تھا۔ اس نے صرف لپ گلوز لگایا تھا اور یہی کافی تھا۔ اسے میک اپ کی ضرورت نہیں تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں میں؟"

اپنے پیچھے اسے کھڑے دیکھ کر وہ اٹھ کر سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور باربی ڈول کی طرح گھوم کر اس سے پوچھا۔ وہ مبہوت سے اسے دیکھتا ہی رہا۔ ابھی اس نے اپنے بال رولر سے آزاد نہیں کیے تھے۔

"تم جانتی ہو کہ تم کیسی لگ رہی ہو۔" اس نے پہلے اسے صرف مسکرا کر دیکھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے جیسے کہہ دیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بمشکل ہی کچھ کہے گا۔ تعریف کرنے کے معاملے میں وہ دن بدن کنجوس ہوتا جا رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔" اس نے اس کی نقل اتاری اور خفا خفا سی رولر کھولنے لگی، جو اس کے ساتھ مل کر وہ بھی کھولنے لگا، لیکن کہا پھر بھی کچھ نہیں۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس ڈریس کے ساتھ اسے یہی ہیر اسٹائل بنانا ہے، ورنہ وہ باہر جانے کے لیے عموماً" بالوں کو صرف برش کر کے کھلا چھوڑ دیا کرتی تھی۔

وہ اس کے ساتھ اس کے دوست کی ہاؤس وارمنگ پارٹی میں جا رہی تھی۔ نیویارک سٹی میں یہ اس کی پہلی باقاعدہ آؤٹنگ تھی، سوائے شاپنگ کے۔ ڈیڑھ ماہ ایک بند فلیٹ میں بے کار پڑے رہنے کے بعد اسے اس پارٹی میں جانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ پہلی بار شادی شدہ جوڑے کی صورت دوسروں سے ملنے جا رہے تھے۔ اس کے خوابوں میں سے ایک خواب یہ بھی تھا کہ وہ بنی سنوری اس کا ہاتھ پکڑے دوسروں سے متعارف ہو اور وہ ہنستے مسکراتے لوگوں کے ہجوم میں توجہ کا خاص مرکز بنے۔

اور یہی ہوا، پارٹی میں وہ جاتے ہی سب کی توجہ کا مرکز بن چکی تھی۔ خوب صورت تو وہ تھی۔ لیکن جس انداز سے آج وہ تیار ہوئی تھی۔ اس نے اسے اور دلکش بنا دیا تھا۔ پارٹی میں اس کی سوچ سے زیادہ لوگ تھے۔ یہ ایک عام سی ہاؤس وارمنگ پارٹی نہیں تھی۔ پارٹی کے لیے خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ میوزک بینڈ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ہفتے کے اختتام پر ویسے بھی لوگ ہر طرح کی پارٹیز کو بہت انجوائے کرتے ہیں۔

"بہت خوش ہو؟" صرف آدھے گھنٹے بعد ہی وہ اسے لیے کار میں بیٹھا تھا۔

"ہاں۔!" اس نے مسکرا کر کہا۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ وہ ایسا دیکھنا بہرحال نہیں تھا، جو اسے خوش کر دیتا۔

"بہت تعریف کی جا رہی تھی، تمہاری اس لیے۔۔؟"

"یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"اور مردوں نے کی ہے اس لیے بھی؟" یک دم ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔

اس نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ کیا وہ مذاق کر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتی ہی رہی۔ لیکن وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔

"مطلب۔۔؟" اس کی سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہے۔

"مطلب صاف ہے۔ عورتیں ویسے بھی چیلنج پسند کرتی ہیں۔"

"میں نے کس چیلنج کو پسند کیا؟"

"خود کو دیکھو اور یاد کرو، تم نے کس چیلنج کو پسند کیا۔ وہ تمہاری تعریف کر رہے تھے اور تم خوش ہو رہی تھیں، اٹھلا رہی تھیں۔"

"میں صرف مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔"

"مسکرا کر۔۔ ہاں، مسکرا کر بھی۔۔ اپنا آپ

دکھا کر۔۔ خود کو اور نمایاں کر کے۔"

"میں نے کب خود کو نمایاں کیا؟ وہ سب تمہارے ہی دوست تھے۔"

"وہ سب مرد تھے۔" اس نے لفظ چبائے۔

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھے۔ وہ جو بھی تھے، میں ان سے تمہارے تعلق سے مل رہی تھی۔ تم بھی میرے ساتھ ہی تھے۔ تم خود مجھے ملوا رہے تھے ان سے۔"

"وہ تم سے تعلقات بنا رہے تھے یا تم ان سے تعلقات بنا رہی تھیں؟"

"تعلقات؟" اس کی آواز قدرے اونچی ہو گئی۔ "مجھے کسی سے تعلقات بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا تعلق کافی ہے میرے لیے۔"

"ایک ہی تو تعلق کافی نہیں ہوتا نا۔۔ تم سب کے لیے۔" اس نے جانے کیوں یہ طنز کیا اس پر۔

"مجھے کس سب میں شامل کر رہے ہو؟" اسے جھٹکا لگا۔

"وہی جو تم ہو۔"

"کیا ہوں میں؟ بیوی ہوں تمہاری اور کیا ہوں میں؟"

"تو بیوی بن کر ہی رہو۔" وہ بھی اسی انداز میں بولا۔

"بیوی ہی بنی ہوئی ہوں۔ ورنہ تم بتا دو، کیسے بنتے ہیں بیوی۔" اس کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا۔ منہ پھلائے وہ باہر کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" گھر کی طرف جانے والی سڑک کو پہچان کر اس نے پوچھا۔

"گھر۔" اس کی آواز اس کے موڈ سے بھی زیادہ خراب تھی۔

"تم نے کہا تھا ہم ڈنر کے لیے جا رہے ہیں۔"

"ڈنر تم گھر پر کرنا۔"

"تم مجھے اس لیے وہاں سے اتنی جلدی میں لے کر نکلے۔"

"وہاں سے نکلنے کا غم ابھی تک ہے؟"

"وہاں سے واپس آنے کا نہیں، تمہارے جھوٹ پر۔۔ یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسی باتیں کر رہے ہو آج مجھ سے۔"

"اچانک کچھ نہیں ہوتا، ہر چیز کی وجہ ہوتی ہے، کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کا انجام شاید اچانک سامنے آتا ہے۔" گھر کا قفل کھول کر اس نے اسے اندر چھوڑا اور واپس پلٹ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"واپس پارٹی میں، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم آرام کرو۔"

دروازہ لاک کر کے وہ چلا گیا۔ اس نے رک کر اس کے چہرے پر آئے افسوس اور ملال کو بھی نہیں دیکھا اور نہ ہی یہ دیکھا کہ اس نے اسے کتنا آزردہ کر دیا ہے۔

سب سے پہلے اس نے اپنا نیکلس اور بندے اتار کر پھینکے اور پھر اپنے جوتے جھٹکے سے دور پھینک کر کاؤچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اسے غم زیادہ تھا یا غصہ۔ اس کا اندازہ اسے بھی نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو وہ وہیں بیٹھی تھی، بنا کچھ کھائے پیئے۔ ایک ہی انداز سے باہر دیکھتے ہوئے اور وہ بنا کچھ کہے سنے جا کر سو گیا۔

رات گئے تک وہ وہیں بیٹھی رہی۔ بار، بار وہ اس کے انداز اور الفاظ کو اپنے ذہن میں دہرا رہی تھی۔

"اسے کیا ہو گیا ہے۔" وہ خود سے ہی بار، بار یہ سوال کر رہی تھی۔

موڈ اس کا خراب ہونا چاہیے تھا، جبکہ موڈ وہ اپنا خراب کیے رہا۔ کئی دن تک وہ اس سے کھنچا کھنچا رہا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کبھی اسے کہیں لے کر نہیں گیا۔ آئے دن اس کے ہاتھ میں کسی نہ کسی کا دعوت نامہ ہوتا تھا۔ چھوٹی بڑی پارٹیز تو ہوتی ہی رہتی تھیں۔ وہ خود بھی ان میں نہیں جاتا تھا۔ وہ زیادہ شوقین بھی نہیں تھا۔ نیویارک میں جو اس کے قریبی ملنے والے تھے اور جن کے یہاں جائے بغیر رہا نہیں جا سکتا تھا، وہاں وہ اکیلا ہی چلا جاتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگوں کے پوچھنے پر کیا کہتا تھا کہ وہ کیوں نہیں آئی۔

شاید ایک ہی گھسی پٹی بات کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں یا وہ کچھ مصروف تھی... یا وہ ضرور آتی اگر وہ بہت تھکی ہوئی نہ ہوتی... آئندہ وہ ضرور آئے گی... ایسی ہی باتیں شاید وہ انہیں بتاتا ہو۔

اس کی بیوی خوب صورت تھی اور وہ اس خوب صورتی کو گھر میں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک عورت تھی اور وہ اس عورت پر اعتبار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس واقعے اور ان دونوں کی پہلی تکرار نے اسے تیزی سے بدلنے کے لیے ایک مکمل ٹریک دے دیا ہو جیسے۔ بدل تو وہ کچھ عرصہ پہلے سے ہی رہا تھا۔ اس پر اب آشکار ہو رہا تھا' کیونکہ اب دونوں ساتھ تھے۔ ایک دوسرے کے پاس تھے اور وہ اس کا حاکم تھا۔ آہستہ آہستہ اور تیزی سے اس کی جون بدلنے لگی۔

✵ ✵ ✵

کچھ ہی دنوں بعد وہ اس کے سیل فون کو استعمال کرنے پر بحث کر رہا تھا۔ دراصل۔ وہ اس کے پرسنل فون رکھنے پر اعتراض کر رہا تھا۔ نیویارک جیسے ہائی فائی سٹی میں رہتے ہوئے وہ اس کے سیل فون استعمال کرنے پر لڑ رہا تھا۔

"گھر میں فون ہے۔ وہ استعمال کرو۔"

"مجھے گھر کا فون استعمال کرنے پر اعتراض نہیں ہے' مجھے اعتراض فون چھین لینے پر ہے۔"

"اعتراض...؟" تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ تم اعتراض کرو' تمہیں جو کہا ہے تم وہ کرو۔"

"لیکن تم یہ سب کر کیوں رہے ہو؟" وہ روہانسی ہو گئی۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے اور وہ رو دینے کو تھی۔

"تمہیں مجھ سے سوال جواب کرنے ہیں؟" اس نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔

"تمہیں مجھے سولڈ وجہ بتانا ہو گی۔"

"تو پھر سنو... شادی سے پہلے تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ جو میں چاہوں گا تم وہ کرو گی' تم نے کہا تھا نا؟"

"ہاں!" وہ بے بسی سے بولی۔ "میں نے کہا تھا لیکن..."

"لیکن' کیوں' کیسے... اگر تم نے یہ سب پوچھنا ہے تو مجھے نہیں لگتا کہ ہم ایک ساتھ ایک گھر میں رہ سکتے ہیں۔"

وہ آنکھوں میں نمی لیے اسے دیکھنے لگی۔ اتنی جلدی وہ ایسے کیسے علیحدگی کی بات کر سکتا تھا۔ اس کی جان نکل جائے تو بھی اسے شاید اتنی تکلیف نہ ہو' جتنی اس بات سے کہ وہ ایک گھر میں نہیں رہ سکتے۔

"میں نہیں جانتا کہ محبت کرنے والے کیا کیا کرتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" اس نے بے چارگی سے پوچھا۔ "نہ" وہ کر نہیں سکتی تھی اور مان اس کی وہ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ سن نہیں رہا تھا۔ وہ کیا پوچھ رہی ہے۔ وہ بتانا نہیں چاہ رہا تھا۔

✵ ✵ ✵

"یہ کس کا نمبر ہے؟" کب لاک کھول کر وہ گھر آیا' اسے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ ایسے ہی دبے پاؤں گھر میں داخل ہوتا تھا جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس کی غیر موجودگی میں وہاں کچھ ہو رہا ہو گا۔ آتے ہی فون کی طرف لپکا' سی ایل آئی چیک کر کے اب کچن میں کھڑا وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نمرہ آپی کا۔" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ رات کے کھانے کے لیے سبزیاں کاٹ رہی تھی اور آج صرف نمرہ آپی سے ہی اس کی بات ہوئی تھی۔

"انہوں نے شکاگو میں نیا گھر لیا ہے۔ اس لیے نمبر چینج ہے۔ یہ ان کے نئے گھر کا نمبر ہے۔"

اس کی پوری بات سنے بغیر وہ کال ملا چکا تھا۔ دوسری طرف سے سنتے رہنے کے بعد اس نے اسپیکر آن کر دیا۔

"ہیلو...!" دانیال کی آواز آئی۔ "اب بولو بھی... اتنی دیر بات کر کے بھی جی نہیں بھرا کہ دوبارہ..." دانیال کی چہکتی ہوئی آواز درمیان میں ہی بند ہو گئی۔

اس نے کال ڈراپ کر دی تھی۔

"یہ نمرہ تھی؟"

"نہیں... یہ دانیال بھائی تھے۔"

"تو تم نے ان سے اتنی لمبی بات کی ہے؟ کوئی اور نہیں ملا تو دانیال ہی سہی۔" اس نے فون اس کے آگے لہرایا۔

"میں نے آپی سے بات کی تھی۔" اس نے حتی الامکان اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔ "وہ ادھر ادھر ہوں گی۔ تو دانیال بھائی نے فون اٹینڈ کر لیا اور پھر یہ ان کے گھر کا فون ہے۔ وہ نہیں اٹھائیں گے تو کون اٹھائے گا۔ تم پوچھ لو نمرہ آپی سے بات کر کے۔"

"مجھے ضرورت نہیں ہے کسی سے بھی پوچھنے کی۔ میری اپنی عقل اتنا تو کام کرتی ہی ہے۔" اس نے فون کو ڈائننگ ٹیبل پر زور سے پٹخ دیا۔

اس کے بعد اب وہ رات کا کھانا اس کے ساتھ ایک ٹیبل پر بیٹھ کر نہیں کھائے گا۔ وہ اپنا کھانا بھی خود نکالے گا اور اسے لیونگ روم میں بیٹھ کر کھائے گا۔ وہ اسے سوری کہہ بھی دے گی تو بھی وہ یہی سب کرے گا۔ لمبی واک کے لیے نکل جائے گا جو اکثر اتنی لمبی ہو جاتی تھی کہ وہ انتظار کرتے کرتے سو جاتی تھی۔ وہ وضاحت کرتی تو بھی یہی ہوتا' تکرار کرتی تو بھی اور اگر لڑتی تو بھی ایسے ہی ہوتا۔ گھر میں رہ کر وہ ایسے زندگی گزار رہا تھا جیسے وہ وہاں اکیلا ہے۔

وہ اسے گھر سے بلاوجہ باہر نکلنے نہیں دیتا تھا۔ قریبی مارکیٹ تک جا کر گھریلو اشیا کی خریداری جو وہ کیا کرتی تھی' وہ بھی اس نے اپنے ذمے لے لی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ محض لونگ روم میں بنی اس واحد کھڑکی سے باہر کی دنیا سے اپنا رابطہ بحال رکھتی ہے تو اس بات نے اسے کافی تکلیف دی کہ وہ اس گھر میں بند کر دی گئی ہے۔ کیسے؟ اپنے شوہر کی وجہ سے اور کیوں؟ اس سوال کے بارے میں وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر سوچنے کا کام اسے کرنا ہی تھا تو وہ اسے پہلے بہت پہلے کرنا تھا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے گھریلو بیوی چاہیے۔" اکثر وہ اس کی منت کرتی تھی کہ وہ اسے کہیں باہر لے جائے۔ وہ کتنے ہی پیار سے کہتی' جواب اس سے ملتا جلتا ہی ملتا تھا۔

"تو کیا میں گھریلو نہیں ہوں؟ کیا گھریلو بیویاں شوہر کے ساتھ باہر نہیں جاتیں؟ کیا وہ لنچ ڈنر نہیں کرتے یا وہ ایک دوسرے کے ساتھ تفریح نہیں کر سکتے؟"

"تو تمہیں ہر صورت باہر ہی جانا ہے؟ باہر کے لوگ' باہر کی دنیا۔"

"مجھے تمہارے ساتھ باہر جانا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" وہ طنزیہ ہنسا۔

"ٹھیک ہے' ہم باہر نہیں جا سکتے' میں باہر نہیں جا سکتی تو کیا ایک چھت کے نیچے ہم ایک دوسرے کا خیال نہیں رکھ سکتے' ایک دوسرے سے محبت نہیں کر سکتے؟"

"میں نے بتایا تھا محبت نام کی چیز سے میں واقف نہیں ہوں' تمہیں مجھے کتنی بار یاد کروانا ہو گا۔" اس کا لہجہ بھی سپاٹ تھا اور انداز بھی۔

"کہا تھا' بہت کچھ کہا تھا اور میں نے بھی کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ بے تحاشا ہے۔ اتنی زیادہ ہے کہ مجھے خود نہیں اندازہ میری زندگی میں صرف ایک تم ہی ہو' تمہیں سمجھ کیوں نہیں آتا' تمہیں میں نظر کیوں نہیں آتی' تم کیوں ایسا کر رہے ہو؟"

"میں وہ کر رہا ہوں' جو مجھے ٹھیک لگتا ہے۔"

"تم مجھ پر شک کرتے ہو۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ محبت تو دور کی بات ہے' ہم دونوں میں تو کوئی رشتہ ہی نظر نہیں آتا۔ تم اپنی اور میری زندگی کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔ کیا تمہیں محسوس نہیں ہو رہا کہ کیا کچھ غلط ہو رہا ہے۔"

"غلط... ہونہہ...! وہ تو کہیں نہ کہیں ہو ہی رہا ہوتا ہے۔"

"تمہاری بیوی کیا غلط کرے گی۔"

"غلط تو کوئی بھی کبھی بھی کر سکتا ہے۔" وہ بے حد

سنجیدہ تھا۔

"کوئی بھی۔" اس نے زیر لب کہا۔ عام حالات میں وہ اس کے اس طرح کہنے پر شاید تالیاں بجاتی کہ وہ بنا جانے اتنی ٹھیک باتیں کیسے کر سکتا ہے۔ اس نے کیسے جان لیا کہ کوئی بھی کبھی بھی کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن اب وہ اس کے سامنے کھڑی اس سب کا الزام لے رہی تھی اور وہ اپنے ملال پر تالیاں نہیں بجانا چاہتی تھی۔

وہ اتنی سنجیدہ باتیں کرنے لگا تھا اور یہی سنجیدگی اسے اس سے دن بدن دور کرتی جا رہی تھی۔ وہ ہر دن، ہر بار کچھ سے کچھ بنتا جا رہا تھا۔ شادی سے پہلے کی دوستی تو وہ بھول ہی چکا تھا۔ ایسے جیسے وہ اسے جانتا ہی نہیں اور اگر جانتا ہے تو صرف اتنا کہ وہ اس کی بیوی ہے اور بس۔ وہ اسے رکھ کر بھول نہیں گیا تھا۔ وہ اسے فراموش کر رہا تھا۔ ہر آنے والے دن پہلے سے زیادہ۔۔۔

آئے دن ان دونوں کی تکرار اور اس کے عجیب و غریب رویے معمول بنتے جا رہے تھے۔

ایک رات اس نے اسے بلاوجہ گالی دے دی۔ وہ کافی دیر سے سنجیدہ سا سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔ وہ اتنا گم تھا کہ اپنے ہاتھ سے بنائی کافی پینا بھی بھول گیا تھا۔ کافی سامنے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اس نے صرف اس کے پاس جا کر اس کا شانہ ہلا کر اسے متوجہ کیا تھا۔

"تمہاری کافی۔۔۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے، کہاں گم ہو تم۔" اس نے بہت محبت سے، اس سے کہا تھا۔ وہ جانتی تھی، وہ تھک جاتا ہے۔ اسے یہ بھی فکر تھی کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پڑھ پڑھ کر تھک چکا ہے اور سونا چاہتا ہے، لیکن صرف پڑھائی کی وجہ سے سو نہیں رہا۔

اس نے چونک کر اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے یاد کر رہا ہو کہ وہ کون ہے اور وہاں کیا کر رہی ہے۔

"یو بِچ!" اس نے حلق کے بل چلا کر کہا۔ اس کشادہ فلیٹ میں اس کی آواز بری طرح گونجی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" ساتھ ہی اس نے دو، تین اور گالیاں دیں۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دے گا۔

"میں تمہیں بِچ لگتی ہوں؟" غصے سے اس کا خون ابلنے لگا۔

"تم ہو۔۔۔"

"تم۔۔۔" اس کی گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ "مجھے گالی کیوں دے رہے ہو؟"

"خدا کے لیے جاؤ یہاں سے، مجھے اکیلا چھوڑ دو، نکل جاؤ یہاں سے۔" اس نے اپنا سر تھام لیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" اس نے ہمدردی سے اسے دیکھا اور اس کے قریب آ کر اس کا سر سہلانے لگی۔

"کہا ہے، نا جاؤ۔۔۔ مجھے تمہاری شکل نہیں دیکھنی۔" اس نے اس کا بڑھتا ہاتھ جھٹکا۔

"تمہیں اپنی بیوی کی شکل نہیں دیکھنی؟" اس کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ وہی شکل جس پر اسے بہت ناز تھا، جو بہت پیاری، من موہنی لگتی تھی۔

"میں کیوں جاؤں تمہیں چھوڑ کر، نہیں جاؤں گی میں۔"

"کوئی نہ کوئی تو ہو گا ہی جس کے پاس تم جا سکو، کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تو چھپا کر رکھا ہی ہوتا ہے نا۔"

"کوئی نہیں ہے۔۔۔ کوئی نہیں ہے ایسا جسے میں چھپا کر رکھوں، صرف تم ہو میرے۔" وہ اس کے رویے پر دکھ سے چلانے لگی۔

"چلاؤ مت۔" اپنا سر تھامے وہ کمرے سے نکل گیا۔ وہ اسے جاتا ہوا دیکھنے لگی۔ "بِچ" اسے اس کی گالی کی بازگشت چاروں طرف سنائی دی۔

اور پھر دوسرے کمرے میں سونا اس کا معمول بننے لگا۔ وجہ بے وجہ وہ خود کو دونوں اس سے الگ رکھتا۔ وہ اس سے کبھی بات کر لیتا کبھی نہ کرتا، وہ پھر بھی بہانے بہانے سے اسے مخاطب کرتی۔ اس کے آس پاس رہتی۔۔۔ وہ وہیں تھا مگر۔۔۔ بہت دور۔ ایسے جیسے وہ اس کے ساتھ زندگی گزار کر تھک چکا ہے اور اب فرار چاہتا ہے۔ ایسا لگتا جیسے ان دونوں کو زبردستی ساتھ رہنے کی سزا دی گئی ہے۔

کچھ دن اور اس نے اس کے روکھے رویے کو برداشت کیا۔ پھر وہ ہمت کر کے اس کے کمرے میں آ گئی۔ کتابیں سامنے رکھے وہ سوچوں میں گم تھا۔ وہ ویرانی جو اس گھر میں تھی، ان دونوں کے درمیان آ گئی تھی، اس کی آنکھوں میں بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

"میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ اس سب کے بارے میں جو ہمارے درمیان چل رہا ہے۔" اس نے آواز پر صرف نظر اٹھا کر ہی اسے دیکھا۔

"میرا دماغ شل ہو گیا ہے یہ سوچ سوچ کر کہ تم چاہتے کیا ہو۔ تم چاہتے ہو میں گھر میں رہوں، ٹھیک ہے میں کبھی باہر نہیں نکلوں گی۔ کسی سے نہیں ملوں گی۔ نہ ہی کسی سے بات کروں گی اور۔۔۔ اور کیا چاہتے ہو؟"

وہ خاموشی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"تم جو کہو گے میں وہ کروں گی، جیسے کہو گے ویسے ہی کہوں گی، میں خود کو اس گھر میں بند کر لوں گی، باہر کی دنیا کو بھی میں اپنے ذہن سے نکال دوں گی۔ میں وہ پہنوں گی جو تم چاہتے ہو۔ وہ سنوں گی جو تم بولو گے۔ میں تمہارے ہر حکم کی تعمیل کروں گی۔ میرا یقین کرو، میں سب کروں گی، بس اس گھر میں میری دنیا بسا دو، تم جانتے ہو، تم ہی میری دنیا ہو۔ کیا کمی ہے مجھ میں؟ کیا ہے جو میں نہیں کرتی۔ کیا ہے جو میں نے نہیں کیا۔ تمہارے لیے اپنی اسٹڈیز چھوڑ دی۔"

"میرے لیے۔۔۔؟" اس نے شاید صرف آخری بات سنی تھی۔

"نہیں۔ اپنے لیے۔۔۔ اپنی مرضی سے تاکہ میں تمہارے ساتھ رہ سکوں۔ لیکن میرے ساتھ رہ کر بھی تم میرے نہیں۔ شادی کو ایک سال بھی نہیں ہوا اور تم نے اپنا بیڈ روم الگ کر لیا۔ تمہاری بیوی ماں بننے والی ہے اور تم اس سب کی پروا کیے بغیر اسے جذباتی دکھ دیتے ہو۔ اگر میرا خیال نہیں رکھ سکتے تو کم سے کم میرے ساتھ، میرے پاس تو رہو۔ محبت نہیں کر سکتے، ہمدردی تو کر سکتے ہو نا۔ سہارا نہیں دے سکتے، خیال تو رکھ سکتے ہو نا۔ اتنا تو کر ہی سکتے ہو تم۔"

"میں خود سے بے اختیار ہو چکا ہوں۔۔۔ میرا یقین کرو۔۔۔ ہماری زندگیوں میں جو کچھ چل رہا ہے، یہ سب ٹھیک نہیں ہے، جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے، وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا۔ میرے پاس اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔ تم طلاق لے لو مجھ سے۔۔۔ مجھ سے علیحدگی ہی بہتر ہے تمہارے لیے۔"

"تم مجھ سے علیحدہ ہونا چاہتے ہو؟" اس نے بمشکل خود کو سنبھال کر اس سے پوچھا۔

"تمہیں مجھ سے ہو جانا چاہیے۔" اس نے نظریں چرائیں۔

"صرف اس لیے کہ مجھے تم سے شکایتیں ہیں، تم انہیں دور کرنے کے بجائے مجھے خود سے علیحدہ ہونے کے لیے کہہ رہے ہو؟" اس نے غم ناک نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں!"

"تم میرے ساتھ رہنے کے لیے کوشش بھی نہیں کر سکتے؟ تم ایک شوہر، ایک باپ، ایک دوست۔۔۔ کچھ بھی نہیں بن سکتے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے بے قراری سے آس پاس دیکھا۔

"تو تمہیں کیا معلوم ہے؟"

"کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں، مجھے کیسے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔" وہ ہسٹریائی چلانے لگا۔ وہ سہم کر اسے دیکھنے لگی۔

اس کے انداز نے اسے سن کر دیا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے بت بن گئی۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ تکلیف میں تھے۔

وہ اس سے شکایت بھی نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اس کا انجام اس کی طرف سے شاید علیحدگی کی صورت سامنے آئے۔۔۔ پہلے وہ تکرار بھی کر لیتی تھی۔ مگر اب

اسے لگ رہا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکے گی۔

"یہی وہ محبت ہے، جس کی اس نے چاہ کی تھی؟"

شکست خوردگی سے چلتی وہ اپنے بیڈ پر گر سی گئی۔ ایک گھر میں ہی رہتے ہوئے وہ اسے یاد کرتی تھی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ اس سے ملنے کی گھڑیاں گنتی تھی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ اسے دیکھنے کے لیے ترستی تھی۔ یہ سب کچھ ساتھ رہتے ہوئے تھا۔ اگر وہ اس سے علیحدہ ہو گئی تو وہ مر ہی جائے گی۔

"کاش میں مر ہی گئی ہوتی۔" آنسو بہاتے رہنے کے بعد اس نے خود کو کوسا۔

☼ ☼ ☼

اس نے ٹھیک کہا تھا کہ اس پر اس کا اختیار ہی نہیں۔ حسام کی پیدائش سے بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ البتہ اس کے چند ماہ کے ہوتے ہی اس نے اسے اپنے ساتھ بیڈ روم میں سلانا شروع کر دیا تھا۔ رات کو جب وہ اٹھ کر رونے لگتا تو وہ اسے خود ہی بہلاتا اور فیڈر بنا کر دیتا۔

اس نے حسام کو ہی اپنا ساتھی بنا لیا تھا۔ حسام کے زیادہ تر کام وہ خود ہی کرتا تھا۔ زیادہ وقت بھی اسی کے ساتھ گزارتا تھا اور اپنی ساری باتیں بھی اسی کے ساتھ کرتا تھا۔ وہ حسام کو بھی اس سے دور کر رہا تھا۔ ایک رات وہ رونے لگا۔ اس نے حسام کو اس سے لینا بھی چاہا مگر وہ خود ہی اسے بہلاتا رہا۔

"تم نے خود کو الگ تھلگ کیا ہی تھا۔ تم میرے بیٹے کو بھی مجھ سے الگ کر رہے ہو۔" وہ حقیقتاً "بہت دکھی ہو گئی۔

"یہ میرا بیٹا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ اپنے باپ کے زیر سایہ پرورش پائے۔" اس کا وہی پرانا انداز تھا۔

"وہ اپنی ماں کے زیر سایہ بھی بڑا ہو سکتا ہے۔" اب اس کے انداز میں غصہ، تاسف، حیرانی، الجھن کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

"ایک عورت اس کی ماں ہے۔" وہی کاٹ۔

"تمہاری ماں بھی عورت تھی۔"

"میری ماں دنیا کی پہلی اور آخری عورت ہے، جس پر میں اعتبار کرتا ہوں۔"

"ہر ماں پر اعتبار کیا جاتا ہے۔"

"ہر ماں پر... اور تم میری ماں نہیں ہو۔"

"تم نے اتنی خطرناک باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں... حسام کو یہ باتیں مت سکھانا۔"

"اسے کچھ بھی سکھانے کے لیے تمہارے پاس نہیں لاؤں گا..." وہ اپنی سوچ کا اظہار ہی نہیں کر رہا تھا، وہ ان پر یقین بھی کرتا تھا۔ گھر میں اب صرف حسام تھا، جس کی آوازیں گونجتی تھیں اور اسی کے لیے اس نے وہ تنگ سا فلیٹ چھوڑ کر ایک چھوٹا سا آراستہ گھر لے لیا۔ جس کے پیچھے ایک چھوٹا سا لان تھا۔ جہاں وہ حسام کو لیے کھیلتا رہتا۔ جیسے اس گھر میں صرف وہ دونوں باپ، بیٹا ہی رہتے تھے۔ ویسے بھی اس گھر میں گھر والی کوئی بات تھی ہی کہاں۔ وہاں ایک عورت تھی، جسے ہر گزرتے وقت کے ساتھ ناپسند کیا جا رہا تھا اور ایک مرد تھا، جس سے محبت کی گئی تھی اور یہی اس کی کمزوری تھی اسی کمزوری کی وجہ سے وہ مسلسل نقصان میں تھی۔ اس کے سب دن ایک جیسے ہو چکے تھے۔ بے معنی اور بے لطف، وہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے الگ الگ سمت میں جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"پاپا! ہمارے گھر بے بی ڈول کب آئے گی؟" اوپن کچن میں کھڑی وہ کام کر رہی تھی۔ جب حسام نے اپنے پاپا سے پوچھا۔ کام کرتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ حسام اس سے بھی بہت دفعہ پوچھ چکا تھا۔ وہ آج کل اسی طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ اسکول سے واپسی پر جب وہ دونوں واک کرتے ہوئے گھر کی طرف آ رہے ہوتے تو یہ اس کا پسندیدہ موضوع ہوتا بات کرنے کے لیے۔ اس کے دوست نے اپنی چھوٹی سی بہن کے بارے میں اس سے اتنی ساری باتیں کیں کہ حسام کی بھی خواہش ہو گئی کہ اسے ایک چھوٹی بہن چاہیے۔

"مجھے نہیں معلوم حسام! اپنے پاپا سے پوچھو۔"

اس کے مسلسل سوالوں سے عاجز آکر اس نے غصے میں اسے جھڑک دیا تھا سو اب وہ اپنے پاپا سے ہی پوچھ رہا تھا۔

"ڈول۔۔۔؟" وہ الجھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"لیس۔" وہ الجھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"حسام میری جان ہے اور جان صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ ہمیں ڈول نہیں چاہیے۔"

"پھر میں کس سے کھیلوں گا؟" وہ اداس ہو گیا۔

"مجھ سے۔۔۔"

"لیکن آپ تو بڑے ہیں اور آپ ہر وقت میرے پاس بھی نہیں ہوتے' وہ ہر وقت میرے پاس رہے گی۔ میں اسے مار بھی سکتا ہوں اور اسے اٹھا بھی لوں گا۔"

"اگر تم چاہو تو میں ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گا۔ کوئی کام نہیں کروں گا۔ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں۔۔۔ اتنی۔۔۔" اس نے اپنے بازو پھیلائے۔

"میں بھی۔۔۔" حسام نے بھی اسی انداز میں بازو پھیلائے۔ "اتنی۔۔۔ اتنی۔"

"تمہیں پتا ہے' دنیا میں ایک ہی محبت ہوتی ہے' باپ اور بیٹے کی' تمہاری اور میری۔"

"اور ماما کی؟ ماما کہتی ہیں کہ وہ مجھ سے سب سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ ماما کی بھی نا' ہے نا پاپا؟"

"ماما کی بھی۔۔۔ اگر وہ عورت نہ ہو تو۔۔۔"

اس بات نے ایک بار پھر سے اس کے کام کرتے ہاتھوں کو روک دیا۔

کچن سے تیزی سے نکل کر اس نے حسام کو اس کی گود سے اٹھایا اور اس کا سر چوما "آئی لو یو بیٹا۔" اور دیر تک اسے سینے سے لگائے رکھا۔

"میرے بیٹے کو تو میری محبت پر یقین کرنے دو۔"

"میں چاہتا ہوں وہ انسانوں کو جان لے۔"

"تم کیا چاہتے ہو' مجھے نہیں معلوم' ان سالوں میں مجھے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ تمہیں کیا چاہیے۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ تم نے خود تو مجھے محبت دی نہیں' تم چاہتے ہو' مجھے حسام کی محبت بھی نہ ملے۔ تم چاہتے ہو وہ تمہارے جیسا بن جائے۔"

"میں یہی تو چاہتا ہوں کہ وہ مجھ جیسا نہ بنے۔" وہ چلانے لگا۔ "اپنے باپ کی طرح اندھا' بہرا نہ بنے۔ وہ آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھے۔ اس کے ہر ڈھنگ کو دیکھے۔ وہ دیکھے کہ دنیا کے کتنے رنگ ہیں۔ وہ دیکھے کہ لوگوں کے کتنے روپ ہیں۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اسے صرف کتابیں ہی نہیں پڑھنی' اسے لوگوں کو بھی پڑھنا ہے۔ اسے میری طرح لوگوں کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بننا۔" اس کی آواز اونچی ہی ہوتی چلی گئی۔

"کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم۔۔۔ یہ کہ میں بدکردار ہوں' بدنیت ہوں' بری عورت ہوں؟ میں نے مان لیا کہ میں بری ہوں' بہت بری ہوں' لیکن میں بدکردار نہیں ہوں۔ میں نے دھوکے دیے ہوں گے۔ لیکن میں نے تمہیں' تمہاری بیوی کی حیثیت سے کبھی کوئی دھوکا نہیں دیا۔ تم جو کرنا چاہتے ہو' میرے ساتھ کرو' جس طرح سے تم خوش اور مطمئن ہونا چاہتے ہو' ہو جاؤ' مجھے گھر سے نکال کر باہر پھینک دو' لیکن اب بس کرو۔ اتنی سزا کافی ہے میرے لیے اس محبت کی جو میں نے تم سے کی۔

تمہاری بیوی تمہارے رہتے تھک چکی ہے' وہ مردہ ہونے کو ہے اور تم اندھے اور بہرے بنے ہوئے ہو۔ کیسے مسیحا ہو تم' اپنی بیوی کا علاج نہیں کر سکتے؟"

حسام سہما ہوا کھڑا اس کا ہسٹریائی انداز دیکھ رہا تھا۔

"نفرت کرتے ہو مجھ سے۔۔۔ تمہیں نفرت کرنا بھی چاہیے۔" وہ اور چلا کر بولی۔ آنسو اس کے گال بھگو رہے تھے اور اس کا وجود کانپ رہا تھا۔

لیکن صرف مجھ سے' ہر عورت سے نہیں' تم سے محبت کا اتنا بھیانک انجام ہو گا کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ میں کتنا بھیانک انجام دیکھنے جا رہی ہوں۔ روتے روتے میں تھک چکی ہوں۔ میرے اندر کی گھٹن اتنی بڑھ گئی ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں خود کو ختم کر لوں۔"

وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ اس نے سنا ہی نہیں۔ اور وہ اسے سنا بھی نہیں رہی تھی۔ وہ تو خود کو یاد دلا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

میڈیکل کالج میں داخلہ کے لیے میں نے اپنا ایک قیمتی سال ضائع کیا تھا۔ میں اسے ضائع ہی کہوں گی' کیونکہ میڈیکل کے لیے میرا میرٹ نہیں بنا تھا اور مجھے دوبارہ پیپرز دینے تھے۔ جس کے لیے میں نے دن رات صرف پڑھائی کی۔ اتنی پڑھائی کی کہ میڈیکل اسٹاف کو مجھے ایڈمیشن دیتے ہوئے اعزاز سے کم احساس نہ ہو۔۔۔ انہیں یہ احساس ہوا یا نہیں' لیکن مجھے ایڈمیشن مل گیا اور اس طرح میں' میں اپنی کلاس فیلوز سے ایک سال اور قدسیہ سے پورے دو سال پیچھے رہ گئی تھی۔

میڈیکل کے لیے میری اتنی محنت کو سب سے زیادہ میرے پاپا نے اہمیت دی۔ وہ اتنے متاثر ہوئے کہ کالج کے پہلے دن میرے پاس میری زیرو میٹر کار تھی۔ جہاں خاندان میں سب ڈیزائننگ اور میڈیا اسٹڈیز پڑھ رہے تھے۔ وہاں صرف میں تھی جو میڈیکل کے لیے اتنی محنت کر رہی تھی۔

میری اور قدسیہ کی دوستی بھی شاید اسی لیے ہوئی کہ ہم اکثر میڈیکل لائف ڈسکس کرتے تھے۔ قدسیہ کو تو خیر جنون تھا ڈاکٹر بننے کا۔ وہ مجھ سے اسکول میں ایک سال سینیئر تھی۔ ہماری دوستی اسکول بس سے شروع ہوئی۔ کالج میں بھی وہ ایک کلاس سینیئر ہی تھی' لیکن اس سب سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا کہ ہم ایک کلاس میں ہیں یا نہیں۔

کلاسز کے علاوہ ہمارا سارا وقت ایک ساتھ ہی گزرتا تھا۔

دوستی کے معاملے میں' میں ذرا سہل پسند تھی۔ دوستوں کے مخصوص ہنگامے 'لڑنا جھگڑنا' شور شرابا مجھے متاثر نہیں کرتے تھے۔ اگر قدسیہ بھی میری دوست نہ ہوتی تو شاید کوئی اور بھی نہ ہوتی۔ قدسیہ سے دوستی بھی بہت سست روی سے آگے بڑھی تھی۔ ایک ڈیڑھ سال تک تو ہم نے اپنے فون نمبرز کا تبادلہ بھی نہیں کیا تھا اور مجھے کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی کہ میں گھر آکر بھی دوست سے چپکی رہوں۔

تعلیم کے علاوہ میری اپنی مصروفیات تھیں اور مجھے عادت نہیں تھی کہ میں اپنی مصروفیات میں اِدھر اُدھر کے لوگوں کو شامل کروں۔ نہ ہی قدسیہ میرے لیے وہ دوست تھی جس کے کانوں میں گھس کر میں اسے ہر بات' ہر خیال' ہر خواب بتایا کرتی۔ میں خود اپنی دوست تھی۔ ہاں! ہم دونوں بس اکثر میڈیکل لائف ضرور ڈسکس کرتے۔

اسکول سے کالج آنے تک ہماری دوستی کافی اچھی ہو چکی تھی۔ میرے ایک دن کالج نہ آنے پر وہ خاص فون کر کے میرا خیال پوچھتی۔ میرے بیمار ہونے پر وہ دن میں کئی کئی بار فون کرتی۔ وہ میرے لیے بالکل میرے گھر والوں کی طرح فکرمند رہتی۔ مجھ سے زیادہ اسے فکر رہتی تھی کہ میرے بال رف ہو رہے ہیں' ناخنوں کی چمک ماند پڑ چکی ہے اور گالوں پر سے دانوں

کے نشان نہیں جا رہے۔

قدسیہ جانتی تھی کہ اسے کب بولنا ہے اور کب خاموش رہنا ہے۔ میں قدسیہ کے ساتھ بہت مطمئن تھی۔ کالج میں ہم ایسی بیسٹ فرینڈز مشہور تھیں جو ایک دوسرے کے علاوہ کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

میرے کالج آنے سے پہلے تک قدسیہ کی کافی ہائے ہیلو تھی کالج میں۔ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی جب آتے جاتے' اٹھتے بیٹھتے لڑکیاں پانچ' پانچ' دس' دس منٹ قدسیہ سے گپ شپ کرتی تھیں۔ میں نے قدسیہ سے کچھ کہا تو نہیں' لیکن قدسیہ کافی سمجھ دار تھی۔ آہستہ آہستہ قدسیہ نے اپنا حلقہ محدود کر دیا۔ وہ کم بولتی تھی' لیکن چونکہ وہ سنتی بہت اچھا تھی' اس لیے سب اسے پسند کرتے تھے۔ تھوڑے سے زیادہ وہ صرف مجھ سے بولتی تھی اور کافی سے زیادہ مجھ سے سنتی تھی۔ اکثر لڑکیوں کا کہنا تھا کہ قدسیہ میری خوب صورتی سے متاثر ہے اور اتنی زیادہ متاثر ہے کہ وہ مجھ سے بلاوجہ چپکی رہتی ہے اور صرف مجھے ہی دوست بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ قدسیہ نے ایک' دوبار ایسی باتیں سنیں اور وہ دل کھول کر ہنسی۔

"مجھے تو اس سے محبت ہے۔" وہ میرے گالوں کو تھپتھپاتی جیسے چھوٹے بچوں کو کیا جاتا ہے۔

"مائی ڈول!" اس وقت اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور چمک دار ہو جاتیں۔ مجھے قدسیہ کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ روشن اور چمک دار۔

☼ ☼ ☼

قدسیہ بہت خوش تھی کہ آخر کار ہم پھر سے ایک ساتھ پڑھنے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اب وہ مجھ سے دو سال سینیر ہو چکی تھی۔ لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا تھا' ان لوگوں کے گروپ نے مجھے بہت اچھے انداز سے خوش آمدید کہا۔ میرا خاص خیر مقدم کیا' جیسے سالوں سے میرا انتظار کیا جا رہا تھا۔

"قدسیہ اور ارفعان کے گروپ نے۔"

ارفعان کا نام میں نے دو سال پہلے سنا تھا۔ جب قدسیہ نے نیا نیا کالج جوائن کیا تھا۔ ویسے تو قدسیہ میری دوست ہے لیکن میں نے کبھی اس کی باتوں کو ذرا زیادہ غور سے سننے کی کوشش نہیں کی' نہ ہی مجھے وہ یاد رہتی تھیں۔ کئی بار اس نے مجھے اپنے کزنز کے بارے میں بتایا اور میں ہر بار کسی نئے تذکرے پر بھول جاتی تھی کہ وہ کس کی بات کر رہی ہے۔ وہ برا نہیں مانتی تھی' بلکہ نئے سرے سے مجھے یاد کرواتی تھی کہ وہ کس کی بات کر رہی ہے۔ میرے مزاج میں حاکمیت تھی اور قدسیہ اس حاکمیت میں محکوم کا کردار ادا کرتی تھی۔ اگر وہ محکوم نہ بھی ہوتی تو بھی وہ حاکم نہ بنتی۔ میں اس کے لیے خاص تھی۔ وہ میری ہر ادا' ہر انداز کو سراہتی تھی۔ وہ بالکل ماؤں کی طرح مجھ سے پیار کرتی تھی۔

ارفعان کا ذکر اس نے بارہا کیا تھا۔ ایک عرصے تک میں یہ سوچتی رہی تھی کہ اس تذکرے کو میں نے نظر انداز کیوں کیا۔ قدسیہ مجھے ارفعان سے ملوا رہی تھی اور میں اسے دیکھ رہی تھی۔ دراصل قدسیہ صرف مجھے لے کر ارفعان کے پاس گئی تھی۔

"حوریہ!" وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ وہ بالکل اسی طرح مسکرا رہا تھا۔ جیسے قدسیہ مسکرا رہی تھی۔ اسی محبت اور چاہ سے۔

"اتنا انتظار کروایا تم نے۔" اس کا اشارہ میرے گیپ کی طرف تھا۔

وہ اتنی نرمی اور اس انداز سے بول رہا تھا کہ اسے سننا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ "ہم دونوں کے گروپ میں' میں سینیر تھا اور یہ جونیر۔" اس نے قدسیہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اب تم اس سے جونیر آگئی ہو۔"

"اور میں بیچ میں۔" قدسیہ ہنسنے لگی۔

"ہم دونوں کے بیچ میں۔" یہ بات بھی میں نے کچھ عرصے بعد سوچی تھی۔

قدسیہ کی کلاس تھی۔ ارفعان مجھے کالج دکھانے لگا۔ مجھے میری کلاسز دکھائیں اور ساتھ ساتھ وہ مجھے

کالج کے واقعات بھی سنا رہا تھا۔ اگر میں کچھ وقت سوچنے کے لیے لیتی تو بھی یہی نتیجہ نکلتا کہ مجھے وہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

ارفعان..... وہ غیر معمولی خوب صورت نہیں تھا۔ یہ تو پہلی ہی نظر نے بتا دیا تھا مگر صرف اگلے ہی چند لمحوں نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ خوب ہے۔ اسے جانچنے کا عمل میں نے اس پر پہلی نظر پڑتے ہی شروع کر دیا تھا۔ کیوں کر دیا تھا۔ یہ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں اس کا ہاتھوں کو اٹھانا' ہونٹوں کو ہلانا' نرمی سے مسکرانا' سر کو ہلانا' سب دیکھ رہی تھی اور غور سے دیکھ رہی تھی۔

کہاں کا میڈیکل کالج اور کہاں کی لائف..... مجھے تو کالج میں کوئی اور نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ قدسیہ سے ایک کلاس سینیر تھا اور مجھ سے تین سال وہ میرے بارے میں وہ سب جانتا تھا جو قدسیہ میرے بارے میں جانتی تھی۔

اور میں..... میں بھی اس کے بارے میں سب جانتی ہوتی' اگر میں نے وہ تمام باتیں ذرا غور سے سنی ہوتیں جو قدسیہ اکثر سنایا کرتی تھی۔ کیا ارفعان کا ذکر بھول جانے کے لائق تھا؟ پہلے دن کالج سے آنے کے بعد میں دیر تک یہی سوچتی رہی۔ اس کا نام نظر انداز کیا جا سکتا ہے' وہ نہیں۔

میں بار بار نئے سرے سے ارفعان سے پہلی بار ملنا یاد کر رہی تھی۔ پہلے دن کے لیے میں نے اپنی ڈریسنگ کا بہت خاص خیال رکھا تھا۔ میک اپ میں ویسے بھی نہیں کرتی تھی۔ کھلے بالوں کو گردن کے ایک طرف آگے رکھ لینا ہی کافی ہوتا تھا۔ مجھے یہ فکر ستائے جا رہی تھی کہ کیا میں نے ارفعان کو متاثر کیا۔ اسے میں کیسی لگی۔ شاید میں اتنی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ کالج کے پہلے دن کی فلم ہزاروں بار میں نے اپنے ذہن میں چلائی۔ اکثر لوگ مجھ سے ملتے ہی میری تعریف کرتے تھے۔

جب قدسیہ مجھے اپنے ساتھ لیے جا رہی تھی تو اس کی ہماری طرف پشت تھی۔ وہ اپنے آئی فون کے ساتھ مصروف تھا۔

"ارفعان!" قدسیہ نے دو قدم کے فاصلے سے اسے متوجہ کیا۔ وہ پلٹا ایسے جیسے کب سے انتظار کر رہا ہو۔

"حوریہ۔" اس نے صرف میری طرف دیکھا۔

میرا نام ہی اچھا تھا یا مجھے اس وقت اچھا لگا۔

ارفعان صرف مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ صرف میری طرف متوجہ تھا۔ وہ یہ سب دوستی کے لیے کر رہا تھا' قدسیہ کے لیے یا..... حوریہ کے لیے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن میں پہلے دن سے بھی زیادہ شوق سے کالج گئی۔

"ارفعان کہاں ہے؟" میں نے قدسیہ سے سب سے پہلے اسی کا پوچھا۔

"کل بتا رہا تھا کہ کچھ کام ہے اسے' اس لیے نہیں آیا۔" قدسیہ مجھے پتا نہیں اور کیا کیا بتانے لگی' لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔ ارفعان کو کالج آنا چاہیے تھا۔ اپنی کلاس میں بیٹھی میں سوچ رہی تھی۔ میڈیکل میں ایڈمیشن کے جنون سے فارغ ہونے کے بعد میرا ذہن اب اتنا پر سکون تو تھا کہ کسی اور کے بارے میں سوچ رہا تھا اور میں وہ باتیں یاد کر رہی تھیں جو قدسیہ گاہے بگاہے مجھے بتاتی رہتی تھی۔

"سینیرز کے بھونڈے مذاق سے میری آنکھوں میں آنسو ہی آگئے تھے۔"

مجھے کچھ کچھ یاد آنے لگا تھا کہ قدسیہ نے بتایا تھا۔

"کوئی دوست بھی نہیں تھی وہاں' ایک دو کلاس فیلوز تھیں' وہ بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا' وہیں کہیں بیٹھ کر رونا شروع کر دوں اور میں رو ہی پڑتی۔ اگر وہ لڑکا میرے پاس نہ آتا۔ اس نے مجھ سے

لائبریری کا پوچھا۔ میں خود اتنی حواس باختہ تھی اُسے کیا بتاتی۔ نفی میں دو تین بار سر ہی ہلا دیا۔

"کیوں نہ ہم مل کر لائبریری ڈھونڈیں؟" اس نے پوچھا۔

اس کا انداز اتنا اچھا تھا کہ وہ مجھے وہاں غنیمت ہی لگا' تھوڑا سا چلنے کے بعد ہم دونوں لائبریری کے سامنے آگئے۔

"کسی بھی مذاق کو اتنا دل پر نہیں لیتے کہ اس کے لیے آنسو ضائع کیے جائیں۔ لائبریری میں بیٹھ کر خود کو ریلیکس کریں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہم دوبارہ بہت اچھے انداز میں ملیں گے۔"

وہ ارفعان تھا' مجھے یاد آگیا تھا' قدسیہ کا پہلی بار ارفعان سے ملنا۔

پھر... پھر کیا ہوا۔ مجھے یاد نہیں اور مجھے یاد آرہا ہے کہ میں نے "پھر" قدسیہ سے پوچھا بھی نہیں تھا لیکن اب تو اس "پھر کو پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی کیونکہ دونوں کی دوستی ان کے پھر ملنے کا ثبوت تھی۔ قدسیہ یقیناً" ارفعان سے ملنے نہیں گئی ہوگی۔ یہ ارفعان ہی ہوگا' جس نے سارا کالج چھوڑ کر اسے دوست بنایا ہوگا۔

ارفعان کے بھی بہت کم دوست تھے اور ان میں سے ایک قدسیہ... مگر قدسیہ ہی کیوں؟

دو سال تک جب میں ارفعان کے قصے سنتی رہی تھی یا یوں کہنا چاہیے کہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتی رہی تھی۔ اس وقت مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ آخر قدسیہ ہی ارفعان کی دوست کیوں ہے۔ وہ قدسیہ کے ساتھ ہی زیادہ وقت کیوں گزارتا ہے۔ اسے ہی اپنے نوٹس کیوں دیتا ہے۔ اسی کی پڑھائی میں اتنی مدد کیوں کرتا ہے اور قدسیہ جیسی کم بولنے والی لڑکی سے وہ اتنی باتیں کیسے اگلوا لیتا ہے۔

فرینڈ شپ ڈے پر ارفعان نے قدسیہ کو خود اپنے ہاتھوں سے ایک آئل پینٹنگ بنا کر دی تھی۔ قدسیہ مجھے خاص دکھانے کے لیے وہ پینٹنگ لائی تھی۔

"نخلستان..." نخلستان میں ایک چھوٹا سا گھر بنا ہوا تھا۔ گھر کے پیچھے سورج کی کرنیں اسے روشن کر رہی تھیں۔ مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ یہ جاننے میں کہ ارفعان نے یہ خود بنا کر قدسیہ کو دی ہے اور کیوں دی ہے۔ قدسیہ مجھے پینٹنگ کے بارے میں بتاتے ہوئے بے حد خوش نظر آرہی تھی۔ تو وہ دیا جانے والا نخلستان ارفعان کا تھا' جہاں میں نے ارفعان سے متعلق بتائی گئی بہت سی اور باتیں یاد کی' مجھے یہ بات بھی یاد آگئی۔

مجھے یہ یادداشت کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی۔ فرینڈ شپ ڈے پر قدسیہ بھی ارفعان کو گفٹ دیتی تھی اور مجھے دکھا کر دیتی تھی۔ ارفعان نے اسی کا دیا فرینڈ شپ بینڈ پہن رکھا تھا۔

اگلے دن اور پھر اس سے اگلے دن میں نے خود کو ارفعان کا جائزہ لیتے ہی پایا۔ وہ صرف بولتا نہیں تھا بلکہ بولنے کے لیے اصرار بھی کرتا تھا۔ وہ خاص طور پر مجھ سے مخاطب ہوتا۔

"حوریہ! مجھے تمہارا نام بہت پسند ہے۔ سنا ہے' جنت میں حوریں ملیں گی۔" کہہ کر وہ شرارت سے ہنسنے لگا۔

"زمین پر بھی حوریں مل سکتی ہیں۔" میں نے ہاتھ سے اپنے سارے بال اکٹھے کیے اور انہیں آگے ایک طرف پھیلا لیا۔ میں نے واضح محسوس کیا کہ ارفعان نے میری بھوری آنکھوں اور بھورے بالوں کو دلچسپی سے دیکھا۔

"تمہارے معاملے تک تو ٹھیک ہے کہ زمین پر بھی مل سکتی ہیں۔" ارفعان نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور اپنی کلاس لینے چلا گیا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اسے دور تک جاتے دیکھا۔

"کیا ہوا؟" قدسیہ نے میری نظروں کا تعاقب کیا۔ ارفعان کی کوئی بات بری لگی۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں ارفعان کی کوئی بات بری لگ ہی نہیں سکتی' وہ ایسی بات کرتا ہی نہیں ہے' جو بری لگے۔"

قدسیہ شاید کالج میں میری اس کوفت کی وجہ سے کہہ رہی تھی جو کہ مجھے اس کی "ہائے۔ ہیلو" سے ہوتی تھی' ایک ہاتھ سے بالوں کو سہلاتے ہوئے میں قدسیہ کی طرف دیکھنے لگی

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ قدسیہ کس حد تک ارفعان کو جانتی ہے۔ وہ کیا کہہ سکتا ہے' کیا نہیں' قدسیہ کو یقین کی حد تک معلوم تھا ارفعان کے بارے میں۔ ان دونوں میں بے شک بہت اچھی دوستی تھی۔ وہ دونوں لڑکا لڑکی کی تفریق کے بغیر ایسے بات کرتے تھے جیسے دو پکی سہیلیاں ہوں۔

اپنے اپنے فارغ وقت میں' ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے۔ کبھی میں اور قدسیہ۔ کبھی میں اور ارفعان اور کبھی ارفعان اور قدسیہ اور کبھی ہم تینوں۔ ان تین لوگوں کے گروپ میں کوئی لیڈر نہیں تھا۔ تینوں برابر تھے۔

تینوں ہی بولتے تھے اور تینوں ہی سنتے تھے۔ ایک طرح سے وہ ایک سنہری وقت تھا ہم تینوں کا۔ تینوں خوش' تینوں بے فکر اور تینوں ایک دوسرے کے ساتھ۔ اس وقت نہ کوئی حاکم تھا نہ ہی محکوم۔ اور اگر کوئی محکوم ہوتا تو وہ میں ہوتی... ارفعان کی۔

قدسیہ آج بھی بولتی تھی تو میں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی تھی مگر ارفعان کا کہا ایک ایک لفظ مجھے یاد رہتا۔ وہ قدسیہ سے بھی زیادہ میری پڑھائی میں میری مدد کرتا۔ اسے معلوم تھا کہ میں کہاں کہاں کمزور ہوں۔ میں اکثر سے زیادہ اسے پڑھائی کے بہانے سے فون کرتی رہتی۔ حتیٰ کہ رات گئے بھی اگر میرا دل چاہ رہا ہوتا اس کی آواز سننے کے لیے تو میں وقت کی پروا کیے بغیر اسے فون کر دیتی۔

میں یہ نہیں سوچتی تھی کہ میں یہ کیوں کر رہی ہوں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ مجھے یہ کرنا ہے۔ وہ نیند سے جاگتا تو بھی مجھ سے دس' پندرہ منٹ ضرور بات کر لیتا۔

اس کی نیند میں ڈوبی آواز مجھ پر نشہ سا طاری کر دیتی۔ میرا دل چاہتا میں اسے سنتی ہی جاؤں۔ ایسا کیوں تھا' مجھے معلوم نہیں۔

ارفعان مجھ سے قدسیہ کی طرح ہی بے تکلف تھا۔ قدسیہ اکثر مذاق میں اسے "ابا جان" کہتی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بالکل "ابا" کی طرح ہم دونوں کا خیال رکھتا ہے۔

"لیکن مجھے کوئی شوق نہیں تم دونوں کو اپنی بیٹیاں بنانے کا۔" ارفعان' قدسیہ کے اس مذاق پر بہت چڑتا تھا۔

"لیکن تمہیں "ابا جان" بننے کا بہت شوق ہے نا۔ ان ہی کی طرح ری ایکٹ کرتے ہو اکثر۔"

"کیا میں نے تمہیں کبھی مارا... کبھی ڈانٹا؟"

"نہیں!" قدسیہ نے شرارت سے کہا۔

"میرا خیال ہے مجھے یہ دونوں کام فوراً" کر لینے چاہئیں کیونکہ ابا لوگ یہ دو کام ضرور کرتے ہیں۔" ارفعان سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"چلو تم نے مان تو لیا نا!" قدسیہ ہنسنے لگی۔

"ایک دوست میں سب رشتے ہوتے ہیں۔ وہ باپ' ماں' بہن بھائی' محبوب سب رنگ رکھتا ہے اور..."

"محبوب!" قدسیہ کی ہنسی کا فوارہ نکلا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی قابو کرنے لگی۔

"محبوب!" وہ ایک بار پھر اسی رفتار اور انداز سے ہنسی۔

ارفعان بری طرح چڑ گیا۔ "اگر تم نے ہنسنا بند نہیں کیا تو"

"تو؟..." وہ خفگی سے قدسیہ کی طرف دیکھنے لگا۔

ارفعان کے اس انداز سے وہ اور لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ ہاتھ ابھی بھی اس کے منہ پر ہی تھے۔ ارفعان نے اپنے دونوں ہاتھوں سے قدسیہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر زور سے دبا دیا۔

"اب ہنسو۔" قدسیہ ایک دم چپ ہو گئی۔ "ہنسو نا اب۔" ارفعان نے اکسایا پھر اس نے خود ہی اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ "یاد رکھنا! ایسا دوبارہ بھی ہو سکتا ہے۔" وہ دونوں ہی مسکرانے لگے۔ مجھے کبھی قدسیہ سے حسد نہیں ہوا۔ اس کے پاس ایسا کچھ تھا ہی نہیں

مگر۔۔۔ ارفعان ہم دونوں کا دوست تھا۔ وہ پہلے اس کی دوست بنی' میں اب' اور یہی اس کا پلس پوائنٹ تھا اور میرا نیگیٹیو۔ مجھے دوستی کے اس جھکاؤ پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن صرف دوستی۔

✡ ✡ ✡

"یہ دیکھو! یہ وہ جگہ ہے جہاں قدسیہ کالج کے پہلے دن روتی صورت لیے کھڑی تھی۔"

ارفعان نے کوریڈور میں ایک طرف اشارہ کیا۔ مجھے اس طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کہاں کھڑی تھی۔

"اس وقت اسے دیکھ کر ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گی۔ اور میں اس طرف بیٹھا تھا۔" اس نے دوسری طرف اشارہ کیا۔

"میری اس پر نظر پڑی اور مجھے بے تحاشا ہنسی آئی۔ میں نے سوچا یہ اب گئی کہ اب گئی۔"

ارفعان ہنسنے لگا۔ آج قدسیہ کالج نہیں آئی تھی شاید اس لیے وہ اسے یاد کر رہا تھا۔

"اور جب تم نے مجھے دیکھا تب۔۔؟"

"تب!" ارفعان مسکرانے لگا "تمہیں دیکھ کر سوچنا نہیں پڑتا۔ میرا خیال ہے۔ صرف دیکھنا' دیکھتے رہنا ہی کافی ہوتا ہے۔"

"تو تم نے یہ ہی کیا۔۔؟" مجھے اس کے منہ سے تعریف اچھی لگی۔

"کیا!"

"دیکھنا اور دیکھتے رہنا۔"

"نہیں۔۔۔ میں نے دیکھا اور سوچا کہ۔۔۔ کوئی اتنا بھی پیارا ہو سکتا ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ "اور یہ سچ ہے حوریہ! تمہیں دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اتنا پیارا بھی ہو سکتا ہے۔"

میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ مجھے اسے پہلی بار دیکھ کر کیسا لگا لیکن میں نے اس بات کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا' ویسے بھی میں اس کے الفاظ کو اپنے ذہن میں بار بار دہرا رہی تھی۔

ہزار کوشش کے باوجود میرا اب پڑھائی میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اگر ارفعان اتنی مدد نہ کرتا تو میں بالکل ہی زیرو ہو جاتی۔ قدسیہ پہلے کی طرح ہی پڑھنے میں تیز تھی۔ پتا نہیں' وہ ارفعان کی موجودگی میں صرف پڑھ کیسے لیتی تھی۔

میں نے خود پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ پڑھائی کے علاوہ بھی میں ارفعان کو فون کر لیتی تھی' قدسیہ سے زیادہ ہم دونوں کی گپ شپ ہونے لگی تھی۔ جس دن میں فون نہیں کرتی تھی' اس دن ارفعان مجھے فون کر لیتا تھا۔ دوستی نام کی جو چیز تھی میں اس سے اب لطف اندوز ہو رہی تھی۔

میں کوشش کرتی تھی کہ میری کوئی بات اس کی اس لسٹ میں نہ آئے جس میں اس کے ناپسندیدہ لوگوں کے نام درج ہوں گے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ارفعان پر میرا مشاہدہ اور جائزہ بڑھنے لگا ایک بات جو میں نے خاص کر نوٹ کی تھی' وہ یہ تھی کہ وہ قدسیہ سے اور ہی طرح سے متاثر تھا' ویسے ہی جیسے محترم لوگوں سے ہوا جاتا ہے۔

ایک دن قدسیہ میرے نئے ٹاپ اور جینز کی تعریف کر رہی تھی۔

"میں پہن تو لوں مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے یہ ڈریس مجھ پر سوٹ نہیں کرے گا۔"

میری طرف مسلسل دیکھتے رہنے کے بعد اس نے جیسے اداس سا ہو کر کہا۔ ایک دو بار وہ میرے ساتھ جا کر ہی اپنے لیے جینز خرید چکی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں ۔۔۔ جھجکتی تھی۔ اس کی اپنی ڈریسنگ روایتی اسٹائلش تھی لیکن مغربی نہیں۔

"جو تم نے پہن رکھا ہے۔ تم پر وہ بہت سوٹ کرتا ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟" ارفعان نے شاید اس کی اداسی دور کرنے کے لیے کہا تھا' اس نے مجھے ناپسند اور قدسیہ کو پسند نہیں کیا تھا۔ شاید وہ قدسیہ کو وقتی اداسی کا شکار بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا یا احساس کمتری کا۔۔۔

یہ بات بھی اس کی ہر بات کی طرح میرے دل میں

کر گئی۔ رات کی نیند کہیں کھو گئی ہر وقت ایک ہی بات۔ ارفعان قدسیہ کا دوست ہے اور میں۔۔۔؟

میں قدسیہ سے پوچھ سکتی تھی کہ ارفعان اس کے لیے کیا ہے لیکن میں پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اسے معلوم ہو کہ ارفعان کے لیے میرے اندر باہر کیا کچھ چل رہا ہے۔ ویسے قدسیہ لوہ میں رہنے والی لڑکیوں کی طرح نہیں تھی۔ اس سے جو پوچھا جاتا وہ بتا دیتی۔ جو بتایا جاتا اس پر یقین کر لیتی۔

میں کالج میں ہر وقت ان دونوں کو نوٹ کرتی رہتی تھی۔ کالج کے بعد ان دونوں کے بارے میں سوچتی' ایک نئی ہلچل شروع ہو گئی تھی زندگی میں۔ ایک مقابلے کی سی کیفیت آگئی تھی دل میں اور دماغ میں۔ دل کچھ کہتا اور دماغ کچھ۔ دماغ کہتا کہ وہ صرف دوست ہیں ان کی دوستی کے شواہد ہزار تھے اور۔۔۔ "محبت" اس کا نہ جواز تھا اور نہ ہی امکان۔۔۔ ہر دن۔۔۔ ہر دن۔۔۔ ہر بار۔۔۔ وہ مجھے صرف دوست ہی لگتے۔ صرف دوست۔

قدسیہ میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ارفعان کے ساتھ کورٹ شپ کرتی۔ وہ سادگی سے ایک دوسرے کے ساتھ عام سا ہنسی مذاق کرتے۔ عام سی' معمول کی باتیں اور وہی نوک جھونک اور بس۔

کفلنس ارفعان مجھے بھی دیتا تھا بلکہ میری برتھ ڈے پر ارفعان نے اپنی طرف سے خاصا اہتمام کیا تھا۔ وہ میری تعریف کرتا تھا اور مجھے پری کہتا تھا یعنی اسے میری خوب صورتی نظر آتی تھی اسے فرق نظر آتا تھا کہ قدسیہ' صرف قدسیہ ہے اور میں پری۔

لیکن پھر بھی وہ ہم دونوں کے لیے اتنا برابر تھا کہ میں کوشش کے باوجود یہ جان نہیں سکی کہ میں اس کے لیے کیا ہو سکتی ہوں۔ ارفعان کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ میں چاہ کر بھی اس کے ساتھ اپنی چاہت کا رشتہ شروع نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ دوستانہ گپ شپ ہی کی جا سکتی تھی وہ ان لڑکوں میں سے نہیں تھا جن پر جال پھینکے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ مجھے ناپسند کرتا۔ اس کے حلقہ احباب میں بھی

ایسے ہی لوگ تھے' وہ رنگین دنیا اور بہاروں کی بات میں نہیں الجھتے تھے۔

ارفعان ایک خاص انداز میں' ایک خاص حد میں رہنے والا شخص تھا۔

لیکن اگر وہ میری آنکھوں میں دیکھ لیتا تو' جان لیتا کہ وہ میرے لیے کیا ہے۔ وہ میرے لیے سب کچھ بن چکا تھا۔

✡ ✡ ✡

"اسپیشلائزیشن کے لیے ارفعان یو ایس اے جائے گا" ایک دن باتوں ہی باتوں میں قدسیہ نے مجھے بتایا۔ ہم دونوں کینٹین میں بیٹھے تھے اور ارفعان ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ "کہہ رہا تھا کہ میں بھی ہارٹ سرجن' بنوں۔"

"لیکن تمہارا تو کوئی پلان نہیں تھا ہارٹ سرجن بننے کا؟" مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ان دونوں کے درمیان یہ بات میری غیر موجودگی میں ہوئی۔

"ارفعان کہہ رہا تھا کہ مجھے بننا ہی ہو گا۔ اس کا کہنا ہے کہ میں ایک بہترین سرجن بنوں گی اور پھر وہ میری مدد کرے گا۔"

"تمہاری مدد کرے گا؟" مجھے بات سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔

"پاگل! جیسے یہاں وہ ہماری مدد کرتا ہے۔"

"لیکن پھر تو وہ یو۔ ایس اے چلا جائے گا نا۔ پھر کیسے؟"

"پھر۔۔۔" قدسیہ بلاوجہ مسکرانے لگی۔

پہلی بار میں نے قدسیہ سے "پھر" پوچھا تھا اور یہی وہ "پھر" تھا جس کا جواب مجھے نہیں سننا تھا۔ قدسیہ کی مسکراہٹ' اس کی آنکھیں بہت کچھ بتا رہی تھیں۔ میرے سامنے سب کچھ دھندلا گیا۔

"مدد۔۔۔ ارفعان۔۔۔ یو ایس اے۔۔۔"

کڑی سے ملتی کڑی نے پوری کہانی بنا دی تھی' لیکن مجھے اس کہانی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ارفعان' قدسیہ کو ہارٹ سرجن بنانا چاہتا ہے۔ وہ دونوں ہارٹ سرجن

بنیں گے۔ میرے سامنے سب کچھ صاف ہو گیا۔ قدسیہ نے مجھے کوئی خبر نہیں سنائی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ میرے لیے ایک تکلیف دہ خبر تھی۔ لفظ تکلیف بہت چھوٹا ہے۔

مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں میں باقاعدہ عہد و پیمان ہوئے تھے یا صرف ایسے ہی بنا کہے کبھی کبھی باتوں ہی باتوں میں۔

یہ وہ محبت ہے، جو بنا کہے ہی سمجھ لی جاتی ہے یا وہ محبت جس کی باقاعدہ بنیاد رکھی جاتی ہے۔

اگر ارفعان باقاعدہ' قدسیہ کو پرپوز کرتا تو یقیناً" قدسیہ مجھے سب سے پہلے بتاتی۔ اس کا مطلب یہ وہی محبت تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ۔۔۔ ساتھ ساتھ۔۔۔ پاس پاس رہتے ہوئے بھی باقاعدہ نہیں بنتی۔ جو ہوتی ہے' لیکن دکھائی نہیں دیتی۔ جس کا اعلان نہیں کرنا پڑتا۔

میرے پیٹ میں شدید درد شروع ہو گیا۔ قدسیہ کو کالج میں ہی چھوڑ کر میں گھر آگئی۔ شدید ڈپریشن مجھے بے حال کر دیتا تھا۔ مجھ پر مرگی کے مریض کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ آج سے پہلے میری یہ کیفیت تب ہوئی تھی' جب میرا میڈیکل کے لیے میرٹ نہیں بنا تھا۔ میں کئی بار بے ہوش ہوئی اور کئی بار ہوش میں آئی۔ سر درد سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا اور الٹیوں نے میرا حشر کر دیا تھا۔ کمزوری اور نقاہت سے میرا برا حال ہو گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے الٹی شروع کر دی اور وہیں اپنا پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔

داخلی دروازے پر ہی بیٹھ کر میں نے دھاڑیں مار' مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ ماما اور گھر کے ملازم میری طرف لپکے۔ لمحوں میں ہی میری حالت بے حد خراب ہو گئی۔ تین بہن' بھائیوں میں' میں سب سے چھوٹی ہوں اور ان چار افراد کو اتنی پیاری ہوں کہ سب کی حالت مجھے دیکھتے ہی غیر ہو گئی۔

یہ ڈپریشن کا دوسرا شدید ترین دورہ تھا' جو مجھے ہوا تھا۔ جب مسئلہ میرا میرٹ تھا تو مجھے معلوم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اب مسئلہ ارفعان تھا تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔۔۔ کم از کم اس وقت۔۔۔

ارفعان پری کو چھوڑ کر قدسیہ کو لے کر جائے گا۔ وہ ارفعان ہے اور اس کے لیے خوب صورتی پلس پوائنٹ نہیں اور قدسیہ میں نیگیٹو پوائنٹ کبھی ہو گا نہیں۔

میرے اور ارفعان کے درمیان صرف دو سال تھے۔ جو خطرناک صورت حال اختیار کر چکے تھے۔ یا وہ قدسیہ کا دوست نہ ہوتا یا وہ صرف ہم دونوں کا دوست ہوتا اور۔۔۔ یا وہ میرے لیے دوست سے زیادہ نہ ہوتا۔ رونے کے لیے میرے پاس آنسو بہت تھے اور وجہ بھی بہت بڑی تھی۔ ان دو سالوں نے قدسیہ کو ارفعان کے پلڑے میں ڈال دیا تھا۔

میں ہر رات ارفعان سے صبح ملنے کے خیال سے گزارتی تھی۔ میں اس ساری زندگی کی اتنی بہت ساری راتیں اس کے بغیر کیسے گزار سکتی تھی۔ یہ تو سوچنا ہی بے کار تھا کہ مجھے یہ زندگی ارفعان کے بغیر گزارنی ہے۔ قدسیہ کا کیا ہے' وہ تو کپڑے بھی اپنی ماما کی پسند کے پہن لیتی ہے۔

قدسیہ کا کیا ہے۔

☼ ☼ ☼

دو دن بیمار رہنے کے بعد میں کالج گئی تو وہ دونوں ہی مجھے بہت مختلف لگے۔ ان کا بات کرنا' مسکرانا' مذاق کرنا' ایک ساتھ آمنے سامنے بیٹھنا۔ ارفعان کا قدسیہ کو پکارنا اور قدسیہ کا ارفعان کا نام لینا۔۔۔ سب کچھ ہی۔۔۔ شاید اس لیے کیونکہ میں ان دونوں کے اندر چھپی ہوئی کہانی کو جان چکی تھی۔ دو دن اور دو راتیں میں نے بہت کچھ سوچا تھا۔

"تمہارا وہ کزن کیسا ہے' جو تمہیں تنگ کرتا تھا؟"

ارفعان کی طرح شیراز کی باتیں بھی صرف میں نے سنی ہی تھیں۔ کبھی ان میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ قدسیہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ اسکول کے وقت سے ہی شیراز اسے مختلف بہانوں سے تنگ کیا کرتا تھا۔ وہ اس کے چچا کا بیٹا تھا اور جب تک وہ ایک ہی گھر میں جوائنٹ فیملی کی طرح رہے' قدسیہ کی اس کے ہاتھوں درگت بنتی رہی۔

ارفعان کے سامنے اس طرح سے پوچھے جانے پر قدسیہ بری طرح بوکھلا گئی۔ پہلے مجھے حیرت ہوئی اس کے بوکھلانے پر' پھر میں نے انجوائے کیا۔ ارفعان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کون تنگ کرتا تھا تمہیں؟"

قدسیہ ایسے خاموش ہوئی جیسے بات کرنا نہیں چاہتی۔ "میرا کزن ہے شیراز' بہت شرارتی تھا۔ ایک بار سوتے میں میرے بال کاٹ دیے سامنے سے۔ پورے ایک سال تک مجھے اسکارف استعمال کرنا پڑا تھا۔" قدسیہ ہمیشہ غصے میں ہی شیراز کا ذکر کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ غصے میں ہی نظر آ رہی تھی۔

اس کے اس طرح سے کہنے پر ارفعان دل کھول کر ہنسا۔

"بچے ایسے ہی ہوتے ہیں' خاص کر لڑکے۔"

"وہ بڑا ہو کر بھی ایسا ہی ہے۔" میں نے براہ راست ارفعان کو مخاطب کیا۔ "وہ ابھی بھی اسے تنگ کرتا رہتا ہے لیکن کسی اور انداز سے۔"

"کسی اور انداز سے؟" ارفعان نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"یہ بھی پاگل ہے اور وہ بھی۔" قدسیہ عجلت میں بولی۔ "تم چھوڑو اس بات کو' پلیز میری یہ بکس ایشو کروا دو' مجھے آج ہی چاہیے۔"

قدسیہ نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے کس انداز سے بات ہی ختم کر دی تھی۔

"حوریہ! پلیز' شیراز کا ذکر ارفعان کے سامنے نہ کرنا۔" ارفعان کے جانے کے بعد قدسیہ نے جیسے مجھ سے التجا کی۔

"اس کی حرکتیں اتنی الٹی سیدھی ہیں کہ خوامخواہ سننے والے کو کھٹکتی ہیں۔ دل میں بیٹھ جاتی ہیں۔" قدسیہ کا انداز سمجھانے والا تھا۔

قدسیہ نے اس بات سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ارفعان کا دل اپنے لیے صاف رکھنا چاہتی ہے۔

"مجھے لگتا ہے وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔"

"مجھے وہ زہر لگتا ہے۔"

"تم نے ہی بتایا تھا کہ تمہارے چچا تمہارا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے انہوں نے شیراز کے کہنے پر مانگا ہو گا۔"

"میں نے انکار کیا تھا۔" وہ یہ سب مجھے پہلے بھی بتا چکی تھی۔ جب وہ میرے ساتھ کالج میں تھی۔ شیراز اکثر اسے زبردستی کالج لینے آجاتا تھا اور اسے ناچار اس کے ساتھ جانا ہی پڑتا تھا۔ وہ اسے سخت ناپسند کرتی تھی اور اکثر کالج کے باہر ہی ان کی لڑائی ہو جاتی تھی۔ شیراز بلاشبہ بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک تھا۔ لیکن پھر بھی قدسیہ نے شیراز کے لیے انکار کر دیا تھا۔

"کتنا برا لگتا ہے وہ مجھے' میں بتا نہیں سکتی۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم اسے اچھی لگتی ہو۔ کزنز میں ایسی لڑائیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس قدر ناپسند کرو اسے۔"

"پاپا اور ماما بھی یہی کہتے ہیں' لیکن پھر بھی مجھے وہ پسند نہیں۔"

"تم ارفعان سے کیوں چھپانا چاہتی ہو شیراز کو؟"

"بات چھپانے کی نہیں' اس کی حرکتیں ہی اتنی الٹی سیدھی ہیں' سننے والا جانے کیا کیا سوچنے لگتا ہے۔"

"ابھی بھی تمہیں تنگ کرتا ہے؟" مجھے شیراز میں انتہائی دلچسپی ہو گئی تھی۔

"نہ ہماری ملاقات ہوتی ہے نہ ہی بات چیت' وہ گھر آئے بھی تو میں اس سے نہیں ملتی۔ حرا اور مانی سے کافی دوستی ہے اس کی۔ برتھ ڈے وغیرہ وش کر دیتا ہے مجھے' بس اتنا ہی۔۔۔"

"یعنی کافی شریف ہو گیا ہے۔"

قدسیہ نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ جیسے مزید بات کرنا نہیں چاہتی۔ وہ پہلے بھی شیراز کے ذکر پر تلملایا ہی کرتی تھی۔ اس کی حرکتیں سناتے ہوئے اس کا انداز جارحانہ ہو جاتا اور منہ غصے سے سرخ۔

جن دنوں شیراز' قدسیہ کو کالج لینے آتا تھا' ان دنوں اس کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔

شیراز..... گزرے دو دنوں میں وہ اچانک ہی مجھے یاد آگیا تھا' لیکن جب وہ یاد آگیا تو مجھے اس کے متعلق اور بھی بہت کچھ یاد آگیا تھا۔

قدسیہ کے موبائل سے شیراز کا نمبر لینا میرے لیے بہت آسان تھا۔ آسان اس سے بات کرنا بھی تھا۔ گھر جاکر میں نے شیراز کو فون کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ قدسیہ اس کو پسند کرتی ہے۔ کالج تک تو وہ سب فرینڈز کو یہی بتاتی رہی کہ وہ اپنے کزن شیراز کو بے حد پسند کرتی ہے اور ان دونوں کی جلد ہی منگنی ہونے والی ہے۔

''آپ یقیناً'' مذاق کررہی ہیں۔'' شیراز کو کسی صورت یقین نہیں آرہا تھا۔ ''وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کرتی۔''

''وہ صرف ایک دکھاوا ہے..... آپ دونوں میں اتنی لڑائیاں ہوتی رہی ہیں کہ وہ شاید ایگو میں بتا نہیں سکی۔''

''اس نے میرے پرپوزل کو بھی منع کردیا۔'' اسے یقین آہی نہیں رہا تھا۔

''اس نے نہیں' اس کے بابا نے کیا تھا..... وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کا دھیان بٹ جائے۔''

''ہاں! تایا جان نے کہا تو کچھ ایسا ہی تھا کہ وہ وقت آنے پر بات کریں گے۔ مجھے لگا' قدسیہ نے انکار کیا ہے۔''

''کیا واقعی وہ مجھے پسند کرتی ہے؟'' شیراز حیران بھی تھا اور بے حد خوش۔ اس کی خوشی سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ قدسیہ کو کس قدر پسند کرتا ہے۔

''اس میں اتنی ایگو ہے' وہ کبھی بتائے گی نہیں اپنی پسندیدگی کا۔''

''ایگو تو واقعی اس میں بہت ہے۔''

شیراز سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ میرا ذکر نہیں کرے گا' میں نے فون بند کردیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ شیراز کو اتنی جلدی ہوگی۔ اگلے دن قدسیہ کالج نہیں آئی۔ شام کو اس نے مجھے فون کیا۔

''ہمارے گھر کل رات بہت ہنگامہ ہوتا رہا ہے حوریہ! چچا جان رشتہ لے کر آئے تھے۔ خاندان کے کچھ اور لوگ بھی تھے۔ چچا جان بہت خوش تھے۔ ان کی تو ہمیشہ سے خواہش رہی تھی میرا رشتہ لینے کی۔''

''پھر.....؟''

''بابا' ماما نے سوچنے کے لیے وقت لیا ہے..... چچا جان اسی وقت ہاں کہلوانا چاہتے تھے۔ بس اسی بات پر ہنگامہ ہوا۔ پھوپھو بھی تھیں اور دادو بھی۔ دادو بہت ناراض ہورہی تھیں کہ بابا فوراً'' ہاں کیوں نہیں کررہے۔'' قدسیہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔

''پھر انہوں نے ہاں کی؟'' میں نے اطمینان سے پوچھا۔

''وہ ہاں کیوں کریں گے۔ میں نے صاف انکار کردیا ہے۔ بابا راضی ہیں اور وہ انکار کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن انہیں میری مرضی بھی چاہیے۔ میں نے ارفعان کا ذکر نہیں کیا۔ پہلے میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' اس کی بے چینی کا اندزہ اس کی آواز سے لگایا جاسکتا تھا۔

''تم ارفعان سے فون پر بات کروگی؟''

''نہیں! میں کالج آکر بات کروں گی۔''

''کیا میں ارفعان سے بات کروں؟ کیا یہ زیادہ مناسب نہیں؟''

''شاید۔ یہ اور بھی مناسب ہے۔'' ایک لمبی خاموشی کے بعد قدسیہ بولی۔

''تم شیراز کا ذکر نہ کرنا۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے شیراز کے بارے میں معلوم ہو۔''

اسے تسلی دینے کے بعد میں فون ہاتھ میں پکڑے کافی دیر تک سوچتی رہی۔ میں جانتی تھی کہ وہ ارفعان سے اب کل ہی بات کرے گی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ قدسیہ میں اتنی ہمت و جرأت ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو شیراز کے لیے صاف صاف انکار کردے گی۔ اس کے بابا اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن وہ سخت بھی بہت تھے اور قدسیہ ان سے کافی ڈرتی بھی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ شیراز کے لیے اس کے بابا انکار کرہی نہیں سکتے۔ قدسیہ کی ناپسندیدگی کے علاوہ شیراز میں کوئی خرابی نہیں تھی اور یقیناً'' قدسیہ کے بابا' قدسیہ کی وجہ کی چڑ کی وجہ سے تو شیراز کو انکار نہیں کریں گے۔

میرے پاس صرف ایک ہی شخص تھا شیراز..... جس سے میں بات کرسکتی تھی اور میں نے اسے ہی کال کی۔ اس بار میں نے اسے ارفعان کے بارے میں بتایا۔

میں نے اسے بتایا کہ ''قدسیہ اسے ہی پسند کرتی ہے لیکن ارفعان نے اس پر ایسا جال پھینکا ہے کہ قدسیہ کو کچھ اور نظر ہی نہیں آرہا۔ وہ ایک کرپٹ لڑکا ہے اور وہ لڑکیوں کو ایسے ہی پاگل بناتا ہے۔ کالج میں سب ارفعان کی وجہ شہرت جانتے ہیں' لیکن قدسیہ کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ پہلے تو ٹھیک تھی' بس چند مہینوں سے ہی وہ اس کی باتوں میں آگئی ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا ہے۔ لیکن وہ سمجھ ہی نہیں رہی۔''

شیراز گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ وہ بول کم رہا تھا اور سن زیادہ رہا تھا۔

''پہلے میں نے سوچا' میں اس کے گھر والوں کو بتا دوں۔ پھر سوچا آپ کو بتاؤں۔ آپ سے منگنی کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔ قدسیہ کو تو عقل نہیں ہے' لیکن آپ عقل سے کام لے کر ضرور ہی اسے ارفعان سے بچاسکتے ہیں۔''

اور پھر میں نے قدسیہ کے گھر کے نمبر پر قدسیہ کی ماما سے بات کی۔

''کون ہے وہ لڑکا حوریہ! تم نے تو مجھے یہ سب بتا کر اس باختہ ہی کردیا ہے۔ قدسیہ میں اتنی سمجھ بوجھ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو پرکھ سکے۔ اتنے کرپٹ لڑکے کے ساتھ قدسیہ نے سوچا بھی کیسے؟''

''آنٹی! میں نے قدسیہ کو بہت سمجھایا ہے۔ لیکن وہ سنتی ہی نہیں۔ شیراز اتنا اچھا لڑکا ہے' لیکن اسے دکھائی ہی نہیں دے رہا۔ آپ جلد از جلد دونوں کی منگنی کردیں۔'' وہ یہ سن کر اور پریشان ہوگئیں۔

''میری تو سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں۔ قدسیہ' شیراز کے لیے انکار کرچکی ہے۔ اس کے بابا' شیراز کے لیے انکار نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن وہ قدسیہ کی مرضی کے خلاف بھی کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ اگر یہ بات انہیں معلوم ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔''

''تو کیا آپ قدسیہ کی پسند سے اس لڑکے ساتھ کرنا چاہتے ہیں جو کالج میں اتنا برا سمجھا جاتا ہے کہ شریف گھرانے کے اسٹوڈنٹس اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ انتہائی گندی سوسائٹی سے اس کا تعلق ہے۔ کبھی کبھی تو قدسیہ کی باتوں سے لگتا ہے اگر کوئی ارفعان کے لیے نہ مانا تو وہ اس سے کورٹ میرج کرلے گی۔ ایک بار اس نے کہا بھی تھا کہ اگر اس کے بابا نہ مانے تو.....''

''کورٹ میرج.....'' ان کے اوسان خطا ہوگئے۔

''کیا ایسا کہا تھا قدسیہ نے کبھی؟''

''جی کہا تھا..... وہ بہت بدل گئی ہے اب۔''

وہ اور پریشان ہوگئیں۔ ''قدسیہ کے تیور اس دن بتا رہے تھے' جب وہ شیراز کے لیے انکار کررہی تھی کہ وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ ہم اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم اسے کنویں میں چھلانگ لگانے دیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ خاندان میں کسی کے کانوں تک یہ خبر جائے۔ اس کے بابا کو بہت مان ہے اس پر۔ قدسیہ نے بھی اس لڑکے کا ذکر تو نہیں کیا ہم سے' لیکن اس نے اتنا ضرور کہا تھا کہ وہ اپنی پسند سے شادی کرے گی۔ یہ ہے میری بیٹی کی پسند۔''

''میں کافی دنوں سے سوچ رہی تھی آپ کو بتانا۔''

''بہت اچھا کیا حوریہ! مجھے بتا دیا..... میرے تو اوسان ہی بحال نہیں ہورہے ہیں سب سن کر۔''

''قدسیہ تو اس لڑکے سے چھپ چھپ کر ملتی بھی ہے۔ کالج آکر وہ اکثر غائب رہتی ہے۔''

''قدسیہ کالج سے غائب رہتی ہے؟'' ان کی آواز لرزنے لگی۔ ''خدایا! یہ لڑکی ہماری عزت کے ساتھ کیا کرنے جارہی ہے۔''

''وہ لڑکا بے حد خوب صورت ہے' بس اسی لیے

سب لڑکیاں..."

میں بہت دیر تک ان سے فون پر بات کرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن قدسیہ کالج نہیں آئی اور اس سے اگلے دن بھی نہیں آئی۔ ارفعان فکرمند ہو گیا قدسیہ کے لیے۔

"تمہاری بھی بات نہیں ہوئی اس سے؟" وہ بلاوجہ مجھ سے بار بار پوچھ رہا تھا۔

"آجائے گی ارفعان! اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے' کچھ کام ہوگا۔"

پھر بھی وہ بے چین ہی رہا۔ بار بار اس کا نمبر ڈائل کرتا جو کہ آف تھا۔

"تم اس کے گھر کیوں نہیں جاتیں؟"

"ٹھیک ہے۔ میں شام میں چلی جاؤں گی۔"

اور میں شام میں چلی گئی۔ آنٹی مجھے چپکے سے ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ ان کی آنکھیں متورم تھیں۔ وہ شاید بہت روتی رہی تھیں۔

"میں نے جیسے تیسے قدسیہ کے پاپا کو کچھ بتا دیا۔ انہوں نے فوراً" شیراز کے لیے ہاں کردی ہے۔"

"اور قدسیہ... وہ کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہے۔ بہت ہنگامہ کیا اس نے۔ اس کے پاپا اسے گھر سے باہر نہیں نکلنے دے رہے۔ اس کی شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔"

"شادی!" حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔

"ہاں! کہتے ہیں عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اتنے پریشان ہیں وہ آج کل۔ اب شادی کے بعد ہی قدسیہ کالج آئے گی۔" وہ اپنی گیلی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ "اتنی ناسمجھ ہوجائے گی قدسیہ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے پاپا نے اسے تھپڑ بھی مارا۔ سمجھایا' منایا' لیکن وہ مان ہی نہیں رہی۔ حوریہ! وہ چاہتی ہے کہ ارفعان سے ایک بار مل لیا جائے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اس کے پاپا نہیں مان رہے۔ لیکن اگر پہلے میں مل لوں اور..."

میں جو اٹھ کر جانے لگی تھی' وہیں رک گئی۔

"اگر آپ ملنا چاہتی ہیں تو مل لیں۔ ابھی اسے معلوم نہیں ہے کہ قدسیہ کی شادی ہو رہی ہے' لیکن شاید یہ معلوم ہوتے ہی وہ کچھ کر گزرے۔ اس کی فیملی زمین دار ہے اور وہ ذات کے معاملے میں بہت کٹر ہیں۔ کالج میں تو یہ افواہیں بھی گردش کرتی ہیں کہ اس نے ایک' دو خفیہ نکاح کر رکھے ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ یہاں لاہور میں وہ اپنی خفیہ بیوی کے پاس ہی رہتا ہے۔ شاید وہ قدسیہ کو بھی ایسی ہی بیوی بنالے ابھی وہ آپ کو جانتا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو جان کر وہ براہ راست آپ کو نقصان پہنچائے۔ اس سے کچھ بعید نہیں۔ بہت امیر ہے۔ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ کالج میں سب اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ اگر آپ ملنا چاہتی ہیں تو..."

وہ بے چینی سے انگلیاں چٹخانے لگیں۔ "کیا ہوگیا ہے قدسیہ کو' اتنی ناسمجھ تو نہیں تھی۔ ابھی حرا نے بھی ڈاکٹر بننا ہے۔ اگر قدسیہ نے یہ سب کیا تو باقی بہن' بھائی کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔ ہم بہت پریشان ہوگئے ہیں حوریہ! تم کالج میں کسی کو پتا نہیں چلنے دینا کہ قدسیہ کی شادی ہو رہی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"تم ملیں؟" ارفعان نے فون پر پوچھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اسے اس کی واپسی کی کتنی بے چینی ہے۔

"ہاں! اس کی دادو کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ اس لیے وہ کالج نہیں آرہی اور اس کا موبائل خراب ہے۔ کہہ رہی تھی ایک' دو دن میں کالج آجائے گی۔"

"اچھا!" ارفعان صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ اسے ابھی بھی کچھ بے چینی ہی ہے۔ وہ شاید کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن "بائے" کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

میں بجلی کے ان تاروں پر کھڑی تھی جن سے مجھے کبھی بھی کسی بھی وقت کسی بھی قسم کا شاک لگ سکتا تھا۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا میں ارفعان اور قدسیہ کے لیے

نفرت کا باعث بن جاتی یا میں اور ارفعان ایک ہوجاتے۔ میں انتہائی خطرناک وقت میں خطرناک رفتار سے چل رہی تھی۔

دو دن بعد میں اپنی کار پارک کر رہی تھی۔ جب میں نے اسے رکشے سے اترتے ہوئے دیکھا۔

"قدسیہ!" میں نے اسے آواز دی۔

"حوریہ!" وہ تقریباً" بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی اور کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح مجھ سے جھول گئی۔ اس نے دیر تک مجھے سینے سے لگائے رکھا۔

"میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔" اس نے میرے گالوں پر پیار کیا۔

ہم دونوں کینٹین میں آکر بیٹھ گئے۔ ارفعان یقیناً" اپنی کلاس لے رہا تھا۔ ورنہ وہ بھی کینٹین میں ہی ہوتا۔

تم ارفعان کو کال کرو اور اسے کہو' کلاس چھوڑ کر آجائے۔ میسج کردو' میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اسے کہو' قدسیہ آئی ہے' جلدی آجائے۔"

"او کے... میں کرتی ہوں۔" میں نے فون نکال کر کال کرنی شروع کی۔

"قدسیہ کالج آئی ہے۔ تم آجاؤ جلدی سے۔ فوراً"۔" اور باقی کی تفصیل میں نے میسج میں لکھ کر شیراز کو سینڈ کردی۔

"قدسیہ! ارفعان کہہ رہا ہے کہ وہ آرہا ہے۔ تم اطمینان سے بیٹھو۔"

قدسیہ نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے حوریہ! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ آناً" فاناً" میرے گھر والوں کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ ارفعان کا نام سننا بھی نہیں چاہتے۔ کہاں پاپا میری مرضی کے خلاف کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے اور کہاں اب انہیں شیراز سے اچھا کوئی نظر نہیں آرہا۔ ماما' پاپا کوئی بھی میری بات نہیں سن رہا۔ وہ ارفعان سے ایک بار بھی نہیں ملنا چاہتے اور میری شادی کر رہے ہیں شیراز کے ساتھ۔" قدسیہ رونے لگی۔

"میرا کالج بھی بند کردیا ہے' موبائل بھی چھین لیا۔ گھر میں مجھ پر ایسے نظر رکھی جاتی ہے جیسے میں کوئی مجرم ہوں یا میں نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ میری نگرانی کرنے کے بعد آج پاپا آفس گئے تو میں ماما سے چھپ کر کالج آگئی۔ میں ارفعان کو لینے آئی ہوں۔ وہ ایک بار پاپا سے مل لے گا تو ان کی سب غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی۔"

"قدسیہ!" اس آواز نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا۔ شیراز اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ "تائی جان بہت پریشان تھیں۔ تم بنا بتائے آگئی ہو۔" شیراز نے تحمل سے کہا "چلو گھر۔"

"میں خود آجاؤں گی' تم جاؤ یہاں سے۔" قدسیہ تڑخ کر بولی۔

قدسیہ! یہاں تماشا نہ بناؤ' گھر چل کر بات کرتے ہیں' تائی جان اور تایا جان بھی آنے ہی والے ہوں گے یہاں۔ چلو میرے ساتھ۔ یہ تمہارا کالج ہے اور تایا جان کے غصے کو تم جانتی ہو۔"

قدسیہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو نظر آنے لگے اور اس نے بے چارگی سے آس پاس دیکھا۔

"حوریہ تم..." اس نے مجھے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ میں ارفعان کو جلد سے جلد اس کے گھر بھیج دوں۔ میں نے سر کو اثبات میں ہلایا۔

"حوریہ! گھر ضرور آنا۔" قدسیہ نے میرے کان کے قریب آکر سرگوشی کی۔ وہ مجھے نہیں ارفعان کو گھر آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ آہستہ روی سے قدم اٹھاتی وہ جارہی تھی۔ ایک' دو بار اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا' لیکن پیچھے صرف میں تھی۔ یہ آخری بار تھا' جب میں نے قدسیہ کو کالج میں دیکھا۔

ارفعان اپنی کلاسز لیتا رہا۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوسکا کہ قدسیہ کالج آئی تھی۔

ٹھیک ایک دن بعد مجھے قدسیہ کی ماما کا فون آیا۔ وہ مجھے گھر بلا رہی تھیں۔ کالج سے واپسی پر میں قدسیہ کی طرف آگئی۔ آنٹی بہت غم زدہ نظر آرہی تھیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا' جیسے وہ بہت بڑے سانحے سے گزری ہیں۔

جس دن قدسیہ کالج آگئی تھی۔ اسی دن شام کو اس

کا شیراز سے نکاح کردیا۔

"جس طرح قدسیہ چھپ کر کالج گئی تھی' اس بات نے اس کے پاپا کو آگ بگولا کردیا۔ قدسیہ نے ان کے مان کا خون کردیا۔ وہ اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ انہوں نے قدسیہ کو ایسے دھتکارا جیسے جانوروں کو دھتکارا جاتا ہے۔" وہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگیں۔

"اتنا شدید ڈپریشن ہوگیا تھا انہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر ہم سب دہل گئے۔ کچھ دنوں تک قدسیہ' شیراز کے ساتھ دبئی چلی جائے گی۔ یہی فیصلہ کیا ہے ہم سب نے کہ اسے یہاں سے دور بھیج دیا جائے۔ کتنا شوق تھا اسے ڈاکٹر بننے کا۔ اس کے پاپا کو اسے ڈاکٹر بنانے کا۔ کتنے ارمان تھے اس کی شادی کے لیے میرے دل میں۔۔۔ قدسیہ نے سب خاک میں ملا دیے۔ خاندان والے الگ باتیں کررہے ہیں' اتنی جلدی نکاح کرنے پر۔ وہ تو شیراز بیٹیوں جیسا ہے' ورنہ شاید۔۔۔" وہ رونے لگیں۔

"تم سے ملنا چاہتی ہے' آج کل میں اس کے پاپا رخصت کردیں گے اسے۔" مجھے لیے وہ قدسیہ کے کمرے میں آگئیں۔ ماحول تو پورے گھر کا ہی سوگوار اور وحشت زدہ سا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وحشت قدسیہ کے کمرے سے جھلک رہی تھی۔

اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو' پھر مجھ سے لپٹ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور روتی ہی رہی۔

"دیکھو تو حوریہ! میرے گھر والے کتنے ظالم نکلے۔ انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔ التجائیں' ضد' غصہ کیا نہیں کیا میں نے۔ لیکن کوئی نہیں مانا۔ جو پاپا میرے سر پر ہاتھ رکھا کرتے تھے' انہوں نے مجھے تھپڑ مارے۔ سب اتنے ظالم ہوگئے حوریہ! میرے پاپا میرے نہیں رہے۔ کہتے ہیں' وہ میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ آخر میں نے ایسا کیا کردیا۔ صرف شیراز سے شادی سے انکار ہی کیا تھا۔ ارفعان سے ملے بغیر وہ ارفعان کو اتنا ناپسند کرنے لگے۔ اسی لیے نفرت کرتی تھی میں شیراز سے۔ میرا سب کچھ چھین لیتا ہے وہ۔ ہمیشہ کامیاب ہوجاتا ہے۔" قدسیہ نے اپنے گیلے گال نفرت سے رگڑے۔

"تمہارا نکاح ہوچکا ہے قدسیہ! اب وہ تمہارا شوہر ہے۔"

"شوہر۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ اس نے پاپا کے بل پر مجھ سے نکاح کیا ہے۔ پاپا نے کہا' وہ مرجائیں گے' میری شکل نہیں دیکھیں گے' اگر یہ نکاح نہ ہوا۔"

"وہ تم سے محبت کرتا ہے۔"

"اس کی حمایت مت کرو۔" قدسیہ نے چلا کر کہا۔ وہ بالکل پاگل لگ رہی تھی۔ "وہ ذلیل انسان' وہ کہا کرتا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرکے ہی دم لے گا اور دیکھو۔"

"قدسیہ! ایسے مت سوچو۔"

"کیسے سوچوں؟ بتاؤ' کیا سوچوں' میرا دل اجڑ گیا۔ اس کے بعد میں اور کیا سوچوں؟"

"نئی زندگی۔"

"نئی زندگی۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ "لاش کو نئی زندگی نہیں' نئی قبر ملتی ہے اور میری قبر۔۔۔ شیراز ہے۔"

وہ رونے لگی اور اتنی اونچی آواز میں رونے لگی کہ آواز اس کے کمرے سے باہر جانے لگی۔ بہت دیر تک وہ ایسے ہی روتی رہی۔ مجھے اسے دیکھ کر افسوس ہورہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اسے دیکھ کر خوش ہورہی تھی۔ قدسیہ ارفعان کے بغیر رہ سکتی تھی' کیونکہ وہ قدسیہ تھی۔ لیکن حوریہ' ارفعان کے بغیر رہنا نہیں چاہتی تھی۔

"حوریہ!" جب میں اٹھ کر واپس جانے لگی تو قدسیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ارفعان سے کہنا' میری شادی ہوگئی ہے اور میں بہت خوش ہوں۔ ارفعان کو ایک بہت بڑا ہارٹ سرجن بننا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اس ہارٹ سرجن کے اپنے دل میں نقص ہو۔ دکھ دلوں کا روگ بن جاتے ہیں اور محبت سے بڑا کوئی روگ نہیں ہوتا۔"

یہ قدسیہ سے میری آخری ملاقات تھی۔ جو آخری نظر میری اس پر پڑی' اس میں اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں۔ جیسے ان میں کوئی جذبہ نہیں' کوئی چاہ نہیں' کوئی امید نہیں' وہ اجاڑ اور برباد آنکھیں تھیں۔

اس ساری رات میں ایک بار پھر سے ڈسٹرب رہی۔ قدسیہ کی حالت نے مجھے افسردہ کردیا تھا۔ اس کی ہچکیاں مجھے بار بار سنائی دے رہی تھیں۔ ایک ایک آنسو چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ وہ اور ارفعان ایک تھے۔ وہ اور ارفعان ایک دوسرے کے لیے تھے۔ کم از کم قدسیہ کی حد تک تو ایسا ہی تھا۔ اس نے اپنا دل ارفعان کے لیے ہی بسایا تھا۔ اب اسی دل کو لیے وہ کسی اور کی بیوی بن چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں کل قدسیہ کے گھر گئی تھی ارفعان!" میرے بال بے ترتیب تھے اور میں اداس نظر آرہی تھی کیونکہ میں واقعی اداس ہی تھی۔

"اس پاگل سے کہنا تھا' آ بھی جاؤ کالج' ارفعان کا دم نکل جائے گا۔" اس کے ذکر پر ارفعان خوش ہوا۔

"وہ اب کالج نہیں آئے گی' وہ دبئی جارہی ہے شیراز کے ساتھ۔"

"دبئی۔۔۔ کیوں؟" ارفعان کو شاید شیراز سے مطلب نہیں تھا۔

"اس کی شیراز سے شادی ہوگئی ہے۔"

ارفعان کئی لحظے میری طرف دیکھتا رہا۔

"شادی۔۔۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے' حوریہ! تم مذاق کررہی ہو کیا؟" اس نے ہنسنے کی کوشش بھی کی اور اس کوشش میں اس کی شکل عجیب صدمے کا شکار نظر آنے لگی۔

"میں مذاق نہیں کررہی ارفعان!" میں نے انتہا کی سنجیدگی لیے کہا۔ "اس کی شیراز کے ساتھ شادی ہوچکی ہے۔ جن دنوں وہ کالج نہیں آرہی تھی۔ ان ہی دنوں اس کی شادی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس نے یہ ساری بات ہم سے چھپائی۔ میں کل جب اس کے گھر گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نکاح ہوچکا ہے اور وہ دونوں دبئی جارہے ہیں۔"

ارفعان ایک بار پھر سے صرف میری شکل کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ وہ شاید ابھی بھی اس انتظار میں تھا کہ میں اچانک سے کہوں گی۔ "میں تو مذاق کررہی تھی۔"

"میں مذاق نہیں کررہی۔"

"قدسیہ کی شادی ہوگئی ہے۔" اس نے خود کلامی کی۔ جیسے خود سے پوچھا ہو اور خود کو بتایا ہو۔ "قدسیہ ایسے کیسے کرسکتی ہے۔" صدمے کی کیفیت اس کے چہرے پر پڑھی جاسکتی تھی۔

"اس نے ایسے شادی کیوں کی؟ بنا بتائے' چھپا کر؟" وہ اٹک اٹک کر بولا۔

"مجھے نہیں معلوم ارفعان! اس نے ایسا کیوں کیا' لیکن ہوا ایسا ہی ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ قدسیہ نے ایسا کیا ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھاما۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں اور وہ آس پاس ایسے دیکھنے لگا جیسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔

کافی دیر تک وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتا وہ پارکنگ کی طرف جانے لگا۔ اس کی چال بھی کم و بیش ویسی ہی تھی' جیسی قدسیہ کی تھی۔ جب وہ آخری بار کالج آئی تھی۔ ایک جاچکی تھی اور ایک جارہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے ارفعان بھی ہمیشہ کے لیے جارہا ہے۔

☼ ☼ ☼

ارفعان کا فون آف تھا اور وہ مسلسل تین دن آف ہی رہا۔

وہ کالج بھی نہیں آرہا تھا۔ اگر میں اس کے گھر جاسکتی تو ضرور جاتی۔ میں نے قدسیہ سے بھی دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مجھے ارفعان کی فکر تھی۔ میں اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔

تین دن بعد رات گئے اس کا فون آیا۔

فون کر کے وہ شاید بات کرنا بھول گیا تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔

مجھے اس کے سوال کی پروا نہیں تھی۔ پریشان میں اس کی آواز سن کر ہو گئی تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ رو تا رہا تھا۔ یا رونے والا تھا۔ "کیا ان کا کوئی فیملی پرابلم تھا۔ اس کے ساتھ زبردستی کی گئی ہے نا؟

میں کیسے مان لوں کہ اس نے چپکے سے شادی کرلی۔ خوشی خوشی' وہ کسی سے بھی شادی کیسے کر سکتی ہے؟ تم پلیز میری ایک بار اس سے بات کروا دو' کچھ بھی کر کے تم میری اس سے بات کروا دو۔"

"ٹھیک ہے ارفعان! تم پریشان مت ہو' میں کوشش کرتی ہوں تمہاری اس سے بات کروانے کی۔ تم کل 'کالج ضرور آنا' مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔"

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

رات کے اس پہر وہ قدسیہ کی یاد میں جاگ رہا تھا اور میں اس کی۔ اگلے دن بھی میں اس کا کالج میں انتظار کرتی رہی' لیکن وہ نہیں آیا۔ ارفعان کے لیے بہت مشکل تھا یقین کرنا کہ وہ اس طرح اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ وہ الجھن میں تھا۔ وہ گتھی سلجھا رہا تھا مجھے اندازہ تھا کہ قدسیہ کے جانے کے بعد ارفعان ڈسٹرب ہو گا۔ اتنا ہو گا' یہ میری سوچ میں نہیں تھا۔ وہ کئی دنوں سے کالج نہیں آرہا تھا۔ وہ قدسیہ کے غم میں مبتلا تھا اور یہ بہت بڑی بات تھی۔ اسے میری محبت میں مبتلا ہونا چاہیے تھا۔ قدسیہ کے غم میں نہیں۔

☼ ☼ ☼

"وہ شیراز کو بچپن سے پسند کرتی تھی۔ وہ ایک ساتھ ایک ہی گھر میں پلے بڑھے تھے۔ میں نے قدسیہ کے منہ سے ہمیشہ شیراز کا ہی ذکر سنا تھا۔ اس کی بچپن سے ہی اس سے نسبت طے تھی۔"

ارفعان بنا کوئی تاثر دیے مجھے سن رہا تھا۔ وہ پورے دس دن بعد کالج آیا تھا۔ اس کی حالت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اسے ہیلو کہنے والے پہلے "کیا ہوا؟" پوچھتے تھے۔

"اس نے مجھے منع کیا تھا کہ میں شیراز کا ذکر کسی سے نہ کروں۔ تم سے بھی نہیں۔ شاید تمہیں یاد ہو' ایک بار میں نے ذکر کیا بھی تھا تو وہ بوکھلا گئی تھی۔ اس نے اس کے بعد مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس کا تذکرہ کرنے سے۔

وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کی بچپن کی محبت ہے۔ شیراز کاروبار کے لیے دبئی جا رہا تھا تو دونوں کی فیملیز نے ان کی شادی کر دی۔ اس شادی کے لیے قدسیہ کافی عرصے سے تیاریاں کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی نہیں بتایا اپنی شادی کا۔ جب میں اسے اس کے گھر ملنے گئی تب بھی نہیں۔"

"وہ شیراز سے محبت کرتی تھی؟" یہ سوال نہیں تھا۔ یہ تمسخر تھا' جو اس نے اپنا اڑایا تھا۔

"ہاں! وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ کالج تو وہ اسے روز پک کرنے آتا تھا۔ سارے کالج کو معلوم تھا کہ وہ دونوں....."

"وہ دونوں....." ارفعان اسی طرح سے ہنسا' جس طرح خود پر ہنسا جاتا ہے' جب کوئی بے وقوف بن جائے۔ جیسے اپنا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اپنا تمسخر بنایا جاتا ہے۔

"اس نے دوبارہ مجھ سے رابطہ نہیں کیا' لیکن اگر تم چاہتے ہو تو میں اسے فون کرتی ہوں۔ اگر وہ دبئی نہ جا چکی ہوئی تو تمہاری بات ہو سکتی ہے۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں۔" ارفعان کی نظریں ایک نقطے پر مرکوز تھیں۔

"جب میں اس سے ملی تو وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔"

"اسے خوش ہی ہونا چاہیے۔" ارفعان نے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"مجھے کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ قدسیہ کون ہے۔ میرے ایک کلاس فیلو نے مجھے ایک بار کہا تھا کہ انسانوں کے معاملے میں 'میں ایک بہت برا ڈفر ہوں۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ میں صرف کتابیں ہی پڑھ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے مجھے صرف کتابیں ہی پڑھنی چاہئیں۔"

بے دلی سے اٹھ کر وہ چلا گیا۔ اس کی چال اس کی شکست خوردگی کی علامت تھی اور یہ علامت ایک عرصے تک اس کے ساتھ رہی۔

میرا خیال تھا کہ وہ قدسیہ سے ملنے کے لیے اصرار کرے گا یا فون پر بات ضرور کرے گا' لیکن میری باتوں سے ہی شاید اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ قدسیہ کی شادی ہو چکی ہے۔ پہلے اسے اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اب آگیا تھا اور یہ کافی تھا۔

☼ ☼ ☼

قدسیہ کا ذکر پھر نہیں دہرایا گیا۔ ہم دونوں کے درمیان سے وہ ہمیشہ کے لیے نکل گئی۔ دبئی جانے سے پہلے قدسیہ نے مجھ سے بات کی تھی۔ چند منٹوں کی بات اس کی طویل خاموشی اور اس کی روانگی کی اطلاع پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد میں نے اپنا نمبر تبدیل کر لیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ پہلے جیسا ہی ارفعان بن گیا تھا۔ وہ جب بھی مجھ سے ملتا' ویسی ہی خوش دلی سے ملتا۔ مجھے اپنے نوٹس دیتا اور میری مدد کرتا۔ پھر بھی تبدیلی بہت بڑی آئی تھی اور اس تبدیلی کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا' نہ ہی اس کی واضح نشاندہی کی جا سکتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ مجھے ایک لمبا انتظار کرنا ہو گا۔ اس تبدیلی کے نشانات کو مٹانے کے لیے۔

اب میں ارفعان کی اکلوتی دوست تھی۔ اس کے دو قریبی کلاس فیلوز کے علاوہ۔ پہلے بھی وہ بہت پڑھتا تھا' اب اور زیادہ پڑھنا شروع کر دیا تھا اس نے اور اس پڑھائی میں انسانی چہرے بھی شامل ہونے لگے تھے۔

بہت آہستہ روی سے' لیکن میں نے اس میں یہ تبدیلی آتی دیکھی۔ وہ اپنے آس پاس نظریں دوڑاتا رہتا تھا۔ خاص کر جوڑے کی صورت میں بیٹھے لڑکے لڑکی پر..... اکثر وہ انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ وہ ان کا جائزہ لیتا تھا۔ ان کا مشاہدہ کرتا تھا۔ اب اکثر وہ مجھے اپنے دوستوں سے سنے گئے کسی نہ کسی اسکینڈل کی کہانی بھی سنا دیتا۔

"فرزین شاہ کو جانتی ہو؟" آج اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔ "میری کلاس فیلو۔"

"جانتی ہوں' کیا ہوا اسے؟" ارفعان کسی لڑکی کا ذکر کر رہا تھا۔ حیرت انگیز بات بھی تھی۔

"فرسٹ ایئر میں وہ مجھ میں بہت انٹرسٹڈ تھی۔"

"تو!"

"تو..... ہونہہ..... اب کالج میں اس کے اور ازمیر کی سچی محبت کے قصے مشہور ہیں۔" ارفعان نے چچی کو کھینچا۔ "میں نے ازمیر کو جا کر بتا دیا کہ یہ مجھے ڈیٹ کرنا چاہتی تھی اور یہ خود چل کر میرے پاس آئی تھی۔ سچویشن دیکھنے والی تھی' لو برڈز آج کل فائٹرز بنے ہوئے ہیں۔" ارفعان ہنسنے لگا۔

"تم نے کیوں بتایا ازمیر کو؟" حیرت سے میری آنکھیں باہر آنے کو تھیں۔

"میں نے سوچا ازمیر کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جس کی سچی محبت میں وہ گرفتار ہے۔ وہ پہلے کتنوں کو لفٹ کروا چکی ہے۔" وہ کہہ کر پھر سے ہنسنے لگا۔

"بچ۔" ارفعان نے نفرت سے کہا۔ اس کی آنکھوں سے غصہ اور نفرت جھلکنے لگی۔

میرا منہ اور آنکھیں پوری کھل گئیں۔ ارفعان گالی دے رہا تھا۔ وہ بھی ایک لڑکی کو۔

"آئی ایم سوری۔" میری شکل دیکھتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "ایسے ہی غصے میں نکل گیا۔" وہ شرمندہ نظر آنے لگا۔

"اٹس اوکے' میں سمجھ سکتی ہوں ورنہ....."

"ورنہ.....؟"

"ورنہ یہی کہ تم اس طرح بی ہیو نہیں کرتے۔"

"ہاں! کرتا تو نہیں تھا۔ لیکن اب کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے' کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے صرف اس کی طرف دیکھتے رہنے کا کام کیا۔ میری نظروں میں تاسف نہیں تھا۔ ان میں محبت تھی۔ نرمی تھی اور ارفعان کے لیے تھی۔ میں نے

اپنے بھورے بالوں کو ایک لمبے عرصے کے بعد ایک طرف سامنے پھیلایا۔

"کیا اب میں تمہاری پری نہیں رہی ارفعان!" میں نے بات کو اچانک ہی بدل دیا۔ مجھے کبھی نہ کبھی تو بات کو بدلنا ہی تھا اور میں بے وقوفی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

وہ میری طرف چونک کر دیکھنے لگا اور دیکھتا ہی رہا۔ شاید اس نے آج پری کو نوٹ کیا تھا قدسیہ کی غیر موجودگی میں' قدسیہ کو دل سے نکال کر۔

"تم ابھی بھی پری ہی ہو۔" اس نے میری کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔

مجھے جلدی نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ لفظ آج نہیں تو کل استعمال کرے گا۔

☼ ☼ ☼

بیرونی اور اندرونی طور پر اس میں جتنی بھی تبدیلیاں آنے لگی تھیں' اس کا اثر اس نے مجھ پر پڑنے نہیں دیا تھا۔ میرے ساتھ وہ پہلے دن کی ہی طرح تھا۔ میں اس کی وہی دوست تھی' جو قدسیہ کی موجودگی میں ہوا کرتی تھی۔

میں اس کا جتنا خیال رکھ سکتی تھی' رکھنے لگی' لیکن بات ایک اچھی دوست تک ہی رہی' حتیٰ کہ اگر میں اسے آدھی رات کو جگا کر اس سے بات کرنے پر اصرار کرتی تب بھی' مجھے یہ دوستی والا رشتہ نہیں چاہیے تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود ارفعان میری طرف مائل ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پتا نہیں' دوست کے علاوہ وہ مجھے کیا سمجھتا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میری یہ خواہش شدت اختیار کر گئی کہ میں اس کا ہاتھ پکڑ لوں اور اسے سب کہہ دوں' سب کچھ جو اس کے لیے میرے دل میں تھا اور پھر۔۔۔

پھر ایک دن میں نے سب کچھ کہہ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ یو ایس اے چلا جاتا' میں نے خود ہی اسے سب کچھ کہہ دیا۔

"مجھے لفظ "محبت" پر یقین نہیں ہے حوریہ! کچھ اور بات کرو۔"

اس نے اپنا ہاتھ نرمی سے مجھ سے الگ کیا۔ میں نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔ میری بھوری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ مجھے ایسے ہی کسی رد عمل کی توقع تھی۔ میرے آنسو باہر آنے لگے۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا' بنا کچھ کہے۔ مجھے دکھ ہوا اس کے اس طرح سے چلے جانے پر' لیکن میں مایوس نہیں ہوئی تھی۔ کئی ہفتوں تک وہ نظریں چرائے میرے اداس چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ مجھ سے کترا رہا تھا اور الجھا ہوا تھا۔ گزرے وقت نے اسے تلخ بنا دیا تھا۔ وہ جذبات کچلنا سیکھ چکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ میری محبت بھی نہ کچل دے۔

"تم نے ایسا سوچا بھی کیوں حوریہ!" میں ایک بار پھر اپنا افسردہ روپ لیے اس کے سامنے موجود تھی۔

"میں نے ایسا سوچا نہیں' بس ایسا ہو گیا۔۔۔ پہلے دن سے میری زندگی تمہارے سامنے ہے۔ جو تمہارے ساتھ اس کالج میں شروع ہوئی تھی۔ میں اسے یہیں ختم کرنا نہیں چاہتی۔ میرے بارے میں سوچنے میں کیا حرج ہے' ہم ساتھ ہنس سکتے ہیں' ساتھ رو سکتے ہیں تو ساتھ رہ کیوں نہیں سکتے۔"

"میں اس کالج کی کسی یاد کو اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتا۔"

"تو مجھے یاد نہ بناؤ' مجھے حصہ بنا لو اپنی زندگی کا۔"

"حوریہ! تم بہت اچھی ہو' لیکن۔۔۔ مجھے سچ میں سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ میں ابھی شادی کے لیے تیار نہیں ہوں' میں کسی بھی رشتے کے لیے تیار نہیں ہوں' نہ جانے کتنا وقت لگے' لیکن وہ وقت یہ نہیں ہے' تم اپنے لیے کچھ اور سوچ لو۔"

"میں نے تمہیں سوچ لیا ہے۔" میں نے التجائیہ کہا۔

"مجھے کسی پروفیشنل سے شادی نہیں کرنی۔ مجھے عام سی گھریلو لڑکی سے شادی کرنی ہے۔" شاید وہ مجھے اس طرح سے ٹالنا چاہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں پروفیشنل ڈاکٹر نہیں بنوں گی۔" میں نے فوراً کہا۔ "جیسے تم چاہو گے' ویسے ہی زندگی گزاروں گی۔"

"تمہیں میرے لیے اپنا پیشن چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے حوریہ! ڈاکٹر بنو۔۔۔ پتا نہیں تم کیا کرنے جا رہی ہو۔ تم مجھے مجبور کر رہی ہو۔"

"میں تمہیں منا رہی ہوں۔"

"میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنی زندگی میں کوئی عورت فی الحال نہیں چاہیے۔"

"تو تم اپنی زندگی میں ایک دوست کو شامل کر لو' یہ دوست عورت کبھی نہیں بنے گی۔"

اس بات نے اس پر چھائی سنجیدگی میں کچھ تبدیلی پیدا کی۔

"کیا تمہیں میرے ساتھ سے کوفت ہوتی ہے؟ اتنے سالوں میں کیا تمہیں مجھ سے الجھن محسوس ہوئی۔ جب ایسا کبھی نہیں ہوا تو آئندہ بھی نہیں ہو گا۔"

وہ سوچنے لگا۔

"تم نے مجھے کبھی انکار نہیں کیا ارفعان! تم اب کیسے انکار کر سکتے ہو' وہ بھی بلاوجہ' بنا کسی قصور کے' کسی کے لیے تم مجھے کیسے سزا دے سکتے ہو۔"

"مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔"

میرے اندر پھول ہی پھول کھلنے لگے اور ان کی خوشبو نے مجھے معطر کر دیا۔۔۔

جس دن پارلر جانے کے لیے میں اپنے بیڈ روم میں سے اپنی چیزیں بیگ میں رکھ رہی تھی۔ اس دن میں نے دعا کی کہ قدسیہ' شیراز کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزارنے اور اپنا ماضی بھول جائے' کیونکہ میں حوریہ ارفعان بننے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سات سال اور چند ماہ بعد میں نے قدسیہ کو انقرہ میں کڈز پلے لینڈ میں دیکھا۔ میں وہاں حسام کے ساتھ گئی تھی۔ ارفعان کو کسی کانفرنس کے سلسلے میں ضروری جانا تھا اور وہ حسام کو بھی اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا لیکن حسام میرے بغیر آنا نہیں چاہتا تھا۔ حسام ضد نہ کرتا تو ارفعان مجھے گھر میں ہی چھوڑ آتا۔ اس کے لیے میں آج بھی وہی تھی' جو ہوتے ہوئے بھی نہیں تھی۔

لوگوں کے ہجوم میں اسے دیکھتے ہوئے مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اس کے پاس جاؤں۔ جتنی وہ کالج میں پیاری ہوا کرتی تھی' وہ آج بھی اتنی ہی پیاری تھی۔ اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں کی چمک دور سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔ سات سالوں میں' میں نے لاکھوں بار یہی دعا کی تھی کہ کہیں سے اچانک قدسیہ مجھے مل جائے اور وہ مجھے مل چکی تھی۔

حسام کو مکمل فراموش کیے میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"قدسیہ!" بہت دیر تک اسے دیکھتے رہنے کے بعد میں اس کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ آواز اتنی اونچی نہیں تھی کہ وہ فوراً سن لیتی۔ مگر اس نے سن لیا۔ وہ ایسے پلٹی جیسے میرے ہی انتظار میں وہاں کھڑی تھی۔

"حوریہ!" آواز سے پہلے وہ مجھ سے آ کر لپٹ گئی اور میرے گالوں پر پیار کیا۔ "میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔"

"میں نے بھی۔۔۔" میں نے سچ کہا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے مضبوطی سے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ میں ایک ایسے سہمے ہوئے بچے کی طرح' جسے اس کی ماں مل گئی ہو' اس سے لپٹی ہی رہی۔

پلے لینڈ میں بنے ریسٹورنٹ میں آ کر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ اس کی جڑواں بیٹیاں تھیں' جو اپنی پھوپھو کے ساتھ انجوائے کر رہی تھیں۔

"انقرہ میں شیراز کی بہن رہتی ہے۔ شیراز تو بہت مصروف تھا۔ میں انہیں انقرہ گھمانے لے آئی۔ تم کہاں ہوتی ہو حوریہ!"

"نیو یارک۔ حسام کے پاپا یہاں انقرہ میں کسی کانفرنس میں آئے ہیں' انہی کے ساتھ ہم دونوں بھی۔۔۔"

حسام پاس ہی بیٹھا فاسٹ فوڈ کھا رہا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر

گیمز کی طرف چلا گیا۔ قدسیہ کے سامنے ارفعان کا نام لیتے مجھے خود پر شرم آرہی تھی۔

بہت طویل خاموشی رہی ہم دونوں کے درمیان۔ میں اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی اور شاید وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کہے۔

سامنے ٹیبل پر رکھے اس کے دونوں ہاتھ میں نے اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

"مجھے معاف کردو قدسیہ!" میری آنکھوں نے اس کے ہاتھوں کو بھی گیلا کردیا۔

قدسیہ نے ہاتھ سے میرے گال تھپکے۔ "مت روؤ حوریہ! حسام تمہیں پلٹ کر دیکھ رہا ہے' بچوں کے لیے ایسے مناظر تکلیف دہ ہوتے ہیں' جن میں ان کے والدین روئیں۔"

"میں بے حد تکلیف میں ہوں۔ مجھے معاف کردو' مجھے معاف کردو اور میرے لیے دعا کرو کہ میری سزا ختم ہوجائے۔ میں نے تم سے رابطہ کرنے کی سر توڑ کوشش کی' تم کہاں چلی گئی تھیں۔ تمہارے گھر کا نمبر بھی بند تھا۔"

"میرے بعد سب ہی آہستہ آہستہ دبئی شفٹ ہوتے چلے گئے۔ تم چاہ کر بھی مجھ سے رابطہ نہیں کرسکتی تھیں۔"

"تم شیراز کے ساتھ خوش ہو؟"

"مجھے اب یہ فکر رہتی ہے کہ کیا میں نے شیراز کو خوش رکھا؟ کیا وہ مجھ سے خوش ہے؟ شادی کے شروع کے سال میں نے اس کے لیے عذاب بنا کر رکھے۔ میں اسے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اتنی بڑی آزمائش بن گئی تھی میں شیراز کے لیے کہ ایک دن وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ "صرف محبت کرنے کی اتنی بڑی سزا؟"

وہ مجھے پاکستان واپس لے آیا' میرے کالج واپس لے آیا۔ اس نے مجھے کالج کے باہر ڈراپ کیا اور کہا کہ میں اپنی پسند کی زندگی اپنالوں' وہ میرے ساتھ ہے' وہ میرا ساتھ دے گا۔ اس وقت مجھے شیراز پر بہت ترس آیا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں کالج کے اندر واپس چلی جاتی اور ارفعان سے ملتی۔ بس اتنی ہمت تھی مجھ میں کہ میں شیراز کے پاس ہی واپس چلی جاتی' اس نے مجھے اتنا برداشت کیا تھا کہ مجھے یقین تھا کہ اب کوئی اور مجھے برداشت نہیں کرسکے گا۔"

قدسیہ نے رک کر میری طرف دیکھا۔

"میں نے شیراز کے ساتھ ہی زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے اس سے محبت نہیں ہوگئی تھی' لیکن میں نے سمجھوتا کرلیا تھا۔ میرے پاس اور راستہ ہی نہیں تھا سوائے شیراز کے۔۔۔ اور اس سمجھوتے میں ساری گتھیاں سلجھتی ہی چلی گئی۔

اپنی فیملی سے نفرت' شیراز سے نفرت۔۔۔ اگر وہ ساری باتیں مجھے پہلے معلوم ہوجاتیں تو میں سب سے اتنی نفرت نہ کرتی۔ جس دن شیراز نے تمہارا ذکر کیا' اس دن ہم دونوں نے مل بیٹھ کر اپنے بارے میں بات کرنی شروع کی۔ اسی دن سب کچھ صاف ہوگیا۔ کسی کی بھی کوئی غلطی نہیں تھی۔ ماما' پاپا' شیراز سب صرف میرے لیے اچھا کرنا چاہتے تھے۔ سب کو میری فکر تھی۔۔۔ اور مجھے صرف اپنی۔۔۔ شیراز کے ساتھ نفرت کی انتہا میں' میں نے کچھ اور سوچا ہی نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ سارا قصور شیراز کا ہے۔ اس نے سالہا سال مجھ جیسی بیمار ذہن کی تیمارداری کی اور میں اسے لعن طعن کرتی رہی۔ آج بھی سوچ کر افسوس ہوتا ہے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ مجھے بہت خوش رکھے گا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا' بہت۔"

"میرے بارے میں جان کر تمہیں۔۔۔"

"ہاں! بہت دکھ ہوا تھا' میں نے تم سے اتنی نفرت کی حوریہ! اتنی کہ اگر وہ نفرت میں تمہیں دکھا سکتی تو تم دیکھتیں کہ کوئی کسی سے اتنی نفرت بھی کرسکتا ہے جتنی تم سے کی گئی۔ کچھ ذرائع سے میں نے کالج میں ارفعان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی' مگر اس وقت تک ارفعان کالج سے جاچکا تھا۔"

جس دن میں دل کی پہلی سرجری کرنے لگی۔ اس دن میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ میں نے سوچا کہ نفرت سے بھرا دل لیے میں کیسے کسی دوسرے دل میں زندگی

دوڑا سکتی ہوں' میں نے اسی دن تمہاری نفرت کو دل سے نکال دیا۔ میں نے اپنا دل پاک کرلیا' ایک مسیحا کو مسیحا کی طرح ہی ہونا چاہیے۔ ہمارے ایک سینیر ڈاکٹر سرجری سے پہلے دو نفل پڑھتے تھے' میری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں نفرت جیسے گناہ کو لے کر کسی کے لیے مسیحا بنوں۔"

"تم ہارٹ سرجن بن گئی ہو؟" میں پستی سے اور پستی کی طرف جارہی تھی۔

"ہاں! شیراز نے مجھے بنایا ہے۔ اس نے میرا ادھورا خواب پورا کیا۔ وہ رات کو میرے لیے دن کرتا ہے۔ میرے قدموں کے نشان وہ اپنی محبت سے صاف کرتا ہے۔ شیراز تمہارا مشکور ہے' وہ اکثر کہتا ہے صرف تمہاری وجہ سے ہماری شادی ہوئی ورنہ یہ شادی کبھی نہ ہوتی۔"

قدسیہ میرے ساتھ ہلکا پھلکا مذاق کرکے مجھے ہلکا کرنا چاہ رہی تھی وہ مسکرا رہی تھی۔

"تمہیں مجھ سے نفرت ہی کرتے رہنا چاہیے تھا قدسیہ! تمہارے لیے یہ گناہ نہیں تھا' تمہارا حق تھا۔ میں نے تمہاری زندگی برباد کی۔ تمہیں اور ارفعان کو جدا کردیا۔ تمہیں میرے منہ پر تھوکنا چاہیے' تمہیں مجھے ذلیل کرنا چاہیے۔"

"مجھے ایسا کبھی بھی نہیں کرنا چاہیے۔ تم۔۔۔"

"شادی کے چند ماہ بعد ارفعان نے مجھے گالی دی۔ وہ مجھے تھپڑ مار دیتا۔ مگر وہ گالی نہ دیتا۔ اس نے مجھے یاد دلایا تھا کہ میں نے تمہاری محبت پر حرام کھایا ہے۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ میں ایک مردار کھانے والی ہوں۔"

"ایسے مت سوچو حوریہ!" قدسیہ نے شفقت سے کہا۔

"پھر وہ ہر روز مجھے ایک نیا نام دیتا ہے' ہر وہ گالی جو میرے کردار کی بالکل درست عکاسی کرتی تھی۔ وہ مجھے ہر وہ طعنہ دیتا جو مجھے دیا جانا چاہیے۔ وہ میرے منہ پر ہر روز کالک ملتا ہے۔ یہ کالک میرے اپنے گناہوں کی ہے' میں نے تمہارے ساتھ اتنا کچھ کرتے ہوئے ایک بار بھی نہیں سوچا۔ جس دن تم کالج سے گئیں۔ ارفعان بھی تمہارے ساتھ ہی رخصت ہوگیا تھا۔ وہاں ارفعان کی جگہ ایک ایسے مرد نے لے لی تھی' جو محبت اور رحم سے عاری تھا۔ جیسے میں تمہارے لیے محبت اور رحم سے عاری تھی۔ میں نے تم پر رحم نہیں کیا تو ارفعان نے بھی مجھ پر کرم نہیں کیا۔ میں نے محبت کے نام پر سب کچھ کیا' سب ناجائز' ہر زیادتی' ہر جھوٹ بولا۔

دن بدن میرا ملال بڑھتا ہی گیا' ہر دن' ہر پل مجھے صرف تمہارا ہی خیال آتا ہے' دیواروں سے لپٹ لپٹ کر روتے روتے میں تھک گئی۔ رات کی تنہائیوں میں' میں نے تم سے معافی مانگی ہے قدسیہ۔۔۔ ہر رات میں نے یہی کرتی ہوں۔

ان سالوں نے مجھے صرف حسام دیا ہے۔ میں ابھی تک ارفعان کے ملنے کے انتظار میں ہوں۔ میں مسز ارفعان بنی تھی' ارفعان کی نہیں' اس نے اپنا نام دیا۔ خود کو نہیں۔ میں نے ارفعان سے محبت کی' میں نے یہ کیوں سوچا کہ اس محبت کا نصیب بھی مجھے خود ہی لکھنا ہے۔ تم نے مجھے معاف کردیا قدسیہ! میرے لیے دعا بھی کردو۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" اس نے میرا سر سہلایا۔

"کاش مجھے یہ دعائیں لگ جائیں۔۔۔ کاش!"

"ارفعان کو مجھ سے گھن آتی ہے۔ اسے مجھ سے وحشت ہوتی ہے۔ وہ میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ دیکھو! اس خوب صورت شکل کی مالک کا بدنما انجام۔۔۔

اس وقت مجھے لگتا تھا کہ میری قسمت میرا ساتھ دے رہی ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری قسمت مجھے میری بدقسمتی کی طرف لے کر جارہی ہے' تم مجھ سے پیار کرتی تھیں اور میں نے تمہاری محبت کے ساتھ کیا کیا۔

ارفعان سے نفرت کرنے کے بجائے میں دن بہ دن اس کی محبت میں مبتلا ہی ہوتی جارہی ہوں قدسیہ! میرے لیے یہ محبت عذاب بن گئی ہے۔ دعا کرو میں

اس سے نفرت کرنے لگوں تاکہ میں اس کے بغیر رہ سکوں۔ اسے دیکھے بغیر رہ سکوں تاکہ وہ اپنی زندگی۔۔۔ زندگی کی طرح گزار سکے۔ دعا کرو قدسیہ!"

☼ ☼ ☼

"ارفعان!" میں اس کے سامنے اس کے اسٹڈی روم میں کھڑی تھی۔ قدسیہ سے ملنے کے اگلے دن ہی ہم واپس نیویارک آگئے تھے۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے ان ہی نظروں سے مجھے دیکھا، جن نظروں سے وہ مجھے دیکھا کرتا تھا۔

"میں نے اپنا سامان پیک کرلیا ہے۔ ٹکٹ بھی کنفرم کروالی ہے۔ تم آخری بار میری باتیں غور سے سن لو پلیز۔ اپنی یہ کتاب بند کردو اور صرف مجھے سنو میں چاہتی ہوں تم وہ سب جان لو، جو صرف تم سے متعلق ہے اور اس سب سے پہلے میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے معاف کردو۔"

اس نے اپنی کتاب بند کردی اور حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"قدسیہ کے جانے کے بعد تمہارے اندر کا وہ بے رحم انسان پیدا ہوا جو عورتوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ تمہارا دل محبت سے خالی ہوگیا۔ اتنا کہ ایک بیٹی کی چاہت بھی نہیں رہی۔ ایک عورت کے جانے کے بعد تمہاری ہر عورت سے اتنی نفرت کی ذمہ دار میں ہوں، قدسیہ نہیں، تمہیں صرف مجھ سے نفرت کرنی چاہیے۔ صرف مجھے دھتکارنا چاہیے۔ قدسیہ تم سے محبت کرتی تھی شیراز سے نہیں۔

اس نے تمہیں نہیں چھوڑا تھا، اس کی زبردستی شادی کی گئی تھی شیراز کے ساتھ۔۔۔ وہ تمہارے لیے روتی تڑپتی رہی تھی جیسے تم اس کے لیے تڑپے تھے۔"

ایک ایک کرکے میں نے ارفعان کو سب کچھ بتادیا۔۔۔

"آخری بات جو قدسیہ نے کی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتی کہ دل کے سرجن کے اپنے دل میں نقص ہو۔ اتنے سالوں میں خود کو قدسیہ کا گناہ گار سمجھتی رہی، لیکن انقرہ میں قدسیہ سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اصل نقصان تو تمہارا ہوا ہے۔ تمہاری تو میں نے روش ہی بدل دی۔ میں نے خود کو تمہارے ساتھ باندھے رکھا۔ تمہیں ناکردہ گناہ کی سزا دی۔ قدسیہ نے مجھے معاف کردیا ہے۔ تم بھی مجھے۔۔۔"

ایک زوردار تھپڑ نے مجھے درمیان میں ہی روک دیا۔ ارفعان کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

"وہ سب تم نے کیا؟"

"ہاں!" میری سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگیں۔

"تم اتنی ذلیل ہوگئی تھیں اور اب تم چاہتی ہو میں تمہیں معاف کردوں؟ مجھے تم سے صحیح گھن آتی تھی، میں نے زندگی میں کسی کو پہچانا نہیں لیکن میں نے اتنا ضرور جان لیا تھا کہ مجھے تم سے نفرت کرنی ہے۔ کیوں کرنی ہے؟ اس کا جواب تم نے خود آج دے دیا۔ اتنے سالوں میں تمہیں ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا کہ تم مجھے اس جہنم سے نکال دو۔ مجھے بتاؤ، صرف اتنا ہی کہ قدسیہ جھوٹی نہیں تھی، وہ شیراز سے محبت نہیں کرتی تھی، اس کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔۔۔ صرف اتنا ہی کافی ہوتا میرے لیے۔

اتنے سال میں نے اس سے نفرت کی۔ اسے گالیاں دیں۔ اس فرشتہ صفت لڑکی کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچا۔ اتنے سال میں نے ہر دن صرف اس سے نفرت کی۔ ہر بار پہلے سے زیادہ نفرت کی۔ تم اندازہ نہیں کرسکتیں اتنی۔۔۔

کیا تمہیں معلوم ہے میں اس سے کتنی محبت کرتا تھا۔" وہ چلایا۔

"تم جانتی ہو!" وہ اسی انداز میں چلایا۔ "اتنی نفرت کے باوجود مجھے آج بھی وہی نظر آتی ہے ہر طرف۔ اس کے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"اسے پہلی بار دیکھنے سے اس سے آخری بار ملنے

تک وہ ایک ایک لمحہ میرے اندر موجود ہے۔ نہ اسے محبت کی نشاندہی کرنی پڑی تھی، نہ ہی مجھے۔ ہم دونوں کو معلوم تھا کہ ہم دونوں کے درمیان کیا ہے۔ تم نے اس عورت سے مجھے نفرت کرنے پر مجبور کیا۔

اس قدسیہ سے۔۔۔ اپنی محبت کو میں نے ایک خاص وقت کے لیے اپنے اندر چھپا کر رکھا تھا، میں اس کی نمائش نہیں کرتا تھا۔ نہ جانے تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم دونوں۔۔۔ ہم دونوں ہی پڑھ رہے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ قدسیہ کی توجہ پڑھائی سے کم ہو میں اسے کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔ تم نے کیسے اس کے لیے میری محبت تاڑلی، تمہیں کیسے معلوم ہوا حور یہ؟"

"کاش مجھے معلوم نہ ہوا ہوتا۔" میری آواز لرزنے لگی۔

"کتنا پیار کرتی تھی قدسیہ تم سے۔ اسی کے پیار کو دیکھتے ہوئے مجھے تم پیاری تھیں۔ میں تمہیں اس کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ میری محبت میں اندھی ہوگئی تھیں تو قدسیہ کی محبت کا ہی خیال کیا ہوتا تم نے۔ اس کی شادی کی خبر نے مجھے پاگل کردیا تھا۔ تمہیں کیا لگا تھا میں نارمل ہوگیا؟ اسے بھول گیا؟ آج بھی کتابوں میں مجھے قدسیہ لکھی نظر آتی ہے۔"

ارفعان نے تنفر سے میری طرف دیکھا۔ اتنی نفرت تھی میرے لیے اس کی آنکھوں میں۔۔۔

"میں اس سے محبت اور نفرت کے درمیان ہی لٹکا رہا اتنے سال۔۔۔ اتنی صدیاں۔ تمہیں ترس نہیں آیا مجھ پر؟" اس نے مجھے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"تم نے صرف اپنا ہی سوچا۔ اپنی محبت۔ اپنی زندگی۔ اتنے سالوں میں بھی تم اپنی ہی محبت کی التجائیں کرتی رہیں۔ اپنے لیے ہی محبت مانگتی رہیں۔ جن سے محبت کی جائے، انہیں تو دیا جاتا ہے، تم جھپٹتی ہی رہیں مجھ سے۔۔۔ اور اب چاہتی ہو، تمہیں معاف کردیا جائے۔ قدسیہ نے تمہیں معاف کردیا، غلط کیا۔ اسے چاہیے تھا وہ تم پر تھوک دیتی۔"

"یہ کام تم کردو ارفعان! تھوک دو مجھ پر۔"

"تم اس کے بھی لائق نہیں ہو۔ افسوس! میری اولاد تمہارے وجود سے پیدا ہوئی۔ میرا دل چاہتا ہے میں اپنے وجود کو جلا کر خاک بنادوں، جس کے لیے تم اتنی گھٹیا بن گئیں۔ میں نے یقیناً" کوئی گناہ کیا تھا، جس کی سزا میں تم مجھے ملیں۔"

"میں نے اس کی سزا پالی ہے ارفعان! تمہاری نفرت ہی میرے لیے سزا ہے۔ ہر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ تمہارے لیے میری محبت بڑھتی ہی جارہی ہے۔ کیا یہ سزا نہیں، کیا یہ سزا نہیں کہ تم مجھ پر تھوکنا بھی نہیں چاہتے۔ کیا یہ سزا نہیں کہ میں تمہارے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتی اور تم مجھے دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔۔۔؟

اتنی سزا ہے یہ۔۔۔ اور اسے سزا میں نے خود بنایا ہے مجھے تم سے محبت بھی کرنا ہے اور تم سے الگ بھی رہنا ہے۔ تمہاری سزا تو ختم کردی میں نے۔ میری کب ہوگی؟"

"ایک ارفعان کے لیے تم نے اتنا کچھ تباہ کردیا۔ ایک خاکی پتلے کے لیے اتنے جھوٹ۔ اتنا فریب۔ تم تو انسانیت کے لیے ایک گالی ہو۔"

"بس کرو ارفعان! خدا کے لیے بس کرو۔" میری آنکھیں اندھیر ہوگئیں۔

"مجھے اپنے ہاتھوں سے ماردو لیکن بار بار اپنی اتنی نفرت کا اظہار نہ کرو۔ مجھے میری ہی بددعا لگ گئی ہے۔ کاش اب مجھے قدسیہ کی کوئی دعا لگ جائے۔ تم مجھے معاف نہ کرسکو لیکن مجھ سے اتنی نفرت نہ کرو۔۔۔"

ارفعان نہیں تھا وہ کب کا جاچکا تھا۔

چھ گھنٹے بعد میری شکاگو کے لیے فلائٹ تھی۔ ایرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے میرے پاس صرف ایک ہی چیز تھی اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرنے کی امید۔ میں نے سوچا شاید کبھی میں بھی کسی دل میں زندگی دوڑا سکوں۔ کاش! کبھی۔۔۔

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

اجلال رازی اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نامناسب گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچالیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اسپتال میں اریبہ کے پاس ساجدہ بیگم ٹھہری ہوئی ہیں۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہے۔ شمشیر علی، توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد نے اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہا۔ بعد میں انہیں پتا چلا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اریبہ ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے۔ وہ سارہ کو صاف صاف بتا دیتی ہے کہ وہ اسے شہباز درانی کے ساتھ دیکھ چکی ہے۔

رازی، اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔

تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

۱۰
دسویں قسط
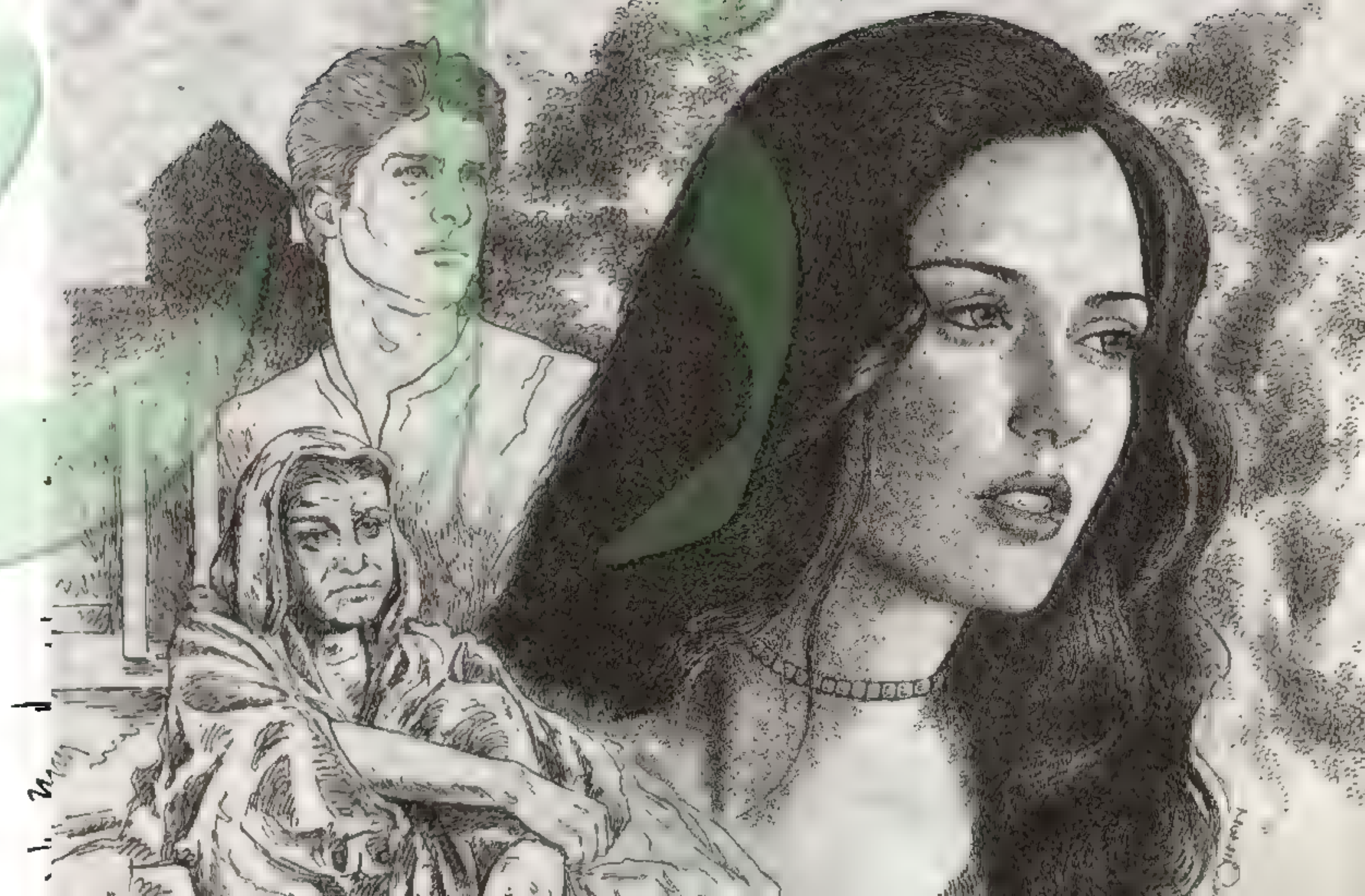
اور اس وقت ساجدہ بیگم کے پاس جانا ملتوی کر کے وہ چوکیدار الیاس کو گھر لے آئے۔

"ہاں اب کہو کیا کہنا چاہ رہے تھے؟" توصیف احمد نے آرام سے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

سر! یہ کوئی پانچ چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ رات کے دس گیارہ بجے میں ٹہلنے نکلا تھا۔ میرا گھر وہیں آفس کے قریب تھا۔ میں روزانہ رات کو ٹہلتا ہوا آفس تک جاتا تھا۔ اس رات میں نے منیجر صاحب کو ایک دو آدمیوں کے ساتھ آفس کی طرف دیکھا تھا۔" الیاس فوراً بتانا شروع ہو گیا تھا' پھر ایک دم خاموش ہو گیا۔

توصیف احمد پوری طرح متوجہ تھے۔ اس کی خاموشی گراں گزری تو فوراً بولے۔ "پھر......؟"

"پھر صاحب مجھے نہیں پتا' انہوں نے آفس میں کیا کیا۔ میں وہیں باہر رک گیا تھا' یہ سوچ کر کہ شاید انہیں کسی کام کے لیے میری ضرورت پڑ جائے۔ لیکن وہ جب باہر آئے تو مجھے دیکھ کر ڈانٹنے لگے کہ میں وہاں کیا کر رہا ہوں اور یہ بھی کہا کہ میں کسی غلط نیت سے آفس جانا چاہتا تھا۔ انہوں نے مجھ پر الزام لگایا اور اسی وقت نوکری سے نکال دیا تھا۔ ساتھ دھمکی بھی دی کہ وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ میں غریب آدمی ہوں سر! ڈر گیا تھا اور اگلے ہی دن اپنے شہر فیصل آباد چلا گیا۔"

الیاس اس رات کی کارروائی بتا کر خاموش ہو گیا۔ توصیف احمد اس پر سے نظریں ہٹا کر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کتنی ہی دیر بعد اسے دیکھ کر کہنے لگے۔

"تم اگلے دن فیصل آباد چلے گئے تھے' پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہاں میرے سیف سے رقم چوری ہوئی ہے ...... پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ شمشیر علی حوالات میں ہے۔ کیسے ...... جبکہ تم یہاں نہیں تھے؟" توصیف احمد جرح نہیں کر رہے تھے لیکن ان کی نظریں کھوجتی ہوئی تھیں۔

"جی سر! میں یہاں نہیں تھا۔ مجھے شمشیر علی کے بارے میں ابھی کچھ دن پہلے پتا چلا کہ وہ حوالات میں ہے۔ وہیں فیصل آباد میں میرے ایک جاننے والے نے بتایا تھا۔" الیاس توصیف احمد کی نظروں سے خائف ہو کر بتا رہا تھا۔

"اصل میں سر! میرا وہ جاننے والا ابھی یہاں حوالات میں تھا شمشیر علی کے ساتھ۔ وہ ابھی دو ہفتے پہلے رہا ہو کر آیا تھا تو حوالات کے قصے سناتے ہوئے اس نے کسی شمشیر کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ روز ہی ان کا ذکر کرتا تھا۔ میرا ذہن اچانک اپنے شمشیر علی کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس سے حلیہ پوچھا تو وہ اپنے آفس والا شمشیر علی نکلا۔"

"پھر......؟" توصیف احمد یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں تھے۔

"پھر...... شمشیر علی کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک میرا ذہن اس رات کی طرف چلا گیا۔ جب میں نے منیجر صاحب کو آفس جاتے دیکھا تھا۔ تب میں نے سوچا سر! کہ مجھے آپ کو بتا دینا چاہیے۔ کیا پتا شمشیر علی بے قصور ہو۔ سر! وہ بہت بھلا آدمی ہے' وہ چوری نہیں کر سکتا۔" الیاس پھر شمشیر علی کی تعریف کرنے لگا تھا۔ جبکہ توصیف احمد کے کانوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔

"میں چور نہیں ہوں سر! میں نے چوری نہیں کی۔"

"سر! مجھے نہیں معلوم اصل معاملہ کیا ہے۔ میں نے جو سمجھا آپ کو بتا دیا۔" الیاس نے کہا تو توصیف احمد چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"اب میں جاؤں سر؟" الیاس پھر خائف ہو گیا تھا۔

"نہیں' ابھی تم کہیں نہیں جا سکتے۔ میں اس معاملے کی پھر سے انکوائری کرواتا ہوں اور جب تک انکوائری مکمل نہیں ہو جاتی' تمہیں یہیں رہنا ہے۔"

"سر! میں...... مجھے واپس فیصل آباد جانا ہے۔ وہاں میری نوکری ہے۔ مشکل سے تین دن کی چھٹی لے کر آیا

ہوں۔" الیاس نے اپنی مجبوری بتائی۔ توصیف احمد پر سوچ انداز میں اسے دیکھنے لگے' پھر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میرے ساتھ آؤ الیاس!"

"جی......!" الیاس کچھ نہ سمجھتے ہوئے اٹھ کر ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ پریشان تھا۔ پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس نے توصیف احمد سے بھی کہا کہ اسے پولیس سے ڈر لگتا ہے' اس لیے وہ ان کے پاس آیا ہے۔

"تمہیں پولیس کچھ نہیں کہے گی۔ صرف تمہارا بیان لے گی۔ اس کے بعد کارروائی میں جہاں تمہاری ضرورت پڑے گی۔ تمہیں بلایا جائے گا۔ تم ڈرو مت اور فی الحال واپسی کا بھی مت سوچو۔ میں تمہیں تمہاری سابقہ ملازمت پر بحال کر دوں گا اور تنخواہ بھی بڑھا دوں گا اور ہاں! تمہارے بیان کے مطابق اگر واقعی اصل مجرم کوئی اور ہے اور ہم اس تک پہنچ جاتے ہیں تو اس کا تمہیں انعام بھی ملے گا۔" توصیف احمد نے الیاس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا اور پھر اسی وقت وہ الیاس کو تھانے لے گئے۔ ایس ایچ او سے اس کا بیان لکھوایا' پھر فوری کارروائی کا کہہ کر اسے واپس اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ سمیر کی اولین محبت تھی' پھر بھی وہ یہ دعوا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس کا ہر روپ پہچانتا ہے۔ جانے کیسے بظاہر سادہ اور بے وقوف نظر آنے والی اس لڑکی نے خود کو سات پردوں میں چھپا رکھا تھا کہ جب بھی وہ ادھر گیا' اسے ایک نئے پردے سے نمودار ہوتے دیکھا تھا اور اس دن سے تو وہ بے حد پریشان تھا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔

"میں کہیں پاتال میں اتر گئی تھی۔ بہت کیچڑ تھا۔ میرا پورا وجود کیچڑ میں لتھڑ گیا تھا۔ منہ سر سب کچھ...... کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔"

"سارہ!" وہ اسی خوف میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "تمہارے اس روز کے مذاق نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کیوں ایسی باتیں کرتی ہو۔ تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔"

"نہیں' مجھے کسی پر رحم نہیں آتا۔ اپنے آپ پر بھی نہیں۔ یہ دیکھو۔" سارہ نے کہنے کے ساتھ پھرتی سے گلاب کے پودے سے ایک کانٹا کھینچ کر اپنی ہتھیلی میں پیوست کر دیا۔

"سارہ!" سمیر نے تڑپ کر کانٹا کھینچا تو اس کی ہتھیلی پر خون کی ننھی سی بوند ابھر آئی تھی۔ "یہ کیا پاگل پن ہے۔ تم...... تم ایسی تو نہیں تھیں۔"

"پھر کیسی تھی؟" وہ اپنی ہتھیلی پر چمکتی سرخ بوند کو دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں' شاید میں نے ہی تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔" سمیر نے جیسے بحث کا ارادہ ترک کر دیا اور سینے میں مچلتی گہری سانس دبا کر بولا۔ "لیکن تم جیسی بھی ہو' مجھے اچھی لگتی ہو۔"

"جیسی بھی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ نظریں اٹھا کر سمیر کو دیکھنے لگی تھی۔

"جھوٹی' پستیوں سے پیار کرنے والی اور۔" وہ جیسے خائف ہو کر خاموش ہو گیا تھا لیکن سارہ نے وہی بات کہہ دی۔

"کیچڑ میں لتھڑی ہوئی؟"

سمیر نے چہرہ دوسری طرف موڑ کر انجان بننے کی سعی کی جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

"اچھا چلو اندر چلو...... میں تمہیں اچھی سی چائے پلاتی ہوں۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

سمیر ہمیشہ کی طرح اس کے پیچھے نہیں بھاگا تھا۔ بلکہ کتنی دیر وہیں کھڑا رہا۔ گہری شام کی اداسی میں اپنا وجود کہیں

گم ہو تا لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا وہ بھاگ جائے۔ کہیں دور۔۔۔ بہت دور لیکن دل پھر اس کے پاس لے آیا تھا۔
سارہ چائے لیے منتظر تھی۔
"کہاں رہ گئے تھے؟" سارہ نے چائے کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بلا ارادہ پوچھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ چائے کا مگ پکڑتے ہی ایک گھونٹ لے کر گلاس وال سے باہر دیکھنے لگا۔ جہاں پرندوں کی واپسی کے بعد کا سناٹا تھا۔
"سنو! میں بہت فضول لڑکی ہوں۔ بولتی بھی فضول ہوں۔ میری باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ انہیں سوچ کر ہلکان مت ہوا کرو۔ بلکہ سمجھ لیا کرو کہ یا تو میں نے کوئی ناول پڑھا ہے یا کسی پر ہونے والی زیادتی اپنے دل پر محسوس کی ہے۔" وہ گرم چائے سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جمائے بول رہی تھی۔
"ایسی ہی تو ہوں میں۔ تم اکثر اسی بات پر تو مجھ سے الجھتے رہے ہو کہ میں دوسروں کے بارے میں اتنا کیوں سوچتی ہوں۔ دوسروں کے دکھ خود پر طاری کیوں کر لیتی ہوں۔"
"ابھی کس کا دکھ ہے؟ وہ ابھی کچھ اور بھی کہتی کہ سمیر نے دھیرے سے ٹوکا تھا۔ وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی لیکن پلکیں اٹھ کے نہیں دیں۔
"اریبہ۔۔۔؟" سمیر نے خود ہی قیاس کیا۔
"نہیں' اریبہ تو اللہ کا شکر ہے اب بہت خوش ہے اور رازی بھائی بھی۔"
"پھر کون؟" سمیر کی نظریں بے قراری سے اس کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔ سارہ نے چند لمحے توقف کیا پھر کہنے لگی۔
"میری ایک دوست ہے' بہت پیاری دوست۔ اس کے ساتھ کچھ برا ہو گیا ہے۔ بس اچانک۔۔۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا' پھر بھی اس کے منگیتر نے جو محبت کے بلند بانگ دعوے کیا کرتا تھا' اسے چھوڑ دیا ہے۔ کیوں؟"
"کیونکہ لغزش محبت کی موت ہے۔" سمیر کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ چیخ گئی۔
"لیکن اس نے جان بوجھ کر تو نہیں کی۔"
"جان بوجھ کر کون کھائی میں گرتا ہے۔ بس اچانک ہی پاؤں غلط پڑتا ہے ناں' اس کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا۔ نہ محبت نہ بلند بانگ دعوے۔" وہ اب اسے سمجھا رہا تھا۔ "اپنی دوست سے کہو صبر کرے۔ اگر واقعی وہ بے قصور ہے تو اللہ نے اس کے لیے اس منگیتر سے بہتر منتخب کر رکھا ہو گا۔ سمجھ رہی ہو ناں!"
"ہا۔۔۔ ہاں تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔"
"شاید نہیں یقیناً" اور ہاں! اگر تم پہلے مرحلے پر ہی یہ باتیں مجھ سے شیئر کر لیا کرو تو نہ خود پریشان ہو اور نہ مجھے پریشان کرو۔" سمیر کو اچانک تنبیہہ کا موقع مل گیا تھا۔
"میں کیا کروں مجھے تمہیں پریشان کرنا اچھا لگتا ہے۔" وہ کہہ کر جانے لگی تھی کہ یاسمین کو آتے دیکھ کر رک گئی۔ جبکہ سمیر دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگا تھا۔
"ارے سمیر! تم کب آئے بیٹا!" یاسمین کے نرم میٹھے لہجے پر سارہ اور سمیر دونوں پر ہی حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔
"جی' جی بس' ابھی تھوڑی دیر پہلے۔" سمیر بمشکل ہکلایا تھا۔
"اچھا اچھا۔ امی ٹھیک ہیں تمہاری' انہیں بھی لے آتے۔ بہت دن ہوئے امینہ سے ملاقات ہوئے۔"
یاسمین یوں بات کر رہی تھی' جیسے ہمیشہ سے ایسی ہی محبت کرنے والی ہو۔
"جی' میں لے آؤں گا امی کو۔ آنٹی! آپ بھی آئیں ناں ہمارے گھر۔" سمیر کو کسی طرح یاسمین کا یہ انداز ہضم

نہیں ہو رہا تھا۔ بار بار سارہ پر نظر جاتی' وہ اپنی جگہ دنگ کھڑی تھی۔
"چائے پی تم نے کہ نہیں۔" یاسمین اس سے پوچھ کر فوراً" سارہ سے مخاطب ہو گئی۔
"سارہ! جاؤ بیٹا! چائے لے آؤ اور ساتھ کچھ کھانے کو بھی۔"
"نہیں آنٹی! میں چائے پی چکا ہوں۔ بس اب چلوں گا۔ پھر ان شاء اللہ امی کے ساتھ آؤں گا۔" وہ یاسمین کی محبت کو کسی خطرے کا الارم سمجھتے ہوئے فوراً" اجازت لے کر وہاں سے بھاگا۔

✲ ✲ ✲

حسب معمول سونے سے پہلے وہ ساجدہ بیگم کو شب بخیر کہنے کے ارادے سے ان کے کمرے میں آیا تو خلاف معمول وہ بیڈ کے بجائے آرام کرسی پر بیٹھی نظر آئیں جبکہ ثنا الماری میں سر دیے جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔
"کیا بات ہے امی! سونے کا ارادہ نہیں ہے' بارہ بج رہے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے ساجدہ بیگم کے سامنے آن بیٹھا۔
"بس بیٹا! دوپہر میں لمبی نیند لے لی تھی اس لیے اب بیٹھی ہوں۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا پھر بھی وہ پوچھنے لگا۔
"ایسا ہی ہے یا کوئی اور بات؟"
"نہیں اور تو کوئی بات نہیں۔"
"کیسے اور کوئی بات نہیں۔" ثنا نے اپنی تلاش ترک کر کے الماری بند کی تھی۔ "ایک نہیں دو باتیں ہیں بھائی!"
"کیا؟" وہ ثنا کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"پہلی بات تو یہ کہ جب سے یاسمین آنٹی آئی ہیں' امی کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں۔ دوسری بات جیسے جیسے بلال کے امریکا جانے کے دن قریب آ رہے ہیں' امی اداس ہو رہی ہیں۔" ثنا بتاتے ہوئے ساجدہ بیگم کے قریب آ بیٹھی تھی۔
"امی!" اس نے ساجدہ بیگم کا ہاتھ تھام لیا۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں بھی تو باہر رہا ہوں اور دیکھیں وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ اسی طرح بلال بھی آجائے گا۔"
"یہی میں امی کو سمجھاتی ہوں۔ پھر اب تو اتنی سہولتیں ہیں۔ روزانہ نیٹ پر بلال کو سامنے دیکھ کر بات کر سکتی ہیں۔ ہیں ناں بھائی!"
"بالکل اور ہاں یاسمین آنٹی کے آنے سے کیوں پریشان ہیں؟" اس نے بظاہر سرسری پوچھا تھا جبکہ اس کے اندر بے چینی پھیل گئی تھی۔
"یاسمین کے آنے سے کیوں پریشان ہوں گی بلکہ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ وہ اب خوشی سے اریبہ کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ البتہ اریبہ کو فوری شادی پر آمادہ کرنے کی جو ذمہ داری اس نے میرے سر ڈالی ہے' وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیسے اریبہ سے بات کروں اور کیا کہوں۔" ساجدہ بیگم آخر میں خود ہی اسی بات میں جیسے الجھ گئی تھیں۔
"آپ کو اریبہ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے امی! میری اس سے بات ہو گئی ہے۔ وہ امتحانوں سے پہلے شادی پر آمادہ نہیں ہو گی اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ جہاں اتنا عرصہ گزرا' وہاں یہ چند مہینے بھی گزر جائیں گے۔" اس نے کہا تو ثنا پھر بول پڑی۔
"یہ بات تو امی بھی سمجھتی ہیں لیکن یہ نہیں سمجھ پا رہیں کہ یاسمین آنٹی پر اچانک عجلت کیوں سوار ہو گئی ہے۔"

"ثنا......!" ساجدہ بیگم نے سختی سے ٹوکا تھا۔ "کتنی بار سمجھایا ہے تمہیں جب بڑے بات کر رہے ہوں تو خاموش رہا کرو۔"

ثنا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر اپنی جگہ پر لیٹ گئی اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا تو رازی بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ بولا کچھ نہیں کیونکہ اس کی بات نے اسے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اچانک یاسمین پر عجلت کیوں سوار ہو گئی ہے۔

"مجھے یاسمین کی عجلت پر حیرانی یا پریشانی نہیں ہے بیٹا! ساجدہ بیگم خود ہی کہنے لگیں۔ "ظاہر ہے وہ ماں ہے۔ یہی سوچتی ہو گی کہ کہیں پھر نہ کوئی ایسی بات ہو جائے کہ اریبہ ہتھے سے اکھڑ جائے' اس لیے اس اچھے وقت میں اس کی شادی کر دے۔ پھر سارہ بھی تو ہے۔ اریبہ کی شادی کے بعد ہی وہ سارہ کا سوچے گی۔"

"ہوں!" اس نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگا۔ "لیکن امی! اریبہ کی بات بھی ٹھیک ہے۔ اس کے امتحانوں تک آپ اس کی شادی کا ذکر نہ چھیڑیں۔ خوامخواہ وہ ڈسٹرب ہو گی۔"

"ٹھیک ہے جب تم دونوں کی یہی مرضی ہے تو پھر یاسمین کو بھی صبر کرنا چاہیے۔" ساجدہ بیگم مطمئن ہو گئی تھیں۔

"چلیں اب آپ سو جائیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جب ساجدہ بیگم اپنی جگہ پر لیٹ گئیں تو لائٹ آف کر کے ان کے کمرے سے نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

پورے سات مہینے بعد اسے رہائی ملی تھی تو اس کی دنیا تاریک ہو چکی تھی کیونکہ اس کے اندر اچھائی کی جو شمع اس کی اماں نے روشن کی تھی اور جس کا وقت کی تیز آندھیاں بھی کچھ نہیں بگاڑ سکی تھیں' اس میں سے اب دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا' اس لیے نہیں کہ وہ سات مہینے کی سزا کاٹ کر لوگوں کی نظروں میں مجرم بن گیا تھا بلکہ وہ سامنے کھڑے توصیف احمد کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا' جن کے لیے اس کے دل میں اتنی نفرت بھر چکی تھی کہ وہ انہیں قتل کر دینا چاہتا تھا اور وہ ایسا کر گزرتا۔ اس کے بعد تختہ دار پر چڑھنے کے لیے بھی وہ تیار تھا لیکن اس سے پہلے اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ اس لیے خود کو ضبط کے کڑے پہروں میں مقید کیے کھڑا تھا۔

جبکہ توصیف احمد نادم ہو کر کہہ رہے تھے۔

"آئی ایم سوری شمشیر علی! میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ اس وقت تفتیش سے جو ثابت ہوا' اسی پر عمل کیا گیا تھا۔ پھر بھی مجھے افسوس ہے کہ تم پر ناحق زیادتی ہوئی۔ میں شرمندہ ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی جاب پر واپس آجاؤ۔"

"تم چاہتے ہو......؟" شمشیر علی نے انتہائی تنفر سے سوچا تھا۔ "اب وہ نہیں ہو گا توصیف احمد! جو تم چاہتے ہو۔ اب جو میں چاہوں گا۔ وہ ہو گا۔"

"اوکے جنٹلمین! اور ہاں یہ الیاس ہے' تم یقیناً اسے پہچانتے ہو گے۔ اس کی بدولت ہم اصل مجرم تک پہنچ سکے ہیں۔ میں اس کا ممنون ہوں۔ تمہیں بھی اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

توصیف احمد نے الیاس کی طرف اشارہ کر کے کہا تو بلا ارادہ ہی وہ نظریں اٹھا کر الیاس کو دیکھنے لگا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا سر! کہ شمشیر علی بہت بھلا آدمی ہے۔ بہت محنتی بہت ایمان دار۔" الیاس اپنی کارکردگی پر خوش ہو کر پھر اس کی تعریف کرنے لگا تھا۔

"بھلا آدمی...... ایمان دار؟" اسے دھچکا لگا تھا۔

"مر گیا وہ بھلا ایمان دار آدمی!" وہ کہہ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگتا چلا گیا۔ بھاگتا چلا گیا...... اسے محسوس ہوا اس کے پیر زمین کو نہیں چھو رہے تھے یا شاید اس کے پیروں تلے زمین تھی ہی نہیں۔ جانے وہ کہاں تھا۔ اس کے اندر گھمسان کا رن تھا۔ باہر کا شور سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ کتنی گاڑیوں کے ٹائر چرچرائے تھے۔ کتنوں نے اسے گالیاں دی تھیں۔ لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا اور پھر میلوں مسافت طے کر کے وہ اسپتال کے ریسپشن پہ کھڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"جی......!" ریسپشن پر موجود لڑکا اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"وہ...... یہاں میری بہن ایڈمٹ تھی۔" تیز چلتی سانسوں کے درمیان وہ بمشکل بول پایا تھا۔

"نام......!" لڑکے نے رجسٹر کھولتے ہوئے پوچھا۔

"تاج...... تاجور......"

"تاجور...... تاجور......" لڑکے کی انگلی رجسٹر کے صفحوں پر پھسلنے لگی تھی۔ پھر وہ اسے دیکھ کر بولا۔

"سوری! اس نام کی کوئی پیشنٹ یہاں ایڈمٹ نہیں ہے۔"

"کیسے نہیں ہے۔ میں نے خود۔" وہ دھاڑ کر یک دم خاموش ہو گیا اور چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر کے خود پر قابو پانے کی سعی کی' پھر کاؤنٹر پر دونوں ہاتھ جما کر خود کو سہارا دے کر کہنے لگا۔

"سنو! یہ چھ آٹھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ میری بہن تاجور ٹی بی پیشنٹ تھی۔ میں نے اسے یہاں ایڈمٹ کرایا تھا۔ پھر اچانک مجھے شہر سے باہر جانا پڑ گیا تو میں وہاں پھنس گیا۔ تم...... تم دیکھو وہ یہیں ہو گی۔"

لڑکا اسے دیکھ بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا لیکن شاید سمجھ نہیں رہا تھا' پھر بھی دوسرا رجسٹر اٹھا کر اس کے صفحے الٹنے لگا۔

"تاجور' تاجور نام ہے۔ ٹی بی پیشنٹ۔" وہ بے قراری سے خود بھی رجسٹر پر جھک گیا اور لڑکے کی انگلی کے ساتھ ساتھ اس کی نظریں چلنے لگیں' پھر جہاں لڑکے کی انگلی رکی' وہاں جیسے اس کا دل بند ہو گیا تھا۔

"جی تاجور...... ٹی بی پیشنٹ تھیں۔" لڑکے نے کہہ کر دوسرا رجسٹر اٹھایا اور اس میں دیکھ کر بولا تھا۔

"جی وہ چھ مہینے پہلے ڈسچارج کر دی گئی تھیں۔"

"کک...... کون آیا تھا' کس نے ڈسچارج کرایا اسے۔ کوئی اتا پتا؟" اس کی کیفیت پل پل بدل رہی تھی۔ کبھی دل زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑاتا' کبھی سہم کر کنڈلی مار لیتا۔

"سوری سر! میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" لڑکے کا کام جیسے ختم ہو گیا تھا لیکن وہ چیخ پڑا۔

"کیسے نہیں جانتے۔ پیشنٹ ایڈمٹ کرتے وقت آپ اس کا پورا شجرہ نسب لکھواتے ہیں اور ڈسچارج کرتے وقت کوئی بھی آجائے' کوئی ایرا غیرا آکر لے جائے بغیر شناخت کے آپ نے کیسے ایک لڑکی کسی کے حوالے کر دی؟"

"سر' سر پلیز!" لڑکا اس کے چلانے سے پریشان ہو گیا تھا۔

"مجھے میری بہن چاہیے۔ میں اسے یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ مجھے بتاؤ کہاں ہے وہ۔" اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔

ڈاکٹرز کے ساتھ پورا اسٹاف بھاگا چلا آیا تھا۔ وہ ان پر بھی چلانے لگا۔ پھر سیکورٹی گارڈز آگئے' جو اسے کھینچتے ہوئے باہر لے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اسپتال کے باہر ہی دھرنا مار کر بیٹھ گیا تھا۔ اور کہاں جاتا کوئی ٹھکانا بھی تو نہیں تھا' پھر اس کی ذہنی حالت اتنی

مفلوج تھی کہ وہ کچھ سوچ سمجھ بھی نہیں پارہا تھا۔ تین دن ہو گئے تھے اُسے وہاں بیٹھے ہوئے۔ بھوک زیادہ ستاتی تو کسی گزرتی ریڑھی سے کچھ لے کر کھالیتا اور رات میں اس سنگی بینچ پر سوجاتا' جہاں سے تاجور کو اریبہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اور نیند بھی ایسی کہ ہر ایک آدھ گھنٹے بعد چونک کر اُٹھ جاتا' کچھ دیر ٹہلتا پھر سوجاتا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی تھی۔ بال گرد آلود' بکھرے ہوئے اور شیو بڑھ گئی تھی۔

اسپتال کے گیٹ پر کھڑا چوکیدار مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت جب دونوں وقت مل رہے تھے' وہ آسمان کی وسعتوں میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ شاید وہ مہربان چہرہ جو اسے آگاہیاں دیتا تھا کہ اپنے کاندھے پر اچانک ہاتھ پڑنے سے وہ اچھلا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی! بہت پریشان لگتے ہو۔ کون داخل ہے یہاں۔" وہ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم تھا۔

وہ خالی خالی نظروں سے فضل کریم کو دیکھے گیا۔

"مایوس کیوں ہوتے ہو۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ وہی بیماروں کو شفا دیتا ہے۔ دعا مانگو۔" فضل کریم اپنی سمجھ کے مطابق بول رہا تھا۔

"کیا دعا مانگوں؟" وہ کھویا ہوا تھا۔

"یہی کہ اللہ بیمار کو شفا دے۔"

"بیمار کو شفا دے.... کون بیمار ہے!" وہ الجھ کر فضل کریم کو دیکھنے لگا۔

"کیوں تمہارا یہاں کوئی نہیں ہے اس اسپتال میں؟" اب فضل کریم الجھا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تو پوچھنے لگا۔

"پھر تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

"پتا نہیں۔" عجیب بے بسی تھی۔

"گھر بار کہاں ہے تمہارا؟"

"اس نے اب "پتا نہیں" کے انداز میں سر اور کندھوں کو جنبش دی تھی۔

"کوئی کام دھندا نہیں کرتے؟" فضل کریم نے پوچھا پھر خود ہی کہنے لگا۔ "ایسے بے کار پڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر زندگی سے اکتا چکے ہو' تب بھی زندگی ختم نہیں ہو جائے گی۔ اللہ نے جتنی سانسیں لکھی ہیں وہ تو پوری کرنی پڑیں گی' پھر کیوں خود کو ضائع کر رہے ہو۔"

"بس خود کو ضائع کر رہا ہوں میں۔" اس کے اندر اچانک ابال اٹھا تھا۔ "میں نے اس وقت خود کو ضائع نہیں کیا تھا' جب میری ماں مری تھی۔ نہ اس وقت جب میں باپ کے گھر سے نکلا تھا۔ گیارہ بارہ سال کا تھا میں تو اس وقت محنت مزدوری کے ساتھ پڑھائی کی.... افسر بنا۔"

فضل کریم حیرت سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

وہ بولتا چلا گیا۔ اپنی زندگی کے سارے نشیب و فراز بیان کر ڈالے۔ آخر میں تاجور کی گمشدگی کا سزاوار توصیف احمد کو ٹھہراتے ہوئے ان کے خلاف ایسا لاوا ابلا کہ وہ خود اپنی وہاں موجودگی پر حیران ہو گیا تھا۔

"میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ مجھے تو بڑے کام کرنے ہیں اور اس توصیف احمد سے اپنی بہن کا بدلہ لینا ہے۔ میں چھوڑوں گا نہیں اسے۔"

"آرام سے بھائی آرام سے۔" فضل کریم اس کا بازو تھام کر کہنے لگا۔ جوش سے نہیں' ہوش سے کام لو۔ ورنہ دوبارہ جیل پہنچا دیے جاؤ گے۔ بڑے آدمیوں سے لڑنا آسان نہیں ہوتا۔"

اس نے "ہونہہ" کے انداز میں سر جھٹک کر ہونٹ بھینچے۔

"چلو اٹھو! میری اس وقت کی ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے۔ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ دماغ کو آرام دو' پھر ٹھنڈے ہو کر سوچنا۔" فضل کریم کہنے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا' لیکن وہ اسی طرح بیٹھا تھا۔

"چلو بھائی! میں بھی اکیلا ہی رہتا ہوں۔ زیادہ نہیں تو دو چار دن ہی میرے ساتھ رہ لو۔ پھر جہاں دل چاہے' چلے جانا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس حلیے میں تم مجنوں لگ رہے ہو۔ یہاں بیٹھے رہے تو ایک دو دن میں لوگ پتھر مارنے لگیں گے تمہیں۔" فضل کریم نے آخر میں ہلکا پھلکا انداز اختیار کرتے ہوئے زبردستی اسے اٹھایا۔

فضل کریم کا ڈربہ نما گھر ایک کمرے اور دو چارپائیوں جتنے صحن پر مشتمل تھا' لیکن اسے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ سات مہینے ایک کوٹھری میں رہ کر آیا تھا۔ بہرحال اب اس کا ذہن بیدار ہو چکا تھا۔ رات اس نے جیسے تیسے گزاری۔ صبح اٹھتے ہی حجام کے پاس گیا۔ بال اور شیو بنوا کر آیا تو آدھا گھنٹہ نہانے میں لگا دیا۔ فضل کریم نے اسے اپنا ایک جوڑا دے دیا تھا جو کہ اسے چھوٹا تھا' لیکن مجبوری تھی۔ وہ نہا کر نکلا تو فضل کریم اسے دیکھتا رہ گیا۔

"یار! تو تو بڑا بانکا سجیلا ہے۔ فلموں میں کام کیوں نہیں کرتا؟" فضل کریم نے اس کی تعریف کے ساتھ کہا تو بڑے دنوں بعد وہ بے ساختہ ہنسا۔

"سچ کہہ رہا ہوں۔ لوگ ابھی تک وحید مراد کو یاد کرتے ہیں۔ تجھے دیکھ کر بھول جائیں گے اسے۔"

"اچھا! کوشش کروں گا۔ ابھی تو پیٹ کچھ کھانے کو مانگ رہا ہے۔" اس نے کہا تو فضل کریم فوراً بولا۔

"ہاں ہاں' آؤ! میں ناشتا لے آیا ہوں۔"

وہ ہاتھوں سے بال سنوارتا چٹائی پر بچھے دسترخوان پر آ بیٹھا۔ حلوہ پوری' چھولے کا سالن اور چائے۔ اس وقت اس کے لیے اس سے اچھی نعمت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

"تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟" ناشتے کے دوران اچانک خیال آنے پر اس نے فضل کریم سے پوچھا۔

"میرے گھر والے وہاڑی میں ہیں۔ پورا ٹبر ہے۔ ماں باپ سات بہن بھائی۔ میں روزگار کے لیے نکلا تو یہاں کراچی آ گیا۔ بڑے دھکے کھائے۔ اب اللہ کا شکر ہے' آرام سے ہوں۔" فضل کریم نے چند جملوں میں جیسے پوری داستان سنا ڈالی تھی۔

"اور...؟ میرا مطلب ہے' گھر والوں کی کفالت تم کرتے ہو؟" وہ فضل کریم کے اطمینان پر قدرے حیران ہوا تھا۔

"میں کیوں کروں گا؟ جب وہ میرا بوجھ نہیں اٹھا سکے تو میں ان کا بوجھ کیوں اٹھاؤں؟ ہاں! کبھی کبھی اماں کو کچھ پیسے بھیج دیتا ہوں۔ میری اماں بڑی چالاک ہے اور لالچی بھی۔"

"لاحول ولا....." وہ سخت جھنجلایا۔ "شرم نہیں آتی' اپنی ماں کے بارے میں ایسا کہہ رہے ہو۔"

"تیری ماں نہیں ہے نا باؤ! اس لیے تجھے پتا نہیں ہے۔ یہ مائیں ہوتی ہی لالچی ہیں۔ جب ہی تو ساری زندگی روتی رہتی ہیں۔" فضل کریم اپنی منطق جھاڑنے سے باز نہیں آیا۔

"اچھا بس..... صبح صبح میرا دماغ نہ خراب کرو۔ یہ بتاؤ! تم ڈیوٹی پر کب جاتے ہو۔" اس نے ناگواری سے ٹوک کر پوچھا۔

"نو بجے جاتا ہوں۔ تو رہنا آرام سے یہاں۔ کوئی تجھے پریشان نہیں کرے گا۔" فضل کریم نے جواب کے ساتھ کہا۔

"نہیں! مجھے بھی گھر نہیں بیٹھنا۔ ایک کام سے جانا ہے اور پھر ہو سکتا ہے وہاں سے میں اپنے گاؤں کے لیے نکل جاؤں۔ اس لیے تم میرا انتظار مت کرنا۔" اس نے کہا تو فضل کریم ٹھٹک کر پوچھنے لگا۔

"کہیں تو اس سیٹھ کے پاس تو نہیں جائے گا اس کا کام تمام کرنے؟"

”نہیں! وہ میں بعد میں کروں گا۔ ابھی کچھ اور کام ہے۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا جائزہ لینے لگا۔ ٹخنوں سے اونچی شلوار اور اسی طرح چھوٹی قمیص میں اسے اپنا آپ بڑا عجیب سا لگا۔

”اچھا! یہ تھوڑے پیسے رکھ لے۔“ فضل کریم نے کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”قرض سمجھ کر لے لے یار! خالی جیب کہاں جائے گا۔“ فضل کریم نے کہتے ہوئے زبردستی اس کے ہاتھ میں پیسے دینے چاہے تو وہ اسے روک کر سہولت سے کہنے لگا۔

”میری جیب خالی نہیں ہے یار! جیل کی مزدوری مل گئی تھی۔ فی الحال کافی ہے اور ہاں! تمہارے پاس موبائل فون تو ہو گا.... اپنا نمبر دے دو۔ میں پھر تم سے رابطہ کروں گا۔“

”صرف رابطہ نہیں، ملنا بھی.... یہ نہیں کہ بھول ہی جاؤ۔“

”نہیں، نہیں! تم بھولنے والی چیز نہیں ہو۔ یوں بھی ابھی یہاں میرے پاس ٹھکانا نہیں ہے۔ گاؤں سے واپسی پر سیدھا تمہارے پاس ہی آؤں گا۔“ اس نے کہا تو فضل کریم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”ضرور! میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔“

”مہربانی ہے تمہاری۔“ اس نے فضل کریم کو گلے لگایا، پھر اس کا سیل نمبر لے کر اس سے پہلے ہی اس کے گھر سے نکل آیا۔

پھر پہلے وہ جس اپارٹمنٹ میں رہتا تھا، اس کے مالک سے ملا۔ شمشیر علی کو یقین تھا کہ اس نے اپارٹمنٹ اس کے لیے خالی نہیں رکھ چھوڑا ہو گا اور وہ اپارٹمنٹ کے لیے گیا بھی نہیں تھا۔ نہ ہی اسے سامان سے غرض تھی۔ البتہ اپنے ضروری ڈاکومنٹس کی فکر تھی۔ وہ اسے مکان مالک سے مل گئے۔ ساتھ اس کے بینک کی چیک بک بھی تھی۔ اس نے مالک مکان کا شکریہ ادا کیا، پھر اس کے بعد بینک میں اپنا اکاؤنٹ چیک کر کے اسی وقت گاؤں کی راہ لی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ اتفاق ہی تھا کہ اریبہ اور سارہ آج ایک ساتھ ہی اپنے اپنے کالج سے لوٹی تھیں تو گھر میں غیر معمولی ہلچل نے دونوں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ دونوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر نہ سمجھنے والے انداز میں کندھے اچکا کر اندر آئیں تو لاؤنج کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جیسے بہت سارے مہمانوں کے بیٹھنے کا اہتمام کیا گیا ہو۔ جبکہ یاسمین کی آواز ڈرائنگ روم سے آرہی تھی جو یقیناً ملازموں کے سر پر کھڑی صفائی کروا رہی تھی۔

”لگتا ہے کوئی خاص مہمان آرہے ہیں۔“ سارہ نے کہا تو وہ جو خود بھی یہی سمجھ رہی تھی، چونک کر سارہ کو دیکھنے لگی۔

”مما سے پوچھتی ہوں کون آرہا ہے۔“ سارہ اچانک مشتاق ہو کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگی تھی کہ یاسمین آگئی اور ان دونوں کو دیکھتے ہی کہنے لگی۔

”اچھا ہوا، تم دونوں آگئیں۔ چلو! کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کر لو۔“

”وہ تو ہم کر لیں گے مما! لیکن یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کوئی آرہا ہے کیا؟“ سارہ کو جاننے کی جلدی تھی۔ جاننا تو وہ بھی چاہتی تھی، لیکن قصداً بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”ہاں! میں نے رات کے کھانے پر سب کو انوائٹ کیا ہے۔“ یاسمین نے بتایا تو وہ بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”سب کو؟“ سارہ نے نہ سمجھتے ہوئے وضاحت چاہی۔

”ہاں! سب کو بلال امریکا جا رہا ہے نا! اس لیے میں نے سوچا، چھوٹی موٹی تقریب کر لی جائے۔ تمہاری تائی امی کی فیملی اور امینہ کے ہاں سے سب آئیں گے اور ہاں! تمہارے ڈیڈی کی دوسری فیملی بھی۔“ یاسمین، سارہ کو دیکھ کر بتا رہی تھی، لیکن اس کا دھیان اس کی طرف تھا جو سب سن کر بھی کچھ نہیں بولی تھی۔

”تو مما! یہ سب آپ کو پہلے کرنا چاہیے تھا کیونکہ بلال تو آج رات کی فلائٹ سے جا رہا ہے۔ کھانے کے دوران ہی افراتفری مچ جائے گی۔“ سارہ کو افراتفری کا سوچ کر ہی عجیب سا لگ رہا تھا۔

”نہیں بیٹا! بلال کی فلائٹ صبح پانچ بجے کی ہے۔ تین بجے تک اسے ایئرپورٹ پہنچنا ہو گا۔ ہم اس سے پہلے فارغ ہو جائیں گے۔ کیوں اریبہ؟“ یاسمین نے اسے مخاطب کر کے گویا اسے بولنے پر اکسایا تھا، لیکن وہ کندھے اچکا کر اپنے کمرے میں آگئی اور جب تک وہ کپڑے تبدیل کر کے فارغ ہوئی، سارہ بھی آگئی تھی۔

”میں چینج کر لوں، پھر کھانا ساتھ کھائیں گے۔“ سارہ کہتے ہوئے اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم میں چلی گئی۔

پھر دونوں ساتھ ڈائننگ روم میں آئی تھیں۔ وہیں تاجور، بی بی سے قرآن پاک کا سبق لے رہی تھی۔

”آگئیں بیٹا! بیٹھو، میں کھانا لاتی ہوں۔“ بی بی کہتے ہوئے اٹھنے لگی تھیں کہ سارہ نے انہیں روک دیا۔

”نہیں بی بی! آپ بیٹھیں، میں کھانا لے آتی ہوں۔“

”ایسے ہی مت لے آنا۔ گرم ضرور کرنا۔“ وہ کہتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور تاجور کو قرآن پاک پڑھتے ہوئے سننے لگی۔

تاجور ہجے کرتے ہوئے بار بار بی بی کو دیکھ رہی تھی، تب پہلی بار اس نے غور کیا، تاجور کی سنہری آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

یہ لڑکی سات پردوں میں چھپ جائے، تب بھی دکھائی دے گی۔“ وہ یہ سوچ کر مسکرائی، تب ہی سارہ کھانا لے کر آگئی اور جب بیٹھی تو سرگوشی میں اس سے پوچھنے لگی۔

”تم کیوں مسکرا رہی ہو؟“

اس نے سارہ کو دیکھا، پھر آنکھوں سے تاجور کی طرف اشارہ کر کے وہ بھی سرگوشی میں بولی۔

”سوچ رہی ہوں، حماد کے لیے کیسی رہے گی؟“

”کیا!“ سارہ اچھل پڑی۔ ”تم ابھی سے حماد۔ میرا مطلب ہے ابھی تو وہ....“

”بس چپ ہو جاؤ، مجھے یونہی خیال آگیا تھا.... آئی ایم ناٹ سیریس۔“ وہ سارہ کو ٹوک کر اپنی پلیٹ میں سالن نکالنے لگی۔

”ویسے خیال برا نہیں ہے۔“ سارہ کے اندر اب کھلبلی مچ گئی تھی۔

”سچ اریبہ! مجھے تو یہ اتنی عزیز ہو گئی ہے کہ کبھی اس کے جانے کا سوچ کر ہی میں پریشان ہو جاتی ہوں۔“

”اچھا بس! کھانا کھاؤ۔“ اس نے پھر ٹوک دیا اور جلدی کھانا ختم کر کے کمرے میں آگئی۔

گو کہ اسے یاسمین کا سب کو مدعو کرنا کھل رہا تھا، لیکن گھر کی تقریب تھی، اس لیے وہ خود کو الگ تھلگ نہیں رکھ سکی، بلکہ شام میں اٹھتے ہی تیار ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی توصیف احمد، خالدہ اور بچوں کے ساتھ آگئے تو وہ ان کے ساتھ مصروف ہو گئی۔

سب کے آجانے سے ایک طویل مدت بعد توصیف ولا میں اچھی خاصی رونق ہو گئی تھی۔ سب خوش تھے۔ یاسمین سب کے آگے بچھی جا رہی تھی۔ اس کا یہ بالکل نیا روپ تھا، جو اس سے پہلے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا، کیونکہ اس نے اول روز سے ہی سسرال والوں کو منہ نہیں لگایا تھا۔ یہ سب جانتے تھے، پھر پتا نہیں کیسے اس کی تبدیلی پر کوئی حیران تھا نہ پریشان۔ بس ایک وہ تھی جو اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی، کیونکہ وہ یاسمین کا مقصد جانتی تھی

کہ وہ سب کو اپنا ہم نوا بنا کر جلد سے جلد اسے اس گھر سے رخصت کرنا چاہتی تھی' تاکہ اپنی سرگرمیوں میں آزاد ہو جائے۔

"کتنی خود غرض عورت ہے۔" اس کے اندر دکھ کے ساتھ ڈھیروں تلخی بھر گئی تھی۔ دل چاہا ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اس بھری محفل میں اس عورت کا پردہ چاک کر دے۔ اس کے بعد جو بھی ہو۔

اور کیا ہونا تھا' یاسمین کا کیا بگڑتا' وہی اپنا بھرم کھو دیتی۔

"شاید یہی ٹھیک ہے۔ مجھے اس گھر سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ ہٹ جانا چاہیے اس عورت کے راستے سے' پھر یہ جو مرضی کرتے پھرے۔ اس سے پہلے کہ لوگ مجھے اس کی بیٹی ہونے کا طعنہ دیں میں بیوی بن جاؤں۔ اجلال رازی کی بیوی' پھر کوئی مجھ پر انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔"

وہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظریں اجلال رازی کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں کہیں اور جمی تھیں۔

اس نے اجلال رازی کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو سارہ سمیر کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ سارہ اس رخ پر کھڑی تھی کہ اس کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا اور غالباً" سمیر کو کسی بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے بات کرنے کے انداز سے یہی لگ رہا تھا' جیسے دلائل دے رہی ہو۔ بار بار سر جھٹکنے سے اس کے کان کا بالا جھول رہا تھا اور شاید اس جھولتے بالے میں کہیں کچھ ڈول رہا تھا۔ وہ اچانک پریشان ہو گئی۔ اجلال رازی کو دیکھا۔ اس کی نظریں ابھی بھی وہیں جمی تھیں۔

"رازی!" اس نے محض اپنی محبت کی زور آوری آزمانے کی خاطر دل میں پکارا تھا اور اسی پل اجلال رازی نے اسے دیکھا تھا۔

وہ شانت ہو کر مسکرائی اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی' لیکن لابی میں ہی سارہ بھاگتے ہوئے اس کے سامنے آ گئی۔

"سنو! تاجور بے چاری اکیلی کمرے میں بیٹھی ہے۔ میں اسے یہاں سب کے پاس لے آتی ہوں!" سارہ نے کہا تو وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ ہر کوئی اس کے بارے میں سوال کرے گا۔"

"میں مطمئن کر دوں گی سب کو۔" سارہ فوراً" بولی۔

"پھر بھی نہیں۔" وہ سختی سے منع کر کے کہنے لگی۔ "مجھے بھی احساس ہے کہ وہ اکیلی کمرے میں بند بیٹھی ہے لیکن یہی بہتر ہے۔"

"پتا نہیں تمہیں کیا بہتری نظر آ رہی ہے۔" سارہ منہ پھلا کر بڑبڑاتے ہوئے چلی گئی۔ تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اجلال رازی اسے لان میں چلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا' پھر اعتماد سے لان کا رخ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اجلال رازی نے ساجدہ بیگم اور ثنا کو ایئرپورٹ جانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ ساجدہ بیگم وہاں صرف روتی رہیں گی' جیسے اس کے جانے پر روئی تھیں تو وہ کافی عرصہ وہاں بے چین رہا تھا۔ اس لیے اس نے ساجدہ بیگم اور ثنا کو سمجھا دیا تھا۔ رات دو بجے وہ بلال کو لے کر نکلا تو اپنے پروگرام کے مطابق پہلے اریبہ کو پک کیا تھا' جس پر بلال بولا تو کچھ نہیں' البتہ بہت شریر نظروں سے اریبہ کو دیکھا تھا۔

"میں نے سوچا' کہیں رازی مارے محبت کے تمہیں آدھے راستے سے واپس نہ لے آئے' اس لیے خود ہی تمہیں پلین میں بٹھا آؤں۔" اریبہ نے بلال کی شریر نظروں کے جواب میں توجیح پیش کی۔

"جی جی! بالکل یہی بات ہے۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا' شام میں جب آپ محفل سے اٹھ کر لان میں چلی گئی تھیں۔" بلال جتانے سے باز نہیں آیا۔

"ارے تم تو بڑے سمجھ دار ہو گئے ہو' تائی امی ناحق پریشان ہو رہی تھیں کہ بچہ اتنی دور جا رہا ہے۔" وہ ذرا خائف نہیں ہوئی تھی۔

"گویا اب آپ امی کو میرے خلاف ورغلانے والی ہیں۔"

"حقیقت بیان کر کے انہیں تسلی دینے کو اگر تم ورغلانا سمجھو تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"ہاں اب تو آپ یہی کہیں گی۔"

اریبہ اور بلال کی دلچسپ نوک جھونک تمام راستہ جاری رہی تھی۔ اس دوران اجلال رازی صرف محظوظ ہوتا رہا تھا' پھر بلال کو رخصت کرتے ہوئے ساری شوخیاں دم توڑ گئیں۔ وہ ضبط کرتے کرتے بھی رو پڑی تھی۔ بلال بظاہر اس کا مذاق اڑانے لگا لیکن اس کے چہرے پر واضح اداسی محسوس ہو رہی تھی۔ اجلال رازی کتنی دیر بلال کو سینے سے لگائے اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا' پھر بلال اندر چلا گیا اور جب تک نظر آتا رہا' وہ دونوں وہیں کھڑے رہے تھے۔ پھر رازی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آؤ چلیں۔ اب بلال آدھے راستے سے نہیں لوٹ سکتا۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بے ساختہ ہنس پڑی' پھر اس کے سنگ سنگ چلتی گاڑی میں آ بیٹھی۔

جناح ٹرمینل کی تیز روشنیوں سے نکل کر جب گاڑی لمبی سنسان سڑک پر فراٹے بھرنے لگی تب اجلال رازی نے اچانک اس سے پوچھا۔

"کہاں چلیں؟"

”ہیں؟“ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”ادھر نہیں ‘ادھر دیکھو۔“ اجلال رازی نے آنکھوں سے اشارہ کیا تو اس نے بے اختیار گردن سیدھی کرکے نظریں اوپر اٹھائیں۔

درمیانی تاریخ کا چاند بڑی فراخ دلی سے ان پر اپنی چاندنی نچھاور کر رہا تھا۔

”کبھی تم نے چاند سے باتیں کی ہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”ہاں!“ اب کوئی پردہ نہیں تھا‘ وہ بار بار اعتراف کرنا چاہتی تھی اور کر رہی تھی۔

”جب تم امریکا میں تھے تو میں اس سے تمہارا احوال پوچھتی تھی اور تمہیں سندیسے بھی بھیجتی تھی۔ حالانکہ ہم روزانہ فون پر باتیں کرتے تھے پھر بھی۔“

”ہاں پھر بھی کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جو ہم صرف چاند کے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔“ وہ دونوں پرفسوں ماحول میں ڈوب کر بول رہے تھے۔

”تم بھی؟“

”میں بھی۔“

”اچھا۔ میں سمجھتی تھی صرف میں ہی پاگل ہوں۔“

”چاند اکیلا صرف تمہارا تو نہیں ہے۔ یہ سب کا رازداں ہے۔ سب کے پاگل پن سے واقف ہے۔“

”جب ہی ہنستا ہوا لگتا ہے۔ ابھی بھی دیکھو‘ مسکرا رہا ہے۔“

”کیونکہ تم خوش ہو‘ میں خوش ہوں‘ اس لیے مسکرا رہا ہے۔“

”اور جو خوش نہیں ہوتے؟“

”انہیں سوگوار لگتا ہے۔“ اجلال رازی نے کہتے ہوئے ٹرن لے کر ایک دم گاڑی کو بریک لگائے تھے۔ وہ چونکی اور خوشگوار حیرت میں گھر گئی۔

سفید چاندنی میں سرکش لہریں اچھل اچھل کر جیسے چاند کو اپنی آغوش میں لینا چاہتی تھیں۔

”مائی گاڈ رازی! ایسا منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“ اس کا اشتیاق انتہاؤں کو چھو رہا تھا‘ آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ اجلال رازی اسے دیکھتا رہ گیا۔

”چلو ناں‘ وہاں پانی میں چلتے ہیں۔“ وہ کہنے کے ساتھ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی تب وہ چونک کر اترا اور اس کا ہاتھ تھام کر ساحل کی سیڑھیاں اترنے لگا لیکن پھر لہروں کی سرکشی دیکھ کر رک گیا۔

”بس اریبہ! آگے نہیں جانا۔ سنا ہے پورے چاند کو دیکھ کر لہریں باغی ہو جاتی ہیں اور انہیں دیکھ کر انسان اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔“

”اوہو رازی! یہ سنی سنائی باتیں رہنے دو‘ چلو۔“ وہ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

”اریبہ!“ وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا لیکن وہ لہروں تک پہنچ چکی تھی۔

”یہ کیا پاگل پن ہے۔“ وہ ناراض ہوا تو جواباً وہ اس پر پانی اچھالنے لگی ساتھ ساتھ الٹے پیر مزید آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک تیز لہر عقب سے اس سے یوں ٹکرائی کہ اس کے پیر اکھڑ گئے۔ وہ اوندھے منہ گر رہی تھی لیکن اس سے پہلے ہی اجلال رازی نے اسے تھام لیا تھا۔

”رازی!“ بے حد خوف زدہ ہو کر اس نے اس مضبوطی سے اجلال رازی کے بازو تھامے کہ اس کے ناخن شاید کسی پرانے زخم میں پیوست ہو گئے تھے۔

”آ...!“ اجلال رازی کراہا تھا‘ پھر ایک دم اسے دھکیل کر پلٹا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا تو وہ جو اپنے حواس میں آ رہی تھی۔ اس بری طرح دھکیلے جانے پر پہلے سناٹے میں آئی‘ پھر اس کے پیچھے بھاگی۔

”رازی‘ رازی!“ وہ پکارتی جا رہی تھی لیکن اجلال رازی کو اس کی آواز سنائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اپنے زخموں سے اٹھتی ٹیسوں سے بے چین تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا اور اس کے بیٹھتے ہی پوری رفتار سے گاڑی بھگا دی۔

رات کے آخری پہر سڑک سنسان تھی۔

اریبہ پہلی بار اس سے بہت خائف ہو گئی تھی۔ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ڈرتے ڈرتے کن اکھیوں سے دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں باغی لہروں کی سی کیفیت تھی وہ مزید خائف ہو کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

وسیع آسمان پر تنہا چاند اب سوگوار لگ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

شمشیر علی ابا کے سینے سے لگ کر بہت رویا تھا‘ پھر بھی انہیں اصل بات نہیں بتائی کہ اتنا عرصہ وہ کہاں رہا۔ اس پر کیا بیتی اور یہ کہ وہ تاجور کو کھو چکا ہے۔ ابا اسے چپ کرانے کے ساتھ اس کے رونے کا سبب پوچھتے رہ گئے۔

”میں بہت پریشان ہوں ابا! میری نوکری بھی چلی گئی۔ میرے لیے دعا کریں۔“ وہ بس یہی کہے جا رہا تھا۔

”لے نوکری چلی گئی کوئی قیامت تو نہیں آ گئی‘ جو تو رو رہا ہے۔“ ابا کی پریشانی جھنجلاہٹ میں بدل گئی تھی۔ ”تو نے تو میرا دل دہلا کے رکھ دیا... اور یہ تو اکیلا کیوں آیا ہے‘ تاجور کو ساتھ کیوں نہیں لایا؟“

”تاجور ابھی نہیں آ سکتی۔“ وہ اسی بات سے پریشان تھا کہ کہاں سے لائے گا تاجور کو۔

”کیوں ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی؟“ ابا نے جرح کے انداز میں پوچھا تھا۔

”نہیں‘ ابھی اس کا علاج چل رہا ہے۔“

”سال ہونے کو آ رہا ہے اور ابھی تک اس کا علاج چل رہا ہے۔ یہ شہری ڈاکٹر صرف پیسے بٹورتے ہیں‘ علاج نہیں کرتے اور تو اب کہاں سے پیسے بھرے گا۔ نوکری تو ہے نہیں تیری اور میرا اپنا بہت خرچا ہے‘ میں تمہیں دے سکتا۔“ ابا کی آخری بات پر اسے غصہ آ گیا تھا۔

”میں کب مانگ رہا ہوں آپ سے۔ کر لوں گا میں کچھ نہ کچھ‘ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تو پھر رونا کیوں ہے؟“

”پاگل ہوں نا میں‘ آپ کی محبت میں رو رہا تھا لیکن آپ کو احساس ہی نہیں ہے۔ میرا نہ تاجور کا۔“ وہ ابا کے گھٹنے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاں تو نے تو میرا بڑا احساس کیا‘ بڑا سہارا دیا مجھے‘ جو مجھ سے امید رکھ رہا ہے۔“ ابا کبھی احساسات سمجھتے ہی نہیں تھے۔

”نہیں رکھ رہا میں آپ سے کوئی امید‘ آپ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا اس لیے آ گیا۔ کچھ مانگنے نہیں آیا۔ آپ کہیں تو ابھی واپس چلا جاتا ہوں اور پھر کبھی نہیں آؤں گا۔“ اس نے کہا تو ابا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگے۔ پھر دی کو مخاطب کر کے بولے۔

”سن رہی ہے! کچھ کھانے کو لے آ اس کے لیے‘ دور سے آ رہا ہے۔“

اس نے سر جھکا پھر نل پر منہ ہاتھ دھو کر برآمدے میں بچھی چارپائی پر آبیٹھا تو فوراً ہی اماں نے اس کے سامنے روٹی سالن لا رکھا۔ اسے بھوک تو لگ رہی تھی لیکن ابا کی باتوں سے دل ایسا ہوا تھا کہ نوالہ حلق سے اتر ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا تھا کہ بیرونی دروازہ کھلنے کے ساتھ پکارتی آواز آئی تھی۔

"چاچی.....!"

اس نے فوراً منہ سے گلاس ہٹا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ تاباں تھی۔ ہمیشہ سے مختلف بجی سنوری دونوں کلائیوں میں بھر بھر چوڑیاں، کانوں میں جھمکے اور ناک میں چمکتی لونگ نے تو اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ محویت سے اسے دیکھے گیا۔

"ارے یہ اتنی مدت بعد تم کیسے راستہ بھول پڑے۔" تاباں نے اس کے سامنے رک کر پوچھا تو وہ چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ بڑی مدت بعد آئے ہو؟" تاباں نے پھر اپنی بات دہرائی تو وہ سنبھل کر بولا تھا۔

"ہاں بس، تم سناؤ کیسی ہو؟"

"کیسی لگ رہی ہوں۔" تاباں شوخی سے کہہ کر اپنے آپ کو دیکھنے لگی پھر اپنی چوڑیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں۔" وہ نظریں چرا گیا تو تاباں کھلکھلا کر ہنسی، پھر کہنے لگی۔

"بڑے بے مروت ہو۔ تھوڑی تعریف ہی کردو۔"

"کیوں میں کیوں تعریف کردوں۔" وہ اچانک اکھڑ گیا۔ "اس سے کراؤ اپنی تعریف جس کے لیے اتنا ہار سنگھار کیے پھرتی ہو۔"

"تو تم جل کیوں رہے ہو۔ تمہیں اچھا نہیں لگ رہا تو اپنی آنکھیں بند کرلو۔" تاباں نے ناک کر نشانہ لگایا تھا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

"تمہیں چاچی سے کام ہے نا، جاؤ وہ اندر ہیں۔"

"مجھے پتا ہے۔" وہ کہہ کر آگے بڑھی تھی کہ وہ اسے مخاطب کیے بغیر قدرے اونچی آواز میں بولا تھا۔

"میں نہر والے باغ جارہا ہوں۔"

تاباں رک کر اسے دیکھنے لگی لیکن وہ چارپائی کی دوسری طرف سے اتر کر باہر نکل گیا۔

گو کہ تاباں کی سج دھج ظاہر کررہی تھی کہ وہ پرائی ہوچکی ہے پھر بھی جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ نہر والے باغ کے اسی مخصوص گوشے میں جہاں ان کی محبت پروان چڑھی تھی، وہ نرم زمین پر بیٹھ کر تاباں کا انتظار کرنے کے ساتھ اسی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد تاباں سچ مچ آگئی اور قدرے تیکھے انداز میں پوچھنے لگی۔

"اب کیوں بلایا ہے مجھے؟"

"میں نے کب بلایا ہے؟" اس کی پیشانی پر بھی بل پڑ گئے۔

"میں نہر والے باغ جارہا ہوں، یہ کون کہہ رہا تھا۔" تاباں نے جتایا تو وہ چہرہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

تاباں گھوم کر اسی طرف آگئی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تم نے نہیں بلایا۔ میں آپ ہی آگئی ہوں۔"

"میرے نہ بلانے پر آگئی ہو اور اگر میں بلاؤں تو۔" اس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ تاباں خائف ہو کر ایک

قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"بتاؤ تاباں! میرے بلانے پر آؤ گی ناں۔ چلو گی نا میرے ساتھ۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" وہ اچانک نہیں بکھرا تھا، بہت پہلے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ تاباں کو لے آئے گا۔

"مجھ سے بڑی غلطی ہوئی تھی۔ میں نے تمہیں مایوس لوٹا دیا تھا۔ مجھے معاف کردو تاباں!"

تاباں سراسیمہ اسے دیکھے جارہی تھی۔

"میرا یہاں کوئی نہیں ہے تاباں! بس ایک صرف تم ہو۔ میں تمہارے لیے آیا ہوں۔ تمہیں لینے۔ چلو ہم ابھی یہاں سے نکل چلیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو شمشیر! پاگل تو نہیں ہوگئے۔ میری شادی ہوگئی ہے۔" تاباں نے اسے ٹوک کر اپنے تئیں انکشاف کیا تھا۔

"مجھے پتا ہے۔ تمہاری سج دھج نے سب بتا دیا ہے مجھے۔ یہ بھی کہ تم خوش نہیں ہو۔ اتار پھینکو یہ سب جھوٹی خوشیاں۔ میں تمہیں....."

"بس۔" تاباں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔ "یہ جھوٹی خوشیاں نہیں ہیں شمشیر! میرا مرد مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ ساری دنیا اٹھا کر میری جھولی میں ڈال دے۔"

"اور میں.... میری محبت؟" اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

"تمہاری محبت۔" تاباں ایک دم آگے آئی اور نرم زمین پر پاؤں مار کر کہنے لگی۔

"تمہاری محبت دیکھو، یہیں کہیں تم نے خود ہی تو دفن کی تھی اور جو دفن ہوجائے اس کی پھر ہڈیاں ہی ملتی ہیں۔ کیا کروگے گلی سڑی ہڈیوں کا۔"

اب وہ سراسیمہ تھا۔

"بھول جاؤ شمشیر! سب بھول جاؤ۔ گڑے مردے مت اکھاڑو۔ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں اپنی زندگی میں خوش ہوں۔ اس لیے کہ یہ تقدیر کا فیصلہ تھا۔ تم نے مجھے یہی سبق پڑھایا تھا ناں، پھر تم تقدیر سے لڑنے کیوں آگئے ہو؟"

وہ ہنوز ساکت تھا۔

"جاؤ چلے جاؤ شمشیر! میں تمہارے بلانے پر نہیں آئی اور اگر تم بلاؤ گے تب تو مر کر بھی نہیں آؤں گی۔ سن رہے ہو ناں! تاباں تقدیر کے فیصلے پر خوش ہے، بہت خوش۔"

وہ ہنسنا چاہتی تھی لیکن آنسو چھلک گئے۔ تب وہ پلٹ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ شمشیر علی نے چاہا اسے دور تک دیکھے لیکن اس کا پورا وجود سن ہوچکا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سعدیہ رئیس

تربیت

زبیدہ نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ سات بجنے ہی والے تھے۔ وہ اپنے شکن زدہ کپڑوں کو یونہی ہاتھ سے سیدھا کرتے ہوئے کمرے سے باہر آگئیں اور وہیں صحن میں بچھی تپائی پر بیٹھ کر فکرمندی سے دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان کے لب ہولے ہولے ہل رہے تھے کیوں کہ وہ کچھ دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ اسی وقت صائمہ کی مخصوص دستک دروازے پر ہوئی تو ان کی جان میں جان آئی اور پیشانی پر پڑی اندیشوں بھری لکیریں زائل ہو کر چہرے پر طمانیت بھری نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

ہر روز وہ اسی طرح مسکرا کر خوش گوار انداز میں صائمہ کا استقبال کرتی تھیں۔ خواہ اس سے قبل کتنا ہی واہموں اور وسوسوں سے نڈھال ہوتی رہی ہوں۔ صائمہ کو دیکھ کر یک گونہ سکون ان کے من میں اتر آتا تھا اور کیوں نہ آتا کہ وہ صبح ہی صائمہ کے گھر سے نکلنے کے بعد اس کی سلامتی اور تحفظ کے لیے دعائیں مانگنا شروع ہو جاتی تھیں۔ بیٹی کے گھر سے نکلتے ہی ان کی جان ہتھیلی پر آجاتی تھی لیکن یہ خوف اس دور سے کہیں بہتر تھا کہ جبکہ وہ ارشد کے گھر میں داخل ہوتے ہی بلاوجہ ان کے عتاب کا نشانہ بنتی تھیں اور ان کے طعنوں سے چھلنی ہوتی تھیں۔

ایک طویل عرصے بعد انہیں ارشد کے عتاب سے نجات ملی تھی اور صبر آزما وقت گزرنے کے بعد یہ سکون اور اطمینان میسر آیا تھا۔

ارشد ان کے شوہر تھے مگر ان کا مزاج نوکیلا تھا۔ وہ ہر ہر طرح ان خاروں سے گھائل ہوتی رہتی تھیں۔ سارا دن گھر سے باہر رہ کر جب ارشد تیوری چڑھائے گھر میں داخل ہوتے تھے تو بات بے بات پر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتے تھے۔ کبھی کھانے میں دیر ہونے پر عزت افزائی تو کبھی کھانے میں نقص اور کچھ نہیں تو انہیں دو روٹیاں کھلانے کے احسان عظیم کا طعنہ دے مارتے۔ حالانکہ وہ باعزت طور پر ان کے عقد میں آئی تھیں مگر وہ انہیں اپنے گھر میں رکھنے کا احسان جتانا کبھی نہیں بھولتے تھے اور زبیدہ ان کے سارے طعنے تشنے سہہ لیا کرتی تھیں۔

انہیں معلوم تھا کہ ان کا جرم بہت بڑا ہے۔ یکے بعد دیگرے تین بیٹیوں صائمہ' فریحہ اور کاشفہ کی پیدائش نے ان کی حیثیت اور درجے کو کم کر دیا تھا اور ارشد کا اصل روپ بھی کھل کر ان کے سامنے آگیا تھا۔ ان تینوں کی دنیا میں آمد کے لیے وہ زبیدہ ہی کو مورد الزام ٹھہراتے تھے۔ اولاد نرینہ نہ ہونے کا بدلہ انہوں نے یوں لیا کہ اپنی تیز و تلخ باتوں سے زبیدہ اور تینوں بیٹیوں کی زندگی عذاب کر دی۔ وہ صاف لفظوں میں ان تینوں کو کھلم کھلا اپنے سینے پر دھری سل کہا کرتے تھے۔ ایسے میں زبیدہ کا دل کانپ جاتا۔ اتنی بے عزتی اور سختی کے باوجود وہ اپنی بیٹیوں سے کبھی بھی نفرت نہ کر سکتی تھیں کیونکہ ان کے سینے میں ممتا بھرا دل تھا۔ البتہ عدم تحفظ کا شکار سی ہو گئی تھیں۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ ان کی تربیت اور پرورش میں اس قدر محتاط ہو کر چلیں اور ہر معاملے میں یوں پھونک پھونک کر قدم رکھا کہ کہیں کسی قسم کی کوئی کوتاہی ان کے حصے میں نہ آجائے۔ کہیں کوئی غلطی الزام نہ بن جائے اور خدا کا شکر تھا کہ وہ اپنی کوششوں میں سرخرو رہیں۔ ان کی تینوں بیٹیاں علم و ہنر میں یکتا' بہت ذہین اور محبت والی تھیں۔ انہوں نے ماں کی تربیت پر آنچ نہ آنے دی اور اب تو صائمہ نے بیٹا بن کر ان کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔

جب تک وہ ارشد کی محتاج رہیں' تلخیوں کے ساتھ ساتھ تنگیاں بھی دیکھتی رہیں۔ ڈرتے کانپتے خوف و اندیشوں بھرے دن گزرتے رہے۔ بہت سے ایسے چھوٹے موٹے معاملات جو نارمل زندگی میں مسئلہ نہیں ہوتے تھے' ان کے لیے مسئلہ بنے رہے ارشد انہیں جان بوجھ کر کنجوسی سے کم خرچا دیتے تھے۔ کبھی کپڑے بنانے پر اعتراض کرتے اور کبھی بچیوں کی ننھی منی ضرورتوں کو فضول خرچی کہتے۔ یہاں تک کہ ان کے اسکولوں کی فیس بھرتے ہوئے وہ زبیدہ کو بے حساب باتیں سناتے تھے۔ ان کے نزدیک ان کی تعلیم پر فضول پیسہ خرچ ہو رہا ہے لیکن زبیدہ

نے ہار نہ مانی۔ وہ ہر طریقہ اور کوشش سے بچیوں کے اضافی اخراجات نکال لیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی اسکول کی فیس کا بندوبست بھی انہیں کرنا پڑتا تھا۔ یوں وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں بھی بہت کوشش کے بعد حاصل کرپاتی تھیں لیکن اب ایک لمبی مشقت آمیز زندگی گزارنے کے بعد انہیں بھی وہ درجہ اور عزت مل گئی تھی جس کی وہ حق دار تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ارشد کا غصہ بھی کم ہوگیا تھا۔ مزاج کی اس تندی میں کمی کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کی بیٹیاں اپنے اخراجات خود پورے کرنے کے قابل ہوگئی تھیں اور ارشد کو جس "توجہ" کی ان سے توقع تھی' وہ ان پر نہ پڑا بلکہ الٹا اب صائمہ ان کا بوجھ ہلکا کررہی تھی۔ ہر ماہ وہ معقول رقم کما کر لارہی تھی اب ان کی بیٹیاں ان کی محتاج نہ رہی تھیں اور نہ ہی اپنی ماں زبیدہ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ارشد کے تنے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔

اب ان کے گھر میں جنگ و جدل کا سماں نہیں رہتا تھا اور نہ ہی ارشد کی بد مزاجی اور بد زبانی سے ماحول پر خوف و ہراس چھاتا تھا۔ صائمہ بی ایس سی کرنے کے بعد صبح میں اسکول میں پڑھاتی تھی اور شام میں ایک کوچنگ سینٹر میں کلاسز لیتی تھی۔ اچھی بھلی رقم اسے مل رہی تھی۔ اس سے چھوٹی فریحہ انٹر میں تھی اور بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی اور ان بچوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ کاشفہ سب سے چھوٹی تھی۔ اس سال وہ میٹرک میں گئی تھی۔ ابھی فی الحال اس نے خود پر کوئی ذمہ داری نہ ڈالی تھی' البتہ وہ گھر داری میں زبیدہ کی اور ٹیوشن پڑھانے میں فریحہ کی مدد کردیا کرتی تھی۔

گزشتہ زندگی کی تلخیوں کا اب کہیں شائبہ بھی نہ تھا۔

ارشد کے مزاج میں لچک آگئی۔ زبیدہ نے بھی یہ بات نوٹ کی کہ ان میں اب وہ پہلے والی بات نہ رہی تھی۔ بات بات پر تنک جانا اور چیزوں کو پٹخنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جو غصہ ہر وقت ناک پر دھرا رہتا تھا' اب وہ بھی نہ رہا تھا۔ چہرے پر ہمہ وقت رہنے والے کھنچاؤ نے ارشد کے نقوش میں کچھ بے رحمی اور سختی سی پیدا کر دی تھی لیکن اب ایسا ہوتا کہ کبھی کبھار ان کے تناؤ زدہ چہرے پر مسکراہٹ آنے لگی تھی اور یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔ دیر سے ہی سہی لیکن بہرحال بیٹیوں کے لیے ان کا دل موم تو ہو ہی گیا تھا اور زبیدہ کو اپنے جکڑے ہوئے اعصاب میں اب بہتری سی محسوس ہو رہی تھی۔ جن بیٹیوں سے پہلے وہ بات کرنا تو درکنار انہیں دیکھنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اب اکثر ہی باپ بیٹی دوستانہ انداز میں ایک دوسرے سے بولتے نظر آتے اور یہ زبیدہ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

صائمہ کی آمد کے کچھ ہی دیر بعد ارشد بھی چلے آئے۔ فریحہ دوسرے کمرے میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھی' سو کاشفہ نے دوڑ کر جلدی سے ابا کے لیے چائے بنائی۔ جب تک صائمہ بھی منہ ہاتھ دھو کر وہیں آگئی اور اب دونوں باپ بیٹی برابر برابر بیٹھے اپنی دن بھر کی مصروفیات ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ زبیدہ بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ بظاہر تو لاتعلق نظر آرہی تھیں مگر ان کا روم روم ان دنوں کی طرف متوجہ تھا۔ یہ وہ حسین منظر تھا' جسے دیکھنے کے لیے انہوں نے اپنی عمر کے قیمتی اور انمول برس بے مول کردیے تھے۔ ہزار کلفتوں' نفرتوں اور حقارتوں کو سہنے کے باوجود انہوں نے اپنی بچیوں کو باپ کی عزت اور احترام سکھایا تھا اور اب یہ منظر دیکھ کر بے اختیار ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھری پڑ رہی تھی۔

بے شک ارشد نے ان کی عمر کے انمول دور کو بے مایہ کر ڈالا تھا۔ ان کی جوانی کو طنز و طعنوں سے چھلنی کردیا تھا اور ان کے خوابوں کو چکنا چور کر ڈالا تھا مگر مشرقی عورت کی طرح وہ ارشد سے سمجھوتا کرتی رہیں۔ صرف اور صرف ان پریوں جیسی معصوم بیٹیوں کے لیے انہوں نے تلخیوں کے گھونٹ صبر شکر سے پی لیے تھے اور اب اسی صبر کا پھل انہیں سامنے نظر آرہا تھا۔

"بیٹا۔۔۔ مرد خواہ کتنا ہی سخت مزاج ہو مگر جب بیٹیوں کا باپ بنتا ہے تو اس کے مزاج میں خود بخود نرمی اور عاجزی آجاتی ہے۔"

برسوں پہلے کہ جب ابتدائے ایام میں ان کی روح چھلنی ہوئی اور خواب ریزہ ریزہ ہوئے تو ان کے بہت رنجور اور مایوس ہونے پر ان کی ماں نے انہیں سمجھایا تھا اور آج وہ ان کی سمجھ داری اور جہاندیدگی کی قائل ہوگئی تھیں۔ ارشد کے موجودہ طرز عمل پر ان کی وہ بات بالکل صادق آرہی تھی۔ انہیں تو بالکل امید نہ تھی مگر حقیقت یہی تھی۔ ارشد کا مزاج یکسر ڈھل گیا تھا۔ وہ خدا کا جتنا بھی شکر ادا کرتیں' کم تھا۔

کاشفہ چائے لے کر آئی تو وہ اپنے خیالات سے چونکیں۔ اس وقت صائمہ اور ارشد کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ اسی وقت فریحہ بھی وہاں چلی آئی۔

"یہ ایک سوال میری سمجھ میں نہیں آرہا اور کل احمد کا ٹیسٹ ہے۔"

"لاؤ مجھے دکھاؤ۔۔۔ میں دیکھتا ہوں' وہ ابھی تھکی ہوئی اپنا دماغ کھپا کر آئی ہے۔" اس سے پہلے کہ صائمہ کتاب تھامتی' ارشد نے خود ہی وہ کتاب لے لی۔

فریحہ ان کے پاس بیٹھ کر اس سوال پر ان سے ڈسکس کرنے لگی۔ بچوں نے اکیلے کمرے میں زیادہ شور مچایا تو کاشفہ ان کو ڈانٹنے چلی گئی۔ بڑا مکمل سا منظر تھا۔ زبیدہ نے گہرا سانس بھر کر آنکھیں موند کر اس منظر کو خود میں جذب کرلیا۔ ایک لمبے' تھکن آمیز دور کے بعد یہ آنے والا وقت ان کے ممتا بھرے دل کو نئی خوشیوں اور بہاروں کی نوید سنا رہا تھا۔

صائمہ ان کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس کے نقوش میں یونانی حسن کی چھب تھی۔ وہ شکل سے بھی مغرور لگتی تھی مگر حقیقت میں بہت خوش اخلاق تھی۔ اس کا قد درمیانہ لیکن سراپا جاذب نظر تھا۔ وہ بہت محنتی اور پر امید لڑکی تھی۔ اتنی محنت اور سختی کے باوجود اس کی دلکشی میں ذرا بھی فرق نہ آیا تھا۔ وہ ذہین بھی تھی۔ اس نے فریحہ اور کاشفہ کو تعلیم کے معاملے میں بہت سے مفید مشورے دیے تھے۔ اس میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ اتنی کہ کبھی کبھی زبیدہ بھی اس کے فیصلوں سے خائف ہو جاتی تھیں لیکن انہیں اس پر پورا بھروسا تھا کیوں کہ وہ ان کی سب سے تابعدار بھی تھی۔ اب تو وہ بہت سے گھریلو معاملات اور مسائل بھی خود ہی حل کرلیا کرتی تھی۔ فریحہ اور کاشفہ اسی کے مشوروں پر انحصار کرتی تھیں۔ وہ ان دونوں کے لیے اک مثال تھی۔ وہ بھی صائمہ جیسا بننا چاہتی تھیں۔ خود انحصاری سے اپنی زندگی جینا چاہتی تھیں۔

صائمہ کے مقابلے میں فریحہ کا قد کچھ زیادہ تھا اور وہ صائمہ کی ہم عمر ہی لگتی تھی' حالانکہ ان دونوں میں تین سال کا فرق تھا۔ اب تو وہ زبیدہ کو پریشان ہونے کی زحمت بھی نہ دیتی تھیں۔ چاہے کپڑے بنانے ہوں' مہینہ کا سودا لانا ہو یا سمسٹر کی فیس بھرنی ہو۔ وہ آپس ہی میں سارے معاملات سدھار لیتی تھیں یا پھر کبھی ضرورت پڑتی تو ارشد سے مشورہ لیتی تھیں۔ کبھی کبھی تو زبیدہ کو غصہ آنے لگتا۔ انہیں محسوس ہوتا کہ انہیں فالتو سمجھ کر ایک طرف کردیا گیا ہے۔ پہلے جن الجھنوں اور پریشانیوں سے وہ بے زار رہتی تھیں' اب انہی پریشانیوں اور الجھنوں کو جاننے کے لیے بے تاب رہتی تھیں مگر صائمہ ان کے علم میں آنے سے پہلے ہی وہ معاملہ سلجھا لیتی تھی۔

☆ ☆ ☆

ان دنوں صائمہ اور ارشد صاحب میں آپس میں بڑی رازدارانہ سی باتیں ہو رہی تھیں۔ انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا معاملہ ہے لیکن چند روز بعد جب ارشد نے سارے گھر میں روغن کرایا اور اس کے بعد صائمہ کے ساتھ جا کر وہ نیا فرنیچر گھر لے کر آئے تو وہ فوراً" سمجھ گئیں کہ یہ ساری کارستانی صائمہ کی ہے۔ یہ تو ان کی بڑی پرانی تمنا تھی کہ گھر کو نئے انداز سے' نئے سامان سے سجائیں مگر ارشد تو اس وقت گھر کے اخراجات کے لیے محدود سی رقم انہیں چندے یا خیرات کی طرح دیتے تھے' سو ان سے تعاون کی امید' حماقت ہی تھی۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتی تھیں مگر بہرحال اب بھی جو ہو رہا تھا' وہ بھی غلط نہ

تھا۔بہتری کے آثار تو نمودار ہونے لگے تھے' خواہ وسیلہ کوئی بھی بنا ہو۔یہ سب آج کے دور کا تقاضا بھی تھا اور ان سب کے حق میں بھی بہتر تھا۔

انہیں ٹوٹ کر صائمہ پر پیار آیا۔اس کی کوشش اور لگن نے گھر کی حالت سنوار دی۔اب آگے کے حالات بھی سنورتے نظر آرہے تھے۔سب کچھ خود بخود ٹھیک ہونے لگا تھا۔زبیدہ نے سکھ بھرا سانس لے کر سامنے بیٹھی صائمہ کی دل ہی دل میں بلائیں لے ڈالیں۔ارشد جیسے پتھر اور سنگ دل شخص کو نہ وہ قابو کر سکی تھیں اور نہ قائل' لیکن صائمہ نے پتھر میں جونک لگادی تھی۔ایک ناقابل یقین بات ہوگئی تھی۔

فریحہ نے انٹر میں شان دار نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔اس روز جب ارشد نے فریحہ کو شاباشی دی تو زبیدہ دنگ رہ گئیں۔کیسا عظیم انقلاب آگیا تھا ان کی زندگی میں کہ ارشد جیسا پتھر دل شخص پگھل گیا تھا' ان بیٹیوں کے لیے جن کا وجود اسے برداشت نہ ہوتا تھا۔

انہیں یاد تھا کہ ارشد کو دوسری بیٹی فریحہ کی پیدائش کی خبر ملی تھی تو انہوں نے آسمان سر پر اٹھالیا تھا اور پورے تین دن بعد فریحہ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی تھی۔ان کے دل کے خانے میں تو پہلی بیٹی کی گنجائش نہ تھی' فریحہ نے آکر رہی سہی کسر نکال دی۔پھر بے چاری کاشفہ تو اتنی محروم رہی کہ وہ اسے دیکھنے اسپتال بھی نہ گئے تھے اور گھر آنے کے بعد بھی بھولے سے اس پر نظر کرم نہ کی تھی۔وہ ان کے گھر میں آئی وہ بن بلائی مہمان تھی جس کا وجود انہیں دو بھر تھا مگر اب کایا پلٹ گئی تھی۔ارشد کے دل میں بیٹیوں کے لیے محبت پیدا ہوگئی تھی۔

گزشتہ دور کے تلخ حالات اور رویے کے مقابلے میں انہوں نے کھلے دل سے فریحہ کو مزید تعلیم کی اجازت دے دی۔زبیدہ نے دانتوں تلے انگلی داب لی یہ وہی باپ تھا' جو بیٹی کی تعلیم پر پیسہ لگانے کو فضول سمجھتا تھا مگر اب خدا مہربان ہوگیا تھا۔صائمہ اور ارشد کے مشورے سے فریحہ نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

انہی دنوں صائمہ کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا۔کچھ ماہ قبل اس نے ایک نجی کمپنی میں جاب کے لیے درخواست دی تھی۔اس دوہری خوشی کو سب نے فراخ دلی سے منایا۔اس روز ارشد پہلی بار بہت سا پھل' کیک اور مٹھائی لے کر گھر آئے تو زبیدہ سجدہ شکر بجالائیں۔

دن بدلتے دیر نہیں لگتی۔زبیدہ کو اب اس بات پر پورا یقین آگیا تھا۔سارا زمانہ اس کی بیٹیوں کی تعریف کررہا تھا اور زبیدہ اپنی تربیت اور محنت پر ناز کررہی تھیں۔برے دن تو چلے گئے' اب اچھا وقت بھی قریب آتا جارہا تھا۔

"تمہاری محنت رنگ لائی' تمہاری بیٹیوں نے تو بیٹا بن کر دکھادیا۔" کئی لوگوں نے ان کے منہ پر صائمہ کی تعریف کی۔

ارشد کا رویہ پہلے پہل تو صرف بیٹیوں کے ساتھ نرم ہوا تھا مگر اب زبیدہ کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ بہتر ہوگیا تھا۔پہلے تو وہ انہیں خاطر میں نہ لاتے تھے۔ان کی حیثیت اور اوقات انہیں گاہے بگاہے جتاتے رہتے تھے مگر اب جب صائمہ نے ان کا سر فخر سے بلند کیا تو وہ بھی شاید ان سے مرعوب ہوگئے تھے۔اگر مرعوب نہ بھی ہوئے تھے تو ان کی ذات کی اہمیت کو انہوں نے تسلیم کر ہی لیا تھا اور زبیدہ کے لیے یہ بھی بہت تھا۔

سب طرف ایک آسودگی سی چھاگئی تھی۔ان کا گھر' ان کی بیٹیوں کی محنت اور قابلیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔جو آتا رشک بھری نظروں سے ان کے گھر کو دیکھتا۔صائمہ تو اب اپنی نئی جاب میں مصروف تھی اور دگنی تنخواہ گھر لارہی تھی جبکہ فریحہ اس کی جگہ اب کوچنگ کی کلاسز لے رہی تھی اور کاشفہ نے ٹیوشن والے بچوں کو سنبھال لیا تھا۔سب کچھ بڑے منظم طریقے سے ہورہا تھا۔

ارشد کا تو یہ عالم تھا کہ اب سارا جوانی کا دور ٹوٹ کر کندھے ڈھے گئے تھے مگر جب کوئی ان کی بیٹیوں کی صلاحیتوں کی تعریف کرتا تو ان کے جھکے کندھے اکڑ سے جاتے اور گردن خود بخود اونچی ہوجاتی۔لیکن ان

ساری سہولتوں اور آرام کے باوجود زبیدہ کے دل پر ایک بوجھ سا پڑا تھا۔جب وہ نظر بھر کر صائمہ کو دیکھتیں تو انہیں ہول اٹھنے لگتے۔اس برس صائمہ اٹھائیس کی ہوچکی تھی۔اس بھرپور عمر میں اس کا دلکش سراپا مزید نمایاں ہوکر ان کی فکروں میں اضافہ کررہا تھا۔اور جب وہ فریحہ کو دیکھتیں تو مزید متفکر ہوجاتیں۔فریحہ تو صائمہ سے بھی اونچی جارہی تھی۔گئے دنوں میں کئی آنے والے رشتے ٹھکرائے جاچکے تھے کیوں کہ ارشد صاحب کو کبھی خاندان پر اعتراض ہوتا تھا' کبھی لڑکے کی کم تعلیم پر' کہیں صورت شکل پسند نہ آتی اور کہیں کمائی ناقابل معیار ہوتی۔۔۔اور جب تو وہ خود بھی یہی چاہتی تھیں کہ صائمہ کا رشتہ بہت اچھی جگہ طے ہو اس لیے وہ بھی ان نقائص پر اعتراض کرتی تھیں۔

اس وقت گھر کا ماحول بھی سازگار نہ تھا مگر اب تو سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں صائمہ کی فکر بھی ہوتی جارہی تھی۔انہوں نے کئی لوگوں سے صائمہ کا ذکر کیا ہوا تھا۔وہ چاہتی تھیں کہ اب صائمہ جلد سے جلد اپنے گھر کی ہوجائے۔

اک روز ان کی مراد بر آئی۔رشتہ بہت اچھا تھا صرف لڑکے کی عمر تھوڑی سی زیادہ تھی لیکن اب انہوں نے اپنے دل کو یہ سمجھالیا تھا کہ کسی نہ کسی خامی کو انہیں برداشت کرنا ہی پڑے گا۔لڑکا قبول صورت تھا اور جاب کرتا تھا مگر اس بار بھی ارشد نے یک جنبش گردن سے وہ رشتہ مسترد کردیا۔

بڑے عرصے کے بعد زبیدہ کے دل میں احتجاج کی صدا بلند ہوئی ورنہ انہوں نے تو کب سے ارشد کے سامنے بولنا چھوڑ دیا تھا اور ان کی ہر بات پر سر خم کرنا اپنا شعار بنالیا تھا۔چونکہ وہ ایک ماں بھی تھیں' سو ماں کی نظر سے جو بات وہ سمجھ رہی تھیں وہ ارشد نہ سمجھ رہے تھے۔اسی لیے اب انہیں قائل کرنا بھی ایک بہت بڑا مرحلہ تھا ان کے لیے۔

انہیں معلوم تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوانی اور حسن اپنی کشش کھو بیٹھتے ہیں' ابھی وقت ان کے ہاتھ میں تھا۔صائمہ کی عمر اتنی تو نہیں نکلی تھی' ہاں!

اگر مزید دیر کی جاتی تو پھر ان کے لیے پچھتاوے ہی رہ جاتے۔انہیں معلوم تھا کہ ارشد سے اپنی بات منوانا پتھر سے سر ٹکرانا ہے مگر اب بات کیے بنا کوئی چارہ نہ تھا۔

جس روز انہوں نے اس موضوع پر ارشد سے بات کی' اس روز جیسے ان کے گھر میں بھونچال سا آگیا۔۔۔وقت نے ارشد کے کندھے ضرور جھکا دیے تھے مگر اندر کا طنطنہ اور اکڑ اب بھی قائم تھی۔

"تم کیا سمجھ رہی ہو میں آنکھیں بند کرکے بے وقوفوں کی طرح گرے پڑے لوگوں میں بیٹی دے دوں۔۔۔ایسی کیا جلدی ہے تمہیں۔۔۔اسے چین سے رہنے دو ابھی۔" وہ چیخ پڑے۔

ماضی کے ارشد کی جھلک ان میں واضح طور پر دیکھ کر زبیدہ پریشان ہوگئیں۔

"لیکن۔۔۔اس کی عمر نکلی جارہی ہے' وہ اٹھائیس کی ہوچکی ہے اور اگلے دو برسوں میں تیس کی ہوجائے گی۔ابھی تو کوئی بھولا بھٹکا مسافر اس طرف آنکلا ہے مگر کل کوئی یہاں آکر کھڑا بھی نہ ہوگا۔ہمیں جو کرنا ہے' جلدی کرنا ہے۔" ہمت کرکے انہوں نے کہہ ہی دیا۔

"ہاں ہاں' نہ آئے میری بلا سے۔۔۔مجھے کسی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔بے وقوف عورت! اپنے ہی

ہاتھوں اپنا زر دوسروں پر کون لٹاتا ہے؟ کیوں ہم سب کو مصیبت میں ڈال رہی ہو۔ رحم کھاؤ میرے حال پر... ساری عمر کی کمائی ان سب پر لگا کر میں اپنی پونجی کسی دوسرے کو نہیں دوں گا۔ اب مجھ سے کام نہیں ہوتا۔ میں نے اپنا پیسہ، محنت اور خون پسینہ ان پر لگا کر انہیں تعلیم دلوائی اب ان کا فرض ہے کہ مجھے کما کر کھلائیں۔ تم نے تو مجھے بیٹا پیدا کرکے نہیں دیا لیکن اب یہی میرے بیٹے جیسی ہیں، میرے بڑھاپے کا سہارا ہیں... ان کے جہیز اور شادیوں میں مفت کے پیسے نہیں لٹا سکتا میں...“

وہ دیوانہ وار برس پڑے۔ اس وقت وہ کسی نیم مجہول دیوانے کی طرح صرف اپنے ہی جنون کے قیدی بن کر، صرف اپنے ہی بارے میں سوچ رہے تھے۔ ان کی جہالت اور خیالات کی پستی ابھر کر سامنے آئی تو نہ صرف زبیدہ بلکہ صائمہ اور فریحہ بھی دم بخود رہ گئیں۔

سارے ماحول پر نحوست سی در آئی۔ اس کل کل میں وہ رشتہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اس روز صائمہ کی بڑی بڑی خالی آنکھوں کو دیکھ کر زبیدہ کا دل خون ہوتا رہا۔ ان کی سب سے مضبوط اور بہادر بیٹی اس وقت بھربھری ریت کی مانند انتہائی کمزور اور خوفزدہ سی لگ رہی تھی۔ خوشیوں کے بجائے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی جیسے اس کے وجود پر خزاں نے ڈیرہ ڈال لیا ہو۔

فریحہ کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ اس کے زندگی سے بھرپور امیدوں سے شاداب چہرے پر کھنڈروں کی ویرانی برسنے لگی تھی اور کاشفہ ٹکر ٹکر ان تینوں کو دیکھ رہی تھی۔ ارشد کی باتوں سے زیادہ اسے ان تینوں کو اس مایوس و ناکام حالت میں دیکھ کر گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ارشد تو انہیں بیٹیاں سمجھنے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ ان کی بیمار ذہنیت انہیں صرف بیٹے کا نعم البدل اور پیسہ کمانے کی مشین سمجھ رہی تھی۔

کاشفہ نے پہلے تو میٹرک کے بعد مزید نہ پڑھنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن پھر ایک نئے عزم کے ساتھ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔

کئی ماہ بعد کاشفہ نے سب کو حیران کر دیا۔ اس نے اچانک ہی گھر سے بھاگ کر ایک لڑکے سے اپنی پسند کی شادی کرلی...

اس نے گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے اور اپنی بہنوں کی محنتوں اور محبتوں کا برا انجام دیکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ وہ ارشد کی بے حسی اور سنگ دلی کی بھینٹ نہیں چڑھنا چاہتی تھی۔ ابھی اس کے جذبے نوخیز تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ صائمہ اور فریحہ کی طرح پیسہ کمانے کی مشین بنے۔

کاشفہ کی شادی کی خبر سے پورے گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ ایک انتہائی غیر متوقع بات تھی ان سب کے لیے۔ اپنی پریشانی میں کسی نے کاشفہ کے جذبات، ارادے اور منصوبے جاننے کی کوشش ہی نہ کی۔ نہ ہی یہ سوچنے کی زحمت کی کہ گھر کی اندرونی باتوں سے اس کا کیا رد عمل ظاہر ہوگا۔

ایک قیامت تھی، جو سب پر ٹوٹی تھی۔ ارشد کے اندر سوئے ہوئے غصیل مرد نے بیدار ہو کر اپنا وہ رنگ دکھایا کہ زبیدہ کی شفاف ممتا پر سیاہ داغ پڑ گئے اور دل کا ہر زخم آبلہ بن گیا۔

”جاہل عورت... یہ ہے تیری تربیت؟“ ارشد کے منہ سے گالیوں اور کوسنوں کا فوارہ ابل رہا تھا۔

خبر سب طرف گردش کر گئی، جس نے بھی سنا کان پکڑ لیے اور زبیدہ کی تربیت کو خراج تحسین سے نوازا۔ ”دیکھو تو، دو جوان بیٹیاں گل کھلانے کو گھر میں بٹھائی ہوئی ہیں۔ ان کی کمائی دونوں ہاتھوں سے اڑائی جا رہی ہے اور تیسری بیٹی منہ پر کالک تھوپ کر اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی... لڑکیوں کو آزادی دے کر آوارہ کر دیا اور اب سر پکڑے بیٹھی ہیں... یہ سارا کیا دھرا ان کی ماں کا ہے... یہ ہے زبیدہ کی تربیت...“

سارا زمانہ تھو تھو کر رہا تھا اور زبیدہ پتھر کا بت بنی بیٹھی تھیں۔

☆

ایک بے حد قدیم دریا ہے
یہ جو میرے لہو میں بہتا ہے

میں اُسے پڑھ رہا ہوں صدیوں سے
اک ستارا مرا صحیفہ ہے

میں نے اُس پھول کی قسم کھائی
رنگ جس کا تمہارے جیسا ہے

آنکھ بس تم کو دیکھتی ہے یہاں
دل تمہارے لیے دھڑکتا ہے

عشق ناکام و نامراد نہیں!
عشق کیجیے تو بھید کھلتا ہے

آدمی ہے کہ ہے شجر کامی
دھوپ لیتا ہے، چھاؤں دیتا ہے

سیّد کامی شاہ

کبھی ایسا ہو

یونہی سفر میں
پچھلی رو میں نظر کروں
اک شخص سے یونہی میگزین مانگ لوں
میگزین ہٹے تو پیچھے
ترا چہرہ ہو
فرض کرو، اک ایسا دلربا
سفر بھی میرا ہو!

عافیہ احمد

عشق کا لگتا ہے اُس کے دل پہ گہرا گھاؤ ہے
جب ہی اس کی گفتگو میں اس قدر ٹھہراؤ ہے

آج بھی اس بے پناہ مصروفیت میں اس کی یاد
وقت کے طوفاں کی لہروں سے لڑتی ناؤ ہے

وصل وہ بھی اس تسلسل سے جذبے مر گئے
آخر اتنی بھی محبت کیا، یہ کیسا چاؤ ہے

اُس کو دلچسپی مجھ سے نہیں، میرے خوابوں سے ہے
عشق و فن کا ان دنوں مجھ میں عجب ٹکراؤ ہے

تجھ کو جب دیکھا تو کتنی دیر بعد آیا یقین
پہلے میں سمجھا تھا میرے وہم کا اک داؤ ہے

دوستوں کی ضد تھی کہ تم سے محبت ہے مجھے
اب بتاؤ کیا میں کرتا؟ کہہ دیا ہاں چاؤ ہے!

ثانی یہ چیزیں بکاؤ کب ہیں اور سب کا سوال
مول کتنے ہیں محبت کے، وفا کیا بھاؤ ہے؟

وجیہہ حسن ثانی

روح میں نغمۂ جاں بن کے اُتر جاؤ گے تم
کوئی موسم تو نہیں ہے کہ گزر جاؤ گے تم!

شہرِ رسوائی کے منظر نہیں دیکھے تم نے
جتنا سمٹو گے یہاں، اتنا بکھر جاؤ گے تم

آنے والوں کے لیے راستہ خالی رکھو
جانے والوں سے نہ پوچھو کہ کدھر جاؤ گے تم

یوں تو سینے کا خلا پُر نہیں ہوتا ہے مگر
کوئی تو خالی جگہ ہے جسے بھر جاؤ گے تم

کتنا سنولا دیا سایوں کی رفاقت نے تمہیں
اب مری دھوپ میں آجاؤ، نکھر جاؤ گے تم

گردشِ خوں میں مہک اُٹھتا ہے خوشبو کی طرح
عشق وعدہ تو نہیں ہے کہ مُکر جاؤ گے تم!

کارِ دُنیا بھی، نیا عشق بھی، یادیں بھی سلیم
کتنے زخموں کو سجائے ہوئے گھر جاؤ گے تم!

سلیم کوثر

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے کسی کو ہدایت کی طرف بلایا تو اسے ان تمام لوگوں کے برابر اجر ملے گا جو اس کی پیروی کرنے والوں کو ملے گا۔ یہ ان کے اجروں سے کچھ کمی نہیں کرے گا۔ اور جو کسی کو گمراہی کی طرف بلائے گا تو اس پر ان تمام لوگوں کے گناہوں کا اتنا وبال بھی ہوگا جو اس کی پیروی کرنے والوں کو گناہ کرنے کا ہوگا۔ یہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی نہیں کرے گا۔" (مسلم)

فائدہ:۔ "ہدایت کی طرف بلاؤ" کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کو نیکی یا برائی کی ترغیب دے۔

نیکی کی طرف بلانے والے کو اللہ کے ہاں کئی گنا زیادہ اجر و ثواب ملے گا اور برائی کی ترغیب دینے والا بہت سارے لوگوں کے گناہوں کا ذمہ دار ہوگا۔

نسلی ولسانی تعصب،

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مال تقسیم کرتے وقت مساوات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ایک دن آپؓ کے پاس دو عورتیں آئیں اور اپنی محتاجی کا اظہار کرکے سوال کیا۔ آپؓ نے مستحق جان کر حکم دیا کہ ان کو کھانا اور کپڑا خرید کر دیا جائے۔ مزید براں کچھ مال بھی دے دیا۔ ان میں سے ایک عورت نے کہا۔ "مجھے کچھ زیادہ دیا جائے کیونکہ میں عرب ہوں اور میری ساتھی غیر عرب۔" آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تھوڑی سی مٹی ہاتھ میں لے لی اور اسے دیکھ کر کہا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ اطاعت اور تقویٰ کے علاوہ کسی اور وجہ سے بھی اللہ نے کسی کو کسی پر فوقیت دی ہے۔"

پردہ داری،

حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ ایک عورت نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں آکر کہا۔

"اے امیر المومنین! مجھے ایک بچہ ملا اور اس کے ساتھ ایک مصری سفید کپڑا ملا، جس میں سو دینار تھے۔ میں نے دونوں کو اٹھالیا اور گھر لے آئی۔ اس بچے کے لیے اجرت پر دودھ پلانے والی عورت کا انتظام کیا۔ اب میرے پاس چار عورتیں آتی ہیں اور وہ چاروں اسے چومتی ہیں۔ مجھے نہیں پتا چلتا کہ ان چاروں میں سے کون اس کی ماں ہے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"جب وہ عورتیں آئیں تو مجھے اطلاع کر دینا۔"

وہ عورتیں آئیں۔ اس عورت نے امیر المومنین کو اطلاع دی۔ امیر المومنین آئے اور ایک عورت سے فرمایا۔

"تم میں سے کون اس بچے کی ماں ہے؟"

اس عورت نے کہا۔ "اللہ کی قسم! آپؓ نے (معلوم کرنے کے لیے) اچھا انداز اختیار نہیں کیا۔ اللہ نے ایک عورت کے عیب پر پردہ ڈالا ہے۔ آپؓ اس کی پردہ دری کرنا چاہتے ہیں۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"تم نے ٹھیک کہا۔" پھر اس پہلی عورت سے کہا۔ "آئندہ جب یہ عورتیں تمہارے پاس آئیں تو ان سے کچھ نہ کہنا اور ان کے بچے کے ساتھ اچھا سلوک کرتی رہنا۔" پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ واپس تشریف لے گئے۔

اللہ جیسا،

عربی کی ایک حکایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

مصر سے مدین گئے تو انہیں بخار نے آلیا اور اس کے بعد بھوک ستانے لگی تو انہوں نے دعا مانگی۔
"اے میرے رب! میں مسافر بھی ہوں، مریض بھی ہوں اور میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"
اللہ جل شانہ نے فرمایا۔
"اے موسیٰ (علیہ السلام) کیا تو جانتا ہے کہ غریب کون ہے۔ مریض کون ہے اور بغیر مال والا کون ہوتا ہے؟"
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "اے میرے پروردگار! مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔"
اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"غریب وہ ہے، جس کا مجھ جیسا پروردگار نہ ہو۔ مریض وہ ہے، جس کا مجھ جیسا طبیب نہ ہو اور بغیر مال والا وہ ہے، جس کا مجھ جیسا کارساز نہ ہو۔"

راز کی بات

ایک شخص عبدالملک بن مروان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔
"آپ سے کچھ راز کی بات کہنا چاہتا ہوں۔"
عبدالملک نے اپنے مصاحبوں سے تخلیے کا کہا۔ وہ سب لوگ اٹھ گئے تو آپ نے اس شخص سے کہا۔
"دیکھو! میری مدح نہ کرنا۔ میں اپنے آپ کو خوب پہچانتا ہوں۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ جھوٹا بغیر سزا پائے میرے پاس سے بچ کر نہیں جا سکتا اور نہ کسی کی لگائی بجھائی کرنا کیونکہ چغل خوری سب سے بڑا جرم ہے۔ اب کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"
وہ شخص کچھ نہ بولا۔ اٹھ کر چلا گیا۔

بندہ نواز

ایف اے کے ایگزام ہو رہے تھے۔ اردو کے امتحانی پرچے میں ایک شعر دیا گیا جس کی تشریح کرنی تھی شعر کچھ یوں تھا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

ایک طالب علم جو کہ اپنی قومی زبان سے بالکل نابلد تھا۔ اس نے اپنی فہم و فراست سے اس مشکل ترین شعر کی آخر تشریح کر ہی لی، جو کچھ یوں تھی۔
"کہتے ہیں کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا محمود۔ جس کا ایک غلام تھا ایاز۔ ایک دفعہ بادشاہ محمود اپنے دشمن کے ساتھ جنگ کر رہا تھا۔ لڑتے لڑتے عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ محمود نے اپنے دشمن سے درخواست کی کہ ذرا ٹھہر جائیں ہمیں نماز ادا کر لینے دیں پھر باقی ماندہ لڑائی کریں گے۔" دشمن نے اس کی درخواست قبول کر لی۔
اس طرح مسلمانوں نے جلدی جلدی صفیں باندھیں اور نماز پڑھنے لگے۔ اتفاق سے جب صفیں باندھی جا رہی تھیں تو محمود اور ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے یہ بالکل لاشعوری طور پر ہوا ورنہ شاید ایسا نہ ہوتا۔
اب جبکہ وہ اپنی عبادت میں مشغول تھے۔ دشمن کو کسی نے بتایا کہ اگر مسلمان نماز پڑھ رہے ہوں تو بالکل بے جان اور موم کے پتلے ہوتے ہیں۔ اگر ان کو اس حالت میں قتل کر سکو تو ٹھیک ورنہ یہ تم سب کو مار دیں گے۔
دشمن نے موقع بہتر جانا اور شروع سے لے کر آخر تک سب کا صفایا کر دیا۔ یوں وہاں نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز۔"

عمرہ، اقرا۔ کراچی

ترکیب

نکاح کے وقت موجود گواہوں اور استغاثہ کے بیان سننے کے بعد جج نے کہا۔
"گواہوں کے بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملزم نے گزشتہ کئی سالوں سے اپنی بیوی پر ظلم روا رکھا اور اسے اپنا غلام بنا کر رکھا۔"
"جناب عالی! دراصل بات یہ ہے کہ" ملزم نے بات شروع کی۔
"مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم اپنی بیوی کو غلام بنانے میں کیسے کامیاب ہوئے؟" جج نے بات کاٹ کر کہا۔

عائشہ۔ گوجرہ

مہکتے پھول

- جب ہم کسی سے رشتہ جوڑتے ہیں تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ بعد میں وجہ ختم ہو جاتی ہے۔ رشتہ رہ جاتا ہے۔
- بعض لوگوں کی زندگی میں اگر غم بڑھ جائیں تو قہقہوں میں شدت آجاتی ہے۔ کبھی شعوری طور پر اور کبھی لاشعوری طور پر۔
- فاصلے بڑھ جائیں تو دلوں کے بندھن کمزور نہیں پڑتے۔ کبھی کبھی ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔
- انتظار مرتا نہیں، آنکھوں میں جم جاتا ہے۔ ہاں بس! آنکھیں مر جاتی ہیں۔
- اکثر محبتیں اس لیے ضائع ہو جاتی ہیں کہ ہم غلط انسان کو سونپ دیتے ہیں۔
- رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ خواہ وقتی ہی سہی۔
- میں نے دو طرح کے لوگوں سے دھوکا کھایا ہے۔ ایک وہ جو میرے اپنے نہیں تھے اور ایک وہ جو میرے بہت اپنے تھے۔

فوزیہ ثمر بٹ۔ ہانیہ عمران۔ گجرات

تربیت

ایک عورت نے اپنے طوطے کو بولنا سکھایا اور اسے ایسی تربیت دی کہ وہ عورت کے گھر کے مختلف کاموں کے سلسلے میں آنے والوں کے معاملات طے کرنے لگا۔
ایک دن کوڑے والا کوڑا لینے آیا۔ طوطے نے اس سے کہا۔
"ہمیں دس بوریاں دیں۔"
کوڑے والا اپنا کام ختم کر کے بولا۔
"تم ایک ذہین پرندے ہو، تب ہی بولنا سیکھ گئے۔" طوطے نے جواب دیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو لیکن مجھے گنتی بھی آتی ہے۔ دسویں بوری لے آؤ۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

نمک پارے،

- سننے میں آیا ہے کہ آج کل ایک درجن سے نامُدُ شعرا اپنی اپنی کلیات چھپوانے کی تگ و دو میں ہیں۔ کاش یہ شاعر پہلے جزئیات میں کمال حاصل کرلیں، صاحب کلیات ہونے کے لیے تو عمر پڑی ہے۔
- چند برس پہلے تک تو میرا خیال تھا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل روشن ہے مگر اب میں مایوس ہوچکا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں اردو کی کتابیں بہت زیادہ چھپنے لگی ہیں۔
- وہ ان نامی گرامی ادیبوں میں سے ہیں جو بیک وقت شاعر اور نقاد ہونے کے باوجود خاصے پڑھے لکھے ہیں لیکن منکسر المزاج اتنے ہیں کہ اپنی تحریروں سے اپنا علم کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

(مشفق خواجہ کے قلم کی کاٹ)

بے غیرتی،

ایک شخص نے بھکاری سے نرمی سے پوچھا کہ وہ پیشہ ور ہونے کے ناتے دن بھر میں کتنا کما لیتا ہے۔

"پانچ، چھ سو تو آرام سے مل جاتے ہیں۔"

فقیر نے جواب دیا۔ "لوگ یہ "معاف کرو بابا" والی بے غیرتی نہ کریں تو دیہاڑی ہزار روپے سے کسی طرح کم نہیں ہوسکتی۔"

ندا، فضہ۔ کراچی

کراچی،

ایک آدمی دوسرے آدمی سے۔ "یہ امن اور سکون کیا ہوتا ہے؟"

دوسرا آدمی۔ "پتا نہیں بھائی! میری تو پیدائش ہی کراچی کی ہے۔"

کبھی کبھی،

کبھی کبھی زندگی میں صحیح آدمی کا انتظار اسی طرح ہے جیسے ایرپورٹ پر کھڑے ہو کر ٹرین کا انتظار کیا جائے۔

نادیہ، طوبیٰ۔ گجرات

لفظ باتیں کرتے ہیں،

- ★ سناٹا جب روح میں اتر جائے تو رونقیں متاثر نہیں کرتیں۔
- ★ پیاس شدید ہو تو لہجے شیریں ہو جاتے ہیں۔ اکثر پیاس بجھ جانے پر رویوں میں فرق آجاتا ہے۔
- ★ لوگ اتنے بے اعتبار کبھی نہیں ہوتے جتنا ہم ان پر اپنی توقع کا بوجھ لاد دیتے ہیں۔
- ★ زندگی ہر شخص کو عزیز ہوتی ہے مگر بہادر انسان کو عزت، زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔
- ★ عمر بھی ضمیر اور جوتے کی مانند ہے جس کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ تکلیف نہ دینے لگے۔
- ★ سب معاملے تقدیر کے آگے سرنگوں ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی تدبیر کے نتیجے میں موت ہوجاتی ہے۔
- ★ مطالعے کی عادت ڈالنا ایک طرح سے تقریباً تمام دنیاوی غم و فکر سے نجات کے لیے اپنے واسطے ایک اہم پناہ گاہ تعمیر کرنا ہے۔
- ★ حسن سیرت برائیوں سے پرہیز کرنے کا نام نہیں بلکہ ذہن میں برائیوں کے ارتکاب کی خواہش نہ پیدا ہونے کا نام ہے۔

حرمت رداکرم۔ ڈلوال

یوں بھی ہوتا ہے،

استاد طالب علموں کو ابتدائی طبی امداد (فرسٹ ایڈ) پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دے کر کہنے لگے۔

"فرض کرو میں اسکول آرہا ہوں، باہر کوئی شخص مجھے مکا مار کر گرا دے، میرا سر کسی چیز سے ٹکرائے اور میں وہیں گر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟"

سب لڑکے خاموش رہے لیکن کلاس کے ایک کونے سے مدھم سی آواز آئی۔

"جناب! ہم چھٹی کرلیں گے۔"

تحریم۔ فیصل آباد

میری بیاض سے

خالدہ جیلانی

صدف محبوب ———— سرگودھا

گھر موم کا پہلے تو بنایا نہیں جاتا
بن جائے تو سورج سے بچایا نہیں جاتا
اب تم ہو مقابل تو مجھے ہارنا ہو گا
تم کو تو میری جان ہرایا نہیں جاتا

ندرتاشیہ شیرازی ———— جڑانوالہ

گرا ہے تو کئی ٹکڑوں میں وہ بکھر اپڑا ہو گا
تمہارے تم سے ہاتھوں میں جو شیشے کا کھلونا تھا
نہ جانے وقت نے کیوں فاصلے یہ دے دیے ورنہ
تم ہی تو میرے جیسے تھے، تم ہی کو میرا ہونا تھا

سادہ نوید ———— کراچی

بڑھ کے خریدے کوئی ایسا بھی ہے یہاں
میرے تمام خواب برائے فروخت ہیں

ماہا انعام ———— کراچی

پھر میری وہی طلب
اب کے برس مل جائے تو

شگفتہ اعجاز ———— کراچی

الجھے ہوئے ہیں گردش دوراں میں آج کل
تم یہ نہ سمجھنا کہ تعلق نہیں رہا

فارحہ اقبال ———— کراچی

آسان نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ ان کے کام ہیں جو زندگی برباد کرتے ہیں

سمیرا اقبال ———— کراچی

وسعت دشت ہجر دیکھ کے ڈر جاتا ہوں
تجھ سے آگے کا سفر دیکھ کے ڈر جاتا ہوں
روز ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح شام گئے
میں بھی ایک درد کے دریا میں اتر جاتا ہوں

مسرت الطاف احمد ———— کراچی

اب عمر نہ وہ رستے نہ وہ موسم کہ پلٹے
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی
ہم جان سے جائیں گے تب ہی بات بنے گی
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

حمیرا سعد رمالی ———— پیراں غائب

مجھے اپنا تو کیا آج تیرا غم بھی نہیں
یہ سانحہ جو نہیں ہے بہت تو کم بھی نہیں
وہ جن کو ہوش نہیں ہے انہیں خبر کر دو
کہ اپنی ذات میں مدت ہوئی ہے ہم بھی نہیں

ایمن فاطمہ ———— گوجرانوالہ

بچھڑتے وقت کسی سے ہمیں تھا یہی گماں
کہ زخم کیسا بھی ہو، عمر بھر نہیں رہتا

نگینہ شہباز ———— لاہور

جو میرا نصیب تھا مل گیا، جو چھنا ہے مجھ سے میرا نہ تھا
تیرا دل یہ رمز سمجھ گیا تو کوئی کمی نہ رلائے گی

حرا شاہ ———— شجاع آباد

میری آنکھوں میں ایک مدت سے
قافلے رتجگوں کے ٹھہرے ہیں

حنا کنول ———— حویلی لکھا

جس کی نظروں میں ہم نہیں اچھے
کچھ تو وہ شخص بھی برا ہو گا

حنا رئیس ———— لاہور

دل کے گہرے سناٹے میں راتوں کو
کبھی کبھی اک کرک ابھرتی دیکھی ہے
بس اک جینے کی خواہش تھی اور وہ بھی
ہم نے اپنی آنکھوں مرتی دیکھی ہے

شمیم شمشاد احمد ________ شکار پور

بارے میں اس کے سوچیں بھی تو کیا سوچیں قتیل
وہ غیر نہیں تو اپنا بھی نہیں لگتا

رافیہ بلوچ ________ گھوٹکی

یہ ضبط چھوٹ گیا تو تمہاری یاد آئی
میں تھک کے ٹوٹ گیا تو تمہاری یاد آئی
تمہارے بعد نہ تھا کوئی مرا دل کے سوا
یہ دل بھی روٹھ گیا تو تمہاری یاد آئی

ثمرہ، اقراء ________ کراچی

بتاؤ دل کی بازی میں بھلا کیا بات گہری تھی
کہا، یوں تو سب ہی کچھ ٹھیک تھا مگر بات گہری تھی
سنو بارش! کبھی خود سے بھی کوئی بڑھ کے دیکھا ہے
جواب آیا، ان آنکھوں کی مگر برسات گہری تھی

فوزیہ سعید ________ کراچی

بچپن کے ہیں خواب سہانے تتلی، پھول اور میں
کہاں سے لائیں اب وہ زمانے تتلی، پھول اور میں
دردرُتوں کی خوشبو سا نجی ایک ہی جیسا روگ
ڈھونڈ رہے ہیں ساتھ پرانے تتلی، پھول اور میں

کومل عدنان ________ گلستان جوہر

کیا کہوں کہ وہ گُل ہے کہ شبنم، غزل ہے کہ غزال
تم نے دیکھا ہی نہیں اس کا سراپا یارو

طاہرہ ملک ________ پسرور

ایک تغافل سے ایک توجہ تک
عشق آنسو بھی ہے تبسم بھی

نادیہ چودھری ________ شاہ تگدر

سر پہ سایہ سا دست دُعا یاد ہے
اپنے آنگن میں ایک پیڑ تھا یاد ہے
ایسا لگتا ہے ہر امتحان کے لیے
زندگی کو ہمارا پتا یاد ہے

شازیہ رانا ________ پاکپتن شریف

نگاہ یار کے پردوں میں ہے پنہاں ادا کیسی
ستم کیسا، کرم کیسا، جفا کیسی، وفا کیسی
سُنے گا کون اب مجھ سے تیرے بہروپ کے قصے
مجھے بھی مار کے کر دی کرم کی انتہا کیسی

آمنہ اُجالا ________ ڈہرکی

بعض مخلص بھی نظر میں نہ جچے اے دانش
پائے وہ کثرت سے اپنوں میں پرائے ہم نے

حنا سلیم اعوان ________ گاؤں آخون باندی

مل بھی جاتے ہیں تو کترا کے گزر جاتے ہیں
ہائے موسم کی طرح دوست بھی بدل جاتے ہیں
ہم ابھی تک ہیں گرفتار محبت یارو
ٹھوکریں کھا کے تو سنا تھا لوگ بدل جاتے ہیں

شمع مسکان ________ جام پور

ہاتھ دیا اس نے میرے ہاتھ میں
میں تو ولی بن گیا ایک رات میں
عشق بُری شے سہی پر دوستو
دخل نہ دو تم، میری ہر بات میں

ایمن فاطمہ ________ گوجرانوالہ

ان کو ناموس بھی عزت بھی، پذیرائی بھی
مجھ کو رونے کو میسر نہیں تنہائی بھی
اپنے ہی حال پہ ہنسنا، کبھی ہنس کے رونا
میں بہ یک وقت تماشا بھی، تماشائی بھی

حرا شاہ ________ شجاع آباد

سوچا کیے کہ ٹوٹ نہ جائے کسی کا دل
گزری ہے اپنی عمر، اسی دیکھ بھال میں
خالد وہ بات تو اسے یاد بھی نہیں
ہم جی کو خوں کر گئے جس کے ملال میں

اعتذار

اپریل کے شمارے میں آپ کی پسندیدہ مصنفہ فرحت اشتیاق کا انٹرویو شائع ہوا تھا سہواً" ان کی تاریخ پیدائش غلط لکھی گئی فرحت اشتیاق کی سالگرہ 23 جون کو ہے۔
ہماری طرف سے بہن فرحت اشتیاق کو مبارک باد اور دعائیں۔

امت الصبور

خواتین کی ڈائری

شبنم شمشاد — کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ چھوٹی سی نظم زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں سے روشناس کرتی ہے۔

وقت کی عدالت میں
زندگی کی صورت میں
یہ جو میرے ہاتھوں میں
ایک سوالنامہ ہے
کس نے یہ بنایا ہے؟
کس لیے بنایا ہے؟
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟
زندگی کے پرچے کے
سب سوال لازم ہیں
سب سوال مشکل ہیں۔

فرحین ناز طارق — کی ڈائری سے

محبت انسانی زندگی کا ایک ایسا ناقابل فراموش پہلو ہے جو حقیقت اور خواب کا نہایت خوبصورت امتزاج ہے۔ اگر اس دُنیا میں محبت نہ ہو تو یہ دُنیا ایک پل بھی نہ ٹھہر پائے۔ چاہتوں اور آس و امید سے سجی سائرہ انور کی یہ غزل آپ کی نذر۔

وہ آسمان کو گواہ کہہ کر مکر گیا تھا
کہ اس کی چاہتوں کا چڑھا دریا اتر گیا تھا

تراشتا تھا جو پتھروں کو عقیدتوں سے
وہ شخص خود آج ریزہ ریزہ بکھر گیا تھا

اب آنے والے تمام موسم ہیں فرقتوں کے
کہ اپنے حصے کا زرد موسم گزر گیا تھا

عجیب سنسان راستے تھے، کھنڈر پڑے تھے
یہ چاند کیسی دعائیں لے کے اُدھر گیا تھا

محبتوں کا دھنی بہت تھا مزاج اس کا
کہ اس سے مل کر میرا مقدر سنور گیا تھا

اُتر رہا تھا کوئی صحیفہ کیا اس زمیں پر
کہ اک تارہ سا آسمان پر ٹھہر گیا تھا

صائمہ گل — کی ڈائری سے

عورت گھر بنانے کے لیے ساری عمر دُکھ سہتی ہے
ماں بنتی ہے تو چاہتی ہے کہ بیٹیوں کو اس کا مقدر نہ ملے لیکن یہ ورثہ منتقل ہوتا رہتا ہے
بیٹیاں بھی تو ماؤں جیسی ہوتی ہیں
ضبط کے زرد آنچل میں اپنے سارے دُکھ چھپا لیتی ہیں
روتے روتے ہنس پڑتی ہیں
ہنستے ہنستے دل ہی دل میں رو لیتی ہیں
خوشی کی خواہش کرتے کرتے
خواب اور خاک میں اَٹ جاتی ہیں
گھر کے دروازے پر بیٹھی امیدوں کے ریشم بنتے ساری عمر گنوا دیتی ہیں
میں....
جو گئے دِنوں میں ماں کی خوش فہمی پر ہنس دیتی

اب خود بھی عمر کی گرتی دیوار سے ٹیک لگائے
فصل خوشی کی بوتی ہوں اور خوش فہمی کاٹ رہی ہوں
جانے کیسی رسم ہے زمانے کی کہ
ہر ماں ورثے میں بیٹی کو
اپنا مقدر دیتی ہے!

عروج انجم کی ڈائری سے

دوستوں سے بچھڑ جانے کے بعد مجھے لگتا ہے
یہ غزل میرے دل کی آواز ہے۔

دل میں وفا کی ہے طلب، لب پہ سوال بھی نہیں
ہم ہیں حصارِ درد میں اس کو خیال بھی نہیں

اتنا ہے اس سے رابطہ چھاؤں سے جتنا دھوپ کا
گر یہ نہیں ہے ہجر تو پھر یہ وصال بھی نہیں

وہ جو انا پرست ہے، میں بھی وفا پرست ہوں
اس کی مثال بھی نہیں، میری مثال بھی نہیں

اس کو زبان دے چکے، دل کا جہان دے چکے
عہدِ وفا کو توڑ دیں، اپنی مجال بھی نہیں

اُس سے کہو کہ دو گھڑی ہم سے وہ آملے کبھی
مانا کہ یہ محال ہے پر اتنا محال بھی نہیں

سحر خان کی ڈائری سے

سلیم کوثر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، سو ان کی کتاب "ذرا موسم بدلنے دو" سے ایک خوبصورت انتخاب آپ سب کے نام۔

اب کیا کہیں کہ تم سے محبت ہی اور ہے
لیکن درونِ دل تو روایت ہی اور ہے

جو شکل آئینے نے دکھائی، کچھ اور تھی
جو یاد ہے مجھے، وہ شباہت ہی اور ہے

سر پر عبادِ کوئے ملامت سہی مگر
اہلِ سفر کو اب کے بشارت ہی اور ہے

وہ چشم مہربان تو بہت ہے، پر ان دنوں
ہم گشتگانِ عشق کو وحشت ہی اور ہے

تم نے تو کشتیوں کو جلایا ہے اور بس
لیکن جو ہم نے کی ہے وہ ہجرت ہی اور ہے

ممکن ہے تیرے حق میں نہ ہو فیصلہ کوئی
یہ دل ہے اور دل کی عدالت ہی اور ہے

راتوں کے جاگنے پہ نہیں منحصر سلیم
شہرِ ہنر میں کارِ مشقت ہی اور ہے

نوشین اقبال نوشی کی ڈائری سے

میری ڈائری میں محفوظ منور جمیل کی یہ نظم ان لوگوں کی یاد دلاتی ہے جو سراب لمحوں کی نذر ہوگئے۔

کتنا سہل جانا تھا
خوشبوؤں کو چھو لینا
شام کا ہر اک منظر گھر میں قید کر لینا
روشنی ستاروں کی مٹھیوں میں بھر لینا
جگنوؤں کی باتوں سے
پھول جیسے آنگن میں روشنی سی بھر لینا
اے نظر کی خوش فہمی!
اس طرح نہیں ہوتا۔

آپ کا باورچی خانہ

صبا سحر

صدف آصف...... کراچی

(1) کھانا پکانا بھی ایک "فن" ہے۔ جی.... اردو والا نہیں، انگلش والا فن۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مجھے کھانا پکانے میں بہت مزا آتا ہے۔ میں کھانا پکاتے وقت کھانے والے کی عمر اور پسند کے حساب سے مینو ترتیب دیتی ہوں۔ اگر میں اپنی ساس، سسر کے لیے کھانا پکا رہی ہوتی ہوں تو ان کی پسندیدہ سبزیوں کا استعمال زیادہ کرتی ہوں، اس کے علاوہ بکرے کے گوشت میں لوکی یا ٹنڈے ڈال کر پکاتی ہوں۔ گوشت اتنا گلا لیتی ہوں کہ ان کو چبانے میں مشکل نہ ہو۔ اسی طرح اگر بچوں کے لیے کوئی ڈش بناتی ہوں تو ایسی چیزوں کا استعمال کرتی ہوں، جس سے وہ کھانے کی طرف فوراً" مائل ہو جائیں، جیسے کسٹرڈ کو رنگ برنگی جیلی، ٹنی اور چاکلیٹ سیرپ سے سجاتی ہوں۔ ہماری جوائنٹ فیملی ہے، سو ہم سب جب مل کر کھانا کھاتے ہیں تو میرے بنائے ہوئے پکوان کی تعریف ہوتی ہے۔

(2) ہمارے یہاں مہمان بغیر اطلاع کے نہیں آتے اور نہ ہی ہم کسی کے یہاں بغیر فون کیے جاتے ہیں، اس طرح سے سب کو آسانی رہتی ہے۔ اگر کسی کا کہیں اور کا پروگرام ہوتا ہے تو وہ ایک دوسرے کو بتا دیتا ہے پھر ملنا ملانا کسی اور دن پر رکھ لیا جاتا ہے۔ ویسے بھی میری نندیں ویک اینڈ پر ہی آتی ہیں کیوں کہ وہ خود بہت مصروف رہتی ہیں۔

ایک بہت جلد تیار ہونے والی ڈش، جو کھانے میں بہت مزے دار ہوتی ہے اور کافی کم وقت میں تیار ہو جاتی ہے۔

ہرے مسالے کی بریانی

اجزا:

باسمتی چاول	ایک کلو
پیاز	ایک عدد
لہسن ادرک کا پیسٹ	دو چائے کے چمچے
دہی	آدھا کلو
نمک	حسب پسند
چکن	ایک کلو (درمیانی بوٹیاں)
ہرا دھنیا	دو گٹھی
پودینہ	دو گٹھی
چھوٹی ہری مرچ	5-6 عدد
آئل	ایک پیالی

سارا ہرا مسالا صاف کر کے دہی میں ڈال کر بغیر پانی کے چٹنی کی طرح گاڑھا سا گرائنڈ کر لیں۔ آئل میں پیاز لال کر کے نکال لیں۔ اب چکن ہلکا سا اسی آئل میں فرائی کر لیں، پھر اس میں نمک اور لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر ایک دو بار چمچ چلائیں، پھر اس میں پسا ہوا ہرا مسالے والا دہی شامل کر دیں۔ آنچ درمیانی رکھیے گا تاکہ چکن ٹوٹے نہیں۔ پانی خشک ہونے پر اچھی طرح بھون لیں۔

چاول میں نمک، دو چھوٹی الائچی اور ایک بادیان کا پھول ڈال کر ایک کنی پر ابال کر چھان لیں۔ اب ایک تہہ ہرے مسالے کی اور ایک چاول کی لگائیں۔ آخر میں زردے کا رنگ دودھ میں گھول کر اور فرائی پیاز اوپر سے پھیلا دیں۔ تھوڑے سے آئل میں ایک دار چینی اور ایک بڑی الائچی کڑکڑا کر چاولوں پر بگھار لگا کر دم پر رکھ دیں۔ منفرد اور مزیدار بریانی تیار ہے۔

(3) ویسے یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ ہم مزے مزے کے کھانے پکا کر مہمانوں کے سامنے رکھیں مگر جب وہ کسی کام سے ہمارے باورچی خانے میں جائیں تو ہچکچائیں کہ اتنے گندے باورچی خانے میں یہ کھانے

پکائے گئے ہیں۔ ہمارے پورے سسرال میں یہ اصول ہے کہ ناشتے، لنچ اور ڈنر کے بعد کچن کو صاف ستھرا کر کے کام ختم کیا جاتا ہے۔ اسی لیے میں بھی تینوں ٹائم کھانا بنانے کے بعد کاؤنٹر پر گیلا کپڑا مارتی ہوں اور کوکنگ رینج بھی صحیح سے صاف کرتی ہوں۔ ورنہ کچن میں میل کی تہیں جم جائیں گی۔ دراصل روٹی پکانے کے بعد خشکی چولہوں پر جمنا شروع ہو جاتی ہے۔ اگر اسی وقت صاف کرلی جائے تو آپ کا اوون چمکتا دمکتا رہے گا۔

(4) : ہمارے یہاں عام طور پر ناشتا ہلکا کیا جاتا ہے مگر اتوار کے دن ہفتے بھر کی پوری کسر نکالی جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی چیز اہتمام سے پکائی جاتی ہے۔ جیسے آلو کی بھجیا، سوجی کا حلوہ یا فیرنی وغیرہ۔

ہمارے یہاں سب بہت شوق سے ناشتے میں گجریلا کھاتے ہیں۔

گجریلا

اجزا :

دودھ	ایک کلو
چینی	حسب پسند
چھوٹی الائچی	2-3 عدد
گاجر (کش یا چوپ کی ہوئی)	ایک پیالی
چاول (بھگو کر ہاتھ سے ہلکا سا پیس لیں)	آدھی پیالی

ترکیب :

دودھ کو الائچی ڈال کر ابال لیں۔ اب چاول ڈال کر دھیمی آنچ پر پکنے دیں۔ جب چاول آدھے گل جائیں تو گاجر ڈال کر پکنے چھوڑ دیں۔ جب گاجر صحیح سے پک جائے اور گجریلا تھوڑا گاڑھا ہو جائے تو اس میں چینی شامل کردیں۔ اب اسے پھر پکنے دیں۔ جب وہ کھیر کی طرح گاڑھا ہو جائے تو چمچے یا دال گھوٹنے والے سے ایک بار صحیح سے گھوٹ لیں۔ اوپر سے میوہ کتر کر ڈال دیں۔ ناشتے میں پوری یا پراٹھے کے ساتھ بہت مزا دیتا ہے۔ اس کے بنانے میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ آپ اسے رات کو بنا کر فریج میں رکھ دیں اور صبح ناشتے کے لیے نکال لیں۔

(5) ہم لوگ مہینے میں ایک بار باہر کھانا کھانے ضرور جاتے ہیں۔ میری بیٹی آؤٹنگ سے بہت خوش ہوتی ہے۔ میں اور میرے میاں کھانے کے شوقین ہیں، اس لیے مہینے میں ایک دفعہ باہر کھانا کھانے ضرور جاتے ہیں۔ اس طرح ہمیں لگتا ہے روٹین لائف میں کچھ چینج آیا ہے۔

(6) موسم کے لحاظ سے ہمارے یہاں کچھ نہ کچھ ضرور بنتا ہے۔ جیسے سردیوں میں مختلف قسم کے سوپ اور گرمیوں میں شیکس یا کولڈ کافی وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں میٹھا بہت شوق سے کھایا جاتا ہے تو حلوے بھی بنائے جاتے ہیں۔

(7) کھانا بناتے ہوئے اس بات کا خیال رکھیں کہ اشیا کا ضیاع نہ ہو، کیونکہ اگر ہم سلیقہ مندی سے بغیر ضائع کیے ہوئے کھانا پکائیں گے تو ہمارے کھانے میں برکت قائم رہے گی۔ میں تو چھوٹی چھوٹی بچی ہوئی اشیا سے نئے کھانے پکا لیتی ہوں۔ جیسے اگر میں لوکی گوشت بناتی ہوں۔ تو جب سالن بچ جاتا ہے تو کسی اور دن اس میں چنے کی دال شامل کر کے پکا لیتی ہوں۔ مزے دار لوکی چنے کی دال پک جاتی ہے۔ اوپر سے تازہ پودینہ ڈال کر کڑی پتے کا بگھار لگا دیتی ہوں۔ کوئی جان بھی نہیں پاتا کہ یہ دال باسی سالن سے بنائی گئی ہے۔

(8) کھانا پکاتے ہوئے ایک بار درود شریف ضرور پڑھیں، بسم اللہ پڑھ کر کھانا سرو کریں۔ ان شاء اللہ کھانا کبھی کم نہیں پڑے گا۔ صفائی نصف ایمان ہے، اس لیے اس بات کا خصوصی خیال رکھیں کہ کھانا پکاتے ہوئے ہاتھ، برتن اور اشیا دھلے ہوئے ہوں۔ میری امی کہتی ہیں کہ "عورت کی سلیقہ مندی یہ نہیں کہ اس نے دیگیں اتارلیں، اس کے سگھڑ ہونے کا پتا اس بات سے چلتا ہے کہ وہ کھانا پکا کر جب کچن سے نکلے تو وہ صاف ستھرا اور سمٹا ہوا ہو۔"

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

پاستا

اجزا :

چکن بریسٹ	2عدد
پاستا	1کپ
پیاز	1عدد
ٹماٹر	4عدد
لیموں کا رس	2کھانے کے چمچے
لہسن پیسٹ	1چائے کا چمچہ
دھنیا	آدھی گٹھی
پسی کالی مرچ	حسب ذائقہ
چینی	1چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
زیتون کا تیل	4کھانے کے چمچے

ترکیب :

نمک ملے پانی میں فیتوسینی پاستا ابال کر چھان لیں اور ایک طرف رکھ دیں۔ بغیر ہڈی کے چکن بریسٹ پیس دھو کر خشک کریں۔ ایک پیالے میں لیموں کا رس، لہسن پیسٹ، دو چمچے زیتون کا تیل اور دھنیا پیس کر باریک اور نرم آمیزہ بنالیں، پھر اس میں نمک اور پسی کالی مرچ شامل کرکے چکن پیس پر لگائیں اور ہلکے سے تیل میں ہلکا سنہری تل کر الگ رکھ دیں۔

فرائنگ پان میں تیل گرم کرکے پیاز تلیں، پھر اس میں ٹماٹر، چینی، نمک اور دو چمچے زیتون کا تیل ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ گاڑھا آمیزہ بن جائے تو چولہا بند کر دیں۔ ڈش میں اٹالین طرز پر فرائی کیے ہوئے چکن پیس رکھ کر اطراف میں پاستا ڈال دیں اور آخر میں ٹماٹر والا آمیزہ ڈال دیں۔ مزے دار اٹالین چکن، فیتوسینی پاستا کے ساتھ تیار ہے۔

آلو کے نرگسی کوفتے

اجزا :

آلو	1کلو
انڈے	5عدد
دہی	آدھا کپ
پیاز بڑی	1عدد
لہسن ادرک پیسٹ	2چائے کے چمچے
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری مرچ	4عدد
ڈبل روٹی کا چورا	ایک
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
ہلدی	1چوتھائی چائے کا چمچہ
زیرہ	1چائے کا چمچہ
پسا ناریل	1کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب :

آلو ابال لیں اور مسل کر بھرتہ بنالیں، پھر اس میں پسا ناریل، ہرا دھنیا، ہری مرچ، آدھا چمچہ زیرہ کوٹ کر، دو انڈوں کی زردی اور نمک ملا کر مکس کرلیں۔ سفیدی کو الگ پھینٹ کر رکھ لیں۔ باقی تین انڈوں کو ابال کر چھیل لیں۔ آلو کا آمیزہ انڈوں پر چڑھا کر سفیدی میں ڈبوئیں، پھر ڈبل روٹی کے چورے میں تہہ لگا کر گرم تیل میں تلیں اور ٹشو پیپر پر نکال کر رکھ لیں۔

پتیلی میں تیل گرم کرکے پیاز کو ہلکا سنہری کرلیں۔ لہسن ادرک پیسٹ، مرچ، ہلدی، دہی، زیرہ اور نمک ڈال کر بھونیں۔ شوربے کے لیے حسب ضرورت پانی شامل کریں اور دس منٹ کے لیے ڈھکن بند کرکے ہلکی آنچ پر روغن آنے تک پکنے دیں۔

ڈش میں گریوی نکالیں اور کوفتے کاٹ کر رکھیں۔ بقیہ شوربہ اس کے اوپر ڈال دیں۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچ کتر کر چھڑک دیں۔

لبی

اجزا :

انڈے	2عدد
میدہ	1کپ
چینی	3کپ
نمک	حسب ذائقہ
مکھن	1کھانے کا چمچہ
لیموں	1عدد
چھوٹی الائچی	4عدد
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

فرائنگ پان میں مکھن گرم کرکے اس میں میدہ ڈال کر بھون لیں۔ ہلکا گلابی ہو جائے تو ایک کپ گرم پانی اور نمک ڈال کر چمچہ چلائیں۔ میدہ اچھی طرح یکجان ہو کر نرم سا آمیزہ بن جائے تو چولہے سے اتار کر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں، پھر اس میں انڈے ڈال کر لکڑی کے چمچے سے مکس کریں۔ چینی میں ایک کپ پانی ملا کر ایک تار کی چاشنی بنالیں۔ اس میں لیموں کا رس اور الائچی کے دانے ڈالیں اور ایک سائز کی بالز بنا کر تل لیں، پھر اسے چاشنی میں ڈال کر ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ چاندی کے ورق لگا کر لبیا کی مزے دار سوئٹ ڈش پیش کریں۔

آم کی لسی

اجزا :

بڑے آم	4عدد
دہی	1پاؤ
دودھ	1پاؤ
چینی	آدھا کپ
نمک	1چٹکی
پودینہ	چند پتے

ترکیب :

آم چھیل کر ٹکڑے کاٹ لیں۔ گٹھلیاں نکال دیں۔ بلینڈر میں آم، دودھ، دہی، چینی اور نمک ڈال کر بلینڈ کرلیں۔ برف ڈال کر ایک بار پھر بلینڈ کریں۔ گلاس میں نکالنے کے بعد پودینے کے پتوں سے سجاوٹ کرکے پیش کریں۔

خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

سعدیہ سعید 'سمبڑیال

1۔ میرا نام سعدیہ سعید ہے۔ ایم اے اسلامیات' بی ایڈ کرچکی ہوں۔ اُف کتنا مشکل ہوتا ہے اس طرح سے اپنا تعارف کروانا کہ مجھ سے ملیے میں فلاں ہوں۔ میں یہ ہوں اور ہاں میں وہ بھی ہوں۔ میرے نزدیک انسان کے اخلاق اور اس کی عادات کی اس کے تعارف کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ رہ گیا نام تو مت پوچھیں لوگوں کو اس قدر پسند ہے کہ ملک میں زیادہ تر اسی نام کی پیداوار زور و شور سے ہورہی ہے۔ یقین نہ آئے تو تمام رسالوں کی مصنفین کے نام گن لیں۔ اکثریت کے ناموں کے ساتھ سعدیہ کا نام جڑا ہوگا' رہ گئی تاریخ پیدائش' تو اس دن میری سالگرہ کی خوشی میں پاکستان کے تمام اسکولوں میں تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ میرے پیدا ہونے کی خوشی میں تمام ٹیچرز مٹھائی کھاتی ہیں۔ تمام بچوں میں کپ بانٹے جاتے ہیں۔ جی ہاں! آپ کا جواب درست ہوا۔ اور جن کو سمجھ نہیں آئی ان کو بتاتے چلیں 31 مارچ' عالمگیر رزلٹ کا دن۔ شکر ہے کہ Ist اپریل کو پیدا نہیں ہوئی ورنہ..... (تمام پڑھنے والے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق خالی جگہ پر کرلیں۔) مشاغل میں پڑھنا' پڑھنا' لکھنے کی ٹوٹی پھوٹی کوشش کرنا۔ پڑھنے کا اتنا شوق ہے کہ سفر کرتے ہوئے راستے میں آنے والے بورڈ تک پڑھتی ہوں۔

2۔ خوبیاں۔ اس مشکل مرحلے سے نپٹنے کے لیے ایک جیوری تشکیل دی گئی۔ جس کے نمایاں ممبران گھر کے افراد تھے۔ تمام افراد سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ کافی غور و خوض کے بعد ایک مسودہ تشکیل دیا گیا۔ جس کے نمایاں نکات یہ تھے۔

"ہم تم میں خوبیاں ڈھونڈنے کے معاملے میں خود کو بے بس پاتے ہیں۔"

جب یہ ترکیب ناکام ہوئی تو تمام افراد سے "فردا" فردا" سروے کرایا گیا۔ سب سے پہلے اماں جان سے پوچھا گیا تو وہ بولیں "تم میری سب سے اچھی بیٹی ہو" ہم فخر و غرور سے باقیوں کو دیکھنے لگے۔ بہن (نازیہ طارق) سے خوشی برداشت نہیں ہوئی فورا" بولی۔

"اماں جان جانتی ہیں نا کہ ہم دونوں کی شادی کے بعد ابھی انہیں تمہارے ساتھ ہی رہنا ہے۔ اگر تمہاری جھوٹی تعریف نہ کریں تو رات کو ان کی ٹانگیں کو کون دبائے گا؟

اسی لیے یہ خطرہ مول نہیں لے رہیں۔"

اب آنکھوں میں اشتیاق کا جہان لیے بھائی کی جانب متوجہ ہوئے تو وہ فورا" بولے۔

"خوبیاں' نہیں خامیاں کہو تو جھٹ گنوا سکتا ہوں۔ بلکہ ایک عدد کتاب تخلیق کرسکتا ہوں۔ ویسے بھی تم خود بھی جانتی ہو کہ تمہارے اندر کون سی اچھی عادت ہیں کون سی بری عادتیں ہیں تو خود انہیں ڈھونڈو۔"

تو جناب میری سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ مجھے بہت جلدی غصہ آتا ہے۔ لیکن اتنی ہی جلدی اتر بھی جاتا ہے۔ تھوڑی سی جذباتی ہوں۔ (کیا جذبات کا ہونا بری بات ہے) اور سب سے اچھی عادت یہ ہے کہ میں کسی بھی بات کو سر پر سوار نہیں کرتی۔ جو ہوگیا سو ہوگیا جو پلٹ نہیں سکتا جو بدل نہیں سکتا' اس کے بارے میں سوچنا اور پریشان ہونے کا کیا فائدہ' حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں میں خود کو ہمیشہ خدا کی رحمت اور فضل کے سائے میں محسوس کرتی ہوں۔ اگر آپ بھی ایسا سوچتے ہیں تو آپ سے زیادہ خوش اور پُرسکون کوئی نہیں ہے۔

3۔ چونکہ میری سالگرہ مارچ کے مہینے میں ہوتی ہے۔ اس لیے دونوں شادی شدہ بہنیں اپنی ہوم پروڈکشن (بچوں) کے ساتھ آجاتی ہیں۔ بقول میرے "فوجیں حملہ آور ہوگئی ہیں۔" میں اپنے بھانجے اور پیاری پیاری بھانجیوں کے ساتھ سالگرہ مناتی ہوں۔ اس طرح سے کہ چھری کا صرف ایک کونا میں نے تھاما ہوتا ہے۔ باقی پوری چھری پر بچوں کا قبضہ ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو سب باری باری کیک کاٹتے ہیں اسی طرح سے کہ بے چارہ نازک کیک چلا اٹھتا ہے۔ "بس اب اور نہیں" کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ میری سالگرہ بھول جائے۔ اس لیے کہ میں آج تک کسی کی سالگرہ نہیں بھولی۔ میرے نزدیک آپ کی سالگرہ آپ کے نہیں بلکہ لوگوں کے یاد رکھنے کی چیز ہے۔ آپ کی سالگرہ کا دن آپ کو یاد رہے یا نہ رہے۔ دوسروں کو ضرور یاد رہنا چاہیے۔ اسی سے تو پتہ چلے گا کہ دوسروں کے لیے یہ دن اور آپ کی ذات کتنی اہمیت کی حامل ہے۔

4۔ بے شمار ایسی کئی تحریریں ہیں جنہیں تحریر کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ میں تقریبا" پندرہ سال کی تھی جب سے ان تحریروں کو پڑھ رہی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہونا تھیں۔ اس روز میں اپنا بیگ لے کر اسکول گئی اور واپسی پر بیگ میں کتابوں کے بجائے شعاع اور خواتین کے رسالے تھے۔ اور کتابیں شمار میں تھیں۔ میں ایک بار جو کہانی پڑھ لوں' سالوں بعد بھی وہ کہانی مجھے پوری پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ صرف اس کا شروع کا حصہ پڑھنے کے بعد ہی مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کہانی میں پڑھ چکی ہوں۔ جس طرح ہر دن اپنے اندر ایک نیا پن رکھتا ہے۔ ہر دن سورج ایک نئی تبدیلی لے کر طلوع ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر تحریر اپنے اندر ایک پیغام رکھتی ہے۔ لیکن ہماری زندگی میں کچھ ایسے دن بھی ہوتے ہیں جو اپنے واقعات کی وجہ سے ہماری زندگی میں خصوصی اہمیت کی حامل ہوتے ہی اور ہمارے لیے یادگار بن جاتے ہیں۔

اسی طرح کچھ تحریریں بھی یادگار اور انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں' چاہے وہ عمیرہ آپا کی پیر کامل ہو۔ یا پھر "سورج کی سلطنت" ہو۔ "رقص جنوں"۔ "مجھے سمندر پار اتار دو" "محبت معجزہ ہے" "ساحلوں کے گیت" "من و سلویٰ" "ایمان امید اور محبت" وغیرہ۔

5۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بطور ماہر نفسیات (صدارتی ایوارڈ یافتہ) سعدیہ غزنوی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد دنیا بھر کے سارے ماہر نفسیات' بڑے بڑے فلاسفی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کاسۂ گدائی تھامے نظر آتے ہیں۔ نفسیات کی وہ گتھیاں جنہیں سلجھانے میں آپ کی زندگی الجھ جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان مسائل کو انتہائی خوبصورت سے حل کیا ہے کہ اگر آپ کے بتائے ہوئے رستے پر چلیں تو زندگی بھر آپ کسی بھی نفسیاتی مسئلے کا شکار نہیں ہوسکتے۔ اس بار نیا سوٹ خریدنے کی بجائے اس کتاب کو خرید لیں اور اپنی زندگی کو اس نئے رخ سے بھی روشناس کرائیں۔

6۔ میری بڑی بہن (شازیہ مبشر) کو شاعری کرنے کا بے حد شوق شادی سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ اور وہ اکثر لولی لنگڑی نظمیں' غزل اور شعر لکھا کرتی تھیں۔ میری ڈائری میں ان کا لکھا ہوا (خیال رہے زبردستی لکھا ہوا۔) شعر مجھے پسند ہے۔

بھری محفل میں اس نے کہہ دیا "میں جانتا نہیں"
کتنے زعم سے میں کہنے والی تھی "میری پہچان ہے یہ"

"متاعِ جاں ہے تُو" کا عبّاد

باتیں عدیل حسین سے

شاہین رشید

1 اصلی نام؟
سید عدیل حسین۔

2 "پیار کا نام؟"
"کوئی نک نیم نہیں ہے۔"

3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"30 جون 1978ء / کراچی۔"

4 "اسٹار / قد؟"
"کینسر / 5 فٹ ساڑھے 9 انچ۔"

5 "تعلیمی قابلیت؟"
"بیچلر۔ ایم آئی ایس اور ایم بی اے مارکیٹنگ اور یہ دونوں ڈگریاں آئرلینڈ سے حاصل کیں۔"

6 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"میں اور میرا چھوٹا بھائی تو نمبر پہلا ہی ہوا۔"

7 "شادی؟"
"نہیں جی شادی نہیں ہوئی۔"

8 "اس فیلڈ میں متعارف کرانے کا سہرا؟"
"میں اپنی محنت سے آیا ہوں۔"

9 "وہ پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟"
"دام" سیریل۔"

10 "پہلی کمائی / کیا کیا تھا؟"
"10 ہزار تھی اور خرچ کر دیا تھا۔"

11 "سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں؟"
"کوئی ایسا دن نہیں ہے۔ ہر دن کو انجوائے کرتا ہوں۔"

12 "کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟"
"نہیں کبھی نہیں۔"

13 "کس شہر میں گھر بنانے کی خواہش ہے اپنے ملک میں؟"
"اس کے بارے میں سوچتا نہیں کیونکہ کام آپ کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔"

14 "کس ملک میں رہائش کی خواہش ہے؟"
"ایسی کوئی خاص خواہش نہیں ہے۔ لیکن مجھے یورپ بہت پسند ہے۔"

15 "کوئی تحفہ جسے پا کر بہت خوشی ہوئی ہو؟"
"میرے ایک دوست نے مجھے clapper دیا ہے بلیک اینڈ وائٹ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اکثر اپنے دوستوں کو کہتا ہوں کہ مجھے ڈائریکشن کا شوق ہے۔"

16 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"بے انتہا..... انٹرنیٹ بہت فائدہ مند ہے۔ فیس بک سے بہت زیادہ نہیں ہے۔"

17 "کوئی فیوچر پلاننگ آپ کی؟"
"کوئی خاص نہیں۔ سوائے اس کے کہ جتنی محنت کر سکتا ہوں کرلوں۔"

18 "سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
"بہت اچھے خیالات آتے ہیں۔ ریلیکس ہو جاتا ہوں۔"

19 "مطالعہ ضروری ہے یا وقت گزاری ہے؟"
"بہت زیادہ ضروری ہے۔"

20 "پاکستانی معاشرے کی کوئی اچھی اور بری بات؟"
"اچھی بات یہ ہے کہ کام کرنے کی آزادی ہے اور بری یہ ہے کہ جو لوگ اچھا کام کرتے ہیں ہم ان کو بھول جاتے ہیں۔"

21 "آپ کی شخصیت کی کمزوری اور طاقت؟"
"طاقت تو یہ ہے کہ مجھے اس بات پہ یقین ہے کہ کامیابی محنت سے ہی حاصل ہوتی ہے اور کمزوری یہ ہے کہ کوئی کام کرنے کا ارادہ تو کر لیتا ہوں مگر اس کو شروع کرنے میں دیر کر دیتا ہوں۔"

22 "میک اپ ایجاد نہ ہوتا تو؟"
"جہاں میک اپ ایجاد نہیں ہوا، وہاں بھی زندگی چل ہی رہی ہوگی۔"

23 "میک اپ میں کیا چیز بری لگتی ہے؟"
"کوئی چیز نہیں۔"

24 "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"
"یہ تو منحصر ہے کہ کون کس انداز میں دکھ دیتا ہے۔"

25 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"
"میں کبھی بھی بور نہیں ہوتا۔"

26 "کس کی یاد تنہائی میں سکون کا باعث بنتی ہے؟"
"کوئی ایک انسان نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ہیں۔"

27 "ہماری رسموں میں کون سی رسم پسند ہے؟"
"مجھے تو ہر کلچر کی رسمیں اچھی لگتی ہیں۔ مگر صرف دیکھنے کی حد تک۔"

28 "کوئی تاریخی شخصیت جس سے ملنے کی خواہش ہو؟"
"بہت ہیں۔ بس مجھے نامور سائنس دانوں سے ملنے کا بہت شوق ہے۔"

29 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"یہی کہ دن اچھا گزرے۔"

30 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"ہر کونے میں۔"

31 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"کھانے کی طرف جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش۔"

32 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"کھانے کے معاملے میں میں شور نہیں مچاتا۔ کھانا اچھا پکا ہوا ہو بس۔"

33 "ناشتے میں کیا لینا پسند کرتے ہیں؟"
"آملیٹ، چائے، لسی کا ایک گلاس۔"

34 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتے ہیں؟"
"اپنے بہت ہی قریبی دوستوں سے۔"

35 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"کوئی بات نہیں۔ وجہ پوچھ کر دوبارہ سو جاتا ہوں۔"

36 "آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟"
"بہت کم۔"

37 "کیا آپ زندگی اپنی مرضی سے گزار رہے ہیں؟"
"اللہ کا شکر ہے۔"

38 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"میرے خیال سے ہم اپنے قریب رہنے والوں کو ہی بھول جاتے ہیں۔ ان کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے۔"

39 "جب پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتے ہیں تو کیا لکھتے ہیں؟"
"اس وقت جو دماغ میں ہوتا ہے، لکھ لیتا ہوں۔"

40 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"نہیں نہیں۔"

41 "دل کب ٹوٹتا ہے؟"

"دل ٹوٹنے کی عمر چلی گئی ہے۔ یہ تو مذاق ہے۔ دل ٹوٹنے کی چیز نہیں ہے۔"

42 "کون سی بات آپ کو جذباتی کردیتی ہے؟"
"جھوٹ بولنا۔"

43 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"
"جب کوئی اپنی قابلیت کا غلط اظہار کرتا ہے۔"

44 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"
"امن ضروری ہے۔ ایک ساتھ کھڑے ہونا ضروری ہے .... بہت تبدیلیاں ضروری ہیں۔"

45 "کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتے ہیں؟"
"اگر ضروری ہو تو خاموشی سے کرلیتا ہوں اور اگر بہت ضروری ہوتا ہے تو سب کے سامنے کرلیتا ہوں۔"

46 "آپ کی زندگی دوسروں سے کتنی مختلف ہے؟"
"مجھے نہیں لگتا کہ مختلف ہے۔ سب لوگ کام کرتے ہیں یہ بھی ایک کام ہے۔"

47 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"موبائل فون' گھر کی چابیاں' بٹوا۔"

48 "تنہائی میں کس سے ہم کلام ہوتے ہیں؟"
"تنہائی نے کبھی تنگ نہیں کیا اور اگر تنگ کرے تو کسی دوست کو فون کرلیتا ہوں۔"

49 "اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کرچکے ہیں؟"
"ایک دفعہ بھی نہیں۔"

50 "سفر کے لیے بہترین سواری؟"
"منحصر ہے کہ کتنی دور جانا ہے آپ نے۔"

51 "کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتے ہیں؟"
"اپنے کام سے متعلق چیزوں پہ بہت خرچ کرتا ہوں۔"

52 "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟"
"بہت ہیں۔"

53 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"
"اچھی تو یہ کہ جن پر بھروسا کرتا ہوں ان سے ہر بات شیئر کرتا ہوں اور بری یہ کہ لوگوں سے قریب ہونے میں بہت ٹائم لگتا ہے۔"

54 "دھوکا اپنے دیتے ہیں یا پرائے؟"
"دونوں دیتے ہیں اپنے دیں تو زیادہ دکھ ہوتا ہے۔"

55 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش ہمارا ہوتا؟"
"کبھی کسی ملک کے بارے میں ایسا نہیں سوچا۔ لیکن مجھے جاپان بہت پسند ہے۔"

56 "پاکستان میں کس چیز کی آزادی نہیں ہے؟"
"بہت سی چیزوں کی آزادی نہیں ہے اور خاص طور پر سچ بولنے کی آزادی نہیں ہے۔"

57 "لائٹ جانے پر بے ساختہ کیا بولتے ہیں؟"
"کچھ بھی نہیں۔ اب عادت ہوگئی ہے اور اس بات پر موڈ خراب کرنا بہت بڑی بے وقوفی ہے۔"

58 "لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟"
"لوگوں پر منحصر ہے کیونکہ ہر عمر کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔"

59 "اگر آپ ملک کے صدر ہوتے تو؟"
قہقہہ.... "اگر میں ملک کا صدر ہوتا تو زیادہ عرصے نہ بچتا۔"

60 "ٹی وی آن کرتے ہی پہلا چینل کون سا لگاتے ہیں؟"
"فی الحال میرے گھر میں ٹی وی نہیں ہے۔"

61 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"ہر چیز۔"

62 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتے ہیں؟"
"دوپہر کے دو بجے اور رات کے دو بجے۔"

63 "کیا محبت بار بار ہوتی ہے؟"
"بار بار بھی ہوسکتی ہے اور ایک بار بھی ہوسکتی ہے۔"

64 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"پیسے نہیں دیتا' نصیحت دیتا ہوں۔"

65 "غصہ کب آتا ہے؟"
"جب اس کی ضرورت پڑے۔"

66 "غصے کا ردعمل؟"
"غصے پر منحصر ہے۔ مگر ردعمل بہت wide ہوتا ہے۔"

67 "نصیحت' جو بری لگتی ہے؟"

"ایسی کوئی نصیحت بری نہیں لگتی جو اچھے انداز میں کی جائے۔ برے انداز میں کی جانے والی نصیحت بری لگتی ہے۔"

68 "پہچان کیسی لگ رہی ہے؟"
"اوہو.... اچھی ہے۔ کچھ چیزوں میں شہرت زیادہ ہوتی ہے۔ پیسہ کم ہوتا ہے۔"

69 "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"
"امن وامان اور سیکیورٹی۔"

70 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"یہی جواب ہے کہ سیکیورٹی اور سکون نہ ہو تو۔"

71 "کوئی لڑکی اگر مسلسل گھورے تو؟"
"تو میں ان سے بولوں گا کہ جی فرمائیے۔"

72 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکی؟"
"اس میں لڑکا یا لڑکی کی بات نہیں' بھروسے کے قابل وہی ہوتا ہے' جو بھروسے کے قابل ہوتا ہے۔"

73 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟"
"بدلنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے آپ کو اور ڈیولپ کرنا چاہتا ہوں۔"

74 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"
"یہ کہ میں ایئر کنڈیشنڈ 24 گھنٹے چلانا افورڈ کرسکوں۔"

75 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"
"ویسے تو ڈر نہیں لگتا۔ لیکن جب موت قریب آئے گی تو پتا نہیں کیا ہوگا۔"

76 "جھوٹ آسانی سے بول لیتے ہیں؟"
"ہاں۔ اگر چاہوں تو آسانی سے بول لیتا ہوں۔"

77 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"اوئے ہوئے بہت اچھا سوال ہے۔ میرے خیال میں لینس ہے۔"

78 "اگر موبائل فون نہ ہوتا تو؟"
"اگر موبائل فون نہ ہوتا تو یہ انٹرویو ہم "آمنے سامنے" بیٹھ کر دے رہے ہوتے۔"

79 "شوبز کی سب سے بڑی برائی؟"
"قابل لوگ آگے نہیں آرہے۔"

80 "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"
"چھٹی کے دن میں وہی کچھ کرتا ہوں' جو کرنے کو میرا دل چاہ رہا ہوتا ہے۔"

81 "کون سا تہوار شوق سے مناتے ہیں؟"
"بچپن میں گرمیوں کی چھٹیاں تہوار سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ اب کوئی نہیں۔"

82 "زندگی کب بدلی؟"
"جب سے شروع ہوئی ہے تب سے بدل رہی ہے۔"

83 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بہت پسند ہے؟"
"اپنی بہادری۔"

84 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتے ہیں؟"
"انسان سچا ہے یا نہیں۔"

85 "ٹریفک کب مسئلہ بنتا ہے؟"
"ہر روز۔"

86 "ٹریفک جام ہو تو وقت کیسے گزارتے ہیں؟"
"ریڈیو سن کے۔"

87 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"اپنے لیے ایک قیمتی گھڑی خریدی ہے۔"

88 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟"
"لیمپ اور کتاب جو پڑھ رہا ہوتا ہوں۔"

89 "مذہب سے آپ کی قربت؟"
"ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔"

90 "اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ کیا بولتے ہیں؟"
"چھوڑیں رہنے دیں۔" قہقہہ۔

91 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتے ہیں؟"
"میں لیٹتا ہی تب ہوں جب کہیں اور بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آنے لگتی ہے۔"

92 "آپ کا ذریعہ معاش؟"
"اداکاری' فوٹو گرافی اور ڈائریکشن۔"

93 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"موقع کے حساب سے جگہ بدلتی رہتی ہے۔"

99 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"عروج کب آیا ہے۔" قہقہہ۔

☆

خبریں یہ وہ بھی

تیسرِ نشاط

سائنسی ترقی

کچھ لوگ سائنسی ترقی سے خائف رہتے ہیں۔ ان کے خیال میں مشینوں میں گم انسان اپنے ساتھیوں سے بے گانہ ہو چلا ہے۔ یہ اعتراضات اپنی جگہ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بڑھتی ہوئی سائنسی ترقی نے دلوں کے فاصلے بڑھائے ہوں تو بڑھائے ہوں، لیکن وقت اور زمینی فاصلے ضرور گھٹا دیے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیجیے!

معروف بھارتی اداکارہ و فلم ساز پوجا بھٹ نے پاکستان کے مقبول گلوکار علی عظمت کو اپنی فلم کے لیے گانے کی پیش کش کی۔ علی عظمت نے ان کی یہ پیش کش قبول کرلی، مگر بھارتی حکومت نے علی عظمت کو مہمان بنانا گوارا نہ کیا۔ یوں علی عظمت کو ویزا نہ ملا۔ مگر جناب! پوجا بھٹ کو بھی جیسے جنون ہو چلا تھا۔ انہیں اپنی فلم کے گانوں کے لیے ہر صورت میں علی عظمت کی آواز ہی چاہیے تھی۔ علی نے ان کے جنون کا احترام کیا اور انہوں نے پاکستان بیٹھے بیٹھے ان کی فلم کے لیے گانے ریکارڈ کرا دیے۔

ارے نہیں! علی عظمت نہ تو جن بھوتوں کے کسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کی آواز کی گونج بڑھ کر بھارت تک جا پہنچی ہے۔ علی نے تو بس جدید سائنسی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ گانے "اسکائپ" کے ذریعے ریکارڈ کرائے ہیں۔ گویا "نہ ویزا لگا، نہ ٹکٹ اور گانا بنا چوکھا۔"

علی عظمت موسیقی کی تاریخ میں غالباً" پہلے فنکار ہیں، جنہوں نے اسکائپ کے ذریعے گانے ریکارڈ کرائے ہیں۔ (مبارک ہو علی جی!)

بڑی چیز

شعیب منصور کی فلم "بول" کو پاکستان میں اہمیت ملی ہو یا نہیں۔ البتہ عالمی سطح پر اس کی پذیرائی کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔۔۔ اور کیوں نہ ہو کہ ہر وہ فلم یا ڈاکیومنٹری، جس میں مذہب اسلام کے حوالے سے کسی شخصیت یا ہمارے ملکی وقار کا چہرہ مسخ کرکے پیش کیا گیا ہو، غیر مسلم اقوام عالم کے دلوں کو خوب بھاتی ہے۔ یوں چاروں جانب سے ایوارڈز کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔

فلم "بول" میں مرکزی کردار ادا کرنے والی اداکارہ عمیمہ ملک بھارت میں ایشین فلم ایوارڈ جیت کر آئی ہیں۔ عمیمہ یہ ایوارڈ حاصل کرنے والی پہلی پاکستانی اداکارہ ہیں۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ عمیمہ کے مقابلے پر اس ایوارڈ کے امیدواروں میں بھارتی اداکارہ شبانہ اعظمی بھی شامل تھیں۔ عمیمہ کا کہنا ہے کہ

"مجھے لگتا تھا، ایوارڈ شبانہ اعظمی کو ملے گا، مگر جب میرے نام کا اعلان ہوا تو چند لمحوں کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔" (حالانکہ اندھیرا تو شبانہ اعظمی کی آنکھوں کے سامنے چھانا چاہیے تھا۔ جیوری کی آنکھوں کے سامنے تو شاید پہلے ہی تھا۔)

عمیمہ نے بتایا ہے کہ بھارت میں ان کے چھوٹے بھائی امر کشمیری کو بھی ایوارڈ ملا ہے۔ (اچھا تو آپ اسی لیے اتنے عرصے سے وہیں تھیں؟) عمیمہ نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ

"میں ٹی وی پر کام کرنا نہیں چاہتی، کیونکہ وہاں وقت بہت ضائع ہوتا ہے اور ابھی میں اپنا وقت کسی بڑی چیز پر لگانا چاہتی ہوں۔" (اس "بڑی چیز" کا نام بھی بتا دیں عمیمہ جی!)

ناراضی

یہ دستور دنیا ہے کہ جب کوئی شخص اعزاز حاصل کرتا ہے تو دوست احباب اور متعلقین اس کے اعزاز میں تقاریب کا اہتمام کرتے ہیں، مگر جناب! اکثر تقریب پذیرائی کا اختتام ہتک عزت کے شکووں ہی پر ہوتا ہے کہ میزبان کا مہمان کو خوش کرنا اتنے ہی جان جوکھوں کا کام ہے جتنا کہ بہو کا ساس کو یا ساس کا بہو کو خوش کرنا۔

گزشتہ دنوں پاکستان کرکٹ بورڈ نے ایشیاء کپ جیتنے والی ہماری کرکٹ ٹیم کے اعزاز میں ایک تقریب پذیرائی کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں پی سی بی نے ٹیم کے تمام کھلاڑیوں کو شیلڈز اور انعامات سے نوازا۔ یہی نہیں، بلکہ ان کے معاوضوں میں پچیس فیصد اضافے کا اعلان بھی کیا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس قدر انعامات کی بارش کے بعد بھی ٹیم کے بعض کھلاڑی ۔۔۔ ناراض ہو گئے۔ بلکہ ایک اخباری خبر کے مطابق کپتان مصباح الحق اور عمر اکمل تو میچ ادھورا چھوڑ کر پویلین ہی سدھار گئے۔ کیونکہ اس موقع پر پیش کیے جانے والے خاکوں میں انہیں اپنا مذاق اڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

ان کھلاڑیوں کا کہنا ہے کہ ہمارے لیے سجائی جانے والی محفل میں ہمارا ہی مذاق اڑایا گیا۔ اس پر بورڈ کے چیئرمین ذکاء اشرف نے کھلاڑیوں کے آنسو پونچھے کہ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ خود بھی ذہنی طور پر تیار ہو کر آئے تھے کہ ان پر بھی کوئی خاکہ پیش کیا جائے گا۔ (انہوں نے غالباً" تقریب کے کپڑوں کی تیاری سے زیادہ وقت ذہن کی تیاری میں لگایا ہوگا۔)

(مصباح الحق اور عمر اکمل شاید موبائل نہیں رکھتے ورنہ وہ جان لیتے کہ پورے ملک میں گردش کرنے والے ایس ایم ایس میں انہیں سست رفتار بیٹنگ پر "ٹک ٹک کنگ" اور کیچ ڈراپ کرنے پر "ہاتھوں میں سوراخ والا جاندار" جیسے القابات سے نوازا گیا ہے۔)

وہ تو خوشبو ہے

پروین شاکر نے کہا تھا کہ

"وہ تو خوشبو ہے، ہواؤں میں بکھر جائے گا۔"

مگر معروف اداکارہ خوشبو ایسی خوشبو ہیں کہ جن کا فن جب ہواؤں میں بکھر کر دیکھنے والوں تک پہنچتا ہے تو داد و تحسین کے خاصے ڈونگرے ہی سمیٹتا ہے۔ خوشبو تقریباً" بیس سال سے اپنے "فن" کے جوہر دکھا رہی ہیں۔ اب ان کی توجہ اسٹیج اور بڑی اسکرین سے کم

ہو کے چھوٹی اسکرین کی طرف زیادہ ہو گئی ہے۔ (ہائیں! وہ اس میں کیسے سمائیں گی۔ ہمارا مطلب ہے، ان کا فن۔۔۔) فلموں میں کام کے حوالے سے خوشبو کا کہنا ہے کہ

"شادی سے پہلے جتنی بھی فلمیں کیں، ان سب میں میرے کردار اچھے تھے۔" (او ہو! تو یہ سب ارباز جی کا کیا دھرا ہے؟)

خوشبو کو یہ بھی شکوہ ہے کہ میڈیا انہیں پسند نہیں کرتا، اسی لیے ان کا کام نمایاں نہ ہو سکا۔ (جی جی! ہمیں احساس ہے کہ میڈیا بس وینا ملک کے پیچھے ہی پڑا رہتا ہے، ورنہ اس شعبے میں آپ جیسی مہان ہستیاں بھی موجود ہیں۔)

خوشبو نے انکشاف کیا ہے کہ جب وہ فلموں میں آئی تھیں تو اس وقت کافی ہیروز نے ان پر لائن مارنے کی کوشش کی تھی۔ (وہ موبائل فون کے اشتہار والی لائن؟) خوشبو نے ان کے نام نہیں بتائے، کیونکہ وہ سب اب شادی شدہ ہیں۔ شکر ہے ورنہ کتنے گھروں میں جھگڑا شروع ہو جاتا۔

کچھ اِدھر اُدھر سے

مولانا اسلم شیخوپوری جیسے لوگ اللہ کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ اپنے دوستوں کا خون معاف نہیں کرتا۔ مجھے اس بے حس حکومت پر بھی ترس آ رہا ہے اور مولانا اسلم شیخوپوری کے قاتلوں پر بھی کیونکہ یہ دونوں نہیں جانتے، انہوں نے مولانا کا خون کرکے اور مولانا کے خون پر چپ رہ کر اللہ تعالیٰ کو کس قدر ناراض کر لیا اور اللہ جب کسی سے ناراض ہوتا ہے تو یہ اس پر اپنی زمین اور آسمان سمیٹ دیتا ہے اور وہ بے ٹھکانہ ہو کر مرتا ہے۔

(جاوید چوہدری۔ زیرو پوائنٹ)

کراچی میں سیاست دانوں اور غنڈوں کا گٹھ جوڑ ہے۔ شہر قائد کی سیاست شہریوں کی زندگی کی قیمت پر چمکتی ہے۔ اس قسم کے تشدد نے جو اسلامی انتہا پسندی سے ماوراء ہے، اس نے شہر کو یرغمال بنا رکھا ہے۔

(برطانوی جریدے اکانومسٹ کی رپورٹ)

یوسف رضا گیلانی نے غیر ملکی دوروں پر سوا ارب (ایک سو پچیس کروڑ روپے) جبکہ شہباز شریف نے صرف 20 لاکھ خرچ کیے۔ پنجاب کے وزیر اعلا شہباز شریف نے ان دوروں پر اٹھنے والے تمام اخراجات اپنی جیب سے ادا کیے۔ اپنی پہلی وزارت اعلا کے دوران ہی وہ ایسا ہی کرتے تھے۔

گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام اور بابری مسجد کے انہدام میں بی جے پی کے لیڈروں کی خوشی پر بھارت میں مسلمانوں نے ایک بار پھر سوچنا شروع کر دیا ہے کہ پاکستان کا قیام غلط نہیں تھا۔

(کلدیپ نائر)

امریکا نے اسامہ کی موت کا ڈراما کیا ہے۔ القاعدہ سربراہ اسامہ کی پانچ سال قبل طبعی موت واقع ہوئی اور انہیں وصیت کے مطابق پاک افغان سرحد پر دفن کیا گیا اور اس کے عینی شاہد ان کے تین چچن محافظ ہیں۔

(سابق ایجنٹ سی آئی اے)

"غربت" کے باعث ذاتی گاڑی نہ رکھنے والے وزیر اعظم گیلانی نے دورہ لندن کے دوران 80 لاکھ کے 3 "سستے" کوٹ خریدے۔ اہل خانہ نے جیولری، کپڑوں، جوتوں اور گھڑیوں کی خریداری پر لاکھوں پونڈز اڑا دیے۔

(ایکسپریس نیوز)

عدنانہ

نفسیاتی الجھنیں اور آپ

ایک مشہور ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ میں ذہنی بیماری یا جسمانی بیماری میں سے کسی ایک کو قبول کروں، تو میں یقیناً "جسمانی بیماری کو قبول کرنا پسند کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جسمانی بیماری کچھ عرصے بعد ٹھیک ہو جائے گی جبکہ ذہنی بیماری مجھ سے چمٹی رہے گی۔ کیونکہ مریض اپنے جسم کا علاج کراتا ہے، ذہن کا نہیں۔ اس لیے جب تک وہ خود نہ چاہے، جب تک وہ خود نہ سمجھے، جب تک وہ خود کو مشورہ نہ دے یا کسی ماہر نفسیات سے رجوع نہ کرے، وہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔

✲ ✲ ✲

اگر زندگی بہت آرام اور چین کے ساتھ گزارنی ہے تو اپنی ضروریات اور خواہشات کو محدود رکھنے کی کوشش کیجیے خواہشات ایک ایسا سمندر ہیں جن کی گہرائی اور کنارے کا پتا لگانا ناممکن ہے دلی سکون کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے دل میں ہر دم نئی تمنائیں خواہشیں نہ ابھریں کیونکہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور اگر وہ پوری نہ ہو یا پورا ہونے کے امکانات نہ ہوں تو آپ کا چین اور سکون خاک میں مل جائے گا۔

کسی عالم کا قول ہے "گزرا ہوا کل ایک کینسل کیا ہوا چیک ہے آنے والا کل چیک کی شکل میں محض ایک وعدہ ہے اس کا کیش ہونا ضروری نہیں ہے صرف حال وہ نقدی جو آپ کے ہاتھ میں ہے اور جسے حسب منشا خرچ کیا جا سکتا ہے آنے والے وقت کے لیے پہلے سے سوچ سوچ کر اپنے ذہن کو پراگندہ نہ کیجیے کل کے مسائل پر چھوڑ دیجیے، مستقبل پر مکمل طور پر بھروسہ نہ کیجیے خواہ وہ کتنا ہی دلکش اور دیدہ زیب کیوں نہ ہو۔

عمل اور صرف عمل پر پختہ یقین رکھیے دل اور ذہن سے ایک ساتھ کام لیجیے بھرپور اور جامع شخصیت وہی کہلاتی ہے جہاں دل اور ذہن میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے جہاں جذبہ اور فکر میں یکسانیت ہو جہاں ان میں تضاد ہوگا شخصیت چکنا چور ہو جائے گی۔ انسان کو اپنے ارادے اور عزائم ہمیشہ بلند رکھنے چاہیں مگر ان کی بنیاد حقیقت پر ہونا ضروری ہے۔

ماضی کو یاد کرکے خود کو زیادہ غمگین نہ بنائیے جو ہوا سو ہوا وقت کے دھارے پلٹ کر نہیں آتے لکیر کو پیٹتے رہنا حماقت ہے حال کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیے مستقبل کے لیے زیادہ فکر مند رہنے کی ضرورت نہیں حال اچھا ہوگا تو مستقبل از حد خود بہتر ہو جائے گا۔ درج شدہ ایک مضمون کے اقتباسات ہیں جو دس بارہ سال پہلے نفسیات ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ ان اقتباسات کی روشنی میں اپنا جائزہ لیجیے شاید جینے کا قرینہ آ جائے یا زندگی میں سوچنے کا انداز بہتر ہو جائے گا۔

مسز.....ش

اچھی بہن! جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا۔ وہ واقعی بہت افسوس ناک ہے۔ جہاں تک ڈاکٹروں کی غفلت کا تعلق ہے‘ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ عمومی طور پر ہمارا مزاج ایسا ہی ظالمانہ اور بے حسی کا ہوتا جارہا ہے ڈاکٹر بھی اسی بے حس معاشرے کا حصہ ہیں۔ سرکاری اسپتالوں کا تو بہت ہی برا حال ہے لیکن پرائیویٹ اسپتالوں میں بھی ڈاکٹرز کی ساری توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بل کس طرح بنائے جائیں۔ مریض کی صحت یابی کا کسی کو احساس نہیں ہے۔

آپ نے مقدمے کی ہے بات کی تو عدالتوں کا حال تو سب سے زیادہ خراب ہے۔ وکیلوں کی بڑی بڑی فیسیں دینے کے بعد آپ صرف تاریخ کا انتظار کرتی رہیں گی اور سال پر سال گزرتے جائیں گے۔ نتیجہ صفر۔

آپ نے سوال کیا ہے کہ کیا اس ڈاکٹر کے خلاف کوئی ایکشن نہیں ہونا چاہیے جس نے آئی سی یو کے مریض کے ساتھ اتنی غفلت اور لاپروائی کی؟

بالکل لینا چاہیے لیکن کون لے گا؟ کیا انصاف تک رسائی ممکن ہے؟ کراچی میں پچھلے دو عشروں سے سڑکوں پر دن دہاڑے لوگ قتل کردیے جاتے ہیں اور قاتل نہ پکڑے جاتے ہیں اور نہ کوئی ان کا نام لیتا ہے۔ ان حالات میں صرف یہی مشورہ دیا جاسکتا ہے کہ۔ آپ اس ڈاکٹر کے خلاف درخواست ضرور دیں لیکن مقدمہ وغیرہ کا خیال چھوڑ دیں۔

بیوہ کی شادی کی ہمارے مذہب میں نہ صرف اجازت ہے بلکہ زیادہ تاکید کی گئی ہے اور اس میں جلدی کرنے کو کہا گیا ہے لیکن مشکل یہ ہے۔ یہاں کنواری لڑکیوں کی شادی مسئلہ بن چکی ہے۔ بیوہ کے لیے اچھا رشتہ کہاں ملے گا۔ اگر پیسہ کے لالچ میں کسی نے شادی کر بھی لی تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ صحیح رویہ رکھے گا۔ اسی لیے عموماً" خواتین بیوہ ہونے کے بعد دوسری شادی کے بارے میں نہیں سوچتیں۔

آپ تو اس لحاظ سے بہتر ہیں کہ شوہر کی پنشن وغیرہ ملے گی۔ ان کے کچھ واجبات بھی ہوں گے۔ ورنہ معاشی مسائل بھی کھڑے ہوجاتے۔ آپ اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ ملازمت بھی کرسکتی ہیں۔

یہ خیال دل سے نکال دیں کہ غصہ میں کوئی بددعا منہ سے نکل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی اور موت کا وقت لکھا ہوا ہے‘ جو کسی دعا یا بددعا سے نہیں بدل سکتا۔ آپ کے شوہر اتنی ہی عمر لکھوا کرلائے تھے۔ سبب کوئی بھی بن سکتا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ کیا لوگوں کو خوش کرنے کے لیے مجھے ہر وقت اداس اور پریشان نظر آنا چاہیے؟

ہرگز نہیں۔ اگر آپ اداس اور پریشان نظر آئیں گی تو آپ کے بچے خودترسی اور خود رحمی کا شکار ہوجائیں گے۔ ان کی ذہنی صلاحیتوں پر اس کے برے اثرات ہوں گے۔

یہ خیال دل سے نکال دیں کہ لوگ آپ کو اور آپ کے بچوں کو ترس بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں‘ آپ سے افسوس اس لیے کرتے ہیں کہ ابھی تازہ تازہ حادثہ ہے۔ کچھ وقت گزر جانے دیں پھر لوگوں کا رویہ نارمل ہوجائے گا۔

آپ نے پوچھا ہے نیک شخص ملے تو دوسری شادی کرلوں؟ اچھی بہن! آپ کا بیٹا 17 سال کا ہے اور بیٹیاں بھی جوان ہوچکی ہیں۔

آپ نے دوسری شادی کی تو اس صورت حال میں آپ کے خاندان والوں کا کیا ردِ عمل ہوگا؟ کیا آپ کے بچے اس پر راضی ہوں گے؟

یہ فیصلہ آپ کو اپنے حالات دیکھ کر کرنا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے‘ آپ اپنے بچوں کو کھو بیٹھیں۔ آپ تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کرکے کوئی فیصلہ کریں۔

آپ نے لکھا ہے کہ بیوہ ماں‘ بچوں کی خاطر شادی نہیں کرتی‘ قربانی دیتی ہے اور بچے بڑے ہوکر ماں کو تنہا چھوڑ کر اپنے اپنے کاموں میں سیٹ ہوجاتے ہیں اور اکیلی ماں دھکے کھانے کے لیے رہ جاتی ہے۔

اس پر بھی غور کرلیں کہ یہ خدشہ تو دوسری شادی کی صورت میں بھی ہے۔

الف.....فیصل آباد

بہن الف نے لکھا ہے کہ ان کی ایک کزن شادی سے پہلے سے مختلف لڑکوں کے ساتھ فلرٹ کرتی رہی۔ گھر والوں کو پتا چلا تو انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی اور شادی جلدی کردی۔ شوہر بہت اچھا ہے تمام حالات جاننے کے باوجود اعلا ظرفی سے کام لیا۔ کچھ نہیں کہتا لیکن اب شادی کے بعد بھی وہ کزن کسی اور لڑکے کے چکر میں ہے۔ ان بہن نے پوچھا ہے آپ اس مسئلے کے بارے میں تسلی بخش جواب دیں تاکہ اس کا کوئی حل نکل سکے ورنہ پتا نہیں کیا تباہی آئے گی۔

ج: آپ نے اسے پہلے شادی سے پہلے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی‘ کیا نتیجہ نکلا؟ الٹا اس نے آپ سے قطع تعلق کرلیا۔ گھر میں اس کے باپ بھائیوں نے اسے مارنے کی کوشش کی‘ برا بھلا کہا۔ فوری شادی کردی۔ اس کے باوجود اس نے اپنی راہ نہیں بدلی۔ جب کوئی خود کو تباہ کرنے پر ہی تلا ہو تو دوسرا کوئی شخص کیا کرسکتا ہے۔

اب بہتر یہی ہے کہ آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں اور کوشش کریں کہ اس سے کم سے کم تعلق رکھیں ورنہ آپ بھی کسی الزام کی زد میں آسکتی ہیں۔

ف۔کبیروالا

آپ اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ بھائی بھی اچھی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ والدہ بھی ملازمت کرتی ہیں۔ مسئلہ والد صاحب ہیں جو ایک حادثے کے نتیجہ میں ذہنی مریض بن چکے ہیں۔ بے جا پابندیاں‘ سختی‘ شک ان کے مزاج کا حصہ بن گیا ہے۔ والدہ بچوں کے ساتھ علیحدہ رہنا چاہتی ہیں لیکن آپ کو یہ گوارا نہیں ہے کہ اس عمر میں والد کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔

ج: عزیز بہن جھگڑے کی وجہ تو آپ نے خود ہی بتادی ہے۔ حادثہ کی وجہ سے آپ کے والد کے ذہن پر برے اثرات ہوئے۔ اگر بروقت توجہ دے لی جاتی تو مسئلہ اس حد تک نہ بڑھتا۔ اب بھی آپ کے والد کا علاج ہوسکتا ہے انہیں کچھ دواؤں کی ضرورت ہے۔ کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے مشورہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔

آپ کے والد صاحب کی جو ذہنی کیفیت ہے اس میں آپ کی والدہ اپنے ردِ عمل میں حق بجانب ہیں۔ ہر وقت کی تنقید‘ بے جا پابندیاں‘ کردار پر الزام تراشی کسی بھی عورت کے لیے برداشت کرنا آسان نہیں ہے جبکہ والد صاحب کو قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ یقین دلایا جائے تب بھی مطمئن نہیں ہوتے۔

اگر آپ علیحدہ نہیں رہنا چاہتیں تو اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ کسی بھی طریقے سے والد صاحب کا علاج کرائیں۔

امت الصبور

بیوٹی بکس

مہرگل.... علی پور چٹھہ

س :۔ میرے چہرے پر ہلکا سا رواں ہے لیکن ہونٹ کے اوپر والے حصے پر بال بہت نمایاں ہیں جو بہت برے لگتے ہیں۔ میں نے لیزر ٹریٹمنٹ کے بارے میں سنا ہے کیا لیزر ٹریٹمنٹ سے بال ہمیشہ کے لیے غائب ہوسکتے ہیں، اس سے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا؟ میری دوست کہتی ہے کہ اس سے جلد سیاہ پڑجاتی ہے۔

ج :۔ آپ نے اپنے بالوں کی ساخت کے بارے میں نہیں لکھا، اگر بال بہت باریک ہیں تو بلیچ کرکے انہیں جلد کے ہم رنگ کیا جاسکتا ہے۔ تھریڈنگ کے ذریعے بھی بال دور کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن یہ مستقل حل نہیں ہے۔ لیزر ٹریٹمنٹ کے ذریعے بال ہمیشہ کے لیے غائب نہیں ہوتے البتہ چھ ماہ سے سال بھر تک کے لیے ان سے نجات مل جاتی ہے۔ لیزر ٹریٹمنٹ کرانے کے لیے ضروری ہے کہ بالوں کی رنگت گہری ہو اور بال کافی موٹے ہوں۔ جہاں تک نقصان کا تعلق ہے تو اس کے کچھ مضر اثرات تو سامنے آئے ہیں لیکن صحیح طور پر ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ ڈاکٹر سے مشورہ کرلیں۔

زرتاشہ.... گاؤں شینکہ

س :۔ میں نے اسکرب کے بارے میں سنا ہے کہ اس سے جلد صاف شفاف ہوجاتی ہے اور رنگ بھی صاف ہوجاتا ہے جہاں میں رہتی ہوں وہاں یہ نہیں ملتا اور شہر سے منگوانا میرے لیے ممکن نہیں۔ کیا واقعی اسکرب سے رنگ گورا ہوجاتا ہے؟ میں اسے کیسے حاصل کرسکتی ہوں۔

ج :۔ اسکرب جلد کو نکھارتا ہے۔ چہرے کے مسامات سے تمام میل کچیل نکال کر مردہ خلیوں کو دور کردیتا ہے۔ اس سے جلد نرم ملائم اور چمک دار ہوجاتی ہے۔

اگر آپ بازار سے اسکرب نہیں خرید سکتیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ان اسکرب کو گھر میں تیار کرنا نہ صرف آسان ہے بلکہ بہت کم خرچ میں گھر میں تیار کیے جاسکتے ہیں۔ خشک اور بے جان جلد کے لیے آپ یہ اسکرب بنا کر استعمال کریں۔ یہ آپ کے چہرے کی جلد میں زندگی اور نئی جان ڈال دے گا۔

چنے کا آٹا.... دو چمچ
خشک دودھ.... دو چمچ
جئی کا آٹا.... دو چمچ

حسب ضرورت پانی استعمال کرکے اس کا ہموار نرم پیسٹ بنالیں اور اس کو چہرے پر لگا کر نرمی سے رگڑیں۔

جئی اور چنے کا آٹا گہرائی تک جلد کی صفائی کردے گا اور خشک دودھ جلد کو نرم ملائم کردے گا۔

ہفتے میں تین بار آپ یہ عمل کریں ــــ واضح فرق محسوس کریں گی۔